جموں کشمیر

تاریخ تنازعہ اور حل



جاوید عنایت

جموں کشمیر

تاریخ، تنازعہ اور حل

Jammu Kashmir
Tareekh, Tanaza aur Hal

جاوید عنایت

جموں کشمیر

تاریخ، تنازعہ، اور حل

جاوید عنایت

Global Research Institute

جموں وکشمیر : تاریخ،تنازعہ اور حل

Jammu Kashmir, Tareekh, Tanaza aur Hall
by Javid Anayat
Awaz Publications. 2023
Islamabad
544p
Kashmir History

نام کتاب	:	جموں کشمیر۔تاریخ۔تنازعہ اور حل
مصنف	:	جاوید عنایت
اہتمام	:	محمود اظہر
تعداد	:	1000
سالِ اشاعت	:	2023ء
مطبع	:	محمود برادرز پرنٹرز
قیمت	:	1200/- روپے
بیرون ممالک	:	10 ڈالر 8 پاؤنڈ

انتساب

ریاست جموں کشمیر کے ان فرزندوں کے نام جنہوں نے 1947ء میں ریاست کو ہندوستان کے بٹوارے کی آگ کے شعلوں میں جھلسنے سے بچانے کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور ریاست کے ان بہادر سپوتوں کے نام جو پچھلے 75 سالوں سے ریاست کی وحدت کی بحالی کے لیے شمع کے پروانوں کی طرح اپنی دھرتی پر قربان ہوتے گئے اور ابھی تک ہو رہے ہیں۔

ریاست جموں کشمیر کے تمام تقسیم شدہ خطوں کے عوام کے نام جو ریاست کی جبری تقسیم، اس کے تنازعہ کی وجہ سے درد بھری اور مصیبتوں والی زندگیاں گزارنے پر مجبور کر دیے گئے اور اس تنازعہ کا منصفانہ حل چاہتے ہیں۔

مصنف کی بات

یہ کتاب لکھنے کا خیال مجھے اس وقت آیا جب سوشل میڈیا پر ریاست جموں کشمیر کے حوالے سے ایک نئی بحث کا آغاز ہوا جس میں سوال اٹھایا گیا تھا کہ آزاد کشمیر کی کچھ سیاسی جماعتیں کشمیری خطے کو ہی ساری ریاست کیوں قرار دے رہی ہیں؟

میں نے اس وقت سوچنا شروع کر دیا تھا کہ ابھی تک ریاست کی تاریخ کے بجائے صرف کشمیر کی تاریخ پر ہی لکھا گیا ہے اور آزاد کشمیر کے خطے میں ریاستی تاریخ کو وہی لوگ مسترد کرتے ہیں جو ریاست کی آزادی کے دعوے بھی کرتے ہیں۔ تب میں نے سوچا تھا کہ ریاست کے بارے میں ایسی کتاب ضرور لکھنی چاہیئے جو عام ریاستی باشندے کو تاریخ سے آگاہی مہیا کرے۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ریاست جموں کشمیر کے اپنے ہی شہری اپنی ریاست کے بارے میں کافی زیادہ پروپیگنڈے کا شکار ہیں اور ریاست جموں کشمیر کی تاریخ اور اس کے تنازعہ کے بارے میں کئی طرح کے فکری مغالطوں کا شکار ہیں۔ اس طرح کے فکری مغالطے دور کیے بغیر ریاست جموں کشمیر کے مختلف خطوں کے عوام کو قریب لانا ممکن ہی نہیں ہے۔

ریاست جموں کشمیر کے تمام تقسیم شدہ خطے متنازعہ ہیں اور ان سب کا فیصلہ الگ الگ نہیں ہوسکتا بلکہ ساری ریاست کا فیصلہ اکھٹے ہوگا لیکن بدقسمتی سے تمام سیاسی جماعتیں

ریاست کے ایک ہی خطے کا مسئلہ پیش کر کے اسی کے حق میں پروپیگنڈہ کرنے میں 1947ء سے سرگرم ہیں جس کی وجہ سے ریاست کا مسئلہ ایک فرقہ وارانہ نوعیت اختیار کر چکا ہے۔ ایک ہی ریاستی خطے، کشمیر کی بنیاد پر تنازعہ کو بڑھانے سے یہ مذہبی فرقہ واریت اور مسلم قوم پرستی کا روپ دھارن کر گیا ہے۔ اس فکری مغالطے کو دور کرنا ہی اس کتاب کا مقصد ہے اور تنازعہ کو سمجھنے کی نئے سرے سے کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کو لکھنے پر مائل کرنے والوں میں جن دوستوں نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں سعید اقبال، حبیب الرحمن، سید شوکت جعفری صاحب، شفقت راجہ صاحب، یاسین انجم، راجہ ایاز، خواجہ اکرم، زائد خان اور دیگر احباب بھی شامل ہیں جن سب کے نام لکھنا ممکن نہیں ہے۔ ان سب دوستوں کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔

جاوید عنایت

جنوری 2023ء

ترتیب

پیش لفظ

میری زندہ روح کو قتل نہیں کر سکتے
خون کا ساگر بھی صداقت کو ڈبو نہیں سکتا

دھرتی ماں کا بیٹا جاوید زندہ روح کے ساتھ صداقت کا جھنڈا اٹھائے وطن عزیز جموں وکشمیر کی حقیقی آزادی کے لیے سیاسی سفارتی اور قلمی محاذ پر کئی دہائیوں سے برسر پیکار ہے۔

زیر نظر کتاب جاوید کی ایک ایسی دستاویز ہے جو غلاموں کی اس بستی (ریاست جموں کشمیر) کے لیے تریاق ہے۔ اگر نسل نو سچ کو اپنے ذہنوں تک رسائی دے تو جاوید کے ان خوابوں کو تعبیر مل سکتی ہے جو وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے اور جاگتی آنکھوں سے اپنی سوئی ہوئی قوم کے لیے دیکھ رہا ہے۔

عجب دیوانہ ہے تھکتا نہیں۔۔۔
دیار غیر اور غم روزگار مگر ہر لمحہ وطن کی وحدت کے لیے وقف۔۔۔

وہ جانتا ہے قوموں کی آزادی کی سمت تاریخ کی سچائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ سچ مسخ کر کے طاقتور گروہوں کے بیانیے کے قصیدے لکھنے سے آزادی نہیں ملتی ''ہمارے سارے اکابرین غلطیوں سے پاک تھے اور ہیں''۔قصیدہ گوئی کی اس صنعت نے جس قدر ترقی کی آزادی کی منزل اتنی ہی دور ہوتی گئی۔

بہتر دنیا کا خواب، سماج کے ارتقائی عمل کو رواں کرنے کے لیے حقائق کی تلاش،

شخصیات کی پوجا کے بجائے علم اور جستجو، انسانوں کو غلام رکھنے والی قوتوں پر سوال اٹھانا جاوید کی زندگی کا مقصد ہے۔

اس میدان میں اس کا مقابلہ ان لوگوں سے ہے جو اپنے لفظوں کو "اسٹیٹس کو" کی حامل قوتوں کی ترجمانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کارگاہِ فکر سے اُن طاقتوروں کے لیے دلائل پھوٹتے ہیں جو لوگوں کو اپنی غلامی میں رکھنا چاہتے ہیں۔

جاوید کے سوال فکری لام بندی کے ہراس واعظ کے "افکار" پر ہیمبرنگ کر رہے ہیں۔

جاوید کی تحریر آرٹیفیشل سیاست دانوں سے پوچھتی ہے کہ وہ صبح جس کی خوش خبری آپ کے نظریات کا حاصل تھی رات میں کیسے بدلی؟

وہ غیرت وحمیت کے درس، دلوں کی دھڑکن کو رواں کرنے والی لچھے دار گفتگو۔۔۔سب سراب کیوں؟

جاوید عنایت نظریہ ضرورت کے تحت تخلیق کیے گے "رہبرانِ ملت" کو حقائق کی روشنی میں بے نقاب کرنا ہے اس لیے کہ جب خود ساختہ "رہبروں" کی اصلیت سامنے آ جائے تو صدیوں کا سفر دنوں میں طے ہوتا ہے۔

وہ تاریخ کے میدان سے اس خطے کی شناخت اٹھاتا ہے ہر دور کے منظر اور پس منظر کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور ہمیں موجودہ منقسم ریاست کے "قیام اور ٹوٹنے" کے صحرا میں پھینک کر غائب نہیں ہوتا بلکہ ایک راہ عمل دیتا ہے۔

جاوید عنایت کی گلوبل پارٹی منقسم ریاست جموں کشمیر کی وحدت اس میں بسنے والی قومیتوں کی اپنی شناخت اور برابری کی بنیاد پر حقوق بلاتخصیص مذہب و مسلک انصاف، ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کی خوشحالی اور بہتر مستقبل کے لیے جس سوچ کے ساتھ جدوجہد کر رہی ہے ہر ذی شعور آدمی کو ان کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے۔

نشستیں گفتگو اور پھر اس کتاب کا مسودہ پڑھنے کے بعد میں یقین سے کہ سکتا ہوں

کہ جاوید عنایت ایک ایسی منزل کے حصول کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکا ہے جس کا اظہار 10 مئی 1994 کو نیلسن منڈیلا نے انتقالِ اقتدار کے وقت کیا۔

" آئندہ کبھی نہیں، کبھی نہیں اور کبھی نہیں یہ ہوگا کہ یہ خوبصورت سرزمین دوبارہ کسی طرح کے ظلم وستم سے دوچار ہو۔ اس قدر شاندار کامیابی پر سورج کبھی غروب نہیں ہوگا"

میری تمام تر نیک خواہشات دھرتی ماں کے اس فرزند کیلئے۔

شعور آزادی اور خوشحالی کے پیامبر کے لیے

ملک عبدالحکیم کشمیری

مظفرآباد جموں کشمیر

2 جنوری 2023ء

مصنف کے بارے میں

زیر نظر کتاب میں جاوید عنایت نے کمال جانفشانی سے منقسم ریاست جموں کشمیر اور اسکی چار اکائیوں کی حقیقی تاریخ کو سامنے لایا۔ ریاست کا قیام 1947 کے بعد متنازعہ حیثیت الحاق اور اٹوٹ انگ کے دعوے تمام تر صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے تنازعہ کا پائیدار حل بھی پیش کر کے گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔

مصنف نے غیر جانبداری سے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے تاریخ کے ان حوالہ جات کو پیش کیا ہے جو غیر جانبدار مورخین نے اپنی تحریروں میں قلمبند کیے۔

خواہشات کے بجائے اصلی متن (Content) کیساتھ ایک ایک چیز نسل نو کے سامنے رکھنا یقیناً جاوید عنایت کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ مصنف مادر وطن کا وہ باشعور بیٹا ہے جس نے روشنائی کے بجائے خون جگر سے یہ کتاب تحریر کی ہے۔

ہماری ریاست میں اس قسم کے تحقیقی کام کی ضرورت ہے تاکہ ریاست کا تاریخی جائزہ لیکر نسل نو درست سمت کا تعین کر سکے چونکہ ہم جس عہد میں جی رہے ہیں یہ نئے انسان کا عہد ہے اس دور کے انسان کے سامنے کرہ ارض پر انسانیت کی بقا کا مسئلہ بھی درپیش ہے لہٰذا نئے دور کے انسان کو انسانی اخوت کا سبق پھر سے سیکھنا ہوگا تاکہ خطے کے امن کے ساتھ ساتھ گلوبل امن کیلئے بھی کردار ادا کر سکے۔

بدقسمتی سے ہماری منقسم ریاست کے بیشمار قلمکاروں نے تاریخی بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیشہ غاصبوں کو مسیحا بنا کر پیش کیا اور سچائی کو سات پردوں کے پیچھے چھپانے کی

ناکام کوشش کی۔

میرا سیاسی ایمان ہے کہ یہ کتاب جہاں پڑھنے والے کے دل، دماغ پر اثر انداز ہو کر نتائج دکھائے گی اور فکری قوت میں اضافے کا سبب بنے گی وہاں جھوٹے قصے کہانیوں کے فلک بوس قلعوں کی دیواروں میں ڈراریں بھی ڈالے گی۔

اب یہ نسل نو پر منحصر ہے کہ وہ اس شعوری علم سے کتنی مستفید ہوتی ہے اور منقسم ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی بحالی، خطے کی ترقی اور گلوبل امن کیلئے اپنا کتنا حصہ ڈالتی ہے۔

بہر حال جب کبھی مستقبل میں کسی نے تاریخ جموں کشمیر جاننے کی کوشش کی تو اسے جہاں مفادات کی دہلیز چومتے بیشمار سرنگوں قلم بردار ملیں گے وہاں جاوید عنایت جیسے کھرے، بے باک اور غیر جانبدار تجزیہ نگار بھی اپنی تحریروں کی گواہی کیساتھ موجود ہونگے۔

اسد نواز

ہجیرہ، جموں کشمیر

پہلا باب

ریاست جموں کشمیر میں شامل خطوں کا تاریخی پس منظر

ریاست جموں کشمیر کا تاریخی پس منظر جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ اس ریاست کے خطوں اور ان خطوں میں رہنے والی قوموں اور قومیتوں کے تاریخی پس منظر سے آگاہی حاصل کی جائے۔ ریاست جموں کشمیر کی اپنی تاریخ اتنی طویل نہیں ہے جتنی اس ریاست میں شامل خطوں میں بسنے والی قوموں اور قومیتوں کی تاریخ ہے۔ اس ریاست میں کشمیر، جموں، گلگت بلتستان اور لدّاخ کے خطے شامل ہیں۔ ان تمام خطوں کا تاریخی، لسانی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی پس منظر ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہا ہے۔ ان تمام ریاستی خطوں کا مشترکہ تاریخی پس منظر ریاست جموں کشمیر کی ایک الگ سیاسی اور جغرافیائی اکائی بن جانے سے شروع ہوا ہے جو 1846ء کے معاہدہ امرتسر کے بعد شروع ہوا تھا گو کہ اس معاہدے کا ایک فریق برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Co) تھی اور دوسرا فریق جموں کی اس وقت کی ریاست کا حکمران راجہ گلاب سنگھ تھا لیکن ریاست جموں کشمیر کا حصہ بننے والے تمام خطے اپنا اپنا تاریخی ارتقاء طے کر کے تاریخ کے اس خاص موڑ پر ایک ریاست کے مشترکہ انتظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ریاست کے یہ خطے اپنے تاریخی ارتقاء کے مختلف مراحل سے گزر کر فیوڈل سیاسی اور معاشی نظام کے تحت اکٹھے کئے گئے تھے اور یہ ایک خاندانی ایمپائر کا حصہ بنائے گئے

تھے۔ اب ہم ان خطوں کا الگ الگ تاریخی پس منظر اور جائزہ پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے کشمیری بولنے والے خطہ کشمیر کی تاریخ کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔

1۔خطہ کشمیر کا تاریخی پس منظر

کشمیر کا خطہ اپنی طویل ترین تاریخ رکھنے والی سرزمین ہے۔ اس علاقے میں قبل از تاریخ انسانی زندگی کے آثار بھی ملتے ہیں یہاں انسانی تاریخ کے شکار کا دور بھی گزرا ہے گو کہ اس دور میں یہاں انسانوں کی مستقل بَستیاں نہیں ہوتی تھیں جہاں انسان مستقل سکونت پزیر ہوتے ہوں چونکہ کشمیر کے علاقے سردیوں کے زمانے میں شدید سردی اور برف سے بھر جاتے تھے اور زندگی گزارنا آسان نہیں تھا لیکن ارد گرد کے علاقوں سے لوگ گرمیوں کے موسم میں یہاں اپنے مال مویشیوں کے ساتھ آتے تھے اور سردیوں میں واپس اپنے اپنے علاقوں میں چلے جاتے تھے۔ یہ زمانہ انسانی تاریخ کا وہ دور ہے جب انسان فطرت سے اپنی خوراک حاصل کرتا تھا اور شکار کر کے اور جانور یا مال مویشی پال کر اپنی زندگی گزارتا تھا۔ اس کے بعد انسان نے یہاں خطۂ کشمیر میں بَستیاں اور مستقل سکونت اختیار کرنی شروع کی لیکن یہ زمانہ بھی خاندانی زندگی کا ابتدائی دور ہے جب کنبے کا سربراہ ہی اپنے کنبے کا حکمران تصور کیا جاتا تھا۔ یہ زمانہ شکار کے دور سے تھوڑا بعد کا ہے جب انسان نے اپنے ابتدائی سماجی نظام کنبہ یا خاندان (Clan) کی بنیاد رکھ لی تھی۔

یہ دور کشمیر میں بھی شروع ہو چکا تھا اور اس دورِ وحشت میں یہاں بھی کوئی باقاعدہ نظام حکومت یا منظم اتھارٹی سماج پر اپنا تسلط قائم نہیں کر پائی تھی۔ خاندان کبھی شکار کے لیے نکل جاتے تھے تو کبھی زمین سے تھوڑا بہت گرمیوں کے موسم میں کھانے کے لیے غلہ اُگا لیا کرتے تھے۔ خاندان اور کنبے کی تعداد میں یا آبادی میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو چھوٹے چھوٹے قبیلے اور برادریاں بننا شروع ہوئیں۔ یہ دور بھی چھوٹے چھوٹے سماجی گروہوں کا آپس میں مل جل کر رہنے کا زمانہ ہے۔ ان سماجی گروہوں کے اپنے سردار ہی حاکم کہلاتے تھے ان کے درمیان جھگڑا فساد کا اندیشہ کم ہوتا تھا جو ہوتا بھی تھا تو ان کے سردار پنچائیت بٹھا کر

آپس کی بات چیت سے حل کرلیا کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے سردار یا حاکم کی اطاعت قبول کرنا سیکھ گئے تھے گو کہ پنچائیت میں بیٹھتے وقت سردار جو حاکِم وقت بھی تھا اور عام پنچائیت کا ممبر برابر ہوتے تھے۔ یہ زمانہ سخت گیر یا جبراً دوسروں پر حکمرانی کرنے کا نہیں تھا ان کے دربار بھی کسی سایہ دار درخت کے نیچے لگتے تھے جہاں پنچائیت میں شامل سارے لوگوں کے حقوق برابر ہوتے تھے۔ پہلے یہاں لوگ صرف چراہ گاہوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے آتے تھے لیکن سردی اور برف کا زور کم پڑنا شروع ہوا اور ماحولیاتی تبدیلی آنے سے کشمیر میں ان گلہ بانوں اور شکار کے لیے آنے والوں نے مستقل رہائش یا سکونت اختیار کرنا شروع کی۔ مستقل سکونت اختیار کرنے سے ہی زراعت کی بنیاد پڑی اور موسمی حالات سازگار ہونے سے انسانی زندگی نے نیچر کی زندگی (فطرت پر مکمل انحصار) سے نجات حاصل کرنا شروع کی۔

زمین سے خوراک پیدا کرنے سے انسان نے سماجی زندگی کا آغاز کیا۔ اس سماجی زندگی کو کسی قاعدے قانون کے تحت لانے کے لیے انسان نے منظم سماجی زندگی کا آغاز کیا۔ اس سماجی زندگی نے وسعت اختیار کرنا شروع کی اور اردگرد کے چھوٹے چھوٹے قبائل طاقتور قبائل کے حملوں اور ان کے علاقوں پر قبضہ گیری کی وجہ سے حاکمیت کا تصور بھی ابھرنا شروع ہوا۔ انسانی آبادی میں مزید اضافے کی وجہ سے منظم حاکم طبقہ بھی وجود میں آیا اور زمین کی ملکیت کا رواج بھی شروع ہوا۔ خطۂ کشمیر سرسبز و شاداب ہونے کی وجہ سے زندگی کی رعنائیوں اور انسانی رہائش کے لیے باعثِ کشش بن گیا لیکن اس خطے کی تاریخ کو بھی اسی طرح افسانوی بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ یہاں ہمارا موضوع بحث صرف اس خطۂ سرزمین کی حقیقی مادی اور تاریخی حقائق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کشمیر میں آب و ہوا جُوں جُوں انسانی زندگی کے لیے موافق ہوتی گئی یہاں کی آبادی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ آبادی میں اضافہ ہونے کے باوجود یہاں ابھی شخصی حکمرانی کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ابتدائی زندگی اور معاشرے یہاں کے سرداروں کے کنٹرول میں تھے۔ ان میں سے کئی ابتدائی زمانے کے سرداروں کے نام بھی ملتے ہیں۔

قدیم تاریخوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس علاقے میں پہلے پانی کی ایک بہت

بڑی جھیل تھی اور اس جھیل کا نام ستی سر تھا۔ ہندوؤں کے ایک بزرگ کشپ رشی (Rishi) نے اس جھیل کو کاٹ کر بارہ مولا کے مقام پر پانی کا اخراج کیا اور پھر یہاں جگہ خشک ہونے کے بعد انسانی زندگی شروع ہوئی۔ سرینگر کو ستی سر جھیل کا ہی بگڑا ہوا نام بتایا جاتا ہے اور کشمیر کی وجہ تسمیہ بھی کشپ رشی کے نام سے ہی کشمیر بتایا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کشپ رشی نے یہاں اپنے لوگوں کو آباد کیا۔ ان سے یہاں آبادی کا آغاز ہوا۔ پھر گاؤں اور قصبے آباد ہونے شروع ہوئے۔ آبادی میں اضافے کی وجہ سے کئی گاؤں کو ملا کر ان کے اکابرین نے بعد میں کئی علاقوں پر قبضے کر لیے اور پہاڑی دروں اور بلند جگہوں پر قلعہ یا کوٹ تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ ان قلعوں یا کوٹوں کے حاکم کئی علاقوں کو کنٹرول کر کے حکمرانی کرنے لگے۔ اس دور کو کشمیر میں کوٹھ راج کا زمانہ بھی کہا جاتا ہے اور یہ کوٹ آج بھی کشمیر میں اپنے کئی ناموں سے موجود ہیں جن میں سے چند مشہور کوٹوں کے نام اندر کوٹ، انہہ کوٹ، سوردہ کوٹ، شالکوٹ، بنہ کوٹ موجود ہیں۔

کوٹ کے سردار یا حاکم کو (Mittar) مِتر کہا جاتا تھا۔ ان کوٹوں کی حکومت کشمیر میں کافی عرصہ تک قائم رہی۔ ان کوٹوں کے حاکموں اور سرداروں کے آپس میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے تو یہ ایک دوسرے کے علاقوں پر زبردستی قبضے کرنے لگے اور یہ کوٹوں کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس نظام کو ٹوٹ پھوٹ جانے سے پورے کشمیر میں فِتنہ فساد برپا ہو گیا ہر طرف خونریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ طاقتور کوٹھ راجوں نے کمزوروں پر ظلم و ستم شروع کر دیا۔ عام رعایا بھی امن و امان درہم برہم ہونے سے خستہ حال ہو گئی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ستم زدہ اور مغلوب کوٹھ راجوں نے جموں کے راجہ پورن کرن سے مدد چاہی اور ان کے ملک میں امن و امان قائم کرنے کی درخواست کی۔ راجہ جموں پورن کرن نے ایک بڑا لشکر دے کر اپنے بیٹے دیا کرن کو کشمیر میں امن بحال کرنے کے لیے بھیجا اور دیا کرن نے یہاں پہنچ کر سارے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ستم رسیدہ ظلم کی ماری ہوئی رعایا نے اس کو اپنا راجہ تسلیم کر لیا اور ملک کی آمدنی کا چھٹا حصہ بطور خراج راجہ کے لیے مقرر کیا گیا۔ تاریخ دانوں کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ کشمیر میں شخصی حکمرانی کا آغاز تھا اور دیا (Diya) کرن ہی کشمیر کا پہلا شخصی حکمران بنا اور

اس نے یہاں خاندانی بادشاہت کی بنیاد ڈالی ۔ یہ زمانہ 3180 قبل مسیح یا 5180 سال قبل بتایا گیا ہے گوکہ اس خاندان کے زیادہ حالات کا پتہ نہیں چلتا اور نہ کوئی تفصیل موجودہ ہے لیکن اس خاندان نے کشمیر پر 55 سال تک حکومت کی ۔ اسی خاندان کے تین راجے یکے بعد دیگرے حکمران رہے ہیں۔ اسی خاندان سے کشمیر میں تیسرا راجہ سوم دت ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ راجہ سوم دت ہی تھا جو مہا بھارت کی جنگ میں کشمیر کی فوج کے ساتھ شریک ہوا تھا اور 18 دنوں کی اس جنگ کے آخر میں راجہ سوم دت مارا گیا تھا۔ اس کے بعد خاندانِ جموں کی حکمرانی کشمیر سے ختم ہوگئی اور چار سال تک ملک میں افراتفری اور امن و امان درہم برہم رہا۔ ہر خاندان، کنبہ اور قبیلہ اپنا اپنا راج قائم کر کے بیٹھ گیا۔ صورت حال کو دیکھتے ہوئے ملک کے معتبر لوگوں نے اپنے ایک سمجھدار بندے کو اپنا راجہ بنا کر حکومت اس کے حوالے کردی۔ اس کا نام راجہ اوکنند تھا اس راجہ کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس کا تعلق یا حسب نسب کیا تھا لیکن بعض مورخین نے اسے راجہ متھرا کے خاندان سے بتایا ہے۔

کشمیر میں شخصی حکمرانی کے شروع ہونے کے جو ابتدائی حالات ملتے ہیں ان کے مطابق پچھلے پانچ ہزار سالوں میں یہاں 21 خاندانوں نے حکومت کی اور ان تمام خاندانوں اور حکمرانی کرنے والے افراد کے حالات کی تفصیل موجود ہے ۔ پنڈت کلھن نے بھی راج ترنگنی میں کشمیر کے قدیم حکمرانوں کا ذکر ترتیب سے کیا ہوا ہے جو کشمیر کے خطے کی سب سے مستند تاریخ مانی جاتی ہے۔ کشمیر کے خطے میں خاندانی حکمرانی کے آغاز سے لیکر 1323ء تک 21 خاندانوں نے حکومت کی ہے اور ان 21 ہندو خاندانوں کی حکمرانی کا دور (4504) چار ہزار پانچ سو چار سال ہے۔ ان خاندانوں کی حکمرانی کی مدت اور ان کی حکومت کے حالات مکمل تفصیل کے ساتھ کشمیر کی تاریخ میں موجود ہیں۔

1323ء میں ہی ذوالقدر خان تاتاری نے کشمیر پر حملہ کردیا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ کشمیر کا راجہ سہدیو ذوالقدر تاتاری کا مقابلہ نہ کرسکا اور بھاگ کر کشتواڑ میں پناہ گزین ہوا۔ ذوالقدر خان کا تاتاری لشکر کئی ماہ تک کشمیر لوٹتا رہا اور آگ وخون کی ہولی کھیلتا رہا۔ آخر

ذوالقدر خان لوٹ مار اور قتل وغارت گری کر کے واپس چلا گیا۔ کشمیر کی حکومت راجہ سہدیو کے وزیر اعظم راجہ رام چندر نے سنبھالی۔ اسی زمانے میں تبّت کا ایک شہزادہ جس کا نام ریچن شاہ تھا اپنے ملک سے بھاگ کر کشمیر کے دربار میں پناہ لیے ہوئے تھا اور کچھ عرصہ سے کشمیر دربار کا حصہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے آقا راجہ رام چندر کو قتل کر کے کشمیر کا اقتدار خود سنبھال لیا۔ ریچن شاہ نے کشمیر دربار پر قبضہ کرنے کے بعد اپنا بدھ مذہب بدل کر اسلام قبول کرلیا اور اپنا نام ملک صدرالدین رکھ لیا۔ کشمیر کے راجہ سہدیو جو ذوالقدر تاتاری کے حملے سے بھاگ کر کشتواڑ چلا گیا تھا نے واپس آ کر دوبارہ کشمیر کی حکومت لینے کی کوشش کی لیکن ریچن شاہ جو ملک صدرالدین بن گیا تھا نے راجہ سہدیو کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

ملک صدراالدین نے سات (7) سال (2) ماہ حکومت کی اور وفات پا گیا۔ اس کی وفات کے وقت اس کا بیٹا حیدر خان ابھی نابالغ تھا اور حکومت سنبھالنے کے قابل نہ تھا اس لیے حکومت صدراالدین کی بیوی کوٹہ رانی کے ہاتھ آ گئی۔ کوٹہ رانی نے راجہ سہدیو کے بھائی اودیان دیو سے شادی کر کے حکومت اس کے سپرد کردی۔ کوٹہ رانی مرحوم ومقتول راجہ رام چندر سہدیو کے وزیر اعظم کی بیٹی تھی جس نے ریچن شاہ سے شادی کی تھی۔ وہ باہمت اور سیاسی چالبازیوں اور محلاتی سازشوں سے اچھی طرح آگاہ تھی لیکن اس کا نیا خاوند راجہ سہدیو کا بھائی بالکل کم ہمت اور عقل سے عاری تھا اس لیے کوٹہ رانی اُمور حکومت خود چلانے لگی۔ کوٹہ رانی نے شاہ میر نامی ایک پرانے دربار کے آدمی کو وزیر اور پنجہ بٹ کا کاپوری کو فوج کا سپہ سالار سینہ پتی بنا کر اپنی حکومت کی بنیاد کو مضبوط کرلیا۔ چار سال تک کوٹہ رانی ہی اپنے خاوند اودیان دیو کے نام پر اصل حکمرانی کرتی رہی اور کامیابی کے ساتھ ملک میں عدل وانصاف قائم کیے رکھا۔ لیکن ایک بار پھر 1331ء میں ایک خونخوار ترک سردار دراون نے کشمیر پر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا۔ کوٹہ رانی راجہ سہدیو کے دور میں ذوالقدر تاتاری کے حملے کا حال دیکھ چکی تھی اس لیے کوٹہ رانی نے دربار کے اکابرین کو سنگین حالات سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں اس خونخوار ترک لشکر کا مردانگی سے مقابلہ کرنے کی تاکید کی تاکہ ملک پہلے والے ذوالقدر تاتاری کے حملے کی طرح دوبارہ تباہی اور بربادی سے بچ جائے۔ چنانچہ دربار کے لوگ دراون کے خونخوار ترک

لشکر کا مقابلہ کرنے میدان میں آ گئے اور ترک سردار کے لشکر کا کشمیری فوجوں نے اس قدر جوانمردی سے مقابلہ کیا کہ ترک سردار کے لشکر نے ان کی تیروتلواروں سے بھاگ کر مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اس فوجی مہم کی تیاری اور انتظام کوٹہ رانی نے دربار کے وزیر شاہ میر کے سپرد کی تھی۔ اس نے بڑی ہمت اور خوش اسلوبی سے چاروں طرف سے لوگوں کو جمع کر کے اس فوجی مہم کے ذریعہ ترک لشکر کو شکست فاش دی۔

شاہ میر اس جنگ میں فتح مند ہونے کے بعد شادیانے بجاتا ہوا کوٹہ رانی کے دربار میں حاضر ہوا اور رانی سے پوری طرح دادشجاعت حاصل کی۔ اس حملے کے دوران کوٹہ رانی کا خاوند اودیان دیوڈر کے مارے تبّت کی طرف بھاگ گیا لیکن کوٹہ رانی نے اسے تلاش کر کے ایک بار پھر کشمیر کے تخت پر بٹھا دیا اور اگلے پندرہ سالوں تک اسی خاندان نے کشمیر پر حکمرانی کی۔ 1341 میں کوٹہ رانی کا شوہر اودیان دیووفات پا گیا۔ کوٹہ رانی کے بطن سے اس کا ایک بیٹا تھا جو ابھی بچہ تھا اور اس کا اتالیق سپہ سالار پنجہ بٹ کو مقرر کیا گیا تھا۔ ملک صدرالدین کی وفات کے بعد اصل حکمرانی کوٹہ رانی ہی کر رہی تھی لیکن اودیان دیو کی وفات کے بعد کوٹہ رانی نے اپنے بھائیوں کی مدد سے ایک بار پھر اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اراکین حکومت اسکی حکمرانی پر دل سے راضی نہ ہوئے تھے۔ شاہ میر جو موقع کی تلاش میں تھا تمام درباریوں کو اعتماد اور رابطہ میں لیکر اندرکوٹ سے نکل کر سرینگر میں داخل ہوا اور کشمیر کے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ رعایا نے بھی شاہ میر کی اطاعت قبول کر لی۔ فوج کے سپہ سالار پنجہ بٹ نے مقابلہ کیا لیکن وہ جلد ہی قتل ہو گیا۔ کوٹہ رانی نے 50 دنوں تک اپنی حکومت قائم رکھی۔ شاہ میر نے اقتدار سنبھالتے ہی اپنا لقب شمس الدین رکھا اور کشمیر کا سلطان بن گیا۔

کشمیر میں شاہ میر کے اقتدار پر قابض ہونے سے شاہ میر خاندان کی حکمرانی شروع ہو جاتی ہے۔ شاہ میر کے حسب ونسب کے بارے میں مورخین میں دو طرح کی آراء پائی جاتی ہیں کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کے شاہ میر ہندوستان کے کسی علاقے سے آ کر سوات کے علاقے میں سکونت پذیر ہوا تھا اور ہندوستان سے کشمیر میں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے آیا تھا۔ کچھ تاریخ دانوں نے شاہ میر کو خراساں کا بتایا ہے جو ایران کے صوبے خراسان سے

ہجرت کر کے سوات آیا اور وہاں سے ہجرت کر کے کشمیر آ گیا۔ شاہ میر کو کشمیر میں رہتے ہوئے 24 سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور کشمیر دربار میں اعلیٰ مقام حاصل ہونے کی وجہ سے اس نے دربار کی محلاتی سازشوں کے سارے داؤ پیچ سیکھ لیے تھے۔اس لیے 1343ء میں اپنے سر پر کشمیر دربار کا تاج رکھ کر اپنی خاندانی بادشاہت کی بنیاد ڈالی۔ شاہ میر کے دو بیٹے تھے جمشید اور علی شیر۔ باپ کی وفات کے بعد بڑے بیٹے نے اقتدار سنبھالا اور چھوٹے بھائی علی شیر کو اپنا نائب سلطان مقرر کیا لیکن ایک سال کے بعد اس کے چھوٹے بھئی علی شیر نے بغاوت کر کے اقتدار پر خود قبضہ کر لیا اور اس کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔

اقتدار کی رسہ کشیوں کی کشمیر کے دربار میں ایک لمبی تاریخ ہے اس طوالت سے بچتے ہوئے ہم اس خاندان کے تمام بادشاہوں کا ذکر نہیں کریں گے۔صرف چند ایک کا تبصرہ کریں گے۔اس خاندان کا ایک بادشاہ سلطان سکندر بھی گزرا ہے۔ جو مذہبی تعصب اور تنگ نظری کیوجہ سے مشہور ہے اسی سلطان سکندر کو سکندر بت شکن بھی کہا جاتا ہے چونکہ اس نے ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کر کے ان کی عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کر دیا اور ان پر جزیہ لگایا جو غریب ہندو رعایا جزیہ ادا نہ کر سکے وہ مجبور ہو کر مسلمان ہو گئے کچھ ہندوؤں نے اس ظالم بادشاہ کی سختیوں سے تنگ آ کر خودکشیاں کر لیں اور کچھ کشمیر چھوڑ کر بھاگ گئے لیکن ظالم نے راستوں میں پہرے بٹھا دیے تا کہ کوئی بھی اجازت کے بغیر ملک نہ چھوڑ سکے۔

سلطان سکندر 1394ء سے 1417ء تک کشمیر پر حکومت کی اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے ہندو فرقے پر ظلم و جبر اپنے ایک وزیر سہہ بٹ کی وجہ سے کیے جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا جو ملک سیف الدین کے نام سے مشہور ہوا۔ سلطان سکندر کے دور میں کشمیری ہندوؤں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا اور ان پر عبادت کرنا بھی ممنوع کر دیا گیا۔ اس زمانے میں بے شمار ہندو کشمیر سے بھاگ کر ہندوستان کے دیگر علاقوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سلطان سکندر کے بعد اس کا بیٹا شاہی خان گدی نشین ہوا جو سلطان زین العابدین کے نام سے آج مشہور ہے اس نے اپنے باپ کے جور و جبر کو ہندوؤں پر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے اس نے باپ کے بنائے گئے مذہبی تعصّبات پر مبنی تمام احکامات منسوخ

کردیے اور تمام رعایا میں عدل انصاف پر مبنی برابری کا نظام قائم کیا۔ ہندوؤں کے ساتھ جو ظلم وستم اس کے باپ نے کیے تھے ان کا ازالہ کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے۔ ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو دوبارہ تعمیر کیا اور ہندوؤں کو اس ملک کا قدیم ترین مذہبی فرقہ ہونے کی وجہ سے ان کی عزت وتکریم پوری طرح بحال کی۔ اس بادشاہ نے کشمیری پنڈتوں کو ہندوستان سے واپس لاکر کشمیر میں دوبارہ آباد کیا جو اس کے باپ کے ظلم وستم سے بھاگ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے تمام مذہبی تہوار دوبارہ شروع کرائے گئے اور بادشاہ خود ان میں شریک ہوتا تھا تاکہ مسلمان بھی ان کے تہواروں کا احترام کریں۔ اس بادشاہ کی اپنی رعایا سے مساویانہ سلوک کی وجہ سے تمام لوگ اسے تاریخ کا بہترین حکمران مانتے ہیں۔ جس نے اپنی رعایا کو مذہبی تعصّبات سے دور رکھا۔ اس سلطان کے تین بیٹے تھے۔ آدم خان، حاجی خان اور بہرام خان۔ سلطان کی زندگی میں ہی ان کے درمیان خانہ جنگیوں کا آغاز ہو گیا۔ اس کے دوسرے بیٹے حاجی خان کو لوہر کوٹ کا حاکم بنایا گیا تو اس نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ باپ کی زندگی میں کشمیر پر حملہ کر دیا لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا۔ شاہ میریوں نے 1554ء تک کشمیر پر حکمرانی کی اس خاندان کا آخری بادشاہ سلطان حبیب شاہ تھا۔ شاہ میری خاندان کی حکمرانی اس خاندان کے دربار میں اثر و رسوخ حاصل کرنے والے چکوں نے ختم کر دی۔ 1554ء میں علی چک نے حبیب شاہ کو معزول کر کے اپنے بھائی غازی چک کو کشمیر کے اقتدار کا تاج پہنا دیا اور چک خاندان کی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ شاہ میری خاندان کی 211 سالہ بادشاہی کا خاتمہ کر کے غازی چک نے کشمیر میں اپنی خاندانی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔

چک خاندان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ گلگت جس کا پرانا نام دردستان ہے، سے 1307ء کو راجہ سہدیو کے زمانے میں ہجرت کر کے کشمیر آئے اور کشمیر میں مستقل آباد ہو گئے تھے۔ لنگر چک چکوں کا سردار تھا جو چکوں کو کشمیر لایا تھا۔ شاہ میری خاندان کے آخری دور میں چک کشمیر دربار میں داخل ہو گئے اور خاموشی سے اپنا اثر دربار میں بڑھاتے رہے۔ موقع غنیمت پا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ چک شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ابتدائی دور میں ہی فِتنہ وفساد کا ماحول کشمیر میں بننا شروع ہوا ان درباری سازشوں نے

کشمیریوں کے ایک وفد کو ہندوستان کے مغل دربار تک پہنچا دیا۔ ایک کشمیری وفد نے جو حاجی بانڈے، بجے ملک اور یوسف شاہ چک پر مشتمل تھا، ہندوستان سے مرزا بہادر کو اپنے ساتھ کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ہندوستان کے مغلوں کا کشمیر پر پہلا حملہ تھا جو 1559ء میں مرزا بہادر کی قیادت میں کیا گیا تھا۔ غازی چک اور سید ابراہیم خان بھی کشمیری فوجوں کو لے کر بہرام گلہ پہنچ گئے جہاں خونریز جنگ ہوئی اور دونوں اطراف سے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ ہندوستانی مغل فوج کشمیریوں سے شکست کھا کر واپس ہندوستان بھاگ گئی۔

1567ء میں ہمایوں کی موت کے بعد جلال الدین اکبر ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اس نے مرزا مقیم کو تھوڑے سے بندوں کے ساتھ کشمیر کے حالات دریافت کرنے بھیجا۔ دراصل یہ لوگ ہندوستان کے جاسوس بن کر سُنی شیعہ کا جھگڑا کھڑا کرنے کشمیر آئے تھے تاکہ کشمیریوں میں مذہبی فرقہ بندی کی بنیاد ڈال کر قبضہ کیا جائے۔ اندرونی خلفشار اور مذہبی فرقہ بندی نے ہندوستان کے مغلوں کے لیے کشمیر پر قبضہ کرنے کی راہ ہموار کر دی۔ آخر کئی حملوں کے بعد مرزا قاسم خان میر بحر نے 1586ء میں کشمیر پر قبضہ کر کے اس خطے کو پہلی بار ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کا حصہ بنا دیا اور کشمیر پہلی بار ہندوستان کے زیر کنٹرول آ گیا۔ حالانکہ کے کشمیر کے چک خاندان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ انتہائی بہادر اور اعلیٰ نظم و نسق کے مالک تھے۔ غازی چک نے اقتدار سنبھالتے ہی جلد اندونی خلفشار اور فِتنہ فساد پر قابو پا لیا تھا اور اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے بعد غازی چک نے تبّت، سکردو، گلگت، پھکلی (ہزارہ) کشتواڑ اور بھمبر کی ریاستوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور پڑوس میں گکھڑوں کے ملک پر بھی حملہ کر دیا تھا لیکن تھوڑی سی جنگ و جدل کے بعد کمال خان گکھڑ نے غازی چک سے صلح کر لی۔

چک خاندان کا اقتدار فرقہ پرستی کی نظر ہو گیا اور کشمیر بھی اپنی آزادی سے محروم ہو گیا گو کہ چکوں نے بڑی بہادری سے ہندوستانی مغلوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ حملہ اس قدر زوردار اور طوفانی تھا کہ ہندوستان کی حملہ آور فوج کے (22 بائیس) جنگی سردار اور فوجیوں کی

تعداد((50ہزار سوار تھی پھر بھی کشمیری سپاہی بڑی بے جگری سے ہندوستانی مغل فوجوں سے لڑے اور ہزاروں مغل فوجیوں کے سر کاٹ کر یوسف شاہ چک کے پاس لائے۔ اکبر بادشاہ کشمیر فوج بھیج کر خود دریائے اٹک کے کنارے خیمہ زن ہوکر اپنی فوجوں کی فتح کا انتظار کرنے لگا۔ چند روز تک شدید خونریز جنگ جاری رہی۔ آخر مغل فوجوں کے پاؤں میدان جنگ سے اُکھڑنا شروع ہو گئے تو ہندوستانی فوج کے ایک کمانڈر راجہ بھگوان داس نے یوسف شاہ چک کو صلح پر اس شرط پر آمادہ کرلیا کہ وہ بادشاہ اکبر سے اس کی ملاقات کرائے گا۔ چونکہ موسم کی خرابی کی وجہ سے مغل فوجوں کے لیے جنگ جیتنا مشکل ہو گیا تھا۔ یوسف شاہ چک بھگوان داس کی باتوں پر اعتبار کر کے اکبر سے ملنے دریائے اٹک پر آ گیا۔لیکن اکبر نے صلح کے بہانے یوسف شاہ چک کو گرفتار کرلیا اور جیل میں ڈال دیا اس صدمے کی وجہ سے یوسف شاہ چک کا دماغی توازن خراب ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد اکبر کی جیل میں مر گیا۔

اس کی موت کے بعد یعقوب شاہ چک اقتدار پر قابض ہوا حالانکہ وہ مغل حملے سے بھاگ کر کشتواڑ کے راجہ بہادر سنگھ کے ہاں پناہ گزین تھا۔ اس نے واپس آ کر مغلوں کے کشمیر پر قبضے کو تہس نہس کر دیا اور بے تحاشہ قتلِ عام کرنے کے بعد دوبارہ کشمیر کے اقتدار پر براجمان ہو گیا۔لیکن مغلوں نے کشمیر کی راہ دیکھ لی تھی۔ ایک بار پھر مغل فوجیں مرزا قاسم میر بحر کی قیادت میں کشمیر میں داخل ہو گئیں۔ ((40چالیس ہزار سوار مرزا قاسم کی قیادت اور ((20بیس ہزار پیادہ مغلوں کی فوجیں ایک بار پھر کشمیر پر حملہ آور ہوئیں۔ اس بار کشت و خون کے کئی جنگی معرکے ہوئے۔ آخر یعقوب شاہ چک کو بھی شکست ہوئی اور مغلوں نے اس بار اپنا قبضہ مضبوط کرلیا۔ 1586ء میں کشمیر میں چک خاندان کی حکمرانی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا لیکن اس کے ساتھ کشمیر بھی اپنی آزاد حیثیت کھو کر ہندوستان کے مغل دربار کے کنٹرول میں چلا گیا۔ مغلوں کا دور 1586ء سے شروع ہو کر 1752ء تک قائم رہا۔ 1752ء سے کشمیر پر افغانوں کا قبضہ ہو گیا۔

افغانوں کا دور بھی کشمیر میں ظلم و جبر، ناانصافی اور لوٹ مار کا دور شمار کیا جاتا ہے۔ کشمیریوں نے مغلوں سے تنگ آ کر خود ہی افغانیوں کو کشمیر پر قبضے کی دعوت دی تھی۔ گو کہ

بیرونی قابضوں کو دعوت دینے والے حکمران طبقے کے سہولت کار ہی ہوتے تھے۔ محلاتی لڑائیوں کی وجہ سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے دوسرے ملک کو قبضہ کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ اسی طرح مغلوں کے صوبیدار سے تنگ آ کر میر مقیم کنٹ اور خواجہ ظہیر دیدہ مری نے خط لکھ کر احمد شاہ ابدالی کو کشمیر پر حملہ کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے لاہور سے عبداللہ خان ایشک کو کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس نے مغلوں کے ہندستانی گورنر ابوالقاسم کو گرفتار کر کے کشمیر کو کابل دربار کا حصہ بنا دیا۔ اب مغلوں کی جگہ افغانوں نے اپنا تسلط قائم کر کے کشمیری عوام پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ افغانوں کا دور کشمیر کے لیے آفتِ ناگہانی سے کم نہ تھا کیونکہ جو بھی افغان کابل کی طرف سے گورنرِ کشمیر بن کر آتا تھا وہ یہاں آ کر باغی ہو جاتا تھا، خود مختار ہونے کا اعلان کر دیتا تھا۔ دوسرا اس کی گوشمالی کے لیے آتا تھا۔ اس طرح جنگ وجدل اور لوٹ مار کا سارا بوجھ عام عوام پر ڈالا جاتا تھا۔ عوام کی حالت فاقوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت تک کشمیری امراء اور دربار کے لوگوں کے دل افغانوں کی حکمرانی سے بھر گئے تھے۔ اب یہ اُمراء کا طبقہ ایک بار پھر افغانوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے لاہور دربار میں رنجیت سِنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے درخواست کی کہ کشمیر پر حملہ کرے اور افغانوں کو ہٹا کر کشمیر پر خود قبضہ کرے۔

رنجیت سِنگھ پہلے سے ہی کشمیر پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جب رنجیت سِنگھ کو کشمیر دربار کی سازشوں کا علم ہوا تو اُس نے 1814ء میں ایک بڑا لشکر جرار لیکر کشمیر پر حملہ کر دیا۔ اس لشکر کی قیادت ڈل سِنگھ کو براور نونی نامدار ٹھا کر کر رہے تھے۔ رنجیت سِنگھ خود پونچھ میں بیٹھ کر فتح کشمیر کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری طرف کابل کا گورنر عظیم خان، عبداللہ خان، اچکزئی، فتح محمد، بابا خان اور دیگر اہلکاروں کو لے کر خالصہ فوج کے مقابلے میں آ گیا۔ اس جنگ میں خالصہ فوج کو کشمیر کے افغان گورنر کی فوج کے ہاتھوں شکست ہوگئی اور خالصہ فوج کشمیر پر قبضہ کرنے میں ناکام رہی۔ یہ دعوت پنجابی فوج کو عظیم خان کے ہی کشمیری پنڈت اہلکاروں نے دی تھی۔ اس کا بہانہ بنا کر عظیم خان نے کئی ہندو پنڈتوں کو قتل کرا دیا جس میں نمایاں نام دیوان، ہیرا داس کا بھی تھا۔ کئی نامور ہندوؤں کی بے عزتی کی گئی اور ہندوؤں پر جزیہ لگا دیا گیا

۔اس ظالمانہ حکم سے غریب کشمیری پنڈت کانپ اٹھے۔ان کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر ظلم وستم شروع ہو گیا جو ہندوؤں سے ملے ہوئے تھے۔بڑے بڑے حکومتی عہدیداروں کو منصب سے ہٹا دیا گیا اور کئی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ ہندو کیا مسلمان بھی اس ظالمانہ کاروائی سے سب چِلاّ اٹھے۔اس زمانے میں کشمیر میں شدید بارشوں کیوجہ سے قحط پڑ گیا اور ہزاروں لوگ اس قحط کی وجہ سے فاقوں سے مر گئے۔

اب کشمیر میں افغانوں کی حکمرانی کے دن گنے جا چکے تھے۔ایک بار پھر پنڈت بیربل نے رنجیت سِنگھ کو کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور یقین دلایا کہ اس کی مدد کی جائے گی۔اس دروان عظیم خان اپنے بھائی جبار خان کو کشمیر کی حکومت سونپ کر خود کروڑوں کا مال نقدو زیورات لیکر واپس کابل چلا گیا۔رنجیت سِنگھ کو اس کے جانے کی اطلاع ہوئی تو اس نے کشمیر پر دوسرا حملہ کر دیا۔ اس بار خالصہ فوج تیاری کر کے آئی تھی۔ جبار خان سے تھوڑی مزاحمت کے بعد آسانی سے خالصہ فوج نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔اب کشمیر افغانوں کے ظلم وستم سے بچنے کے لیے ایک بار پھر خالصہ دربار لاہور کے رحم وکرم پر آ گیا۔خالصہ فوج نے 1819ء میں سرینگر میں داخل ہو کر قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ عام کشمیریوں کو بھی لوٹ کر کنگال کر دیا۔

کافی دنوں کی لوٹ مار ،غارت گری کے بعد کشمیر میں ایک بار پھر امن تو قائم ہو گیا لیکن سکھوں کا دور اس قدر بھیانک خواب ثابت ہوا کہ افغانوں کے دور میں جو ظلم وستم کی کسر رہ گئی تھی وہ سکھوں نے اپنے عہد میں پوری کر دی۔ سکھوں کے ظلم وستم کا ذکر کشمیری شاعروں نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔خاص کر کے کشمیر میں لاہور دبار سے جو صوبیدار آتے تھے وہ کشمیریوں سے صرف پیسہ بٹورنے اور عام رعایا کو لوٹنے کے لیے آئے تھے اور ہر صوبیدار کی یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ لوگوں سے اکٹھا کر کے لاہور دربار تک پہنچائے۔ جو بھی صوبیدار کم پیسہ یا دیر سے پیسہ بھیجتا تھا اسے فوراً واپس بُلا لیا جاتا تھا۔اس جاگیردارانہ عہد میں مذہب کا تعصب بھی حکمران طبقات اور انکے اہلکاروں میں زیادہ ہوتا تھا۔ مسلم حاکموں سے ہندوؤں کو ہمیشہ شکایت رہتی تھی کہ حکومتوں کے مسلم اہلکار اُن کے ساتھ

انصاف نہیں کرتے اور دولت مندوں سے زبردستی مال و دولت اور پیسہ چھین لیتے ہیں۔ یہی شکایت سکھوں کے عہد میں کشمیری مسلمانوں میں عام تھی کہ سکھ اور ہندو اہلکار اُن کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کرتے ہیں۔ سکھوں کے عہد میں کشمیر میں مقرر ہونے والے دو صوبیداروں ہری سِنگھ نلوہ اور جمعدار خوشحال سِنگھ نے تو وہ ستم ڈھائے کہ کشمیری کانپ اُٹھے۔ ان دونوں نے کشمیریوں کی عزت اور دولت دونوں نہ رہنے دیں۔ ہندو ہو یا مسلمان جس کے پاس دولت کا پتہ چلا اس سے زبردستی چھین لی۔ کشمیری رئیسوں اور دولت مندوں کو ان کے دور میں زبردستی دولت چھین کر کنگال کر دیا گیا اور بیگار کی رسم کو بھی انہوں نے کشمیر میں عام کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو سلطان سکندر ہندوؤں کی عبادت گاہوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ یہ دور بھی کشمیری عوام کے مصائب و آلام، دکھ درد اور کسم پُرسی کا بدترین دور کہلاتا ہے۔ آخر سکھوں کے خالصہ دربار میں بھی وہی محلاتی سازشیں شروع ہو گئیں جو اس عہد کے ہر دربار کا خاصہ ہوا کرتی تھیں۔ 1839ء میں رنجیت سِنگھ مر گیا۔ دربار کے درباریوں کی آپس کی لڑائیوں نے خالصہ دربار کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

رنجیت سِنگھ کی وفات کے بعد خالصہ دربار ایک طرف اندرونی خلفشار کی آگ میں جلنے لگا تو دوسری طرف انگریز کی بڑھتی ہوئی طاقت نے سارے شمالی ہندوستان پر قبضہ کر کے اپنی نظریں پنجاب کے وسیع و عریض علاقے پر گاڑھ رکھی تھیں۔ لاہور دربار رنجیت سِنگھ کی موت کے بعد اندرونی طور پر خون آشام ہنگامہ خیز دور سے گزر رہا تھا۔ لاہور دربار 1839ء میں رنجیت سِنگھ کی موت سے لیکر 1846ء کی سِکھ انگریز جنگ تک تباہ حال ہو چکا تھا۔ لاہور دربار میں دو گروہوں کے درمیان تصادم اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ دربار کا انتظام چلانے والے اہم حکومتی عہدیداران قتل کر دیے گئے۔ جس میں رنجیت سِنگھ کا بیٹا ولی عہد شیر سِنگھ سمیت دربار کا وزیر اعظم ڈوگرہ راجہ دھیان سِنگھ بھی قتل ہو گیا تھا۔ لاہور دربار کی اس اندرونی خانہ جنگی اور افراتفری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خالصہ فوج بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والے بھی خالصہ فوج کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ فوج نے دو دنوں میں ہی دربار کے تمام سرکردہ لوگ قتل کر دیے تھے۔ لاہور دربار کے اس خونی تصادم اور

ہنگامہ آرائی کرنے والوں میں ایک گروہ رنجیت سِنگھ کے ہی رشتے داروں سندھیانوالوں کا تھا اور دوسرا گروہ دربار کے وزیراعظم راجہ دھیان سِنگھ کے بیٹے ہیرا سِنگھ اور دیگر سکھ سرداروں کی قیادت میں ایک دوسرے کے خلاف خونی معرکوں میں مصروف تھا۔ لاہور دربار میں پھیلی ابتری، اندرونی فسادات اور شاہی خاندان کی خانہ جنگیوں نے سارے ملک پنجاب میں بدامنی اور شورش پھیلادی تھی اس کا اثر کشمیر پر بھی ہوا۔ اس وقت کشمیر میں لاہور دربار کی طرف سے شیخ غلام محی الدین گورنر تھا۔

مظفرآباد جو اس وقت کشمیری صوبہ کی ایک پہاڑی ریاست تھی اس کا راجہ زبردست خان نے لاہور دربار کی ابتری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کردیئے لیکن کشمیر کے گورنر شیخ غلام محی الدین نے دھوکہ سے نماز پڑھتے ہوئے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ اس پر پہاڑی علاقوں کے، اس کے حامیوں نے بغاوت کر دی اور اسی بغاوت کی قیادت گھوڑی کے راجہ نجف خان، سلطان شیر احمد خان ساکنہ کرناہ اور سلطان حسین خان ساکنہ مظفرآباد نے شروع کی۔ ان کی قیادت میں کشمیر کے ملحقہ تمام پہاڑی لوگ جمع ہوگئے اور کشمیر میں ہنگامہ اور فساد برپا کرنے کیلئے اتنے زیادہ لوگ ان کے ساتھ شامل ہوگئے کہ کشمیر میں موجود لاہور دربار کی فوج ان کو روکنے میں ہر طرح ناکام ہوگئی۔ اس پر کشمیر کے گورنر شیخ غلام محی الدین نے لاہور میں اطلاع دی کے کشمیر کے گردونواح کے تمام زمیندار اکٹھے ہوکر جنگ وجدل اور ہنگامہ آرائیاں کرنے لگے ہیں اور کئی مقامات پر حملے کر چکے ہیں اور یہ سب کچھ لاہور دربار کے اندرونی فِتنہ وفساد کا نتیجہ ہے۔ اگر لاہور دربار نے کوئی فوری اقدامات نہ کیے تو کشمیر کا سرسبز وشاداب ملک پنجاب کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

کشمیر میں لاہور دربار کی فوج بہت تھوڑی تعداد میں ہے اور کشمیر کے لوگ جو کثیر تعداد میں ہیں ہر طرف بغاوت پر آمادہ نظر آرہے ہیں۔ گورنرِ کشمیر نے ایک مراسلہ راجوری کہ راجہ کو بھی لکھا اور کشمیر میں فوجی امداد بھیجنے کی درخواست کی۔ اس وقت لاہور دربار کا وزیر راجہ ہیرا سِنگھ تھا جو ڈوگرہ دھیان سنگھ (جو قتل ہوگیا تھا) کا بیٹا تھا۔ اس نے لاہور دربار سے شیخ امام دین اور سردار حکم سِنگھ کو فوج دے کر کشمیر کی طرف روانہ کیا۔ راجہ راجوری نے اپنے بیٹے

مرزا فقیر اللہ خان کو ایک ہزار فوج دیکر کشمیر کی طرف روانہ کر دیا۔ برف باری کا موسم ہونے کے باوجود فوجیں کشمیر پہنچ گئیں لیکن گورنر کشمیر نے فقیر اللہ خان کے کہنے پر باغیوں سے صلح اور امن سے معاملات طے کرنے کی کوشش کی اور راجہ زبردست خان کو پچاس ((50ہزار روپیے کی ضمانت پر قید سے رہا کر دیا۔ اس طرح زبردست خان کے کہنے سے لوگ فتنہ وفساد اور بغاوت سے باز آ گئے لیکن یہ صلح بھی دیر پا ثابت نہ ہوئی کیونکہ لاہور دربار کی کمزوریوں اور خانہ جنگی نے اس کی طاقت کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ لاہور دربار میں جموں کے ڈوگروں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ راجہ دھیان سنگھ جو راجہ گلاب سنگھ والئی جموں کا چھوٹا بھائی تھا وزیر اعظم کے عہدے پر پہنچ گیا تھا لیکن سکھوں کی درباری سازشوں اور خانہ جنگی کے نتیجہ میں دھیان سنگھ کو سکھوں کے ایک گروپ نے 1843ء میں قتل کر دیا تھا اور اس کے بیٹے ہیرا سنگھ نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے لاہور دربار کی ڈوگرہ فوج کے ایک دستے اور اپنے حمایتی خالصہ فوج کے حامیوں کی مدد سے سارے مخالفین کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس جنگ میں اس کا اپنا چچا سوچیت سنگھ بھی مارا گیا۔ ہیرا سنگھ کا بڑا بھائی پہلے ہی باپ کی جاگیر پونچھ کا انتظام سنبھال رہا تھا۔

گلاب سنگھ 1822ء سے جموں کا راجہ بن گیا تھا لیکن گلاب سنگھ جموں کا راجہ بنتے ہی جموں کی تمام پہاڑی ریاستوں کو اپنے مرکز کے زیر انتظام لانے کے لیے زبردست کوششیں کر کے جموں میں شامل کر چکا تھا یا بعض کو اپنا مطیع یا باج گزار بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ گلاب سنگھ کی اب یہ کوشش تھی کہ وہ لاہور دربار کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کشمیر کی باقی پہاڑی ریاستوں کو بھی اپنے ملک جموں کا حصہ بنائے۔ گلاب سنگھ نے سکھوں کی کمزوری دیکھ کر پہاڑی ریاستوں کے سرداروں اور مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے زبردست کوششیں جاری رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہزارہ کے راجہ حبیب اللہ خان، مظفر آباد کے راجہ زبردست خان، گھوڑی کے راجہ سلطان خان اور دیگر پہاڑی علاقوں کے سرداروں کو اندرونِ خانہ راجہ جموں گلاب سنگھ اکسا رہا تھا۔ 1844ء میں راجہ حبیب اللہ خان نے گھوڑی کے سکھوں پر حملہ کر دیا جو کشمیر کے گورنر کی مدد سے ناکام بنا دیا گیا

لیکن اس حملے کرنے والی فوج کے سردار حبیب اللہ خان کوشیخ امام الدین کی سکھ فوج نےقتل کر دیا۔تھوڑے ہی عرصے بعد راجہ سلطان خان نے دیگر پہاڑی سرداروں سےمل کرگھوڑی پر قبضہ کرلیا اور مظفر آباد کی جانب مارچ کرتے ہوئےقلعوں پر قبضہ کرلیا۔شیخ غلام محی الدین نے ساری سکھ فوج مظفر آباد کو بچانے کے لیےبھیجی لیکن سکھ فوج کوشکست ہوئی۔مظفر آباد پر باغیوں نے قبضہ کرلیا اور سکھوں کے تمام قیدیوں کوقتل کر دیا۔اب راجہ زبردست خان کا بیٹا،راجگان گھڑی دوپٹہ اور اوڑی کے راجگان بھی ان بغاوت کرنے والوں سےمل گئے۔اب ان سرکشوں اور باغیوں کواتنی طاقت حاصل ہوگئی تھی کہ وہ نومبر 1844ء میں بارہ مولا اور سوپور پر بھی قبضہ کرچکے تھے۔سوپورکشمیر سےمتصل علاقہ تھا۔

شیخ غلام محی الدین گورنرکشمیر نے ایک بار پھرلاہور دربار کو بغاوت کی اطلاع دی۔ لاہور دربار سےفوج لیکر شیخ غلام محی الدین کا بیٹا شیخ امام الدین روانہ ہوالیکن اس وقت کشمیر میں مسلمان فوج بھی باغی ہوچکی تھی اور پہاڑی علاقوں کے سارے راجگان اور ان کے زمیندارہتھیار اٹھا کرسامنے آگئے تھے۔انہوں نے سارے کشمیرکوایک سرے سے دوسرے سرے تک تاخ وتاراج کر دیا تھا۔شیخ غلام محی الدین گورنرکشمیر بھاگ کر ہری پربت قلعہ میں بند ہو چکا تھا۔لاہور دربار کی فوج ایک بار پھر دیوان مولراج کی قیادت میں مظفر آباد پہنچی اور یہاں سکھ فوج کو بچا کرسرینگر کی طرف بڑھ گئی۔ باغیوں کوشکست دی لیکن پہاڑی راجگان کوان کی ریاستوں پر بحال کر دیا گیا تا کہ مزید فتنہ فساد سے بچا جائے۔1845ء میں شیخ غلام محی الدین نے لاہور دربار کی خراب حالت دیکھتے ہوئے ہندوستان کی انگریز سرکار سے معاملات طے کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انگریز سرکار نے انکار کر دیا۔کچھ عرصہ بعد شیخ غلام محی الدین کا انتقال ہوگیا اوراس کا بیٹا شیخ امام الدین کشمیر کا گورنر بنایا گیا۔لاہور دربار ایک طرف اندرونی خلفشار کا شکار تھا تو دوسری طرف سکھوں کی فوجوں نے انگریز سرکار سے کیے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دریائےستلج کے پاران کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جس کا نتیجہ دوسری سکھ انگریز جنگ ہوئی۔اس جنگ میں خالصہ فوج کوانگریزوں کے ہاتھوں شکست ہوگئی۔اب لاہور دربار پر انگریز نے اپنا قبضہ کرنے کے لیے سکھوں کی خالصہ فوج پر انگریز

علاقوں میں جارحیت کرنے اور جنگ کا آغاز کرنے کا الزام لگاتے ہوئے جنگ کی ذمہ داری لاہور دربار پر ڈال دی۔

انگریز فوج نے 20 فروری 1846ء میں لاہور پر قبضہ کرلیا اور لاہور دربار کو جنگ بندی کے معاہدے پر مجبور کرلیا۔ 9 مارچ 1846ء میں لاہور میں ایک معاہدہ ہوا جسے معاہدہ لاہور کہا جاتا ہے۔ اسی معاہدے پر انگریز اور خالصہ دربار کی جنگ بندی ہوئی۔ اس معاہدے کی رو سے دریائے ستلج اور جالندھر اور دوابہ کے بائیں جانب کے علاقوں کو انگریزوں کے حوالے کردیا گیا۔ ڈیڑھ کروڑ روپیہ سکھوں پر تاوانِ جنگ عائد کیا گیا۔ 75 لاکھ روپیہ تو دوابہ، جالندھر کی قیمت چکا کر وصول کیے گئے۔

سکھوں نے کشمیر اور کچھ پہاڑی ریاستوں کو بھی انگریز کے حوالے کر کے مزید 75 لاکھ روپیہ ادا کرنے کے لیے معاہدے میں کشمیر اور گلگت کے علاقوں کو انگریز کے حوالے کردیا۔ اس طرح معاہدہ لاہور کے تحت کشمیر کا صوبہ اب انگریز کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے ہوگیا۔ انگریزوں کو چونکہ پیسوں کی اشد ضرورت تھی اس لیے 16 مارچ کو ایک اور معاہدہ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی اور راجہ جموں گلاب سِنگھ کے درمیان ہوا۔ یہ معاہدہ امرتَسر کے مقام پر ہوا اور 75 لاکھ میں کشمیر انگریزوں نے گلاب سِنگھ کے حوالے کردیا۔

2۔ جموں کی ابتدائی تاریخ

ریاست جموں کشمیر کا یہ خطہ بھی اپنی طویل تاریخ کا حامل ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ جموں میں انسانی زندگی کے آثار قبل از تاریخ (Pre-Historic Era) کے زمانے کے بھی ملتے ہیں۔ اس خطے میں خاندانی حکومت کرنے والے ایک ہی خاندان کے ساڑھے تین ہزار سال میں 60 سے زیادہ راجگان کے حالات زندگی تحریری شکل میں موجود ہیں۔ کچھ مورخین نے اس خطے میں خاندانی حکمرانی کا دور پانچ ہزار سال کے لگ بھگ بیان کیا ہے۔ لیکن قدیم آبادی اور حکمرانوں کا کھوج لگانا کافی مشکل کام ہے۔ ہم جموں خطے کی معلوم اور تحریر شدہ تاریخ تک ہی محدود رہیں گے۔ جموں خطے میں خاندانی حکمرانی کے ابتدائی

حالات راجہ ایودھیا سودرشن کے چھوٹے بیٹے اگنی گر سے شروع ہوتے ہیں جس کے بارے میں دو آراء پائی جاتی ہیں۔

ایک کا خیال ہے کہ اگنی گر کا زمانہ پانچ ہزار سال پرانا ہے، جب وہ جموں کے علاقے میں وارد ہوا۔ دوسرا خیال ہے کہ اگنی گر کا زمانہ 1600 قبل مسیح یا3600 سال پرانا ہے۔ اگنی گر پہلے گانگڑہ (ہماچل) اور پھر بعد میں کٹھوعہ پڑول کے مقام پر آیا اور اپنی چھوٹی سی ریاست بنالی۔ اگنی گر کے بیٹے مایوشرب نے اردگرد کے بہت سے علاقے فتح کر کے اپنی ریاست کا حصہ بنا لیے اور اپنے باپ کی ریاست میں مسلسل وسعت پیدا کرتا گیا۔ رفتہ رفتہ اس راجہ نے اپنی ریاست کوکٹھوعہ پڑول سے دریائے توی تک وسعت دے دی اور یہ سارا ملک اس کے قبضہ میں آ گیا۔ اس راجہ کی اولاد سے راجہ اگنی گر بھ ہوئے ہیں۔ جن کے اٹھارہ (18) بیٹے ہوئے ہیں۔ اگنی گر بھ کے بڑے بیٹے کا نام باہولوچن تھا۔ باہولوچن اپنے باپ کے بعد حکمران بنا۔ یہی وہ راجہ تھا جس نے اپنے نام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا جو آج بھی باہو قلعہ کے نام سے جموں میں دریائے توی کے کنارے ایک پہاڑی پر موجود ہے۔ راجہ باہولوچن پنجاب کے راجہ چندر ہاس سے لڑائی میں مارے گئے۔ باہولوچن کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اس کا چھوٹا بھائی جامبولوچن اس کی جگہ راجہ بنا۔ جامبولوچن نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ پنجاب کے راجہ چندر ہاس سے لیا اور پنجاپ کے راجہ چندر ہاس کو قتل کر کے پنجاپ پر قبضہ کرلیا۔ ایک دن راجہ جامبولوچن دریائے توی کے کنارے شکار کھیل رہا تھا کہ اس کی نظر ایک بکری اور شیر پر پڑی جو اکھٹے ایک تالاب میں پانی پی رہے تھے۔ یہ جگہ راجہ جامبولوچن کو بہت پسند آئی اور راجہ کو خیال آیا کہ یہ جگہ بہت ہی امن اور پیار کی ہوگی جہاں ایک درندہ اور بکری اکٹھے ایک ہی ندی میں پانی پی رہے ہیں۔ اس نے یہاں جنگل صاف کر کے اپنے محلات تعمیر کرائے اور اپنی ریاست کا مرکز یہاں منتقل کر دیا اور اپنے نام پر ایک شہر آباد کیا۔ اس شہر کو راجہ جامبولوچن کی نسبت سے جامبو پورہ یا جامبونگر کہا جانے لگا۔ کثرت استعمال سے اس شہر کا نام جموں مشہور ہوگیا۔

اس راجہ نے اپنی ریاست کی سرحدوں کو ایک طرف پنجاب تک، دوسری طرف

شوالک کی پہاڑیوں تک اور مشرق کی طرف کرناہ تک وسعت دے دی۔ اس راجہ کا بیٹا پورن کرن ہوا ہے۔ پورن کرن کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام دیا کرن اور دوسرے کا نام دھرم کرن تھا۔ پورن کرن کے زمانے میں ہی کشمیر میں فِتنہ وفساد برپا ہوا تو وہاں کے لوگوں نے اس راجہ جموں سے مدد کی اپیل کی تھی۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے دیا کرن کو ایک لشکر دے کر کشمیر میں امن و امان قائم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ دیا کرن نے کشمیر میں فتنہ وفساد کا خاتمہ کیا اور اپنی خاندانی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اس زمانے میں کشمیر میں باقاعدہ کوئی حکومت موجود نہیں تھی بلکہ یہ ابتدائی زمانہ تھا۔ اس لیے وہاں کے لوگوں نے راجہ جموں کو دعوت دی تھی کہ وہاں بھی کوئی باقاعدہ حکومت قائم ہو جو ان کو فِتنہ وفساد کرنے والوں سے تحفظ فراہم کرے۔ راجہ دیا کرن پہلا راجہ ہے جس نے جموں سے جا کر کشمیر میں حکومت قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس راجہ کی حکومت کشمیر میں تین نسلوں تک چلی جو 55 سال کا عرصہ بنتا ہے۔

اسی راجہ کی تیسری نسل سے راجہ سومدت ہوا ہے جو مہابھارت کی جنگ میں شریک ہوا، مارا گیا اور اس کے ساتھ ہی کشمیر سے اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ راجہ پورن کرن جس کے چھوٹے بیٹے کی خاندانی حکمرانی جموں میں جاری وساری تھی، اس کی کئی نسلوں کے بعد ایک راجہ جوگ رائے ہوا ہے۔ راجہ جوگ رائے کا زمانہ 800 سے 770 قبل مسیح یعنی 2770 سے 2800 سال قبل گزرا ہے، اس راجہ کے دو بیٹے تھے۔ راجہ جوگ رائے کے ایک بیٹے کا نام ملن ہنس (Malen Hans) اور دوسرے کا نام سورج ہنس (Suraj Hans) تھا۔ ملن ہنس (Malen Hans) باپ کی زندگی میں ہی مر گیا تھا۔ ملن ہنس کی اولاد منہاس کہلاتی ہے جو جموں میں کثرت سے آج بھی موجود ہیں اور پنجاب کے کئی حصوں میں بھی موجود ہیں۔ بڑے بیٹے کی موت کے بعد جوگ رائے نے چھوٹے بیٹے سورج ہنس کو جموں کا راجہ بنایا۔

مہاراجہ گلاب سِنگھ اور مہاراجہ ہری سِنگھ کا خاندان بھی راجہ سورج ہنس کی اولاد سے ہے۔ اس خاندان کے کئی مشہور حکمرانوں نے جموں کے خطے پر بڑی کامیابی سے کئی صدیوں تک حکمرانی کی ہے۔ یہاں سب کا دورِ حکومت بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس خاندان

کے ایک مشہور راجہ ہوئے ہیں جن کا نام راجہ رنجیت دیو تھا۔ راجہ رنجیت دیو 1725ء میں جموں کے راجہ بنے۔ راجہ رنجیت دیو نے اپنے دور میں عدل و انصاف کے لیے بڑی شہرت حاصل کی اور نہایت ہی شان وشوکت سے جموں پر حکمرانی کی۔ راجہ رنجیت دیو نے اردگرد کے راجوں کو بھی اپنا مطیع کیا اور امن وامان بحال کیا جس کی وجہ سے جموں شہر کی قدر و قیمت بڑھ گئی اور لوگوں کی بڑی تعداد شہر میں آ کر آباد ہوئی۔ راجہ رنجیت دیو کا ہندوستان کی مغل فوج سے بھی مقابلہ ہوا جسکی وجہ سے انہیں جموں چھوڑ کر پہاڑوں پر پناہ لینی پڑی۔ بعد میں اپنے تعلق کی وجہ سے وہ لاہور گئے لیکن وہاں لاہور کے صوبیدار نے انہیں قید میں ڈال دیا۔ بارہ 12 سال تک لاہور قید میں رہنے کے بعد آخر تاوان دیکر لاہور کی قید سے رہائی ملی۔ ان کی عدم موجودگی میں راجہ کھنسار دیوان کی جگہ جموں کا راجہ رہا تھا۔ لاہو کی قید سے واپس آ کر راجہ رنجیت دیو نے جموں کی راجگی پھر سنبھال لی۔ راجہ رنجیت دیو نے 57 سال تک جموں پر حکومت کی اور 1782ء میں وفات پائی۔ راجہ رنجیت دیو کے دو بیٹے تھے برج راج دیو اور دلیل سنگھ۔ راجہ رنجیت دیو نے اپنی مہارانی کے کہنے پر اپنے چھوٹے بیٹے دلیل سنگھ کو جموں کا راجہ بنانے کو کوشش کی تو بڑے بیٹے برج راجدیو نے باپ کے خلاف بغاوت کردی۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔ بڑے بیٹے برج راجدیو نے اپنی مدد کے لیے پنجاب کی دو سکھ مثلوں (Missils) کو جموں بلالیا۔ برج راجدیو اور سکھ مثلوں کو جموں میں شکست ہوگئی لیکن برج راجدیو نے اقتدار کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ آخر کار رنجیت دیو کی موت کے بعد برج راجدیو جموں کا راجہ بننے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کو اپنے چھوٹے بھائی سے اقتدار کے لیے خطرہ تھا اس لیے اس نے اپنے ایک حمایتی میاں موٹا سنگھ کے ذریعہ ایک معرکے میں دلیل سنگھ کو بڑے بیٹے سمیت قتل کرادیا۔ دلیل سنگھ کا بڑا بیٹا بھگوان سنگھ تو مارا گیا لیکن اس کا چھوٹا بیٹا جیت سنگھ کسی طرح جان بچا کر اس خونریز معرکے سے بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔

برج راجدیو نے 5 سال تک جموں پر کامیابی سے حکمرانی کی اس دوران مہان سنگھ برج راجدیو سے باپ کی تعزیت کے بہانے جموں آیا اور جموں کو لوٹنا شروع کردیا۔

مہان سنگھ کا تعلق لاہور کے خالصہ دربار سے تھا۔ برج راجدیو جموں سے بھاگ گیا لیکن واپسی پر سکھوں کی بھنگی مثل اور ڈوگروں کی لڑائی میں مارا گیا۔ برج راجدیو کا بیٹا سپورن دیو ابھی ایک سال کا تھا، اس کو راجہ جموں بنایا گیا لیکن سپورن دیو بھی برائے نام حکمرانی کرنے کے بعد 10 سال کی عمر میں ہی فوت ہوگیا۔ اب خاندان میں جیت سنگھ کے سوا کوئی قریبی وارث موجود نہیں تھا۔ اس لیے 1798ء میں جیت سنگھ کو جموں کے تخت پر بٹھایا گیا اور جموں کا راجہ تو بنایا گیا لیکن یہ راجہ جیت سنگھ کامیابی سے حکومت کرنے میں ناکام رہا۔ اس دور میں جموں میں ابتری پھیل گئی اور ملک کا انتظام درہم برہم ہوگیا۔ ایک بار پھر 1808ء میں پنجاب کی خالصہ فوج نے جموں پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں سکھوں نے قتل و غارتگری اور لوٹ مار کرنے کی کوشش کی لیکن خالصہ فوج کو زبردست مزاحمت کیوجہ سے کامیابی نہ ہوئی۔ اس حملے میں سکھوں کے خلاف معرکے میں جموں کی طرف سے گلاب سنگھ بھی شریک ہوا اور جموں کے ڈوگروں کا پلڑا بھاری ہوگیا۔ اس وقت گلاب سنگھ کی عمر 16 سال تھی۔ اس لڑائی میں جموں کی حکومت سکھوں سے تو بچ گئی لیکن اندرونی خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت کی وجہ سے جموں کی ریاست بہت کمزور ہوچکی تھی اور ملکی اُمور بگڑ چکے تھے۔ جیت سنگھ راجہ جموں کے کنٹرول سے معاملات نکل چکے تھے۔ رانی بندرال نے عملاً جموں کی حکومت سنبھال لی تھی لیکن رانی بندرال اندرون خانہ سازشوں میں مصروف تھی۔ رانی بندرال نے لاہور دربار میں مہاراجہ کھڑگ سنگھ اور بھائی رام سنگھ کو خفیہ پیغام بھیجا کہ وہ جموں پر حملہ کریں۔ ابتری کی وجہ سے حالات بگڑ چکے ہیں اور خالصہ فوج ایک بڑا لشکر لیکر اگر جموں پر حملہ کرے تو آسانی سے جموں پر قبضہ کرلے گی اور سارا ملک جموں خالصہ دربار کے قبضہ میں آجائے گا۔ شہزادہ کھڑک سنگھ اور بھائی رام سنگھ نے جموں پر حملہ کر دیا اور آسانی سے خالصہ فوج جموں پر قابض ہوگئی۔ اس سے پہلے حکما سنگھ چمنی نے جموں پر حملہ کیا تھا جو ناکام ہوگیا تھا۔

اس حملے میں گلاب سنگھ نے بھی خالصہ فوج کے خلاف 16 سال کی عمر میں لڑائی میں حصہ لیا تھا اور جوانمردی دکھائی تھی جس کی وجہ سے گلاب سنگھ کی شہرت لاہور دربار کے مہاراجہ رنجیت سنگھ تک پہنچ گئی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو بلا بھیجا تھا کہ وہ

لاہور دربار میں حاضر ہوکر اپنے درشن کرائے۔گلاب سنگھ 1811ء میں لاہور دربار میں حاضر ہوا اور وہاں ملازم ہوگیا۔اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی دھیان سنگھ بھی 1812ء میں لاہور دربار میں بڑے بھائی کے پاس آ گیا اور ملازم ہوگیا۔دونوں بھائیوں نے آہستہ آہستہ لاہور دربار میں بہت اثر ورسوخ حاصل کرلیا۔ان کے بعد سب سے چھوٹا بھائی سوچیت سنگھ بھی لاہو دربار میں ملازم ہوگیا۔جموں کے چند دیگر جموال بھی بطور سوار لاہور دربار میں ملازم ہوگئے۔ راجہ گلاب سنگھ اور دھیان سنگھ نے لاہور دربار کی طرف سے کئی فوجی معرکوں میں حصہ لیا اور جوانمردی کے جواہر دکھائے جس کے بدلے دھیان سنگھ کو 1822ء میں چبال (بھمبر) اور پونچھ بطور جاگیر ملی۔گلاب سنگھ کو 1830ء میں پنڈ دادخان، بھیرہ، لون پانی، قادرآباد منڈی نمک بطور جاگیریں ملیں۔ 1833ء میں گلاب سنگھ کو جہلم ، روہتاس اور 1836ء میں گجرات بطور جاگیر ملی۔جبکہ 1820ء میں گلاب سنگھ کے والد کشور سنگھ کو جموں کا راجہ بنایا گیا۔جموں اس وقت بطور اجارہ کشور سنگھ کو دیا گیا تھا۔1819ء میں دھیان سنگھ کو لاہور دربار میں ڈیڑھی کا نگران بنایا گیا۔یہ لاہور دربار میں ایک بہت بڑا عہدہ اور ذمہ داری کا کام تھا۔اس کی وجہ سے جموں برادران کا لاہور دربار پر خاصا کنٹرول مضبوط ہوگیا تھا۔

گلاب سنگھ اپنے بھائی دھیان سنگھ کی لاہور میں آہستہ آہستہ پوزیشن مضبوط کر چکا تھا۔دوسری طرف اپنے باپ کی طرف سے جموں کے معاملات میں بھی اپنی دلچسپی بڑھا رہا تھا۔اسی دوران گلاب سنگھ کا والد کشور سنگھ کا جموں میں انتقال ہوگیا۔1819ء میں رنجیت سنگھ نے پنڈت بیربل در کی دعوت پر کشمیر پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔اسی دوران دھیان سنگھ کی خدمات سے خوش ہوکر رنجیت سنگھ نے ایک دن دھیان سنگھ کو جموں کا راجہ بنانے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ تم نے لاہور دربار میں رہ کر ہماری بہت مدد کی ہے لیکن دھیان سنگھ نے رنجیت سنگھ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بڑے بھائی گلاب سنگھ کی موجودگی میں اس کا راجہ بننے کا حق نہیں ہے۔بلکہ ہمارے دستور میں بڑے بھائی کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔رنجیت سنگھ نے اس بات سے خوش ہوکر گلاب سنگھ کو 1822ء میں راجہ جموں بنایا اور خود دریائے چناب کے کنارے ایک درخت کے نیچے گلاب سنگھ کو راج تلک لگایا۔ جموں کا راجہ بنتے ہی

گلاب سنگھ نے اپنی حیثیت مضبوط کرنی شروع کردی۔ اس وقت موجودہ جموں کے علاقے جن میں آزاد کشمیر کے علاقے بھی شامل ہیں چھوٹی چھوٹی 22 ریاستوں میں تقسیم تھا جن پر 16 ہندو راجواڑے اور 6 پر مسلم راجواڑے مسلط تھے۔ گلاب سنگھ کی ریاست صرف جموں کے مرکزی علاقوں تک محدود تھی۔ گلاب سنگھ نے جموں کا راجہ بنتے ہی اردگرد کی تمام ریاستوں کو ایک مرکز کے زیر انتظام لانے کے لیے جدوجہد شروع کردی اور جموں مرکز کے قریبی راجواڑوں کو اپنے مرکزی انتظام کے ماتحت کرنے کی مہم شروع کردی۔ 1824ء میں گلاب سنگھ نے گڑھی سمیرتا(Samirta) کو فتح کرکے جموں کا حصہ بنالیا۔ 1825ء میں گلاب سنگھ لاہو کی طرف سے جنگِ سیدو میں شریک ہوا اور اس جنگ میں بہادری کے کمال جوہر دکھائے۔ اس کے بعد جموں کے کچھ مزید علاقے فتح کیے جس میں سانبہ رام کوٹ وغیرہ شامل ہیں۔ سانبہ کا علاقہ اس وقت رام سنگھ عیشی پوریہ کی حکمرانی میں تھا۔ رام نگر گلاب سنگھ کے چھوٹے بھائی سوچیت سنگھ کی حکمرانی میں تھا۔ بعدازاں سانبہ اور رام کوٹ بھی سوچیت سنگھ کے اقتدار میں شامل کردیے۔ 1829ء میں گلاب سنگھ کشتواڑ پر قبضہ کرنے کے لیے ایک بڑا لشکر لیکر ڈوڈہ پہنچ گیا۔ اس مہم میں چینینی (Chaneni) کا راجہ دیال چند بھی شامل ہوگیا۔

راجہ تیغ سنگھ اس وقت کشتواڑ کا راجہ تھا، گلاب سنگھ کا لشکر جرارار دیکھ کر راجہ کشتواڑ بھاگ گیا اور گلاب سنگھ نے کشتواڑ کی ریاست پر قبضہ کرکے یہاں چین سنگھ کو کشتواڑ کا حاکم مقرر کیا۔ گلاب سنگھ اس وقت کے جموں کے اکثر علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کر چکا تھا۔ رام نگر، سانبہ گڑھی سمیرتا پہلے ہی اپنے بھائی راجہ سوچیت سنگھ اور راجہ رام نگر کے حوالے کرچکا تھا۔ اسی زمانے میں جموں بطور اجارہ لاہور دربار کی طرف سے گلاب سنگھ کے باپ کشور سنگھ کو ملا ہوا تھا۔ لاہور دربار کی طرف سے بھائی رام سنگھ اور دیوان بھوانی داس خالصہ دربار کی طرف سے سیاسی اُمور کے نگران تعینات تھے۔ اس کا جموں کے لوگوں پر کوئی اچھا اثر نہیں تھا۔ بلکہ لوگ پنجاب کے قبضے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں میاں ڈیڈو سنگھ نامی ایک بندہ اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جموں میں بدامنی پھیلا چکا تھا

۔ ڈیڈو سنگھ بڑا بہادر اور دلیر آدمی تھا۔ اس نے ایک طرف پنجاب کی خالصہ فوج پر اپنے حملے جاری رکھے ہوئے تھے تو دوسری طرف جموں شہر کو بار بار اپنے حملوں کا نشانہ بنا رہا تھا۔ چونکہ ڈیڈو سنگھ، گلاب سنگھ کا رشتہ دار تھا لیکن وہ پنجاب کا جموں پر قبضہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے ساتھ جموں کے کچھ راجپوت بھی شامل ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے جموں کی حکومت ان کے آگے بے بس تھی۔ اس زمانے میں پنجاب سے کچھ لوگ جموں کی لڑکیاں زبردستی بیاہ کر لے جاتے تھے۔ بارات لیکر گاؤں میں آتے تھے۔ ایک دفعہ میاں ڈیڈو نے اپنے مسلح آدمیوں کو لیکر ایک بار زبردستی ایک گاؤں میں پنجاب سے آئی ہوئی بارات کے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور ایسے اقدامات کی وجہ سے وہ جموں میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ جب جموں کی حکومت اس کے مسلح گروپ کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہوگئی تو رنجیت سنگھ نے اس کی سرکوبی کے لیے گلاب سنگھ کو لاہور دربار کی فوج کے ساتھ بھیجا۔ گلاب سنگھ نے بڑی حکمت اور تدبر سے ڈیڈو سنگھ کو قتل کرا دیا۔ اس کے قتل سے جموں کے علاقوں سے بدامنی دور ہوگئی۔

اسی دوران گلاب سنگھ نے راجہ اغر خان، راجہ راجوری کو بھی گرفتار کر کے راجوری پر قبضہ کر لیا۔ گلاب سنگھ جموں میں اپنے پاؤں پھیلا رہا تھا۔ اب تک گلاب سنگھ میر پور، بھمبر، کوٹلی، پونچھ، راجوری اور کشتواڑ تک کے علاقوں کو اپنے زیر اثر کر چکا تھا۔ گو کہ پونچھ کے علاقے ابھی تک دھیان سنگھ کی اولاد کے پاس جاگیر کے انتظام میں ہی تھے۔ گلاب سنگھ اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے بعد لداخ کی طرف متوجہ ہوا۔ 1834ء میں گلاب سنگھ نے لدّاخ پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنایا اور جرنیل زور آور سنگھ کو اس فوجی مہم کا نگران مقرر کیا۔ زور آور سنگھ کرگل اور دراس کو فتح کرتے ہوئے زنسکار تک پہنچ گیا اور بعد ازاں لدّاخ فتح کر کے واپس آ گیا۔ سکردو کے راجہ احمد شاہ کے بیٹے محمد شاہ نے زور آور سنگھ سے اپنے باپ کے خلاف مدد مانگی۔ محمد شاہ اپنے باپ راجہ احمد شاہ کے ظلم ستم سے بہت تنگ آ گیا تھا۔ اس کو زور آور سنگھ نے راجہ لدّاخ کے حوالے کیا۔ دوسری بار زور آور سنگھ نے سکردو فتح کیا جو راجہ شیر علی خان اور راجہ کھرمنگ کی مدد سے ہوا۔ زور آور سنگھ نے راجہ لدّاخ کی بداعمالیوں کی وجہ سے اس کو معزول کر کے لدّاخ کو جموں کا حصہ بنا دیا۔ سکردو اور لدّاخ کو فتح کرنے کے

بعد وزیر زورآور سنگھ لہاسہ فتح کرنے کے ارادے سے آگے بڑھتے ہوئے پوارنگ پہنچا اور طغلا کھر میں اپنا پڑاؤ ڈالا تا کہ سردیوں کا موسم ختم ہوتو آگے بڑھ سکے۔ اسی دوران لہاسہ کی فوج نے حملہ کر دیا۔ طویو کے مقام پر ڈوگرہ فوج کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ 12 ستمبر 1841ء کو اس لڑائی میں زورآور سنگھ مارا گیا اور ڈوگرہ جرنیل نے جموں کی سلطنت کی سرحدوں کو تبّت تک پھیلا دیا۔ ان علاقوں پر جو زورآور سنگھ نے تبّت کی سلطنت سے چھینے تھے، کی سرحدوں پر تبّت کی فوج سے جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ 1842ء کو ایک معاہدہ طے پایا جسے چوشال معاہدہ (Chushal Agreement) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے تبّت اور جموں کی سرحدوں کا تعین کیا گیا۔ لدّاخ اور بلتستان کے علاقے جموں کا حصہ تسلیم کیے گئے اور باقی علاقے تبّت حکومت کو واپس کر دیے گئے۔ معاہدہ چوشال یا عہد نامۂ لدّاخ میں ڈوگرہ حکومت کی سابقہ حدود برقرار رہیں۔ اس سے قبل لاہور دربار میں بڑی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

گلاب سنگھ کے خاندان نے لاہور دربار سے اپنی شروعات کی تھی اور لاہور دربار کی طاقت اور مدد سے گلاب سنگھ نہ صرف پورے جموں کے علاقوں کو اپنے زیرنگیں کر چکا تھا بلکہ اپنی ریاست کی سرحدوں کو تبّت تک پھیلا چکا تھا۔ 1839ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ لاہور دربار نے کھڑک سنگھ کو پنجاب کا مہاراجہ بنایا۔ کھڑک سنگھ کے تختِ لاہور پر بیٹھنے سے ہی ملکی انتظام میں بدنظمی پیدا ہو گئی۔ لاہور دربار اندرونی سازشوں کی نظر ہونا شروع ہوا۔ پہلے اجیت سنگھ قتل ہوا۔ پھر کھڑک سنگھ، کنور نونہال سنگھ اور گلاب کا بیٹا اودھم سنگھ بھی قتل ہو گیا۔ مہاراجہ شیر سنگھ نے حکومت سنبھالی لیکن خانہ جنگی جاری رہی اور چند دنوں میں سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ گلاب سنگھ کا بھائی دھیان ابھی تک لاہور دربار کا وزیراعظم تھا لیکن اس اندرونی خانہ جنگی میں گلاب سنگھ کے بھائی اور خاندان کے دوسرے لوگ ملوث ہو چکے تھے۔ اجیت سنگھ کا قتل بھی راجہ دھیان سنگھ کو ہٹا کر اجیت سنگھ کو لاہور دربار کا وزیراعظم بنانے سے ہوا تھا۔ کھڑک سنگھ دھیان سنگھ کی جگہ اجیت کو پسند کرتا تھا۔ کنور نونہال سنگھ، کھڑک سنگھ کا بیٹا تھا لیکن حکومت حاصل کرنے کی لالچ میں اور دھیان کی حمایت سے اجیت سنگھ کو قتل کرا دیا۔ راجہ دھیان سنگھ وزیراعظم لاہور دربار رانی سے چھٹی لیکر جموں چلا

گیا لیکن اس کے جموں جانے کے بعد لاہور دربار کے اراکین حکومت کے درمیان فساد برپا ہو گیا۔فوج کے دھڑے بن گئے اور فوج خودسر ہو گئی۔ مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کا بیٹا پرتاب سنگھ بھی سندھیانوالہ کے سرداروں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ ابتری مزید بڑھی اور دونوں فریقوں کے درمیان لاہور میں خونریزی مزید بڑھ گئی۔اسی دوران دھیان سنگھ کو جموں سے واپس بلایا گیا۔رانی ڈوگروں کی شدید دُشمن بن چکی تھی۔دھیان سنگھ کی جموں سے واپسی پر رانی اس کے قتل کے درپے ہو چکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ دھیان کو قتل کراتی اس کا اپنا کام تمام ہو گیا۔فریقین کے درمیان مزید خونریزی میں لاہور دربار کا وزیر اعظم دھیان سنگھ کئی دیگر عہدیدانِ لاہور دربار کے ساتھ قتل ہو گیا۔اس وقت کی لاہور کی خانہ جنگی میں گلاب سنگھ کا بھائی جس کا لاہور دربار پر اصل کنٹرول تھا اور اس کا ایک بیٹا مارے جا چکے تھے۔

گو کہ خوش قسمتی سے راجہ دھیان سنگھ کا بھائی سوچیت سنگھ اور اس کا بیٹا ہیرا سنگھ وہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے سندھیانوالوں سے بچ گئے۔ کچھ عرصے بعد یہ خونریزی بند ہوئی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ کو لاہور کے تخت پر بٹھایا گیا۔اس وقت اس کی عمر 9 سال تھی اور وزارت کا قلمدان راجہ ہیرا سنگھ کے سپرد کیا گیا۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ چونکہ کم عمر تھا اس لیے اس کی والدہ رانی جنداں اور راجہ ہیرا سنگھ مل کر نظام حکومت چلانے لگے۔اس پر راجہ ہیرا سنگھ اور اس کے چچا سوچیت سنگھ کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہیرا سنگھ نے اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے سندھیانوالہ سرداروں کے خلاف کاروائی کرتے ہوئے سب کو چن چن کر قتل کرا دیا۔اس لڑائی میں راجہ ہیرا سنگھ کا چچا بھی مخالفین کے ساتھ مارا گیا۔ ہیرا سنگھ نے لاہور میں اپنے مخالفوں کے خلاف توپ خانے کا استعمال کیا۔ یہ واقعہ اپریل 1845ء کا ہے۔گلاب سنگھ کو جموں میں اپنے بھائی سوچیت سنگھ کی موت کی خبر ہوئی تو بہت افسوس ہوا۔راجہ ہیرا سنگھ نے اپنے چچا کی جاگیر اور اس کے ملک رام نگر پر قبضہ کرنے کا بھی حکم دیا۔جبکہ سوچیت سنگھ پہلے ہی اپنی جائیداد گلاب سنگھ کے بیٹے کے نام کرا چکا تھا چونکہ اس کی اپنی اولاد نہیں تھی۔اس پر گلاب سنگھ کے بیٹے رنبیر سنگھ اور ہیرا سنگھ کے درمیان سانبہ اور سوچیت گڑھ کی جاگیر پر جھگڑا کھڑا ہو گیا۔گلاب سنگھ نے دعویٰ کیا

کہ سوچیت سنگھ کی جاگیر رنبیر سنگھ کے نام ہے جسے ہیرا سنگھ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر ہیرا سنگھ نے گلاب سنگھ کی پنجاب میں ساری جاگیریں ضبط کرنے کا حکم دیا جو گلاب سنگھ کو خالصہ سرکار سے ملی تھیں۔ ہیرا سنگھ نے مزید کاروائی کرتے ہوئے گلاب سنگھ کی ریاست جموں پر حملے کا حکم بھی دے دیا اور خالصہ فوج جموں پر حملے کے لیے ایمن آباد پہنچ گئی۔ گلاب سنگھ نے بھی جموں کی فوج کو تیار رہنے کا حکم دے دیا اور ان کی کمانڈ اپنے بیٹے راجہ رنبیر سنگھ کے سپرد کر دی۔ آخر جواہر سنگھ نے درمیان میں آ کر گلاب سنگھ کی ہیرا سنگھ سے صلح کرا دی۔ اس صلح کے تحت گلاب سنگھ کا چھوٹا بیٹا لاہور دربار میں ہیرا سنگھ کے پاس رہے گا تاکہ صلح پائیدار طریقے سے قائم رہے۔ رندھیر سنگھ کو لاہور ہیرا سنگھ کے پاس بھیج دیا گیا۔ اتفاق سے افسرانِ فوج اور ہیرا سنگھ کی کسی مسئلے پر زبردست ٹھن گئی اور ہیرا سنگھ کو خبر ہوگئی کہ خالصہ فوج اس کے مخالف ہو چکی ہے۔ ہیرا سنگھ نے اپنے ساتھیوں سمیت رات کے وقت لاہور سے نکلنے کے لیے پروگرام بنایا۔ ابھی لاہور سے تھوڑی ہی دور تک گئے تھے کہ خالصہ فوج نے سب کو گھیر کر قتل کر دیا۔ اس قافلے میں ہیرا سنگھ کے ساتھ گلاب سنگھ کا بیٹا رندھیر سنگھ بھی مارا گیا۔

اس وقت تک لاہور دربار کی خانہ جنگیوں میں گلاب سنگھ کے دونوں بھائی، دو بیٹے اور ایک بھتیجا مارا گیا تھا۔ گلاب سنگھ ابھی ابھی اپنے بھائی اور بیٹے کی آخری رسومات سے فارغ ہی ہوا تھا کہ یہ خبر پہنچی کہ سردار شام سنگھ اور لال سنگھ خالصہ فوج لیکر جسروٹہ اور ہیرا سنگھ کی دیگر جاگیروں پر قبضہ کرنے پہنچ گئے ہیں۔ دوسرا وفد گلاب سنگھ کے پاس یہ پیغام لیکر جموں پہنچ گیا کہ ہیرا سنگھ اور سوچیت سنگھ کے تمام علاقے اور ہیرا سنگھ کا آدھا ترکہ فوراً ان کے حوالے کر دیا جائے۔ انہوں نے جواہر سنگھ کو بھی لاہور دربار کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ گلاب سنگھ کو یہ بے اعتنائی دیکھ کر سخت ناگواری ہوئی کہ کس طرح اس کے بھائیوں اور بیٹوں کو قتل کیا گیا اور اب ان کی دولت اور زمین بھی چھیننے کی کوشش ہو رہی ہے۔ گلاب سنگھ نے جواہر سنگھ کو اور رنبیر سنگھ کو فوجیں تیار کرنے کا حکم دیا اسی دوران جواہر سنگھ شکست کھا کہ جموں پہنچ گیا اور شام سنگھ اور لال سنگھ نے جسروٹہ پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران لاہور دربار کی خالصہ

فوج نے جموں پر بھی حملہ کر دیا۔ دوسری طرف یہ خبر بھی جموں پہنچی کہ راجہ راجوری فقیر اللہ نے پونچھ اور نوشہرہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنالیا ہے۔ جو فوج نوشہرہ میں تھی اس میں افراتفری اور فساد پیدا ہو گیا۔ ہر طرف ایک شورش برپا ہو گئی۔ لاہور دربار کی جو فوج توپ خانے سمیت جسروٹہ فتح کرنے گئی تھی وہ سردار شام سنگھ کی قیادت میں سانبہ اور رام گڑھ پر قبضہ کر چکی تھی۔ دیگر فوج جس میں چند پلٹن اور توپ خانہ سمیت لال سنگھ کی قیادت میں گلاب سنگھ کے بے شمار دیہات اور علاقوں پر قبضہ کر چکی تھی۔ گلاب سنگھ کی ایک بار پھر پنجاب میں ساری جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں۔

جموں کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے فوج کے ایک حصہ نے نجو ہد سنگھ اور راجگان پواہد کی مدد سے بسوہلی سے اتر کر بھینی پر حملہ کر دیا۔ سردار منگل سنگھ کچھ فوج لیکر مناور پر حملہ آور ہوا، نوشہرہ سے فیض طالب خان اور سردول سنگھ حوالی اور پونی تک آ گئے۔ ایک اور گروہ نے ہزارہ سے نکل کر کھوٹہ پر دھاوا بول دیا۔ کچھ لوگوں نے روہتاس کی طرف سے قلعہ منگلا پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لاہور دربار سے مہاراجہ دلیپ سنگھ کا ایک حکم کشمیر کے گورنر شیخ غلام محی الدین کے نام آیا کہ کشتواڑ پر فوراً فوج بھیج کر قبضہ کیا جائے اور جموں کے پیچھے جو بھی علاقے ہیں ان میں فتنہ و فساد برپا کیا جائے تاکہ راجہ جموں گلاب سنگھ کا حوصلہ پست ہو جائے۔ لاہور دربار کی خانہ جنگی اور فتنہ و فساد نے جموں کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا تھا۔ گلاب سنگھ کے سارے ملک میں ہنگامہ و فساد برپا ہو گیا تھا۔ خالصہ دربار کی لاہوری فوج نے جموں کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا لیکن اس کے باوجود خالصہ فوج کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ گلاب سنگھ کی ڈوگرہ فوج نے جگہ جگہ لاہور دربار کی فوج کا مقابلہ کیا۔ ڈوگرہ فوج نے اپنی جموں کی سرزمین کو بچانے کے لیے جگہ جگہ جان کی بازی لگا دی۔ جب لاہور دربار کے فوجی افسران اور سرداران خالصہ کو جنگ وجدل سے اپنا مطلب حاصل ہوتا ہوا نظر نہ آیا تو انہوں نے صلح کرنے کی کوشش کی۔ لال سنگھ نے اب دھوکہ اور فریب سے کام لینے کی ٹھان لی۔

لال سنگھ نے لاہوری فوج کے افسران کے مشورے سے ایک نیا منصوبہ بنایا اور وہ منصوبہ یہ تھا کہ پہلے مکر و فریب اور دھوکے سے مال و دولت ہتھیا لیا جائے اور اس روپیہ پیسے

کا لالچ دے کر ڈوگرہ فوج کے اہلکاروں کو گلاب سنگھ کے خلاف کر دیا جائے۔ اس منصوبہ کے تحت لال سنگھ نے ایک وفد سردار فتح سنگھ مان کی قیادت میں راجہ جموں گلاب سنگھ کے دربار میں صلح کے لیے بھیجا۔ گلاب سنگھ نے لاہوری دربار کی فوج کے وفد کو صاف جواب دیتے ہوئے کہا کہ میرے بچے اور بھائی لاہور دربار کی خالصہ فوج کے ہاتھوں ناحق مارے گئے جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ لاہور دربار نے ہمارے خاندان کی ان کے لیے خدمات کا یہ صلہ دیا ہے لیکن میں پھر بھی لاہور دربار سے صلح کے لیے تیار ہوں شرط یہ ہے کہ اہلِ لاہور دربار یہ عہد کریں کہ وہ آئیندہ میرے ملک پر حملہ نہ کریں گے اور نہ ہی وہ میرے خاندان کی جائیداد، مال و دولت پر دست درازی کریں گے۔ ہیرا سنگھ کی جائیداد اور ملک جسر وٹہ جس پر اب خالصہ فوج نے قبضہ کر لیا ہے میرے حوالے کر دیا جائے۔ لاہور دربار کا وفد سردار فتح سنگھ مان کی قیادت میں گلاب سنگھ کا یہ پیغام لیکر جموں دربار سے لال سنگھ کی طرف روانہ ہوا۔ لال سنگھ خالصہ فوج لیکر جموں سے دس میل دور بیٹھا ہوا تھا۔ گلاب سنگھ نے اپنے وزیر زور آور سنگھ کو لاہور دربار کے وفد کے ساتھ باہر بھیجا تا کہ وہ انہیں بحفاظت جموں کی ڈوگرہ فوج سے باہر پہنچا دیں۔ ان دنوں جموں کی ڈوگرہ فوج کے افسران لاہور دربار کے ان سازشی عناصر سے سخت ناراض اور غصے میں تھے۔ لاہور دربار کے وفد کے اراکین جونہی ڈوگرہ فوج کے درمیان سے گزرے، جموں کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اور چاروں طرف سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ وفد کے باقی لوگوں سمیت سردار فتح سنگھ بھی مارا گیا۔ یہ خبر خالصہ فوج تک پہنچی تو انہوں نے جموں میں ہر طرف حملے شروع کر دیئے۔ جسر وٹہ اور رام گڑھ پر لاہوری فوج نے حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ لال سنگھ اپنی خالصہ فوج لیکر قلعہ دیوی پر حملہ آور ہوا۔ خالصہ فوج کے دوسرے جتھوں نے بھی جگہ جگہ گلاب سنگھ کی ڈوگرہ فوج پر حملے شروع کر دیئے اور کئی علاقے تاراج کر دیئے۔ خالصہ فوج کی پلٹن ہیرا سنگھ اور رندھیر سنگھ جو گلاب سنگھ کے بالترتیب بھیتجا اور بیٹا تھے کو لاہور میں قتل کرنے کے بعد جموں کے کئی علاقوں میں داخل ہوگئی تھی تا کہ جموں کے ان علاقوں پر قبضہ کر سکیں جو ہیرا سنگھ اور گلاب سنگھ کے بھائی سوچیت سنگھ کی ملکیت اور عملداری میں تھے۔

دیوی گڑھ میں ڈوگرہ فوج نے خالصہ فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اوتر بھینی میں کرنیل بجے سنگھ اور میاں ہمیر سنگھ نے خالصہ فوج سے سخت مقابلہ کیا۔ راجہ لال سنگھ خالصہ فوج لیکر سنبل کے مقام پر قیام پذیر ہوا اور جموں کے گرد و نواح میں دیہاتوں کو جلانا شروع کر دیا۔ اسی دوران سردار شیر سنگھ خالصہ فوج لیکر نندی کی طرف سے جموں پر حملہ آور ہو گیا۔ سردار شیر سنگھ کی خالصہ فوج اور جموں کی فوج کے درمیان سخت معرکہ ہوا۔ دونوں طرف سے بہت جانی نقصان ہوا لیکن فتح کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ جب خالصہ فوج کے افسران نے یہ حالت دیکھی تو ایک بار پھر صلح پر راضی ہو گئے۔ بڑی بحث مباحثہ اور مشورہ کے بعد خالصہ فوج کے افسران نے سردار سلطان محمد خان اور سردار چتر سنگھ کے ذریعے گلاب سنگھ سے صلح کا انتظام کیا۔ طے یہ پایا کہ راجہ گلاب سنگھ لال سنگھ سے ملاقات کریں اور کچھ شرائط تسلیم کریں گے اور ان کو بحفاظت لاہور رانی جنداں کے پاس بات چیت کے لیے پہنچایا جائے گا۔ لال سنگھ نے گلاب سنگھ سے ملاقات کی لیکن چند باتیں کر کے واپس چلا گیا۔ لال سنگھ نے یہ شرط رکھی کہ اگر گلاب سنگھ جواہر سنگھ کو ان کے حوالے کر دے تو خالصہ فوج جموں سے واپس لاہور چلی جائے گی۔ گلاب سنگھ نے خالصہ فوج کی یہ شرط تسلیم کر لی اور جواہر سنگھ کو خالصہ فوج کے حوالے کر دیا۔ جواہر سنگھ جونہی خالصہ فوج میں گیا اس کو حراست میں لے لیا گیا۔ گلاب سنگھ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو دیوان جوالا سہائے کو حالات درست کرنے کے لیے خالصہ فوج کے پاس بات چیت کے لیے بھیجا لیکن خالصہ فوج کے کچھ افسران نے ان کی بات ماننے کی بجائے خالصہ فوج کے ایک افسر بخشی بھگت رام نے کہا کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ نے لاہور دربار کی طرف سے ہمیں قلعہ باہو پر قبضہ کرنے اور جموں کا راج گلاب سنگھ سے چھین کر میاں رگھبیر دیو کے حوالے کرنے کے لیے بھیجا ہوا ہے۔

دیوان جوالا سہائے نے خالصہ فوج کے افسران کو سمجھانے کی بہت کوشش اور کہا کہ کوئی ملک جب کسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تو واپس کوئی کسی کے حوالے نہیں کرتا۔ اس پر خالصہ فوج کے کچھ افسران دیوان جوالا سہائے کو بھی قید کرنے کے لیے مشورہ کرنے لگے اور جوالا سہائے پر حملہ بھی کیا۔ اسی دوران راجہ جموں گلاب سنگھ خالصہ فوج کے لشکر کے درمیان

پہنچ گئے اور لاہور جانے کے لیے لشکر سمیت میوہ سنگھ کے پاس ٹھہر گئے۔راجہ گلاب سنگھ کے لیے حالات اس قدر غیر یقینی تھے کہ جموں سے نکلتے ہوئے انہوں نے جموں ریاست کے انتظامات دیوان ہری چند کے سپرد کرتے ہوئے اسے یہ ضروری ہدایات دیں کہ اگر میں دُشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاؤں یا مارا جاؤں تو جموں کی ریاست اس وقت تک کسی دُشمن کے حوالے نہ کرنا جب تک اس کی مٹی اس کے بہادروں کے خون سے رنگین نہ ہو جائے۔ گلاب سنگھ نے فوج کے اختیارات بھی دیوان ہری چند کے سپرد کر دیے تھے۔گلاب سنگھ نے خالصہ فوج کے لشکر میں پہنچتے ہی اپنے بھتیجے راجہ جواہر سنگھ کو واپس جموں بھیج دیا اور پانچ روپیہ خالصہ فوج کے ہر آدمی کو انعام دیا اور انہیں اپنا مطیع بنالیا۔میوہ سنگھ کو گلاب سنگھ نے کچھ رقم اور ایک گھوڑا انعام میں دیا۔اس کا بڑا اچھا نتیجہ نکلا اور خالصہ فوج کا لشکر اپنے افسران سے ناراض ہو کر لاہور کے طرف کوچ کر گیا۔گلاب سنگھ نے اپنی حکمت عملی سے خالصہ فوج میں پھوٹ ڈال دی۔گلاب سنگھ اس وقت انتہائی خطرناک حالات میں لاہور کی طرف جا رہا تھا۔ لاہور دربار کی رانی نے فوج کے افسروں کی باز پرس کی اور دھمکی دی کہ وہ بغیر پوچھے کیوں راجہ گلاب سنگھ کو لاہور لا رہے ہیں۔لاہور فوج کا جرنیل میوہ سنگھ جونہی لاہور دربار میں مہاراجہ دلیپ سنگھ کے پاس گیا اس کو نظر بند کر دیا۔لاہور میں تیار شاہی فوج اور توپ خانہ، جرنیل میوہ سنگھ کی پلٹنوں کے مقابلے کے لیے تیاری کرنے لگا۔جو خالصہ فوج جموں کی طرف سے واپس آ رہی تھی وہ پہلے ہی دو گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔گلاب سنگھ اس سنگین صورتِ حال سے گھبرایا لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔گلاب سنگھ نے خالصہ فوج کے افسران سے کہا کہ جس طرح مجھے شرائط طے کر کے لائے ہو انہی شرائط کے مطابق مجھے لاہور کی فوج کے حوالے کر دو چنانچہ ایسا ہی ہوا۔راجہ گلاب سنگھ کو کشتی میں بٹھا کر دریائے راوی کے پار پہنچا دیا گیا اور ہاتھی پر بٹھا کر لاہور کی طرف روانہ کیا گیا۔گلاب سنگھ جونہی لاہور کی طرف روانہ ہوا خالصہ فوج کو حکم دیا گیا کہ گلاب سنگھ کو حراست میں لیا جائے۔گلاب سنگھ لاہور پہنچا اور کنور سنگھ کی حویلی میں ٹھہر گیا۔

حویلی میں پہنچتے ہی گلاب سنگھ پر لاہور دربار کی طرف سے فوج کا حراستی پہرہ لگا دیا گیا اور تمام ملازمین کو گلاب سنگھ سے الگ کر دیا گیا۔دیوان جوالا سہائے کے علاوہ کسی کو

گلاب سنگھ کے پاس آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ لاہور دربار کے کچھ لوگ گلاب سنگھ سے مال و متاع ہتھیانے کے درپے تھے اور سردار جواہر سنگھ کو کسی نے اطلاع دی کہ دیوان جوالا سہائے اور وزیر زورآور سنگھ جموں کی حکومت کے خزانوں اور ان کے ٹھکانوں سے واقف ہوں گے، اس لیے ان پر تشدد کر کے راز اگلوائے جائیں۔ چنانچہ سردار جواہر سنگھ نے دیوان جوالا سہائے اور وزیر زورآور سنگھ کو توپ کے ساتھ باندھ کر پٹوایا اور لوہے کی سیخ گرم کر کے ان کے جسم کو تپایا گیا۔ گلاب سنگھ نے کسی طریقے سے وزیر زورآور سنگھ کو کشتواڑ کی فوجی مہم کے بہانے جموں بھیج دیا، لیکن دیوان جوالا سہائے پر تشدد بدستور جاری رہا۔ یہ اطلاع جب خالصہ فوج میں پہنچی تو شورش اور بے چینی پھیل گئی۔ لال سنگھ کو اطلاع دی گئی کہ اگر گلاب سنگھ کو حراست سے رہا نہ کیا تو خالصہ فوج میں بغاوت پھیل جائیگی۔ فوج کے وہ اہلکار جو گلاب سنگھ کے ساتھ شرائط طے کر کے اس کو لاہور لائے تھے کہنے لگے کہ وہ گلاب سنگھ سے عہد و پیمان کر کے لائے تھے اور اگر انہیں کوئی تکلیف دی گئی تو لاہور دربار کے اہلکاروں کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

خالصہ فوج کا ایک حصہ گلاب سنگھ کے ادب و احترام میں اتنا آگے نکل گیا اور انہوں نے دربار کے اہلکاروں کو دھمکی دے دی کہ اگر گلاب سنگھ عزت و احترام کے ساتھ رہا کر کے جموں نہ پہنچایا گیا تو وہ فتنہ وفساد برپا کر دیں گے۔ اس فساد کے ڈر سے گلاب سنگھ کے اوپر سے خالصہ فوج کا حراستی پہرہ ہٹا دیا گیا اور دوسرے دن انہیں مہاراجہ دلیپ سنگھ کے دربار میں بات چیت کے لیے لایا گیا۔ ہیرا سنگھ اور سوچیت سنگھ کی جائیداد کے بارے میں بات چیت کر کے اصل معاملہ ٹالنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد کئی بار گلاب سنگھ کو دھوکہ و فریب سے لاہور میں قتل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن راجہ جموں گلاب سنگھ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا اور وہ بحفاظت کچھ عرصہ اسی طرح لاہور میں موجود رہے۔ اسی دوران لاہور دربار کے دو سازشی اور فتنہ وفساد کی جڑ سردار جواہر سنگھ اور لال سنگھ کے آپس میں اختلاف پیدا ہو گئے۔ دونوں اب گلاب سنگھ کی لاہور دربار میں موجودگی کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے کہ گلاب سنگھ انتہائی زمانہ شناس اور دربار کے معاملات کو اچھی طرح اور تمام حکمتوں سے

واقف ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لاہور دربار میں کسی حکمت سے ان دونوں کا کام خراب نہ کر دے ۔اس لیے دونوں نے گلاب سِنگھ کو لاہور دربار سے دور کرنے کی ترکیب سوچی اور دونوں نے سردار سلطان خان کے ذریعہ ایک دوسرے کو کہلا بھیجا کہ گلاب سِنگھ کو واپس جموں بھیج دیا جائے۔ اس فساد کا گلاب سِنگھ کہ یہ فائدہ ہوا کہ لاہور دربار نے خوشی سے انہیں واپس جموں بھیج دیا۔ اقتدار کی گردشوں میں اور طاقت کے اس کھیل میں کوئی کسی کا دوست اور دُشمن نہیں ہوتا بلکہ مفادات ہی ان حکمران گروہوں کے اصل ہدف ہوتے ہیں۔ گلاب سِنگھ، جس نے اپنی زندگی کا آغاز ہی لاہور دربار کی ملازمت سے شروع کیا تھا اور اس نے لاہور دربار کی تخت شاہی کے پھیلاؤ کے لیے سینکڑوں فوجی مہمات میں حصہ لیا تھا۔ پنجاب کی سرحدوں کو کابل تک لے جانے میں نہ صرف خود شریک ہوا تھا بلکہ اس کے بھائی اس خون آشام جنگی مہم کا حصہ بنے تھے۔ آج اسی لاہور دربار کی قید سے رہا ہو کر گلاب سِنگھ واپس اپنے وطن جموں کی طرف جا رہا تھا۔ آج لاہور دربار میں گلاب سِنگھ کے خاندان کا کوئی بھی فرد زندہ نہ بچا تھا بلکہ ڈوگرہ خاندان کے تین بچے جن میں گلاب سِنگھ کے دو جوان سال بیٹے اودھم سنگھ، رندھیر سنگھ، بھتیجا ہیرا سِنگھ ، دو چھوٹے بھائی دھیان سِنگھ (جو لاہور دربار کے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا) اور سوچیت سِنگھ قتل ہوئے تھے۔

گلاب سِنگھ نے لاہور دربار کے آپس کے اختلافات اور فسادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ تمام علاقے اور چھوٹے ملک جو اس سے چھین لیے گئے تھے واپس لیے اور خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا اپنے ملک کے دارالحکومت جموں پہنچ گیا۔ گلاب سِنگھ کے لاہور دربار میں نظر بندی کے دوران مخالفوں نے جموں میں ہر طرف ایک بار پھر فِتنہ وفساد برپا کر دیا تھا۔ کشتواڑ میں سابق راجہ تیغ سِنگھ اور اس کے حامی دلاور سِنگھ نے فِتنہ وفساد کھڑا کر دیا لیکن وہاں وزیر لکھپت رائے نے ان فسادیوں کو کنٹرول کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسکی مدد کے لیئے وزیر زورآور سِنگھ اور اس کا بیٹا بھی لاہور سے واپس آ کر بروقت اس کی مدد کو پہنچ گئے اور فسادیوں کو کشتواڑ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بھمبر کا کنٹرول چتر سِنگھ کو دیا گیا۔ پونچھ میں دیوان کرم چند باغیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ قلعہ منگلا کی حفاظت پر مامور رائے دھنپت اپنی جگہ

ڈٹا ہوا تھا۔گو یا اس وقت صرف جموں گلاب سنگھ کے پاس رہ گیا تھا۔

دوسری طرف لاہور دربار کا حال یہ تھا کہ اندرونی خلفشار اور ابتری مزید بڑھ گئی تھی۔ اراکینِ حکومت کی آپس کی طاقت اقتدار پر قبضہ کرنے کی کشمکش نے خالصہ فوج کو بھی اتنا خودسر کردیا تھا کہ ان کو اگر کوئی اراکینِ دربار سے لالچ دیتا، اس کے ساتھ ہوجاتی تھی۔اس کا نتیجہ آپس میں دربار کے طاقتور لوگوں کی قتل و غارتگری ہوتا تھا۔فوج نے رانی جنداں کے بھائی سردار جواہر سنگھ کو بھی قتل کردیا تھا۔اب صورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ رانی جنداں سمیت اراکین دربار خالصہ فوج کی خودسری سے تنگ آکر اسے ستلج پار انگریز فوج سے لڑانے کی سازش کا سوچ رہے تھے۔گلاب سنگھ کو بھی لاہور دربار کی طرف سے خطوط آنے شروع ہوگئے کہ وہ لاہور آئے لیکن گلاب سنگھ اب اپنے آپ کو لاہور دربار کے معاملات سے دور رکھنا چاہتا تھا۔رانی جنداں نے گلاب سنگھ کو لکھا کہ وہ واپس آکر ملک کے حالات ٹھیک کرے اور یہ بھی لکھا کہ خالصہ فوج ستلج پار انگریزی علاقوں پر حملے کی تیاری کر رہی ہے۔گلاب سنگھ نے رانی جنداں کو لکھا کہ انگریز علاقوں پر خالصہ فوج حملہ نہ کرے کیونکہ انگریز اپنے معاہدے پر قائم ہیں اور خالصہ فوج بھی انگریز سے کئے گئے معاہدے کی پاسداری کرے۔ان کے علاقوں پر حملہ نہ کرے لیکن خالصہ فوج دربارِ لاہور کے حکم سے 24 دسمبر 1845ء کو دریائے ستلج پار کر کے انگریز علاقوں پر حملہ آور ہوگئی۔خالصہ فوج نے گلاب سنگھ کی بات اور صلاح کو نہ مانا چنانچہ دوسری طرف انگریز بھی کافی تیاری کے ساتھ فوج لیکر مقابلہ کرنے کے لیے آگئے۔دونوں فوجوں کے درمیان بڑا خونریز معرکہ ہوا لیکن خالصہ فوج کو انگریز فوج کے ہاتھوں شکست ہوئی۔

لال سنگھ جو خالصہ فوج کی قیادت کر رہا تھا ایسا میدانِ جنگ سے بھاگا کہ کچھ عرصہ تک اس کا کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔لاہور دربار سے ایک وفد گلاب سنگھ سے انگریز کے خلاف جنگ میں مدد لینے جموں آیا۔گلاب سنگھ نے اس بار بھی انہیں کسی طرح ٹرخا دیا لیکن اسی دوران لاہور سے رانی جنداں کا ایک حکم نامہ گلاب سنگھ کے پاس پھر آگیا اور لاہور آنے کا کہا گیا۔اس بار گلاب سنگھ لاہور جانے کی تیاری کرنے لگا اور خالصہ فوج کو خط لکھا کہ میرے آنے تک فوج آگے نہ بڑھے لیکن خالصہ فوج کی خودسری کا یہ عالم تھا کہ اس نے اگلے دن

لدھیانہ میں انگریز فوج کی چھاؤنی پر حملہ کر کے اس کو آگ لگا دی۔ گلاب سِنگھ لاہور پہنچا تو دربارِ لاہور کے کئی اراکین دریائے راوی کے کنارے استقبال کے لیے آئے۔ گلاب سِنگھ رانی جنداں کے پاس دربار میں حاضر ہوا اور رانی جنداں نے گلاب سِنگھ کو وزارت عطا کی۔ گلاب سِنگھ نے اپنی صوابدید کے مطابق خالصہ فوج کے افسران کو احکامات جاری کیے لیکن خالصہ فوج کے کمانڈر سردار نجو ہد سِنگھ نے ایک بار پھر دریائے ستلج عبور کر کے انگریز فوج پر حملہ کر دیا۔ دونوں فوجوں کا ایک بار پھر سخت مقابلہ ہوا لیکن خالصہ فوج اس بار بھی شکست کھا گئی اور فوج میدانِ جنگ سے بھاگ گئی۔ گلاب سِنگھ ابھی معاملات کو انگریز کے ساتھ سُلجھانے کوشش ہی کر رہا تھا اور کچھ جنگ بندی کی شرائط طے ہونے والی تھیں کہ ایک بار پھر خالصہ فوج کا ایک لشکر انگریز فوج پر حملہ آور ہو گیا۔ اس بار پھر لاہوری فوج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

دوسری طرف انگریز فوج اس بار دریا عبور کر کے لاہور کی حدود میں داخل ہو گئی۔ خالصہ فوج کے ناعاقبت اندیش افسروں نے بلاوجہ انگریزوں سے شرارت کر کے اوران کے علاقوں میں فساد کر کے لاہور دربار کی حدود پر انگریزی فوج کا قبضہ کرا لیا۔ گلاب سِنگھ کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے بہت افسوس کیا اور لاہور دربار کے چیدا چیدا اراکین سے مشورہ کیا کہ اس صورت حال میں کیا تدبیر کی جائے۔ رانی سمیت سب اراکینِ دربار نے کہا کہ گلاب سِنگھ جو بندوبست کریں گے وہ سب کو قابل قبول ہوگا اور منظور ہوگا۔ گلاب سِنگھ نے لاہور دربار کے معززین کا ایک وفد تشکیل دیا اور جنگ بندی کی شرائط طے کرنے انگریز فوج کے کیمپ میں مذاکرات کے لیے چلے گئے۔ اس وفد میں لاہور دربار کی طرف جو اراکین شامل ہوئے ان میں فقیر نورالدین، دیوان دینا ناتھ، دیوان دیوی سہائے، سردار گلاب سِنگھ اٹاری والا وغیرہ تھے۔ جب صلح کی بابت جنگ بندی کی شرائط پر بات چیت ہوئی تو انگریز گورنر جرنیل نے دو کروڑ روپیہ نقد تاوانِ جنگ میں مانگا اور ساتھ ہی دوآبہ کا علاقہ بھی تاوانِ جنگ میں طلب کیا۔ گلاب سِنگھ نے لاہور دربار کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ دو کروڑ کی رقم زیادہ ہے اس لیے اتنی رقم مہیا ہونا مشکل ہے۔ بڑی بحث کے بعد ڈیڑھ کروڑ روپیہ پر اتفاق ہوا۔ پوری رقم ادا ہونے کے بعد دوآبہ کا علاقہ واپس لاہور دربار کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ اس کے بعد

مہاراجہ دلیپ سنگھ نے بھی گورنر جنرل سے ملاقات کی اور 50 لاکھ روپیہ ادا ہونے کے بعد انگریز فوج کو لاہور سے چلے جانے کی یقین دہانی لی۔ اس موقع پر لاہور دربار نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور رانی جنداں نے یہ حکم جاری کیا کہ گلاب سنگھ کو جو اختیارات انگریزوں سے صلح کے لیے تفویض کیے گئے تھے وہ گلاب سنگھ سے واپس لیکر سردار لال سنگھ کو تفویض کیے جاتے ہیں۔ لال سنگھ نے انگریزوں کو معاہدہ لاہور کی نئی شرائط پیش کیں۔ معاہدۂ لاہور 9 مارچ 1846ء کو ہوا۔ لال سنگھ نے لاہور دربار کی طرف سے انگریز کو ایک کروڑ روپیہ نقد جنگی تاوان اور باقی رقم کی جگہ دوآبہ، بیاس، ستلج، گانگڑہ سمیت چمبہ، کشمیر، ہزارہ اور گلگت تک کی تمام ریاستوں اور علاقوں کو انگریز سرکار کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ کشمیر، ہزارہ، گلگت، سمیت تمام پہاڑی علاقے اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں لاہور دربار کے قبضے میں تھیں۔ اب یہ سارے علاقے کشمیر سمیت 9 مارچ 1846ء کے معاہدۂ لاہور کے تحت انگریز سرکار کے حوالے کر دیے گئے۔ لاہور دربار کے وزیر اعظم سردار لال سنگھ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اس کی رُو سے گلاب سنگھ کی جموں ریاست کے اردگرد کے تمام علاقے انگریز کے کنٹرول میں آنے سے گلاب سنگھ کی جموں کی ریاست بھی انگریز کے قبضے میں آجائے گی۔ یہی لال سنگھ خالصہ فوج لیکر گلاب سنگھ کی جموں کی ریاست پر اس وقت حملہ آور ہوا تھا جب گلاب سنگھ نے اپنے بیٹے اور بھتیجے ہیرا سنگھ کے قتل کے بعد لاہور دربار کی بالادستی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

لال سنگھ نے راجہ جموں گلاب سنگھ سے تین لاکھ روپیہ وصول کرنے کے لیے جموں پر حملہ کیا تھا۔ لال سنگھ اندر ہی اندر گلاب سنگھ سے سخت انتقام لینا چاہتا تھا اور گلاب سنگھ کی ریاست کو کسی حیلے بہانے سے انگریز کے حوالے کرنے کی ترکیب کر رہا تھا۔ معاہدۂ لاہور میں انگریز کے ساتھ نئی شرائط طے کرنے کا مقصد بھی گلاب سنگھ کی جموں کی ریاست کو مشکل اور مصیبت میں ڈالنا تھا۔ گلاب سنگھ کو جب لاہور دربار کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ بہت گھبرایا۔ گلاب سنگھ سمجھ گیا کہ لاہور دربار کی طرف سے لال سنگھ نے جموں کی ریاست کے خلاف یہ خطرناک چال چلی ہے۔ گلاب سنگھ نے اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے انگریز سرکار سے مذاکرات کرنے کے لیے دیوان جوالا سہائے کو انگریز گورنر جنرل سر ہنری لارنس کے پاس بھیجا۔

دیوان جوالا سہائے نے گلاب سنگھ کی طرف سے انگریز سرکار سے مذاکرات شروع کیے۔ ہنری لارنس نے کہا کہ دریائے بیاس سے دریائے سندھ کے درمیان کے علاقے گانگڑہ، کشمیر، ہزارہ کوہستان سمیت ڈیڑھ کروڑ روپیہ کی رقم لیکر گلاب سنگھ کی ریاست جموں کے حوالے کیے جائیں گے لیکن گلاب سنگھ کے پاس اتنی رقم نہ ہونے کی وجہ سے 75 لاکھ نانک شاہی میں کشمیر، گلگت، ہزارہ یعنی راوی اور دریائے سندھ کے مشرقی علاقوں تک جموں کی ریاست کی حدود مقرر کی گئیں جس کی وجہ سے جموں کی ریاست کی حدود پھیل چکی تھیں۔

☆☆☆☆

دوسرا باب

لدّ اخ، بلتستان اور گلگت کا تاریخی پس منظر

ریاست جموں کشمیر کے رقبہ کے لحاظ سے سب سے بڑا خطہ اور آبادی کے لحاظ سے تیسرا بڑا خطہ لدّ اخ، بلتستان اور گلگت پر مشتمل ہے۔لدّ اخ کا علاقہ 1834 ء سے ہی جموں کی ریاست کا حصہ بن چکا تھا لیکن تبّت اور جموں کی ریاست کے درمیان اس علاقے کا تنازعہ چل رہا تھا۔اسی خطے کی وجہ سے دونوں ملکوں کی فوجوں کے درمیان آئے روز جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔آخر 1842 ء میں تبّت اور جموں کی حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے چوشل (Chushal) معاہدہ کہا جاتا ہے۔اس معاہدے کی رو سے لدّ اخ اور بلتستان کے علاقوں کو جموں کی ریاست کا حصہ تسلیم کر لیا گیا اور سرحدوں کا بھی تعین ہو گیا۔لدّ اخ اور بلتستان کے علاقوں کا تاریخی تعلق تبّت سے ہی رہا ہے اور تبّت کا مرکز لہاسہ قدیم زمانے سے رہا ہے۔تبّت کا مکمل تاریخی پس منظر یہاں بیان کرنا مقصود نہیں ہے البتہ اتنا معلوم ہے کہ اس خطے کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔کچھ ماہرین ارضیات کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک زمانے میں یہ خطہ،سمندر کے پانی کے نیچے دبا ہوا تھا۔پانی نیچے اترا تو یہاں برفیلے پہاڑ نمودار ہوئے جن پر برف جمی رہتی تھی۔غالباً یہ زمانہ انسان کی آبادی شروع ہونے سے پہلے کا ہے جسے شدید سردی کا زمانہ (Ice Period) بھی کہا جاتا ہے۔اس کے بعد موسمی تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں تو برف پہاڑوں سے پگھلنے لگی۔اس علاقے میں ندی نالے بہنے لگے اور جنگلات، گھاس اور

جھاڑیاں اُگ آئیں۔اب یہاں زندگی کا آغاز ہوا۔ پہلے جانور، چرند، پرندنمودار ہوئے۔ آب وہواموافق ہونے کی وجہ سے یہاں انسانی زندگی کا آغاز ہوا۔(جیالوجی)علم ارضیات کےانکشافات سےمعلوم ہوتا ہے کہ یہاں انسان کی ابتدائی زندگی نیم وحشی دور سےموجودتھی۔ اس دور کے انسان چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں رہتے تھے۔ بہت سی دیومالائی کہانیوں سے بچتے ہوئے ہم اس خطے کی معلوم انسانی آبادی کی تاریخ سے ہی بات شروع کریں گے چونکہ معلوم نہیں کہ اس خطے کے لوگ کب تک اور کس زمانے تک چھوٹے چھوٹے گروہوں اور قبیلوں کی صورت میں زندگی گزارتے رہے ہیں۔ البتہ اس خطے میں باقاعدہ حکومت کے آثار 500 یا600 قبل مسیح یعنی2500 یا2600 سال پہلے سے ملتے ہیں۔

اس خطے میں ابتدائی حکومت قائم کرنے والاحکمران نیاٹھی چن تھا۔اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آدمی بیابانوں سے پھرتا ہواالہاسہ کے پہاڑوں پر پہنچ گیا۔ان پہاڑوں کے نیچے اسے آبادی بہت خوشنما معلوم ہوئی تو وہ نیچے آبادی میں آ گیا۔لوگوں کے پوچھنے پر کہ وہ کون ہےاور کدھر سے آیا ہےتو اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا تو لوگوں نے سوچا کہ اس کو آسمان سے کسی دیوتا نے بھیجا ہے۔انہوں نے سوچا کہ ہمارے ملک کا کوئی بادشاہ ہوگا اوراسے کندھوں پر بٹھا کر اپنے لوگوں کے درمیان لائے۔کندھوں پر بٹھا کرلانے کی وجہ سے اس کا نام نیاٹھی چن پو یعنی کندھوں والا بادشاہ مشہور ہوگیا۔اِسی نے سب سے پہلے حکومت قائم کی اوراپنے لیے ایک محل تعمیر کرایا جس میں وہ رہنے لگا۔ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کے کسی علاقے کے راجہ کے گھر پیدا ہوا تھا۔اس راجہ کا نام پراسنا جیت اوراسکی ریاست کا نام کوسالہ تھا۔ یہ لڑکا وہاں سے فرار ہوکر ہمالیہ کے اس علاقے میں آ گیا جسے تبّت کہا جاتا ہے۔ یہاں کی بارہ اقوام یا قبائل کے سرداروں نے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ یہ تبّت میں پہلی خاندانی حکمرانی قائم ہوئی تھی۔آگے چل کے اس نیاٹھی چن پو کے خاندان کے سات مزید راجگان گزرے ہیں لیکن ان کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ملتی ہیں۔اس خاندان کے بعد کئی خاندانوں نے اس خطے پر حکمرانی کی اوراپنی سلطنت کو بہت وسعت دی۔اس خاندان کے بعد لونیولونگ نم نے حکومت شروع کی۔ یہ پہلے بادشاہ کا وزیر

تھا۔ دونوں کا آپس میں جھگڑا ہوا تو اس نے بادشاہ کو قتل کر کے خود اقتدار پر قبضہ کیا۔ پہلے بادشاہ کا نام گیایوٹی گوم تھا۔ اس کے ایک لڑکے نے اس بادشاہ سے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور بادشاہ لو نیولونگ نم کو قتل کر کے خود باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس کا نام چاٹھی یا پوتی کونگیال تھا۔ اسی راجہ کے دور حکومت میں مذہب پون رائج ہوا۔ یہ اس علاقے کا ابتدائی مذہب تھا۔ اسی زمانے میں اس خطے میں نہریں تعمیر کرائی گئیں اور زراعت شروع کی گئی۔ معدنی مادوں کو تپا کر آگ کی مدد سے چاندی، تانبا اور لوہے کی دھاتیں تیار کرنا شروع کیں اور دریاؤں کے اوپر پل بنانے کا رواج شروع ہوا۔

اسی زمانے میں یہاں تمدنی زندگی کا دور شروع ہوا۔ اس خاندان کے چھ راجگان گزرے ہیں۔ جس میں آخری راجہ کا دور 5 قبل مسیح کا ہے لیکن ان راجگان کے حالات کا کوئی ریکارڈ تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس کے بعد 8 مزید بادشاہوں کا ذکر ملتا ہے جن کا 195ء تک آخری فرمانروا موجود تھا۔ اس کے بعد توری لونگ چن کے خاندان کا آغاز ہوتا ہے جو 220ء سے شروع ہو کر 295ء تک کا ہے۔ اس کے بارے تھوتھوری نین چن گیاپو کے دور میں لہاسہ میں بودھ مذہب کا آغاز ہوا۔ مہاتما بودھ کی تاریخ پیدائش 557 قبل مسیح یا 2557 سال پہلے بتائی جاتی ہے اور وفات کا زمانہ 477 قبل مسیح یا 2477 سال پہلے لکھا گیا ہے۔ بودھ مذہب ان علاقوں میں اشوک کے بھی بعد آیا ہے۔ اس کے بعد نم ری شونگ چن ایک بادشاہ گزرا ہے جس کا زمانہ 629ء کے آس پاس کا ہے۔ اس گیاپو بادشاہ نے چین سے علمِ طب اور علمِ حساب، سائنس اور میتھ (Science &Math) لایا اور ان علوم کو لہاسہ میں رائج کیا۔ اس گیاپو بادشاہ نے لہاسہ میں ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا۔ اسی بادشاہ نے لہاسہ میں نمک کے استعمال کا رواج شروع کیا اور جھیل ڈک سوم الدنگ کے پانی سے نمک برآمد کیا۔ اس سے پہلے لہاسہ میں نمک استعمال کرنے کا رواج نہ تھا۔ اس گیاپو خاندان کے ایک اور بادشاہ نے اپنے بیٹے کو ہندوستان میں سنسکرت کے حروف سیکھنے کے لیے بھیجا۔ اس نے ٹمزے پنڈت سے سنسکرت زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ہندوستان میں اس وقت دو طرح کے حروف تہجی رائج تھے۔ ایک کا نام تبتی کتابوں میں لانسا لکھا ہے اور دوسرے کا نام ورتو لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

ان حروف تہجی کے نمونے تھا ئیک حروف میں مرتب کیے گئے اور کاروباری کتابیں انہی حروف میں مرتب کی گئیں۔خط وکتابت اسی حروف تہجی میں شروع ہوئی۔ان میں کوئی زیادہ فرق بھی نہ تھا۔اسی بادشاہ سمبوٹا نے ہندوستان، چین، نیپال اور کشمیر سے بڑے بڑے علماء کولہاسہ بلایا اوران کی مدد سے سمبوٹا نے اور دھرما کوشا نے مذہبی اور دیگر علوم وفنون کی اکیس 21 کتابوں کا سنسکرت اور چینی زبان سے لہاسی زبان میں ترجمے کروائے اوراس نے آٹھ ((8 کتابیں خود بھی لکھیں۔

گیالپو بادشاہ نے لہاسی زبان کے حروف تہجی سیکھے اور پھر اس نے قانون مرتب کیا۔اس نے اپنا ایک آدمی نیپال بھیج کر نیپال کے راجہ کی بیٹی سے شادی بھی کی، اس شہزادی کا نام پلنزاتھی چون تھا۔اس نیپالی شہزادی کے ساتھ بہت سامال واسباب اورمورتیاں بھی لہاسہ آئیں۔اس کے بعداس نے چین کی شہزادی سے بھی شادی کی۔اس چینی شہزادی کا نام روشن کونگ جوتھا۔اس شہزادی کے ساتھ بھی چین سے مورتیاں لائی گئیں جنھیں ایک چھت تعمیر کروا کراس میں رکھا۔ان بیرونی تعلقات کی وجہ سے لہاسہ میں بہت سی صنعتوں کا رواج شروع ہوا جیسے چاول سے شراب تیار کرنا، دودھ سے دہی،لسی اور مکھن بنانا، پن چکی چلانا، اچھے کپڑے بننا اور زیورات بنانا وغیرہ۔اس بادشاہ کے زمانے میں لہاسہ میں بودھ مذہب کی اشاعت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔اس کی دونوں رانیاں جو نیپال اور چین سے تھیں نے بودھ مذہب پھیلانے میں اس بادشاہ کی بہت مدد کی اورلوگوں کوزبردستی بودھ مذہب میں شامل کیا۔ یہ بڑا پر عزم بادشاہ تھا۔اس نے 639ء میں ایک شہر لہاالدین آباد کیا جو بعد میں لہاسہ کے نام سے مشہور ہوا۔اس بادشاہ نے اپنی سلطنت کو بہت وسعت دی اور اردگرد کے تمام راجگان کو اپنا مطیع اورفرمانبردار بنایا۔اپنی فتوحات کی وجہ سے یہ گیالپو بادشاہ بہت مشہور تھا۔اس نے شمال کی طرف کیانگ قوموں کے علاقوں پر قبضہ کیا اور مغرب کی طرف اس کی حکومت لدّاخ تک قائم ہوگئی تھی۔جنوب کی طرف نیپال اور ہندوستان تک اس کا اقتدار قائم ہوگیا لیکن معلوم نہیں کہ وہ کہاں تک ہندوستان کے اندر تک گیا تھا۔چونکہ اس کا کہیں کوئی ہندوستانی تاریخ میں ذکر نہیں ملتا۔

اس گیا لپو خاندان کا ایک راجہ 750ء تک تبّت پر حکمرانی کرتا رہا اور اس نے اپنے عہد میں فنون اور علوم کو بہت ترقی دی۔ اس گیا لپو بادشاہ نے چین سے کچھ مذہبی لوگ منگوائے جن کی وجہ سے لہاسہ میں مذہبی گروہ پیدا ہو گیا۔ اس مذہبی گروہ نے آہستہ آہستہ طاقت حاصل کر لی اور یہ مذہبی گروہ اس کی سلطنت کے لیے خطرناک ثابت ہوا جب اس کے عہدِ حکومت میں مذہبی گروہ یا لاماؤں کو اقتدار کے ایوانوں میں اعلیٰ جگہ دی جانے لگی تو اراکین سلطنت کو خطرہ پیدا ہوا کہ حکومت کہیں لاماؤں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے۔ اب شاہی دربار میں سازشوں کا آغاز ہوا۔ بادشاہ کے مخالفوں نے اعلان کرایا کہ اس ملک پر جو مصیبت نازل ہوئی اسکی وجہ یہ نیا دھرم ہے اور پرانے مذہبی عقائد سے دوری ہے۔ اب دربار کے کچھ لوگوں کو بودھ مذہب سے ناپسندیدگی ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن موقع پا کر گیا لپو چن جو بودھ مذہب کی طرف زیادہ مائل ہو گیا تھا کی گردن مروڑ کر مار دیا اور اس کے بھائی کو بادشاہ بنایا گیا۔ اقتدار کے ایوانوں میں مذہب کا داخلہ ہمیشہ خطرناک گروہوں، انتشار اور خانہ جنگوں کو مزید بڑھانے کا باعث رہا ہے۔ اقتدار پر قابض طبقات ایک دوسرے کی گردن کاٹنے کا جواز ہمیشہ مذہب سے تلاش کرتے رہتے ہیں۔

اسی دوران لہاسہ میں وبا پھیل گئی اور مخالفوں نے اس مصیبت کو بھی باہر سے لائی گئی مورتیوں کو قرار دیا۔ جن کے ساتھ بدروحیں اس ملک میں داخل ہو گئی تھیں۔ ان کی مورتیوں کو توڑ پھوڑ کر تباہ کر دیا گیا اور بادشاہ کے چند وزیر بودھ مذہب کو ملک سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے تدبیریں سوچنے لگے۔ مورتیوں کو توڑنے اور کتابوں کو دریا بُرد کرنے کے علاوہ بودھ مذہب کے لاماؤں کو جو ہندوستان سے لائے گئے تھے اور پنڈت تھے، قتل کر دیا گیا۔ کچھ لوگ جان بچا کر ہندوستان کی طرف بھاگ گئے۔ کچھ لاماؤں کو گونپوں سے نکال کر زمینداری پر لگایا گیا۔ جنہوں نے اس کام کو قبول نہ کیا اُنہیں شکار کے کام پر لگا دیا گیا۔ اسی زمانے میں لامہ لالونگ کو جب یہ پتا چلا کہ بادشاہ مذہب دُشمنی پر اُتر آیا ہے تو اس نے بھیس بدل کر بادشاہ کے محل میں داخل ہو کر اُسے قتل کر دیا اور خود بھاگ گیا۔ ترما بادشاہ کے قتل کے بعد اس کے دو لڑکے جب بڑے ہوئے تو ان کے درمیان جانشینی پر تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ ایک نے تبّت کے

مغربی حصے پر اور دوسرے نے مشرقی حصے پر قبضہ کرلیا لیکن اس زمین کی تقسیم کے بعد بھی ان کے درمیان لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ان کی اولادوں نے بھی چھوٹے چھوٹے حصوں پر اپنا اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ کُبلائی خان، چنگیز خان کے ایک بیٹے نے چین پر قبضہ کیا تو اس نے مشرقی تبّت کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ 1248ء سے 1253ء کے دور کا واقعہ ہے جب تبّت کے مشرقی علاقے منگول سلطنت کے قبضہ میں چلے گئے۔ اسی سے پہلے سکیا پا لامہ تبّت کا بادشاہ بن گیا اور اس کے بعد 21 لاموں کی تبّت پر حکمرانی قائم رہی۔ اس کے بعد کئی خاندان برسرِ اقتدار آئے اور کئی سالوں تک اقتدار کے لیے خونریز لڑائیاں ہوئیں۔

اس زمانے میں پھگمو دونمودار ہوا اس نے تبّت پر قبضہ کرلیا۔ کئی سال تک لڑائی لڑنے کے بعد دربارِ چین کی منظوری سے اس نے اپنی حکومت قائم کی جو اس کے بارہ جانشینوں تک جاری رہی۔ اس خاندان نے تبّت کا اقتدار لینے کے بعد ملک کو خوب ترقی دی۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ کے دور میں ملک کے امراء کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ان فسادات کی بنا پر کھوشوٹ خاندان کے ایک منگول راجہ کو تبّت میں مداخلت کرنے کا موقع مل گیا۔ منگول لوگوں کو لاماؤں کے مذہب سے کافی دلچسپی تھی۔ 1576ء میں تبّت کے ایک بڑے لامہ کو اپنے دربار میں بلایا اور اس لامہ کو بعد میں تبّت کا اعلیٰ ترین لامہ (دلائی لامہ) کا خطاب دیا گیا تھا۔ شاہ منگول ٹنگر ٹو نے اس طرح مذہب کو اِستحکام دینے کے بہانے ملکی معاملات میں مداخلت کی تو لامہ پنچن نے حملہ آوروں کو بہت بڑی رقم تاوانِ جنگ ادا کر کے انہیں ملکِ تبّت سے واپس کردیا اور چین کے مانچو بادشاہ سے امداد کی درخواست کی۔ جس پر منگول بہت ناراض ہوئے اور گوشری خان نے تبّت پر حملہ کردیا اور تمام چھوٹے چھوٹے راجاؤں، رئیسوں اور گیالپوں کو معزول کردیا۔ تمام ملک پر قبضہ کر کے 1645ء کو پانچویں دلائی لامہ کو سارے تبّت کا حکمران مقرر کردیا۔ 1653ء میں حکومتِ چین نے بھی دلائی لامہ کے تبّت پر اقتدار کو توثیق کردی۔ دلائی لامہ چین کے دربار میں پنکیگ کے مقام پر حاضر ہوا لیکن 1706ء میں منگول کھوشوٹ نے اور 1717ء میں منگول سونگر نے دلائی لامہ کی جانشینی کے متعلق پھر دست اندازی کی۔ اس بار چین کی افواج نے 1720ء میں تبّت پر اپنا قبضہ کر

لیا۔ چین کا یہ اقدام تبّت کو بیرونی حملہ آوروں خاص کر انگریز اور چین کے درمیان خودمختار ریاست بنانے کا تھا تا کہ یہ انگریز اور چین کے درمیان بفرزون بنی رہے۔

انگریز ہندوستان پر اس وقت تک اپنا اقتدار مضبوط کر چکے تھے اور تبّت کے ساتھ تجارت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ 1873ء میں اور بعدازاں 1884ء میں بھی ہندوستان کی انگریز سرکار نے تبّت کے ساتھ تجارت کھولنے کی کوشش کی۔ بالا آخر 1886ء میں ہندوستان کی انگریز سرکار نے ایک وفد لہاسہ بھیجنے کا انتظام کیا۔ چین نے پہلے راہداری کی اجازت دے دی اور پھر اعتراض کیا جس پر ہندوستان کی انگریز سرکار نے تجارتی معاہدے کا خیال ترک کر دیا۔ اسی دوران تبّت نے سِکم پر حملہ کر دیا۔ انگریز نے ایک بڑی فوج بھیج کر تبّت والوں کو سِکم سے بھگا دیا۔ 1893ء میں ایک بار پھر چین اور انگریز کے درمیان تجارتی معاہدہ ہوا۔ چونکہ یہ معاہدہ ہندوستان کی انگریز سرکار اور چین کی حکومت کے درمیان ہوا تھا اسلئے تبّت کے لاماؤں نے اس معاہدے کو ماننے سے انکار کر دیا اور معاہدہ توڑ دیا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے رُوس کی زارشاہی کے دربار میں ایک بندہ پہنچ گیا اور انہیں ترغیب دی کہ زارِرُوس تبّت کو انگریز سے لاحق خطرات سے بچانے کے لیے حفاظت کے انتظامات کرے۔ یہ آدمی رُوس کا شہری تھا، پیدائشی منگول تھا اور اپنے آپ کو لامہ کہتا تھا۔ اس کا رُوسی نام ورجیو تھا۔ اس نے تبّت کے دلائی لامہ کو راضی کر لیا کہ وہ زارِرُوس کے حکام سے ملے۔ دلائی لامہ جو تبّت کا حکمران بھی تھا رُوس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن وزراء کی کونسل نے اسے رُوس جانے سے روک دیا۔ البتہ اس نے اپنا ایک نمائندہ زارِرُوس کی خدمت میں بھیجا۔ یہ تبّت کی طرف اعلیٰ سرکاری افسر تھا۔ اسے زارِرُوس کے دربار میں کافی کامیابی حاصل ہوئی اور زارِرُوس کے ساتھ ایک معاہدے کی دستاویز لیکر واپس آیا۔ ان دستاویزات میں زارِرُوس کی یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ایک رُوسی شہزادہ کو تبّت کے لہاسہ دربار میں تعینات کیا جائے جو تبّت اور رُوس کی حکومتوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرے لیکن تبّت کی مجلسِ وزرا اور چینی حکام جو لہاسہ میں تعینات تھے نے اس تجویز کی مخالفت کی۔

دلائی لامہ نے ہندوستان کی انگریز سرکار کو اشتعال دلانے کے لیے ایک بار پھر سِکم

میں انگریزی علاقوں میں دخل اندازی کی۔ اسے پورا یقین تھا کہ زار رُوس کی طرف سے اسے مدد ملے گی۔ رُوسی اسلحہ بھی خفیہ طریقے سے تبّت پہنچایا گیا۔ رُوسیوں نے تبّت میں خفیہ مداخلت سے انکار کیا اور ایک معاہدۂ تبّت کی حکومت سے تیاری کے مراحل میں ہونے کا اعتراف ضرور کیا۔ تبّت کی دست اندازی نے واسرائے ہند لارڈ کرزن کو سخت قدم اٹھانے کی دعوت دے دی تھی۔ انگریز سرکار رُوسی حکام کی ان علاقوں میں اثر ورسوخ روکنے کے لیے پہلے ہی کئی طرح کے اقدامات کر رہی تھی۔ یہ زمانہ ہمالیہ کے پہاڑوں میں رُوس کی بادشاہت اور برطانیہ کی بادشاہت کے درمیان زبردست خفیہ کشمکش کا دور تھا جو اس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ان ریاستوں سے تجارت کے بہانے ایک دوسرے کی جاسُوسی کرنے کے لیے اپنے خفیہ مشن بھیجا کرتے تھے۔ ہندوستان کی انگریز سرکار نے ایک حفاظتی فوجی دستہ سِکم کے راستے تبّت کی طرف حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ انگریز سرکار تبّت کی سرکار پر دباؤ ڈال کر سِکم کے علاقوں میں مداخلت نہ کرنے کا معاہدہ کرنا چاہتی تھی۔

انگریز فوج نے سِکم کے شمال میں کھمبا جونگ میں پہنچ کر 11 دسمبر 1903ء تک تبّت کے حکام کا انتظار کیا لیکن کوئی نہ آیا۔ بالآخر انگریز سرکار نے 13 اکتوبر 1903ء کو گیانستی پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کی اور 12 دسمبر 1903ء کو دَرہ جلیب عبور کر کے یہ مسلح وفد تبّت میں داخل ہوا۔ 31 مارچ 1904ء کو آگے پیش قدمی کی گئی۔ دوسری طرف سے راستے میں ہی تبّت والوں نے حملہ کر دیا لیکن انہیں شکست ہوئی۔ انگریز فوج نے پیش قدمی جاری رکھی اور 12 اپریل 1904ء کو گیانستی پر قبضہ کر لیا۔ یہاں زبردست لڑائی ہوئی۔ انگریز فوج 13 اگست کو لہاسہ میں داخل ہو گئی لیکن دلائی لامہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ چین کے حکام نے بہت کوشش کی کہ کوئی فیصلہ ہو جائے لیکن دلائی لامہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ آخر کار 7 ستمبر 1904ء کو صلح نامہ پر دستخط ہوئے اور شرائط طے کی گئیں۔ اس صلح نامے میں تبّت پر 5 لاکھ پونڈ تاوانِ جنگ بھی مسلط کیا گیا۔ اور برطانیہ حکومت نے تبّت سے اپنی مرضی کی ساری شرائط تسلیم کراتے ہوئے رُوس اور برطانیہ دونوں کے نمائندوں میں سے کسی کو بھی لہاسہ میں تعینات نہ کرنے کی شرط بھی منظور کرائی۔ جنوری 1908ء تک برطانیہ کو تاوان

کی آخری قسط دی گئی۔ دلائی لامہ کو چین نے ایک بار پھر تبّت کی حکمرانی کے اختیارات دیئے۔1909ء میں چند لاماؤں نے سرحدزی چن پر گڑبڑ کی تو چینی فوج ان کی سرکوبی کے لیے گئی۔

دلائی لامہ نے چینی فوج کو لاماؤں پر سختی سے روکنے کا حکم جاری کرنے کی کوشش کی تو چینی حکام جو لہاسہ میں تعینات تھے، دلائی لامہ کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا اور چینی فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ دلائی لامہ ہندوستان فرار ہوگیا۔ چینی افواج نے اس کا سرحد تک تعاقب کیا اور بعد میں شاہی حکم نامے سے دلائی لامہ کو معزول کر دیا گیا۔ تبّت کی جغرافیائی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس کے شمال میں کوہستان کوئن لون ہے جو تبّت کو مشرقی ترکستان سے الگ کرتا ہے۔ مشرق کی طرف چین ہے اور جنوب کی طرف ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ ہے جو اس ملک کو برطانوی ہند(British India) اور نیپال، بھوٹان سے جُدا کرتا ہے۔ اس کے مغرب میں لدّاخ کے ساتھ ہی جموں کشمیر کی ریاست ہے۔ انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ کرنے بعد زارِرُوس کے ساتھ سنٹرل ایشیا کے ممالک کا راستہ ہمالیہ کے اسی پہاڑی سلسلہ سے ملتا تھا۔ انگریز زارِرُوس کو کسی بھی طریقے سے سنٹرل ایشیا سے آگے آنے سے روکنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بھی تجارت زیادہ تر چین، ترکستان، منگولیہ، ہندوستان اور جزائرِ ہند کے ساتھ بڑے پیمانے پر اس راستے سے ہوتی تھی۔ دوسری طرف سنٹرل ایشیا کے ساتھ رُوس اور اس سے آگے افغانستان اور ایران تک لوگ اس رُوٹ پر تجارت کرتے تھے۔ انگریز کے لیے ایک طرف تو یہ علاقے تجارت کے لیے بہت اہم راستہ تھے تو دوسری طرف دفاعی اعتبار سے بھی یہ علاقے برطانیہ کے لیے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ تبّت کے پہاڑوں کی بلندی سطحِ سمندر سے سولہ((16 ہزار فٹ ہے یہ دنیا کا بلند ترین علاقہ کہلاتا ہے۔ بڑے بڑے دریاؤں کے نکلنے کی جگہ بھی یہی پہاڑ ہیں۔ شمالی ہندوستان کے اکثر دریا انہی پہاڑوں سے نکل کر آتے ہیں۔ تبّت میں سونا بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ شمال اور مشرقی تبّت میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں سونے کے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ یہاں لوہے سمیت کئی دیگر دھاتیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہ خطہ ہر لحاظ سے اہم خطہ ہے

۔زارِرُوس کے زمانے سے آج تک یہاں بڑی طاقتوں کی آپس میں کشمکش کا مقصد بھی دنیا کے سب اہم تجارتی اور بلند ترین پہاڑوں پر کنٹرول حاصل کرنا ہے۔اب تک ہم نے تبّت کے ان حصوں کا حال بیان کیا ہے جو تبّت کے مرکز لہاسہ کے کنٹرول میں ہیں۔یہ علاقے تبّت کے پانچ صوبوں پر مشتمل ہیں۔تبّت کے ان صوبوں کے نام امدو، کھمس ، ودا، سانگ اور نارس ہیں۔تبّت کا حاکم دلائی لامہ ہوتا تھا۔اب تبّت کے مغربی حصہ میں لدّاخ اور بلتستان کے علاقے شامل ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پچھلے صفحات میں تبّت کے شاہی خاندانوں کی اندرونی خانہ جنگیوں اور چینی فوجوں کے ساتھ کئی سالوں تک تبّت کی کئی لڑائیوں کا ذکر کیا ہے۔ان جنگوں اور اندرونی لڑائیوں کی وجہ سے تبّت کے یہ علاقے کئی چھوٹی چھوٹی علاقائی بادشاہتوں میں بٹ جاتے تھے۔اپنے علاقوں میں جو زیادہ طاقتور ہوجاتے تھے وہ اپنے سے کمزور حکمرانوں کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیتے اور انہیں بھی ایک مرکز کے انتظام کے تحت لے آتے تھے۔کبھی ایک دوسرے کے خلاف بغاوتیں کر کے اپنی الگ بادشاہتیں قائم کر لیتے تھے۔اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ان علاقوں میں دردستان اور بلورستان کے نام سے بھی علاقائی بادشاہتیں قائم رہی ہیں لیکن ان کی کوئی مستقل سرحدیں نہیں ہوئی تھیں۔یہ ریاستیں بڑھتی اور گھٹتی رہتی تھیں اور حکمران خاندان بھی بدلتے رہتے تھے۔اسی طرح تبّت کا ایک شاہی خاندان نیما گون گزرا ہے ۔اس کے تین بیٹے تھے۔اس کے بڑے بیٹے سپلگی گون نے لدّاخ پر قبضہ کیا اور اپنے خاندان کی بنیاد پر حکمرانی کی ابتداء کی۔یہ خاندان راجگانِ لدّاخ کا بانی تھا۔اس کا زمانہ 975ء سے 990ء تک کا ہے۔اس کی اولاد نے 990ء سے لیکر 1532ء تک لدّاخ پر حکمرانی کی۔ لدّاخ پر حکمرانی کرنے والے اسی خاندان کے ایک شہزادے نے کشمیر کی طرف ہجرت کی تھی۔جس کا نام رینچن شاہ تھا۔رینچن شاہ کے باپ کا نام لہا چھن نوروپ گون تھا۔اس بادشاہ کا عہدِ حکومت لدّاخ میں 1340ء تک قائم رہا۔رینچن شاہ اسی سے ناراض ہوکر کشمیر میں آباد ہو گیا تھا۔

1324ء میں کشمیر کے راجہ کو قتل کر کے خود کشمیر کا راجہ بن گیا تھا۔اپنا بدھ مذہب

بدل کر اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام ملک صدرالدین رکھ لیا تھا۔ رنچن شاہ راجہ سہدیو کے عہدِ حکومت میں کشمیر آیا تھا۔ لھا چھن نوروپ کے عہد میں مرزا حیدر گورگان نے 1532ء میں لدّاخ پر حملہ کیا تھا۔ مرزا حیدر گورگان نے یہ حملہ موسم سرما میں کیا تھا اس لیے ناکام ہوا تھا۔ مرزا حیدر گورگان نے اپنے حملے کی تفصیل تاریخ رشیدی میں بیان کی ہے۔ یہ حملہ ترکستان کے حکمران سلطان سعید خان کے حکم پر کیا گیا تھا۔ یارقند اس وقت ترکستان کا دارالحکومت تھا۔

بہرحال لدّاخ پر لہاچھن تشی گون کے خاندان کے ہی راجہ نے اپنے خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ یہ راجگانِ لدّاخ کی جدید شاخ ہے۔ اس شاخ کی حکومت کا بانی ٹکیا بوم ہے۔ گو کہ یہ راجہ پورے لدّاخ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا تھا لیکن اس کے ایک پڑپوتے لھاچھن سیوانگ گون نے لدّاخ کے دوسرے راجہ اور اس کے بھائیوں کو قتل کر کے سارے لدّاخ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے قتل وغارتگری کرنے کے بعد نمگیل کا لقب اختیار کیا۔ جس کا مطلب فاتح ہے۔ اس کے بعد خاندان کا نام اور اس کی شاخ کے ساتھ نمگیل ہی مشہور ہو گیا ۔لہاچھن سیوانگ نمگیل نے لدّاخ پر 1532ء سے 1555ء تک حکومت کی۔ اس راجہ سے قبل لدّاخ پر دو حکومتوں کا راج قائم تھا۔ اسی راجہ نے سارے لدّاخ کو ایک حکومت کے ماتحت لایا تھا۔ یہ بڑا مدبر اور عالی حوصلہ راجہ گزرا ہے۔ اسی راجہ نے لہہ میں ایک چھُوبی نامی گاؤں بھی آباد کیا تھا۔ جو اس کے شاہی محل کے نیچے تھا۔ لدّاخ کا یہ راجہ بڑا بہادر بھی تھا۔ اس نے اپنی جوانی میں ہی مشرقی علاقوں پر قبضہ کر کے اپنے ملک کی سرحدوں کو لہاسہ تک پہنچا دیا تھا۔ جنوبی علاقے بھی اس نے اپنے ملک کے قبضہ میں کر کے زوم الدنگ اور نیونگٹی تک اپنی ملکی حدود کو پھیلا دیا تھا اور مغربی علاقوں کو فتح کر کے بلتستان تک اس کے قبضہ میں آ گیا۔ اس نے شمال کی طرف یارقند پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ سلطان سعید خان کے لدّاخ پر حملے کا بدلہ لے سکے لیکن کچھ لوگوں کے منع کرنے پر ارادے سے باز رہا۔ اپنے علاقوں کے جن راجگان پر اس نے فتح حاصل کی ان کی حکومتوں کو بحال رکھا، انہیں صرف اپنا مطیع بنایا اور ان کے درباروں میں اپنے وکیل تعینات کیے۔ ان پر اقتدار قائم رکھنے کے لیے ان کے معززین کو اپنے دربار میں یرغمال رکھا۔ اس راجہ نے ذرائع آمدورفت کو ترقی دی۔

بلتستان سے ایک سڑک ہنولا تک اور زنسکار سے ہنو پٹہ تک تعمیر کرائی۔ ندی نالوں پر پُل بنوائے۔

اس راجہ کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بھائی جمیا نگ نمگیل لدّ اخ کے اقتدار پر تخت نشین ہوا۔ جمیا نگ نمگیل نے 1555ء میں اقتدار سنبھالا لیکن اسے اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع نہ ملا کیونکہ اس کے علاقوں پر سکردو کے راجہ علی شیر خان اچن نے حملے شروع کردیئے اور کچھ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ان علاقوں میں کرتخشہ اور پرکوتہ بھی شامل تھے۔کرتخشہ جو کھرپوں کا صدر مقام تھا،علی شیر خان نے بے شمار لدّ اخیوں کو قتل کردیا جو مقابلہ کرنے آئے۔ علی شیر خان نے مردل گنوخ تک بھاگنے والوں کا پیچھا کیا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ سوت اور چگنن کے راجہ آپس میں لڑ رہے تھے جو دو بھائی تھے۔علی شیر خان نے سوت کے راجہ ارگیال کے ملک پر حملہ کردیا اور بودھ کھربو کا علاقہ اس نے اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔علی شیر خان لدّ اخ کے کئی دیہاتوں کو اجاڑنے اور برباد کرنے کے بعد چلا گیا۔جمیا نگ نمگیل علی شیر خان کے حملے سے بہت غضب ناک ہوا اور اس سے انتقام لینے کی تدبیر سوچنے لگا۔آخر کار جمیا نگ نمگیل نے حملہ کر کے علی شیر خان کے قبضہ سے اپنے علاقے واپس لیے۔اس زمانے میں علی شیر خان نے راجہ شغر اور کھپلو کے ساتھ اتحاد کر کے ایک بڑا لشکر لدّ اخ پر دوسرے حملے کے لیے تیار کرلیا۔ بودھ کھربو کے کچھ لوگ فرار ہو کر علی شیر خان کے پاس پہنچے اور جمیا نگ نمگیل کی تباہی کی کہانی اسے سنائی۔علی شیر خان نے بڑا زوردار حملہ لدّ اخ پر کیا اور سیدھا اس کے دارالحکومت پر چڑھ گیا۔ یہاں اس کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔جمیا نگ نمگیل کے افسروں نے مقابلہ کیا لیکن وہ بلتیوں کے اس طوفانی حملے کے آگے نہ ٹھہر پائے اور علی شیر خان لدّ اخ پر قابض ہوگیا۔جمیا نگ نمگیل سوت میں اپنی فوجی مہم چھوڑ کہ واپس لدّ اخ آیا لیکن اس وقت علی شیر خان لدّ اخ پر قبضہ کر چکا تھا اور اس نے جمیا نگ نمگیل کو بھی قید کرلیا۔جمیا نگ نمگیل نے جب دیکھا کہ لدّ اخ میں اس کا ساتھ دینے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوا تو اس نے علی شیر خان سے صلح کرنے کی درخواست کردی۔علی شیر خان خود بھی لدّ اخ پر قابض رہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اسلئے اس نے جمیا نگ نمگیل سے مصالحت کرنے میں رضامندی ظاہر کی اور سکردو اور لدّ اخ کے درمیان نئی

حدود مقرر کر کے صلح کر دی ۔علی شیر نے لدّاخ کے کچھ علاقے سکردو میں شامل کر دئے۔ جمیا نگ نمگیل نے اپنی بیٹی کی شادی علی شیر خان سے کر دی لیکن علی شیر خان نے اسے رہا نہ کیا بلکہ اسے اپنی لدّاخی بیوی کے ساتھ سکردو لے آیا اور لدّاخ میں ایک عارضی حکومت کا انتظام کر کے اس سے سالانہ خراج کی رقم لے کر واپس سکردو لوٹ آیا۔علی شیر خان فاتح لدّاخ بن کر ہی نہیں لوٹا تھا بلکہ لدّاخ سے دولت، مال و اسباب سے مالا مال ہو کر اپنی لدّاخی رانی اور سُسر جمیا نگ نمگیل کو بھی ساتھ لایا تھا۔

سکردو پہنچنے کے بعد راجہ سالنگ کھریبکو شیر غازی نے بڑی حِکمت عملی کے ساتھ جمیا نگ نمگیل کو لدّاخ کی راجگی پر دوبارہ بحال کرا کر واپس لدّاخ بھیج دیا۔جمیا نگ نمگیل کی واپسی پر رعایا نے گرم جوشی سے اس کا ستقبال کیا اور اس نے لدّاخ پر اپنی حکمرانی پھر سے شروع کر دی۔اب اس کی حکومت کی حدود بہت ہی گھٹ گئی تھیں پھر بھی اس نے اسی پر قناعت کی۔راجہ جمیا نگ نمگیل کی حکومت اس کی موت 1610ء تک قائم رہی۔ 1610ء میں لدّاخ کے تخت پر اس کا بیٹا سنگے نمگیل بیٹھا جس کا عہد حکومت 1645ء تک رہا۔اس نے بھی ارد گرد کے علاقوں پر حملے کیے اور خانہ بدوش قبیلوں سے ان کے جانور لے کر اپنے ملک میں جانوروں کی بہتات کر دی۔اس نے سوت پر بھی حملہ کیا لیکن ناکام ہوا۔اس زمانے میں راجہِ سوت محمد سلطان تھا۔

سنگے نمگیل نے کئی علاقے واپس فتح کر لیے۔اس نے حدودِ لہاسہ پر حملے کیے لیکن بعد میں صلح کر کے لدّاخ اور لہاسہ کے درمیان دریائے ناؤ سرحد قرار پائی۔اس لڑائی اور پھر صلح کے بعد سنگے نمگیل لدّاخ واپس آیا اور 1645ء میں فوت ہو گیا۔اس کے بعد اس کا بیٹا دے الدن نمگیل 1645ء میں تخت نشین ہوا لیکن اس کے دو بھائی بھی کچھ علاقے پر اپنا اپنا راج قائم کر کے بیٹھ گئے لیکن اس نے ان کی بھی سرپرستی کی۔اس راجہ کی خواہش تھی کہ وہ لدّاخی فوج کی عزت دوبارہ بحال کرے، پوریگ کے سلطانوں کو اپنے زیرِ تسلط لائے اور بلتیوں سے بھی ان حملوں کا بدلہ لے لیکن اس کو زندگی کے آخری ایام میں یہ سب کچھ کرنے کا موقع ملا۔ آخر کار اس نے لدّاخ کی سلطنت کے اقتدار اور طاقت کو اسی درجہ تک پہنچایا جہاں یہ ملک

اپنے بہترین حکمرانوں کے دور میں ہوا کرتا تھا۔ یہ راجہ فوجی قابلیت کے ساتھ ملکی انتظام سمیت رعایا کی فلاح و بہبود کی قابلیت بھی رکھتا تھا اور رعایا کی فلاح و بہبود پر توجہ بھی دیتا تھا اسلئے ہر کوئی اس کا مداح تھا۔ اسی دے الدن نمگیل کے عہد حکومت میں حاتم خان سرلنگ کھرزیریں کھپلو میں اور راجہ سکردو کے دو بیٹے بابر اور یعقوب تھور کھر بالائی کھپلو میں حکمرانی کرتے تھے۔ حاتم خان تمام علاقے کھپلو سرلنگ کو اپنی حکومت کے ماتحت لانا چاہتا تھا۔ اس نے سازش کر کے راجہ لدّاخ سے تھور سے کھر پر حملہ کرا دیا۔ بابر اور یعقوب اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور دونوں راجہ لدّاخ کے قیدی بن کر لدّاخ لائے گئے۔ حاتم خان نے تمام کھپلوں کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کے ماتحت کر لیے۔ اس کا انتقام لینے کے لیے راجہ سکردو شاہ مراد نے راجہ قلی اور شغر کے ساتھ اتحاد قائم کر کے بودھ کھربو پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کی خبر پہنچنے پر راجہ لدّاخ دے الدن نمگیل نے مقابلہ کے لیے لدّاخ سے فوج بھیجی اور بدھ کھربو میں ایک خون ریز معرکہ ہوا۔ لدّاخی فوج کا لشکر میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ نوسو کے قریب لدّاخی فوجی گرفتار ہوئے۔ راجہ سکردو شاہ مراد کھربو قلعہ پر قابض ہو گیا۔ راجہ لدّاخ دے الدن نمگیل نے راجہ سکردو کی بہن اور دو بیٹے بابر اور یعقوب اپنی قید میں رکھے ہوئے تھے۔ اب اس نے ان کی رہائی کے بدلے راجہ سکردو سے لدّاخی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ شاہ مراد نے یہ مطالبہ منظور کیا اور اپنی بہن اور بیٹوں کے سکردو پہنچنے پر لدّاخی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ الدن نمگیل 1666ء تک لدّاخ پر راجگی کرنے کے بعد فوت ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا دے لیک نمگیل تخت نشین ہوا۔ اس کے دور حکومت میں تبّت جس کا مرکزی صدر مقام لہاسہ تھا، بدھ مت کے لاماؤں کے دو گروہوں میں فِتنہ و فساد شروع ہو گیا۔ اس خانہ جنگی نے طول پکڑا تو دونوں فریقوں نے یکے بعد دیگرے منگولیا کی حکومت سے فوجی امداد طلب کی۔ منگولیا کی فوج لیکر گوشری خان لہاسہ پر قابض ہو گیا۔

گوشری خان منگولیا کی فوج، جدید خیال کے لاماؤں کی مدد کے لیے لایا تھا اسلئے ان لاماؤں کا زور بڑھ گیا۔ اسی دوران بھوٹان اور تبّت کے درمیان جھگڑا ہوا۔ لدّاخ کے راجہ نے لہاسہ کو مراسلہ بھیجا کہ وہ بھوٹان کے ساتھ فِتنہ و فساد نہ کرے ورنہ لدّاخ بھوٹان کی مدد کے

لیے تبّت کے خلاف ہتھیار اٹھالے گا۔ لہاسہ کی حکومت نے اس کے جواب میں فوراً لدّاخ پر حملہ کر دیا۔ لدّاخی فوج نے آگے بڑھ کر لہاسہ کی تبتی فوج کا راستہ روکنے کے لیے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور لدّاخیوں کو شکست ہوئی۔ تبتی فوج آگے بڑھ کر لاہہ کے قریب پہنچی تو راجۂ لدّاخ اپنے دارالحکومت کو چھوڑ کر بھاگ گیا اور ایک قلعہ میں محصور ہو گیا۔ لہاسی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ دے لیگ نمگیل نے دیکھا کہ تبتی فوج قلعہ کا محاصرہ ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس نے مجبور ہو کر ہندوستان کے مغل گورنرِ کشمیر ابراہیم خان کو مدد کی درخواست کی۔ یہ ہندوستان میں اورنگ زیب کا عہد حکومت ہے۔ اورنگ زیب نے ابراہیم خان کے بیٹے فدائی خان کو افغان فوج کا ایک لشکر دے کر تبّت کی طرف بھجوایا۔ اس فوج کی آمد کا سن کر لہاسہ کی تبّتی فوج نے قلعہ کا محاصرہ اٹھالیا اور فدائی خان کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے چارگیال کے میدان میں جنگ کے لیے تیار ہو کر آئی۔ اس جگہ شدید لڑائی ہوئی۔ لہاسی فوج کو شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنا جنگی ساز و سامان بھی میدان میں ہی چھوڑ گئی۔ کشمیر کی فوج نے دُور تک لہاسی فوج کا تعاقب کیا لیکن زیادہ پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس آ گئی۔ واپسی پر راجہ لدّاخ دے لیگ نمگیل بھی تنگ موگانگ قلعہ سے نکلا اور کشمیر کی فوج کے سپہ سالار فدائی خان کا بڑی عقیدت سے شکریہ ادا کیا۔ بعض کشمیری مورخین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر دے لیگ نمگیل نے مذہبِ اسلام قبول کیا اور اپنا نام عاقب محمود خان رکھا۔ لدّاخ کے تاریخ دانوں نے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ لدّاخی اس واقعہ کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اس نے ہندوستان کی مغلیہ حکومت کے ساتھ جو خط و کتابت کی ہے وہ اسی نام سے کی ہے اور کچھ مورخین انہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس نے لدّاخ پر ہندوستان کی سرکار کی بالادستی قبول کر لی تھی۔ اس کے عوض کشمیر میں اسے نوشہرہ کے مقام پر ایک جاگیر بھی دی گئی تھی۔ جب تک کشمیر دہلی کا صوبہ رہا یہ جاگیر بدستور قائم رہی۔ کچھ مورخین کہتے ہیں کہ فدائی خان اس لدّاخی راجہ کے ایک بیٹے، چند لدّاخی معززین اور مالِ غنیمت سمیت واپس کشمیر چلا گیا۔ یہ واقعہ 1683ء کا بتایا گیا ہے۔

کشمیر کی مغل فوج کے واپس چلے جانے کے بعد لدّاخ کے بیرونی دنیا سے جو

تعلقات قائم ہوئے تھے، تبّت کے دارالحکومت لہاسہ میں ان کا شدید ردعمل ہوا۔لدّاخ کے راجہ کی کشمیر سے مدد کے لیے فوج بلانے کی حرکت کو بیرونی قوتوں کی لدّاخ میں مداخلت سے تعبیر کیا گیا اور ایک اعلیٰ سطح کا وفد لہاسہ کی حکومت نے لدّاخ بھیجا۔ یہ وفد حکومت کے ایک اعلیٰ افسر کی قیادت میں لدّاخ پہنچا اور حکومتِ لدّاخ سے مذاکرات شروع کیے۔حقیقت میں یہ وفد لہاسہ کی طرف سے ایک صلح نامے کی شرائط طے کرنے آیا تھا اور تبّت کی طرف سے آئندہ لدّاخ پر حملہ نہ کرنے کی یقین دہانی کرانے آیا تھا۔لدّاخی حکومت نے لہاسہ سے آئے ہوئے اس اعلیٰ سطحی حکومتی وفد سے شرائط طے کر کے یقین دہانی کرائی کہ وہ آئندہ کشمیر کی طرف سے لدّاخ میں مداخلت نہ کرانے کا عہد کرتے ہیں۔ راجہِ لدّاخ نے یہ شرط قبول کی اور کشمیر کی طرف سے سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھانے کی یقین دہانی بھی کرائی۔اس صلح نامے میں لدّاخ اور لہاسہ نے آپس میں کچھ تجارتی شرائط بھی طے کیں اور ان پر دونوں طرف سے عمل درآمد کی یقین دہانی بھی کرائی گئی۔اب صورتِ حال یہ ہو چکی تھی کہ راجہِ لدّاخ نے بیرونی حکومت کی طرف سے مدد لیکر اپنے آپ کو لہاسہ اور کشمیر کی مغل طاقت کی درمیان پھنسا لیا تھا اور دو طاقتوں کے ماتحت آ گیا تھا۔

بہرحال لدّاخ کے راجہ نے مغل سلطنت کے زوال تک دونوں کا ساتھ نبھایا۔آخر کشمیر میں سے مغلیہ سلطنت کے خاتمے سے ان کے لدّاخ سے تعلقات کا بھی خاتمہ ہو گیا لیکن لہاسہ کے ساتھ اس عہد نامے پر عمل ہوتا رہا۔ بعد میں گلاب سِنگھ کی ڈوگرہ فوج نے لدّاخ پر قبضہ کیا تو تبّت کے ساتھ اسی عہد نامے کی تجدید مہاراجہ گلاب سِنگھ کے نمائندے دیوان ہری چند نے 1842ء میں کی۔لدّاخ کے راجہ دے لیگ نمگیل کے پانچ بیٹے تھے۔اسکی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا نیما نمگیل 1695ء میں اسکی جگہ تخت نشین ہوا۔ یہ راجہ بھی کافی زیادہ رعایا کے معاملات میں دلچسپی لیتا تھا۔اس نے ہر گاؤں میں ایک بندہ حکومت کی طرف سے نگران بنا دیا۔وہ مقدمات کا حل بھی اکابرین اور تجربہ کار لوگوں کے مشورے سے کرتا تھا۔کسی فریق کی طرف داری نہیں کرتا تھا اور انصاف کی بنیاد پر احکام صادر کرتا تھا۔اس کے زمانے میں لدّاخ میں پہلی بار چھاپہ خانہ پہنچا لیکن چھاپہ خانے کا کام صرف مذہبی کاموں تک محدود تھا۔اس کی

وجہ سے کاغذ سازی کے یہاں کارخانے لگائے گئے۔ترقی کے ساتھ اس نے لوگوں کو چوری، ڈاکہ اور جھوٹ سے بھی روکا۔ وہ لوگوں کو ماں باپ کی طرح اچھی باتوں کی تلقین کیا کرتا تھا۔ اس لدّاخی راجہ کے عہد میں دو اطالوی پادری بھی ہندوستان سے ہوتے ہوئے کشمیر کے راستہ سے لدّاخ اور تبّت کے شہر لہاسہ آئے تھے۔ ان میں سے ایک پادری نے اپنے کشمیر اور لدّاخ کے سفرنامہ میں حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ پادری 1715ء کو لدّاخ میں داخل ہوئے اور تبّت کے مرکز لہاسہ بھی گئے۔اس زمانے میں یہاں یورپ کے لوگوں کا پہنچنا اس خطے کی اہمیت مزید بڑھا دیتا تھا۔اس پادری نے یہاں کے لوگوں کا رہن سہن اور طرز تعمیر کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ ان کے لباس کی وضع قطع کا ذکر بھی کرتا ہے اور یہاں کے لوگوں کو بہت ہی فرمانبردار، رحم دل، خوش مزاج اور نیک لوگ کہتا ہے۔ وہ لدّاخ اور لہاسہ کے لوگوں، ان کی زبان اور مذہبی کتابوں کو ایک ہی طرح کی سمجھتا ہے اور مذہبی عبادت گاہوں اور خانقاؤں کو ایک طرز کا تصور کرتا ہے۔ وہ تبّت میں کشمیری سوداگروں کا ذکر بھی کرتا ہے جو وہاں پشمینہ کی تجارت کرتے ہیں۔ وہ تبّت میں بڑے آرام سے سکونت پذیر ہیں اور انہیں مسجدیں بنانے اور مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی ہے۔ یہاں تجارت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

اطالوی پادری یہ بھی لکھتا ہے کہ یہاں شہر صرف ایک ہی لیہہ ہے جہاں لدّاخ کے خودمختار راجہ کی سکونت بھی ہے۔ بظاہر یہ پادری مذہبی تعلیمات کے لیے اور مذہب کی دعوت و تبلیغ کے لیے یہاں آئے تھے لیکن بقول ان کے لدّاخ کے دربار میں ان کا بے تکلف آنا جانا شروع ہوا تو کشمیری سوداگروں نے ان پر الزام لگایا کہ یہ لوگ مذہب کے پردے میں قیمتی موتی، جواہرات اور نادر قسم کا مالِ تجارت اپنے ملک سے یہاں لاکر بیچنا چاہتے ہیں۔ ان پادریوں نے اس سے انکار کیا۔ جونہی یہ خبر راجہ لدّاخ تک پہنچی، اس نے اپنے دربار کے ایک وزیر کو ان پادریوں کے پاس اس خبر کی تصدیق کے لیے بھیجا لیکن اس کی تصدیق نہ ہوئی۔ راجہ لدّاخ نے کشمیری سوداگروں پر اپنے محل میں آنے پر پابندی لگادی جنھوں نے پادریوں کے بارے میں جھوٹی خبر پھیلائی تھی۔اس اطالوی پادری نے کئی دوسرے پادریوں کے بارے میں بھی لکھا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کے برطانوی حکومت سے تعلقات بھی

تھے۔ ان مشنریوں اور پادریوں پر اس وقت تبّت میں داخلے پر پابندی لگادی گئی جب سلطنتِ چین کا تعلق تبّت سے قائم ہوا۔ چین نے تمام غیر ملکیوں کے تبّت میں داخلے پر پابندی عائد کردی۔ بہرحال نیما نمگیل 1750ء تک لدّاخ کا راجہ رہا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا دیس گیونگ نمگیل لدّاخ میں تخت نشین ہوا جو 1770ء تک لدّاخ کے تخت پر بیٹھا رہا۔ اس کی حکومت کے زمانے میں چین کی طرف سے تبّت میں ایک ریذیڈنٹ کی تعیناتی بھی ہوئی تھی۔ اس خاندان کا آخری راجہ شہزادہ تنڈوف نمگیل 1820ء میں لدّاخ کے اقتدار پر تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِحکومت 1834ء تک ہے۔ اس کے راج میں لدّاخ میں بدانتظامی کا دور شروع ہوا۔ یہ راجہ رعایا کی فلاح وبہبود کا خیال نہیں رکھتا تھا۔ یہ نااہل اور نالائق حکمران ثابت ہوا۔ اس کا ولی عہد بھی نالائق اور عیاش تھا۔ ان کی نااہلی اور نالائقی نے لدّاخ میں دوسری اقوام کا راستہ ہموار کردیا۔ اس کے آخری دور میں جموں سے ڈوگرہ فوج لیکر وزیر زورآور سنگھ نے لدّاخ پر حملہ کردیا۔ زورآور سنگھ نے لدّاخ پر پہلا حملہ 1833ء میں شروع کیا۔

لداخ پر ڈوگرہ فوج کا پہلا حملہ: 1833ء

راجہ جموں گلاب سِنگھ نے کشتواڑ پر قبضہ کرنے کے بعد لدّاخ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کیا۔ گلاب سِنگھ نے پہلے جموں کی ریاست کو اندرونی استحکام دیا اور جموں کی ایک مضبوط فوج تیار کی۔ اردگرد کے راجواڑوں کو جموں کے مرکزی انتظام کے تحت لایا اور اگلا ہدف لدّاخ کو بنایا۔ گلاب سِنگھ نے پہلے یہ اطمینان کرلیا کہ ہندوستان پر قابض برطانوی ایسٹ (East) انڈیا کمپنی اور پنجاب میں رنجیت سِنگھ کی خالصہ سرکار کو اِس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس وقت وزیر زورآور سِنگھ ریاسی، وارناس اور کشتواڑ کا حاکم تھا۔ راجہ گلاب سِنگھ کو اس کی بہادری، دلیری اور جانثاری پر پورا بھروسہ تھا۔ اسلئے وزیر زورآور سِنگھ کو لدّاخ پر فوجی مہم کا نگران اور سپہ سالار بنایا۔ بعد میں وزیر زورآور سِنگھ نے ثابت کیا کہ وہ اس مہم کے لیے موزوں ترین جرنیل تھا۔ وزیر زورآور سِنگھ نے چار پانچ ہزار کا ڈوگرہ فوج کا لشکر تیار کیا اور 1833ء میں لدّاخ پر حملہ آور ہوا۔ وہ سیدھا کشتواڑ کے دارالحکومت ڈوڈہ سے ہوتا ہوا لدّاخ کے علاقے سورو میں

بھوٹول کے راستے داخل ہوگیا۔ یہ علاقہ ایک مسلمان راجہ ٹھی سلطان کا ہوا کرتا تھا۔لیکن اسکی موت کے بعدلدّ اخ کی حکومت کے ماتحت آ گیا تھا۔لدّ اخ حکومت کی طرف سے یہاں اپنا حاکم مقرر تھا جس نے ڈوگرہ فوج کے حملے کی اطلاع لدّ اخ کی حکومت کو دی۔

لدّ اخ میں ریاست کی طرف سے کوئی باقاعدہ فوج رکھنے کا رواج نہیں تھا بلکہ ضرورت کے وقت اردگرد کے دیہاتوں سے ہر گھر سے ایک آدمی جنگ کے لیے لیا جاتا۔ یہ لوگ جنگ کے لیے اسلحہ، دیگر جنگی سازوسامان کے علاوہ اپنی خوراک بھی ساتھ لانے کے پابند ہوتے تھے۔ڈوگرہ فوج کی اطلاع ملتے ہی اردگرد کے دیہاتوں سے پانچ ہزار فوج جمع ہوگئی اور کالون جے نمگیل کو اپنا سپہ سالار مقرر کر کے سورو کے لیے ڈوگرہ فوج سے جنگ کے لیے روانہ ہوگئی۔ کالون دورجے نمگیل کا تعلق ستوک کے علاقہ سے تھا۔ یہ دلیر اور ایک بے خوف نوجوان تھا۔اس کی عمر پندرہ 15 سے اٹھارہ 18 سے زیادہ نہ تھی۔ دوسری طرف وزیر زورآور سِنگھ اپنا ڈوگرہ فوج کا لشکر لیکر سورو کی وادی میں آ گیا۔ یہاں جولدّ اخی فوج تعینات تھی اس نے ڈوگرہ فوج کا جوانمردی سے مقابلہ کیا۔سارا دن لڑائی جاری رہی۔آخر لدّ اخی فوج کا کمانڈر اور اس کا بیٹا دونوں مارے گئے۔شام تک ڈوگرہ فوج نے قلعہ فتح کرلیا۔قلعہ میں موجود لدّ اخی فوج کے سارے لوگ مارے گئے۔لدّ اخیوں کے پاس نہ جنگی اسلحہ اچھا تھا نہ تربیت یافتہ فوج تھی۔ڈوگرہ فوج کا مقابلہ کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔اس کے بعد وزیر زورآور سِنگھ نے کرتسے کھر کے قلعہ پر بھی قبضہ کرلیا اور دریائے سورو کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر رعایا سے اطاعت قبول کرانے کے بعد آگے بڑھ کر کھرپور پر قبضہ کرلیا۔اب اگلا مقابلہ لنکر سے میں ہوا جہاں لدّ اخی فوج پہلے ہی مورچے مضبوط کر کے ڈوگرہ فوج کا انتظار کررہی تھی۔ وزیر زورآور سِنگھ دڈوگرہ فوج لیکر لنکر سے پر حملہ کے لیے پہنچا تولدّ اخی فوج راستہ روکے کھڑی تھی۔لدّ اخیوں نے اپنے مورچوں کے اندر ڈوگروں سے سخت مقابلہ کیا اور دوروز تک انہیں آگے نہ بڑھنے دیا۔جب ڈوگرہ فوج مورچہ توڑنے میں ناکام رہی تو اچانک ندھان سِنگھ ایک سپاہی لیکر لدّ اخیوں کے مورچہ کے اندر نہر کے راستے گھس گیا۔اسی دوران ندھان سِنگھ نے لدّ اخی فوج کے سپہ سالار کالون دورجے کو سفید گھوڑے پر سوار نزدیک ہی دیکھ لیا اور سب سے

پہلے ندھان سِنگھ نے کالون دورجے نمگیل کو قتل کر دیا۔

جونہی لدّاخی فوج کی توجہ ندھان سِنگھ کی طرف ہوئی زورآور سِنگھ نے موقع پا کر لدّاخیوں کے مورچہ پر حملہ کر دیا اور فوج لیکر مورچہ کے اندر گھس گیا۔ دست بدست لڑائی میں تمام لدّاخی فوج بے جگری سے لڑتے ہوئے کٹ گئی جو فوج بچی وہ بھاگ گئی اور کچھ جوان گرفتار کر لئے گئے۔ یہ لڑائی لدّاخیوں کے لیے فیصلہ کن معرکہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد لدّاخیوں نے ہمت ہار دی۔ ڈوگرہ فوج مسلسل آگے بڑھتی گئی اور لدّاخی فوج مدافعانہ انداز میں پیچھے ہٹتی گئی۔ اس کے بعد راجہ لدّاخ نے ایک اور فوج تیار کر کے ڈوگروں کے مقابلہ کے لیے روانہ کی لیکن یہ فوج سابقہ فوج تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوئی اور پسپا ہونے پر مجبور ہوگئی۔ وزیر زورآور سِنگھ سلس کوٹ سے ہوتا ہوا منجی اور وہاں سے ہوتا ہوا پل اندو سے گزر کر پشکم پہنچا۔ یہاں لدّاخی فوج لمبہ واپس ہوگئی اور پشکم کا راجہ بھی قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب وزیر زورآور سِنگھ نے قلعہ سوت کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بستی مہتہ رام نے رات گئے سوت کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ صبح ہونے تک سوت کا قلعہ فتح کر کے بہت سے آدمیوں کو قید کر لیا۔ اب وزیر زورآور سِنگھ نے لدّاخ کے راجہ کے پاس اپنا وکیل شرائط طے کرنے بھیجا۔ راجہ لدّاخ کو کہا گیا کہ وہ جموں دربار کی مکمل اطاعت قبول کر لے، نو ہزار روپیہ سالانہ خراج ادا کرے اور پندرہ 15 ہزار روپیہ تاوانِ جنگ ادا کرے۔ راجہ لدّاخ یہ شرائط ماننے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن شہزادی نے اسے منع کر دیا اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی صلاح دی۔ راجہ لدّاخ نے فوج کے سپہ سالار کو ڈوگروں سے لڑنے کا حکم دیا۔ لدّاخیوں نے ڈوگروں کا وفد جو صلح کی شرائط طے کرنے گیا تھا، پکڑ کر اُن کے ہاتھ پاؤں باندھے اور نالہ واکھا میں گرا دیا۔ وزیر زورآور سِنگھ سردی کی شدت دیکھ کر فوج کو واپس لیکر سانگو آ گیا اور موسمِ سرما وہاں قیام کیا۔ کچھ ڈوگرہ فوج پشکم اور کچھ سانگو میں رہی۔ لدّاخیوں نے سرد موسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈوگرہ فوج پر حملہ نہ کیا اور موسم بہار میں لدّاخیوں کے لیے ڈوگروں کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔

زورآور سِنگھ جموں کی فوج لیکر موسم بہار میں سانگو سے پشکم آ گیا۔ لدّاخی فوج یہ خبر سن کر وہاں سے بُودھ کھربو چلی گئی۔ وزیر زورآور سِنگھ سوت پشکم سے ہوتا ہوا لمبہ پہنچ گیا۔

یہاں لمبہ کے کالون سیوا نگ نمگیل نے اور وا کھا کے راجہ اعظم خان نے ڈوگرہ فوج کا مقابلہ کیا لیکن وہ کوئی بڑی رکاوٹ ڈالنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ وزیر ڈوگرہ فوج لیکر بُودھ کھر بو پہنچا تو لدّاخی فوج واپس لہہ کو روانہ ہوگئی۔ بُودھ کھر بو میں لوگ ڈوگرہ فوج کی دہشت کی وجہ سے لدّاخی وزیر کی خدمت میں اطاعت کے لیے حاضر ہوتے رہے۔ وزیر جب پورولا مہ پہنچا تو وہاں بھی لوگ نذرانے لیکر اطاعت کے لیے حاضر ہوئے۔ یہ صورتِ حال تو لدّاخ کے ان علاقوں کی بیان کی گئی ہے جو راجہَ لہہ کے زیر کنٹرول تھے۔ اس علاقے میں راجہ لدّاخ کی ماتحتی میں بھی کافی چھوٹے چھوٹے علاقائی اور کچھ آزاد حکمران بھی تھے۔ دوسرا علاقہ بلتستان کا تھا جس کے اپنے علاقائی حکمران تھے۔ ابھی ڈوگرہ فوج لہہ کے زیر کنٹرول علاقوں میں جنگی مہم چلا رہی تھی جبکہ دوسری طرف بلتستان کے علاقوں میں مندرجہ ذیل راجگان کا الگ الگ راج قائم تھا۔

1- سکردو کا راجہ احمد شاہ مقپون تھا۔

2- پرکوتہ کا راجہ اس وقت غلام شاہ مقپون تھا۔

3- طولتی راجہ احمد خان مقپون۔

4- کرتخشہ جس کا نام کھرمنگ ہے راجہ علی شیر خان مقپون حکمران تھا۔

5- کھپلو کا راجہ اس وقت دولت علی خان بیگو تھا۔

6- کرس پر راجہ خورم خان بیگو راجہ تھا۔

7- شغر پر راجہ حیدر خان کی راجگی تھی۔ یہ راجہ عماچہ خاندان سے تھا۔

8- روندو کا راجہ علی خان مقپون تھا۔

9- اَستور کا راجہ اس وقت جبار خان تھا جو مقپون خاندان سے تھا۔

انہی دنوں راجہ علی شیر خان، راجہ کھرمنگ اور سکردو کے راجہ احمد شاہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا۔ راجہ علی شیر خان احمد شاہ کا داماد اور بھانجا تھا۔ احمد شاہ نے اپنے بیٹے شاہ مُراد کو ایک بڑی فوج دے کر کھرمنگ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ شاہ مُراد نے علی شیر خان کو بُری شکست سے دوچار کیا اور علی شیر خان لدّاخ کی طرف بھاگ گیا۔ شاہ مُراد نے کھرمنگ میں لوٹ مار مچائی اور واپس سکردو پہنچنے کے بعد فوت ہوگیا۔ راجہ علی شیر خان لدّاخ پہنچا

اور راجہ لدّاخ تنڈوف نمگیل سے مدد کی اپیل کی۔ اس دوران وزیر زورآور سنگھ ڈوگرہ فوج لیکر سورو میں پہنچا۔ اس کی خبر سن کر راجہ علی شیر خان، وزیر زورآور سنگھ سے رابطہ کرنے کی تدابیر سوچنے لگا۔ اس نے اپنے ایک وزیر نفتا لوپا، اپنے بھائی غلام حسین اور اخون فضل علی کو وزیر زورآور سنگھ کے پاس بات چیت کے لیے پوریگ روانہ کیا۔ اس طرح راجہ علی شیر خان نے جموں دربار سے اپنے تعلقات اس وقت سے قائم کر لیے تھے۔ اسی دوران راجہ لدّاخ کا مراسلہ وزیر زورآور سنگھ کے پاس آیا کہ وہ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے وزیر زورآور سنگھ کے پاس خود آنا چاہتا ہے۔ وزیر نے یہ شرطِ صلح نامہ قبول کر لی اور کہا کہ اس کی خواہش ہے کہ لدّاخی جموں دربار کی اطاعت قبول کر لیں اور سالانہ خراج دینا منظور کر لیں تو ان کے علاقوں میں کوئی دخل اندازی نہ ہوگی۔

آخر طویل گفت وشنید کے بعد صلح نامہ کی شرائط طے پا گئیں۔ ان شرائط کے مطابق راجہ لدّاخ پچاس ہزار روپیہ ڈوگروں کو تاوانِ جنگ کی رقم ادا کرے گا۔ نو ہزار روپیہ سالانہ جموں دربار کو خراج کی رقم دے گا۔ پچاس ہزار کی رقم سے 37 ہزار روپیہ اسی وقت نقد اور زیورات کی صورت میں ادا کی جائے گی اور باقی رقم دو قسطوں میں ادا کی جائے گی۔ یہ شرائط طے کر کے وزیر زورآور سنگھ لدّاخ کو ٹنڈوف نمگیل راجہ لدّاخ کے حوالے کر کے واپس جموں آ گیا۔ لدّاخ میں کوئی ڈوگرہ فوج تعینات نہ کی گئی۔ صرف منشی دیا رام کو جموں دربار کی طرف سے لدّاخ دربار میں وکیل مقرر کیا گیا۔ وزیر زورآور سنگھ نے زانسکا فتح کر کے وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا تھا اور کچھ فوج اس قلعہ میں تعینات کی۔ اس نے سورو براستہ زانسکا اور پاڈر جموں کا راستہ اختیار کیا۔ جموں کی طرف سے چونکہ لدّاخ میں کوئی فوج تعینات نہیں کی گئی تھی لہذا لدّاخیوں نے وزیر زورآور سنگھ کے واپس جموں جانے کے بعد پھر سرکشی اختیار کی اور خراج دینے سے انکار کر دیا۔ یہ اطلاع وزیر زورآور سنگھ کو ملی تو اس نے زانسکار کے راستے لدّاخ پر پھر دوسرا حملہ کیا۔ اس حملے سے راجہ لدّاخ بہت گھبرایا اور وزیر زورآور سنگھ کے سامنے پیش ہو کر شرمندگی ظاہر کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ اسکی وفاداری میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اس بار وزیر نے ٹنڈوف نمگیل راجہ لدّاخ پر بھروسہ کرنے کے بجائے اسے معزول کر دیا اور تاوانِ جنگ

اور خراج کی باقی رقم بھی راجہ لدّاخ سے وصول کی جو اس نے بڑی مشکل سے محل کا سامان حوالے کر کے ادا کی۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ ٹنڈوف نمگیل کی جگہ راجہ لدّاخ کس کو مقرر کیا جائے کیونکہ اس کا بیٹا محض چندروز کا تھا۔ آخر طے پایا کہ راجہ کے ایک معزول سابقہ وزیر کو جموں کی طرف سے لدّاخ کا راجہ بنایا جائے جو راجہ کا رشتہ دار بھی تھا۔ اس کو راجہ نے معزول کر کے عتاب کا شکار بنایا ہوا تھا۔ اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ خراج مقرر کر کے وزیر زورآور سِنگھ نئے راجہ کے بیٹے اور چند معززین کو یرغمال بنا کر، تین سو سپاہی تعینات کر کے واپس جموں چلا گیا۔ گلاب سِنگھ نے وزیر زورآور سِنگھ کی لدّاخ سے واپسی پر جموں دربار میں بہت عزت افزائی کی۔ وزیر زورآور سِنگھ اگلے پانچ سال تک جموں کی طرف ہی رہا۔ وزیر زورآور سِنگھ نے جس بندے کو راجہ لدّاخ جموں کی طرف سے مقرر کیا تھا وہ کچھ عرصہ کے بعد عیش وعشرت میں پڑ کر اُمورمملکت سے بالکل غافل ہو گیا۔ اُمورِ حکومت اسکے وزیروں کے کنٹرول میں آ گئے اور انتظام میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ اسی دوران لاہور دربار کا صوبہ دار کرنل مان سِنگھ جو کشمیر میں تعینات تھا پوریگ کے لوگوں سے مل کر ڈوگروں کے خلاف لدّاخ میں سازش کرنے لگا۔

کشمیر کے لاہور دربار کے صوبیدار کرنل مان سِنگھ نے اپنے ایک ملازم فتح سِنگھ جوگی کو کچھ آدمیوں کے ساتھ کرگل بھیجا اور بااثر لوگوں کو ڈوگروں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ خالصہ دربار کے ان آدمیوں نے کالون رحیم خان کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور اسے سکھوں کی طرف سے امداد دینے کا وعدہ کیا گیا۔ رحیم خان نے راجہ لدّاخ سمیت اس کے کئی وزیروں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا اور انہیں مشورہ دیا کہ لہاسہ اور سکردو کی طرف سے بھی امداد کا انتظام کیا جائے۔ رحیم خان نے پوریگ، لہاسہ، بلتستان، کشمیر اور لدّاخ سارا ڈوگروں کے خلاف کھڑا کرنے کی مہم شروع کر دی۔ جسکے نتیجہ، پوریگ اور دراس کرگل میں ندھان سِنگھ کو اس کے ڈوگرہ سپاہیوں سمیت کرکت میں قتل کر دیا گیا۔ وزیر زورآور سِنگھ کو جموں میں ان حالات کی اطلاع ملی تو وہ تیسری بار لدّاخ پر حملہ کرنے کے لیے تیاری کرنے لگا۔ اس بار 1839ء میں وزیر زورآور سِنگھ پھر سورو کے راستہ لدّاخ کی طرف ڈوگرہ فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ سورو پہنچ

کروزیر نے زانسکار کے راستہ لدّاخ جانے کا فیصلہ کیا۔ ڈوگرہ فوج کی خبرسن کر ہرکوئی اپنے بچاؤ میں مصروف ہوگیا۔ راجہ لدّاخ محل سے نکل کر اپنے آدمی لیکر بھاگ کھڑا ہوااور کسی دوسرے ملک کی طرف فرار ہونے کی کوشش کی۔ ڈوگرہ فوج کواسکی اطلاع ہوگئی اور فوج نے معمولی لڑائی کے بعد راجہ لدّاخ کوگرفتار کرلیااور لدّاخ پہنچادیا۔

1840ء کووزیرزورآور سنگھ لدّاخ میں داخل ہوااور راجہ لدّاخ کو معزول کر کے اُسے قلعہ میں قید کردیا۔ جو لوگ شورش اور فساد میں ملوث تھے انہیں سزائیں دیں، جرمانے کیے اور جائیدادیں ضبط کیں۔ وزیرزورآور سنگھ نے اس وقت راجہ لدّاخ کو معزول کر کے اس کا باقاعدہ الحاق جموں دربار سے کردیا اور وزیر میاں مگنا کو اس ملک کا حاکم مقرر کردیا۔ پرانے شاہی خاندان کو چند محلات دے کر اقتدار سے بے دخل کردیا۔ اوراب لدّاخ کا انتظام درست کرنے کے بعد زورآور سنگھ نے سکردو اور کرگل کا رُخ کیا۔ کرگل والوں نے خالصہ دربار کے کشمیر میں صوبہ دار سے امداد حاصل کرنے کوشش کی جو اُنہیں نہ ملی۔ لدّاخ کی طرف سے بھی یہ مایوس ہوگئے۔ کالون رحیم خان سکردو کی طرف فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ اب وزیر نے لدّاخیوں کی بھرپور جنگی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنایا اور بلتستان پر قبضہ کرنے کے لیے لدّاخیوں کی ایک بڑی فوج تیار کی۔ اس لدّاخی فوج کی تعداد سات، آٹھ ہزار بتائی گئی ہے۔ زورآور سنگھ لدّاخی فوج اور ڈوگرہ فوج کا مشترکہ لشکر لیکر سکردو کی طرف روانہ ہوا۔ سکردو کا راجہ احمد شاہ کا بیٹا محمد شاہ پہلے ہی باپ کے خلاف وزیرزورآور سنگھ کی مدد مانگ چکا تھا۔ احمد شاہ نے اپنے بیٹے کو قید کر کے اس کو شدید عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وزیر نے راجہ سکردو کو احمد شاہ اور اس بیٹے کو واپس لدّاخ پہنچانے کا حکم دیا تھا جس کا راجہ سکردو نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وزیر نے لدّاخی فوج کو اپنے دوافسروں کی نگرانی میں دے دیا تھا۔ دونوں افسر مسلمان تھے۔ ایک کا نام محی الدین شاہ جو جموں کا تھا۔ دوسرا سکردو کا رہنے والا شاہ جی کے نام سے مشہور تھا۔ وزیر اپنی ڈوگرہ فوج کو لے کر گرکونو سے ہوتا ہوا دریائے سندھ عبور کر کے سوت پسری کھر پہنچا۔ یہاں وزیر نے پوریگ کے باغیوں کو سزائیں دیں اور مناسب سپاہی تعینات کر کے اس کا الحاق کرگل، سورو سے کردیا۔

پوریگ کا نظام درست کر کے وزیر زورآور سنگھ نے اس علاقے سے بھی ایک لشکر تیار کیا اور اس کے ساتھ وزیر پسری کھر سے پہاڑ عبور کر کے چے تھنگ سے سکردو کی طرف روانہ ہوا۔ وزیر کے حملے کی خبر سکردو پہنچی تو راجہ احمد شاہ نے ڈوگرہ فوج کا راستہ روکنے کا پورا انتظام کیا ہوا تھا۔ راجہ سکردو نے دو بھائیوں وزیر غلام حسن اور وزیر غلام حسین کو فوج کے کمانڈر مقرر کر کے بلتستان کی سرحد پر جموں کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا۔ سکردو کے راجہ کی فوج نے مرول سے تین میل اوپر کی طرف ایک بلند میدان میں لشکر گاہ بنا کر ڈیرے ڈال دیئے۔ موخون رمی تھنگ یعنی میدانِ جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر سکردو کی فوج نے کمین گاہیں اور مورچے بنا لیے اور درہ وانکو سے جو راستہ دریا کے درمیان سے اوپر چڑھتا تھا روک دیا۔ اس سے وزیر زورآور سنگھ کی پیشقدمی ناممکن بنا دی۔ جموں کی فوج کو یہاں دو ہفتے ٹھہرنا پڑا کیونکہ دریا عبور کرنا مشکل تھا۔ اس کے لئے پُل تعمیر کر کے دریا کو عبور کیا گیا۔ رات کی تاریکی میں ڈوگرہ فوج کے سپاہی اچانک سکردو کی فوج کے سر پر پہنچ گئے۔ دست بدست لڑائی ہوئی اور تمام ڈوگرہ سپاہیوں کو جو حملہ آور ہوئے تھے سکردو کی فوج نے کاٹ کر رکھ دیا۔ زورآور سنگھ نے مزید ڈوگرہ فوج بھیجی۔ اس لڑائی میں سکردو کی فوج کا ایک کمانڈر وزیر غلام حسن مارا گیا اور بلتی فوج کے حوصلے پست ہو گئے۔ درہ وانکو پر ڈوگرہ فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اب ڈوگرہ فوج کے لیے دریا عبور کرنا آسان ہو گیا۔ سکردو کی فوج تھا موخون کے میدان میں اکٹھی ہو گئی۔ وزیر زورآور سنگھ نے اپنی ساری فوج کے ساتھ بلتی فوج پر موخون کے میدان میں حملہ کر دیا۔ ایک بار پھر بلتی اور ڈوگرہ فوج کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ دست بدست لڑائی میں بلتی فوج ڈوگروں کا مقابلہ نہ کر سکی اور انہیں بھاگنا پڑا۔ وزیر غلام حسین اور روندو کے وزیر سلطان بیگ فرار ہو کر جا رہے تھے کہ راستے میں مرول سے پہلے ہی مارے گئے۔ ڈوگرہ فوج فرار ہونے والی بلتی فوج کا پیچھا کرتے ہوئے مرول اور حمزہ گونڈ پہنچ گئی۔

یہ معرکہ 1841ء میں ہوا اور بلتستان کی فتح کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ حمزہ گونڈ میں بلتی فوج سے ایک اور مقابلہ ہوا جس میں ڈوگروں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد راجہ علی شیر اپنی ریاست کھرمنگ پر بحال ہو گیا۔ اس نے خفیہ مدد دے کر وزیر زورآور سنگھ کی خوشنودی

حاصل کرلی تھی۔راجہ علی شیر کی وجہ سے احمد خان مقپون راجہ طولتی اور پرکوتہ کا ایک وزیر بھی زور آور سنگھ کی اطاعت کے لیے حاضر ہوا۔وزیر زور آور سنگھ جن جن راجگان کے علاقوں سے ڈوگرہ فوج لے کر سکردو کی طرف بڑھتا گیا سب اطاعت گزاری اور فرمان برداری کا اظہار کرتے گئے۔اس طرح وزیر زور آور سنگھ متحدہ لدّاخی اور ڈوگرہ فوج کے ساتھ سکردو میں داخل ہوگیا۔اس وقت کسی نے بھی سکردو کے داخلے کے مزاحمت نہ کی۔راجہ احمد شاہ کھرپوچھے میں قلعہ بند ہوگیا۔وزیر زور آور سنگھ نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا لیکن دس پندرہ دنوں تک محصورینِ قلعہ پر کوئی اثر نہ ہوا تو راجہ علی شیر خان کے ذریعے حکمت عملی سے احمد شاہ سے بات چیت کرائی گئی۔راجہ علی شیر خان اور اور زور آور سنگھ کی فوج کے ایک افسر سید بدین شاہ نے راجہ سکردو احمد شاہ کو یقین دہانی کرائی کہ اگر وہ وزیر زور آور سنگھ کی خدمت میں حاضر ہو جائے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔اس پر اعتبار کر کے احمد شاہ وزیر زور آور سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ڈوگروں کے پاس قید ہوگیا۔سکردو ڈوگرہ فوج نے خون خرابے کے بغیر ہی فتح کرلیا تھا۔راجہ احمد شاہ کو قید کرکے اس کے بیٹے راجہ محمد شاہ کی حکومت قائم کی گئی اور اس کو راجہ سکردو مقرر کیا گیا۔

زور آور سنگھ اب بلتستان کے ان راجگان کی طرف متوجہ ہوا جنہوں نے ابھی اس کی اطاعت قبول نہیں کی تھی جس میں علی خان راجہ روندو اور جبار خان راجہ اَستور بھی شامل تھے۔زور آور سنگھ نے روندو کے راجہ کو اطاعت قبول کرانے کے لیے ایک ڈوگرہ فوج کا دستہ مرزا رسول بیگ اور محمد خان کی قیادت میں روندو بھیجا لیکن اس فوج کے پہنچنے سے پہلے ہی روندو کا راجہ فرار ہوگیا تھا۔قلعہ پر ڈوگرہ فوج کا قبضہ ہوگیا تھا۔بعد میں 15 ہزار روپیہ تاوانِ جنگ لے کر راجہ علی خان کو روندو کی حکومت پر دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ اس طرح وزیر زور آور سنگھ نے پوریگ کے باغیوں کو بدترین سزائیں دیں۔اس کے بعد وزیر زور آور سنگھ نے بدین شاہ کو تھوڑی سی فوج دے کر راجہ اَستور کے خلاف بھیجا۔بدین شاہ نے بیس دن کی لڑائی کے بعد راجہ اَستور جبار خان کو قید کر دیا۔اسی دوران خالصہ دربار کے کشمیر میں حاکم نے اعتراض اٹھایا کہ اَستور کا علاقہ لاہور دربار کے قبضہ اقتدار میں ہے اور ڈوگرہ فوج کو ان علاقوں پر دست اندازی کا حق نہیں ہے۔اس وجہ سے اَستور کے راجہ جبار خان کو سکردو سے واپس بھیج دیا گیا

لیکن کچھ سالوں بعد کشمیر سمیت گلگت اور اَستور بھی سرکارِ جموں کے قبضہ اقتدار میں آ گیا تھا۔

بلتستان پر قبضہ کرنے اور اس کا انتظام درست کر کے زورآور سِنگھ راجہ احمد شاہ اور اس کے وزیروں مشیروں کو جو اس کی قید میں تھے لے کر اپنی ڈوگرہ فوج کے ہمراہ واپس لدّاخ آ گیا۔ اب زورآور سِنگھ نے لہاسہ پر حملہ کرنے اور اسے فتح کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے وہ بلتستان کی فوج بھی تیار کر کے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تمام راجگان کی طرف سے ایک ایک نمائندہ بھی ان کی فوج کے ساتھ گیا تھا۔ یہ مئی 1841ء کا واقعہ ہے کہ زورآور سِنگھ بلتستان، لدّاخ اور ڈوگرہ فوج لے کر لہاسہ کی طرف روانہ ہوا۔ فوج کی تعداد تین چار ہزار کے لگ بھگ تھی، باقی پانچ، چھ ہزار لدّاخ اور بلتستان کے علاقوں سے جمع کی گئی تھی۔ اب اس فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصہ کو میاں رائے سِنگھ کی کمانڈ میں دیا گیا اور دوسرے حصے کی کمانڈ وزیر زورآور سِنگھ نے خود سنبھال لی۔ جوں جوں یہ متحدہ فوجیں آگے بڑھتی گئیں لہاسہ کی فوج جگہ جگہ ان سے مقابلہ کرتی۔ بالآخر متحدہ فوج شکست دے کر آگے نکل گئی۔ آخر کار وزیر زورآور سِنگھ اپنی فوج کے ساتھ جھیل مانسرور سے آگے بڑھا تو قلعہ کرتونگ کو خالی پایا جو شاہرہ لہاسہ پر واقع ہے۔ اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ تفلا کھر کی طرف بڑھا جو پورانگ کا صدر مقام ہے۔ یہاں لہاسی فوج نے جم کر جموں کی فوج کا مقابلہ کیا لیکن شکست ہوئی اور وزیر کی فوج نے قلعہ فتح کر لیا۔ تفلا کھر آب و ہوا کے اعتبار سے اچھا علاقہ تھا اس لیے وزیر زورآور سِنگھ نے اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ اس وقت وزیر تبّت کے بہت سے علاقے اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔ اس میں صوبہ نارس گورسوم کے علاقہ جات ردودق، کوگے، پورانگ اور علاقہ پسینی بھی شامل تھا۔ جگہ جگہ لدّاخی اور ڈوگرہ فوج تعینات کر دی گئی۔ ان فتوحات نے جموں دربار کے اقتدار کو نیپال اور ہندوستان کے صوبہ الٰہ آباد کے ضلع کماؤں تک وسعت دی۔ تغلا کھر سے صوبہ الٰہ آباد کے ضلع کماؤں اور نیپال کی سرحد پندرہ بیس میل کے فاصلے پر تھی۔ چونکہ نیپال اور جموں کی سرحد مل گئی تھی اس لیے نیپال کے مہاراجہ نے ایک وفد 120 سپاہیوں کے ہمراہ وزیر زورآور سِنگھ کے پاس بھیجا اور نیپالی حکومت کی طرف سے ایک دوسرے کا پڑوسی ہونے کے ناطے دونوں ملکوں کے تعلقات کو اتحاد و یگانگت سے چلانے کے لئے خیر سگالی کا

پیغام دیا گیا۔ وزیر نے نیپالی وفد کی چند روز تک خاطر مدارت کی اور واپس بھیج دیا۔

وزیر نے موسمی حالات کی شدت کی وجہ سے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ وزیر دُشمن کے حملے کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ وزیر نے جموں سرکار کی طاقت کو دریائے سندھ اور ستلج کے منبع سے گزار کروادی گھاگرہ کے اوپر کے علاقوں تک پہنچا دیا تھا۔ گویا وزیر نے جموں کی سرحد کو دنیا کے اس مشہور مقام تک پہنچا دیا تھا جہاں سے ہندوستان کے چار مشہور دریا نکلتے ہیں ۔ جن میں دریائے برہم پوترا بھی شامل ہے۔ وزیر زورآور سنگھ کے حملے کی خبر لہاسہ تک پہنچی ہوئی تھی ۔ اس کے حملہ کی مزاحمت کا وہاں انتظام ہو رہا تھا۔ کچھ دنوں بعد اچانک خبر آئی کہ لہاسہ کی فوج وزیر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو چکی ہیں۔ سردی کی شدت بھی کمال کو پہنچی ہوئی تھی ۔ وزیر کی فوج کے پاس رسد کا انتظام موجود نہ تھا۔ اس کے باوجود وزیر زورآور سنگھ لہاسہ کی فوج کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ 10 دسمبر 1841ء میں کرتونگ (Kartung) اور تقلاکھر کے درمیان طویونا می جگہ پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ دونوں طرف سے گولی چلتی رہی اور تین دن تک لڑائی جاری رہی ۔ تیسرے دن وزیر خود سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے میدان جنگ میں کود گیا۔ اچانک وزیر کو گولی لگی، وہ گھوڑے سے گر گیا اور دُشمن نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وزیر نے اس حالت میں بھی تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی اور دُشمن کا بہادری سے مقابلہ زخمی حالت میں بھی جاری رکھا ۔ دُشمن کے ایک سپاہی نے پیچھے سے وزیر زورآور سنگھ کو نیزہ مارا جسے دونگ کہتے ہیں۔ وہ نیزہ وزیر کی پیٹھ میں لگا اور سینے کی طرف سے باہر نکل گیا۔ یہ واقعہ 12 دسمبر 1841ء کا ہے۔ یہ ڈوگرہ فوج اور تبّتی فوج کے درمیان جنگ کا تیسرا دن تھا۔ ڈوگرہ فوج کا یہ بہادر جرنیل مارا جا چکا تھا۔

جموں ریاست کے دربار کی طرف سے فتح کے جھنڈے گاڑھتے ہوئے یہ بہادر ڈوگرہ جرنیل میدان جنگ میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ وزیر کے مارے جانے سے ڈوگرہ فوج کے میدان سے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں ۔ اس جنگ میں ڈوگرہ فوج کی بہت تباہی ہوئی اور تقریباً ساری ڈوگرہ فوج میدانِ جنگ میں ماری گئی ۔ ایک سو سے کم ڈوگرہ سپاہی زندہ بچے، ایک ہزار کو قیدی بنایا گیا۔ ڈیڑھ ہزار لدّاخی اور بلتی فوج لہاسہ کی فوج سے بچ کر لدّاخ پہنچی ۔

اس کے علاوہ ڈوگرہ فوج نے لہاسہ کے جو علاقے فتح کر کے وہاں فوج تعینات کی تھی وہ بھی ماری گئی۔ ڈوگرہ فوج کی اس تباہ کن شکست کی وجہ سے لدّاخ اور بلتستان کے لوگوں میں بھی باغیانہ جذبہ پیدا ہو گیا۔ وزیر کی موت نے ان کے حوصلے بلند کر دیے تھے اور جگہ جگہ لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ یاد رہے کہ اس وقت تبّت کے تین حصے تھے اور تینوں پر ان کی اپنی اپنی علاقائی حکومتیں قائم تھی۔ تبّت کے بڑے مرکزی علاقے کا نام تبّت لہاسہ تھا جس کا دارالحکومت لہاسہ تھا۔ اس کے کنٹرول میں کئی چھوٹے چھوٹے علاقائی حکمران تھے جو لہاسہ کی مرضی سے ہی اپنی علاقائی حکومتوں کا نظام چلاتے تھے۔ دوسرا بڑا علاقہ الدّاخ تھا جس کو تبّت بزرگ بھی کہا جاتا تھا۔ اس کا مرکزی مقام لہہ تھا اور اس علاقے میں بھی چھوٹے چھوٹے علاقائی راجگان تھے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس خطے کا تیسرا بڑا علاقہ بلتستان کا تھا جس کا نام تبّتِ خورد مشہور تھا یا اسے تبّتِ خورد کہا جاتا تھا۔ ڈوگرہ فوج لدّاخ اور بلتستان کو جموں دربار کا حصہ بنا چکی تھی۔ بلتستان میں بھی لدّاخ کی طرح کے چھوٹے چھوٹے علاقائی راجگان اپنے اپنے علاقوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ ان کی ریاستوں کے درمیان کوئی مستقل سرحدیں نہیں ہوتی تھی لیکن پھر بھی انہوں نے علاقوں کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ کبھی کبھار ایک دوسرے کے علاقوں پر بھی حملہ کرتے تھے اور ان کے درمیان جنگیں بھی رہتی تھیں۔ کبھی آپس میں اتحاد کر کے دُشمن سے بھی لڑتے تھے۔

تبت کے دو علاقوں پر جموں دربار کا قبضہ موجود تھا یا ان کے دو علاقوں یعنی لدّاخ اور بلتستان کے راجگان کو وزیر زور آور سِنگھ نے اپنی تیسری فوجی مہم میں اپنا مکمل زیرنگیں یا فرمانبردار بنا لیا تھا۔ تیسری مہم میں وزیر زور آور سِنگھ نے تبّت کے بڑے علاقے لہاسہ پر چڑھائی کر دی تھی۔ جس میں ڈوگرہ فوج کو بڑی تباہ کن شکست ہوئی تھی۔ تبّت لہاسہ اور تبّت لدّاخ دونوں بدھ مذہب کے اکثریتی علاقے تھے جبکہ تبّت بلتستان مسلم اکثریت والا علاقہ تھا۔ اب ڈوگرہ فوج تبّت لہاسہ کی فوج سے ہارنے کے بعد دوسرے دو علاقوں پر اپنا کنٹرول مضبوط کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ لہاسہ کی فوج نے ڈوگروں کو اپنے علاقوں میں شکست دینے کے بعد لدّاخ پر سردیوں کے موسم میں حملہ نہ کیا۔ چونکہ لدّاخ میں بلتستان کے علاقوں

پر ہزاروں سالوں سے اپنی علاقائی حکومتوں کا راج قائم تھا اور لہاسہ والے انہیں اپنا دُشمن نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بھاگنے والی فوج کا لدّاخ تک تعاقب نہیں کیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ڈوگرہ فوج کا کوئی بھی سپاہی جنگ طویو (Tuyu) سے زندہ نہیں بچا۔ لہاسہ کی فوج نے اپنے علاقوں میں تعینات ڈوگرہ فوجیوں کو گھیر کر قتل کر دیا۔ جن علاقوں پر ڈوگروں کا قبضہ ہو گیا تھا وہ انہوں نے واپس لے لیے۔ اب لہاسہ کی فوج کے سپہ سالار نے بہار کا موسم شروع ہوتے ہی یہ منصوبہ بنایا کہ لدّاخ سے بھی اب ڈوگرہ فوج کو نکال کر اس کے راجہ کی پہلے والی آزاد حیثیت کو بحال کیا جائے۔ اگلے سال 1842ء کو وہ تین ہزار لہاسی فوج لے کر لدّاخ پر حملے کے لیے روانہ ہوا۔ اِرد گرد کے مقامی راجگان کی کچھ افواج بھی لہاسی فوج کے ساتھ شامل ہو کر لدّاخ کے راجہ کے محل میں داخل ہو گئیں۔ کچھ عرصے تک یہ فوج لدّاخ میں تعینات ڈوگرہ فوج کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں کرتی رہی۔ آخر ایک دن مشورہ کر کے جموں کی فوج پر حملہ کیا لیکن اس جنگ میں ڈوگرہ کی لدّاخ میں موجود فوج نے اُنہیں شکست دی اور بے شمار لدّاخیوں کو قتل کر دیا۔ لدّاخی اور لہاسی فوج کے ہزاروں لوگ مارے گئے۔ اس جنگ کے بعد لدّاخی اور لہاسی دونوں فوجوں کے حوصلے پست ہو گئے لیکن بلتستان میں کچھ راجگان نے ڈوگرہ فوج پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا۔

کئی راجگان جو جموں کی طرف مقرر کیے گئے تھے، قید کر دیے گئے اور ان کی جگہ جموں دربار کے مخالفوں نے ان کی ریاستوں پر قبضے کر لیے۔ گویا بلتستان میں ڈوگرہ فوج کے خلاف زوردار بغاوت پھیل گئی۔ راجہ حیدر خان اور راجہ شغر نے سکردو پر قبضہ کر لیا۔ تمام قلعے ڈوگرہ فوج سے چھین کر فوجیوں کو قتل یا پابند سلاسل کر لیا گیا۔ مہاراجہ گلاب سِنگھ تک ڈوگرہ فوج کی تباہی کی خبر پہنچی تو اس نے فوراً ہی دوسری کمک لدّاخ بھیجنے کا انتظام شروع کیا۔ دیوان ہری چند کو سپہ سالار اور وزیر رتنوں کو نائب سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ دیوان ہری چند جموں پہنچا اور سامانِ جنگ کا بندوبست کر کے میر پور پہنچ گیا۔ میر پور میں پندرہ روز کے اندر چھ ہزار کا لشکر لے کر وہ اوڑی کے راستے لدّاخ روانہ ہوا۔ دیوان ہری چند اور وزیر رتنوں ڈوگرہ فوج لے کر لدّاخ میں داخل ہوئے۔ راستے میں جہاں بھی کوئی مقابلے کے لئے آیا اسے تہہ تیغ کرتے

ہوئے کرگل پہنچ گئے ۔ راستے میں جہاں جہاں بغاوتیں ہوئیں ان علاقوں میں داخل ہوکر قتل و غارت گری کی ۔ جگہ جگہ باغیوں کے قلعے جلاتے ہوئے دیوان ہری چند ڈوگرہ فوج لے کر لہہ کے قریب پہنچ گیا۔ لہاسہ کی فوج لدّاخ کے شاہی محل سے نکل کر ڈوگرہ فوج پر حملہ کرنے کے بجائے لہاسہ کی اپنی سرحد کی طرف چلی گئی ۔

جموں کی فوج کا دوسرا لشکر دیوان نصرت نشان کی قیادت میں لدّاخ چھاؤنی کے سامنے پہنچ گیا۔ دیوان نصرت نشان نے ایک ڈوگرہ فوج کا دستہ زانسکار کی بغاوت ختم کرنے کے لیے میاں جواہر سِنگھ کی قیادت میں بھیجا۔ اس بار ڈوگرہ فوج اور لہاسہ کی فوج کے درمیان کوئی بڑا معرکہ نہیں ہوا۔ آخر کار ڈوگرہ فوج نے لہاسی فوج کی چھاؤنی کا محاصرہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑا سا دُشمن کے ساتھ مقابلہ ہونے کے بعد چھاؤنی میں ڈوگرہ فوج کا کافی جانی نقصان ہوا لیکن کچھ دنوں کے محاصرے کے بعد لہاسی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ دیوان ہری چند نے لہاسی فوج کی قید سے لوگوں کو چھڑا لیا۔ اسی دوران حکومتِ لہاسہ نے صلح کی درخواست کی ۔ دونوں طرف سے صلح کے لئے نمائندے مقرر کیے گئے اور معاہدے کی شرائط طے کی گئیں ۔ دیوان ہری چند اور وزیر رتنوں جموں حکومت کی طرف سے، پی شی شاٹا اور کالون زور کھانگ لہاسہ حکومت کی طرف نمائندے مقرر ہوئے ۔ اس معاہدے میں لہاسہ کی تبّت حکومت نے لدّاخ کی پرانی حدود کو ہی سرحد تسلیم کرلیا تھا۔ اس طرح لدّاخ اور بلتستان پر حکومتِ جموں کی عملداری اور اقتدار تسلیم کرلیا گیا۔ جموں دربار اور تبّت کی لہاسہ حکومت نے اس معاہدے کو قبول کر کے امن قائم کرلیا۔ تبّت کی حکومت اور جموں کی گلاب سِنگھ حکومت کے درمیان ہونے والے معاہدہ کو معاہدۂ لدّاخ یا چوشال معاہدہ (Chushal Agreement) بھی کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد لدّاخ میں مکمل امن وامان قائم ہوگیا۔ اب بلتستان میں جموں دربار کی بحالی اقتدار کا کام رہ گیا تھا اس کے لئے گلاب سِنگھ نے ایک الگ فوجی مہم شروع کی اور اس بلتی فوجی مہم کی کمانڈ وزیر لکھپت کشتواڑیہ کو دی گئی۔ وزیر لکھپت کشتواڑیہ تین ہزار کا ڈوگرہ لشکر لے کر بلتستان کی طرف روانہ ہوا۔ وزیر لکھپت کشتواڑیہ بلتستان میں داخل ہوتے ہی راستے میں باغیوں کا قلع قمع کرتے ہوئے سکردو پہنچ گیا۔

اس وقت کا راجہ سکردو حیدر خان تھا۔ راجہ سکردو تھوڑے دنوں کے مقابلے کے بعد قلعہ سکردو سے نکل کر بھاگ گیا لیکن بدقسمتی سے بھاگتے ہوئے راجہ کھپلو، راجہ دولت خان نے اس کو پکڑ کر وزیر لکھپت کشتواڑیہ کے حوالے کر دیا۔ وزیر لکھپت اسے قیدی بنا کر جموں لے گیا یہ بعد میں وہیں فوت ہوا۔ وزیر لکھپت نے راجہ کھپلو دولت خان کی کھپلو پر راجگی بحال رکھی۔ اسی طرح کرس میں راجہ خورم خان کو بدستور راجہ کرس بحال رکھا۔ کھرمنگ میں راجہ علی شیر خان، طولتی میں راجہ احمد خان، شغر میں راجہ قلی خان اور روندو میں راجہ علی خان کی حکمرانی بدستور بحال رکھی۔ اَستور میں تھوڑے مقابلے کے بعد راجہ جبار خان نے بھی جموں دربار کی اطاعت قبول کر لی۔ زانسکار میں راجہ چے مور گیالپوے نے جموں دربار کی حامی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔ وزیر لکھپت کشتواڑیہ نے وہاں پہنچ کر اس کو سارے خاندان سمیت گرفتار کر لیا اور قید کر کے جموں لے آیا۔ وزیر نے زانسکار میں مہتہ بستی رام کو حاکمِ زانسکار مقرر کیا اور واپس جموں آ گیا۔ اس طرح پورے بلتستان پر جموں کے ڈوگرہ دربار کا مکمل کنٹرول ہو گیا۔ وزیر لکھپت کشتواڑیہ بلتستان کے تمام مخالف راجگان کو قیدی بنا کر جموں لے آیا جنہوں نے بلتستان میں جموں دربار کے خلاف شورش برپا کی تھی۔ اس طرح 1842ء کے آخر تک لدّاخ اور بلتستان کا سارا علاقہ جموں دربار کے زیرِ اقتدار آ گیا۔ ہر علاقہ میں جموں دربار کی طرف سے علاقائی حاکم اور راجگان مقرر کیے گئے اور ایک مضبوط حکومتی نظام قائم کیا گیا۔ گو کہ پہلے یہاں مالیہ کا کوئی نظام موجود نہ تھا۔ زمیندار، راجاؤں کو ذاتی اخراجات کے لئے حصہ دیتے تھے لیکن ملکی دفاع سب کا مشترکہ کام تصور کیا جاتا تھا۔

اسی لیے جنگ لڑنے کے لیے گھر کا ایک فرد اپنے جنگی اخراجات سمیت شریک ہوتا تھا۔ بودھ مذہب کے ماننے والوں میں یہاں اونچ نیچ کا کوئی تصور نہیں تھا البتہ کام یا پیشوں کے لحاظ سے تفریق موجود تھی۔ یہ اپنے راجہ یا بادشاہ کو گیالپو کہتے تھے۔ کالون ایسے لوگوں کو کہا جاتا تھا جن کے بزرگ کسی صوبہ کے حاکم رہے ہوں یا وزیراعظم کے عہدے پر رہے ہوں۔ اور لونپو اُن لوگوں کو کہا جاتا تھا جن کے بزرگ وزیر رہے ہوں۔ اسی طرح باقی پیشوں سے منسلک لوگوں کی درجہ بندی مختلف ناموں سے ہوتی تھی۔ تبّت میں سارے بھائیوں میں ایک

بیوی رکھنے کا رواج بھی عام تھا ۔ اسی طرح بودھوں کے آپس میں مذہبی فرقے بھی ہیں جوکونپوں کے ناموں سے مشہور ہیں۔ بودھوں کے کئی تہوار بھی ہیں جو سال میں تاریخوں کے حساب سے ہوتے ہیں۔ انکے کئی سالانہ میلے بھی ہوتے ہیں۔ بودھوں کے کئی لامے ہوتے ہیں اوران کے باقاعدہ عہدے ہوتے ہیں۔سب سے بڑالامہ دلائی لامہ ہوتا ہے۔ یہ دلائی لامہ تبّت کا حاکم مطلق بھی ہوا کرتا تھا۔ لاماؤں کو باقاعدہ مذہبی تعلیم اورتربیت دی جاتی تھی۔اسی طرح بلتستان کے علاقوں کے راجگان کے خاندانی پسِ منظراور حالاتِ زندگی بھی تفصیل سے موجود ہیں۔کئی خاندانوں نے کئی کئی صدیاں ان علاقوں میں اپنی حکمرانی قائم رکھی ہے اوران میں کئی مشہورخاندان ہیں۔انہی میں سے سکردوکامقپون خاندان بھی شامل ہے۔اس خاندان نےسکردوسمیت بلتستان کے کئی دوسرےعلاقوں پراپنی خاندانی حکمرانی قائم کی۔اس خاندان نے سکردو میں اپنی خاندانی حکومت کا آغاز 1190ء میں کیا۔اس خاندان کے کئی ناموراجگانِ سکردوگزرے ہیں۔اس خاندان کاایک راجہ علی شیرخان اچن بھی گزرا ہے جو اپنی بہادری اور دلیری کی وجہ سے اچن کے نام سے پکارا جانے لگا۔جس کا مطلب اعظم ہے، جیسے اکبراعظم، اشوک اعظم گزرے ہیں۔اسی طرح سکردو میں علی شیرخان اعظم گزرا ہے۔اس کے باپ کانام غازی میر تھا۔اس کے بیٹےعلی شیرخان اچن نےلدّاخ پر بھی حملے کیےاورکئی علاقوں پرقبضہ کر کے ان کواپنے زیرِ اقتدارلایا۔اس کے تین بیٹے تھے جنہوں نے اس خاندان کااقتدارعروج وکمال تک پہنچادیا۔سکردوکی ڈوگروں کے ہاتھوں فتح ہونےتک اسی خاندان کی حکمرانی رہی ہے۔اسی خاندان سےدوعلی شیرخان ہوئے ہیں۔علی شیرخان اچن کادورِعہد 1595ء سے 1633ء تک ہے جبکہ علی شیرثانی کا دور 1787ء سے 1800ءتک رہا ہے۔کچھ لوگوں نے دونوں کوایک ہی سمجھا ہے۔

مقپون خاندان کے کچھ افراد نے کھرمنگ اوررونڈومیں بھی اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کیں۔ اَستور کا آخری راجہ، جبارخان بھی اِسی مقپون خاندان سے تھا۔ یہ بلتستان کے خطے کا بہت طاقتوراورنامورحکمران خاندان رہا ہے کیونکہ اس خاندان کے کئی ناموراجگان نے اردگرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کر کے اپنی خاندانی حکمرانی قائم کی۔ اسی طرح

بلتستان کے کئی دیگر نامور راجگان اور ان کی خاندانی حکمرانی کے حالات بھی کافی تفصیل سے موجود ہیں۔ ان بادشاہوں کی آپس میں جنگیں بھی ہوتی تھیں اور کئی آپس میں دوست اور اتحادی بھی ہوتے تھے۔ اس زمانے میں حکومتوں کا نظام خاندانی ہوتا تھا۔ اس لیے ان خاندانوں کی نسل درنسل کسی علاقے پر حکمرانی رہتی تھی جب تک طاقتور علاقے کا حکمران اپنی طاقت سے دوسروں کی حکمرانی ختم کر کے ان علاقوں کو اپنی خاندانی حکومت کا حصہ نہیں بنا لیتا تھا۔ان علاقوں کے حکمرانوں کی عروج وزوال کی یہی رِیت ہوتی تھی۔ جب ڈوگروں نے ان علاقوں تک جموں دربار کا اپنا اقتدار قائم کیا تو ان علاقوں کے راجگان آپس میں لڑتے رہتے تھے اور یوں جموں دربار کے زیر اقتدار آ گئے۔

☆☆☆☆

تیسرا باب

تاریخ گلگت (دردستاں)

خطہ ءگلگت کی تاریخ پر لکھنے سے پہلے اس خطے میں بولی جانے والی زبانوں کا ذکر ضروری ہے۔زبان کسی علاقے کی پہچان کا ذریعہ ہوتی ہے۔موجودہ دور میں گلگت بلتستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں بلتی (Balti)، بروکشی (Burushaki)، شینا(Shina)، واخی(Wakhi)،کھوار(Khowar)، دوماکی(Domaki) وغیرہ شامل ہیں۔

1-بلتی (Balti): یہ زبان سینوتبتین(Sino Tibetain) یا تبتی زبان کی برمن شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔یہ بلتستان اور لدّاخ میں بولی جاتی ہے۔

2-بروشسکی (Burushaki): یہ زبان ہنزہ،نگر اور یاسین کی بروشو قوم بولتی ہےاور یہ قدیم زبان ہے۔

3-شینا (Shina): یہ زبان گلگت بلتستان کی دوسری بڑی زبان ہے۔شینا درد لوگوں کی زبان ہے۔ یہ بلتی زبان کے بعد بولی جانے والی دوسری زبان ہے۔شینا بولنے والے گلگت،ہنزہ،نگر، داریل،استور،سکردو اور لدّاخ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

4-واخی(Wakhi): یہ زبان گوجال، اشکومن،اور یاسین کے سرحدی علاقوں میں چترال کی وادی بروغل کے علاوہ چین کے صوبہ سنکیانگ میں بھی بولی جاتی ہے۔اس طرح

یہ علاقے کئی زبانوں اور کئی نسلی گروہوں پر مشتمل ہیں جو صدیوں سے ان علاقوں میں رہتے ہیں۔ یہ اپنی زبانوں اور کلچر کے ساتھ زندہ ہیں۔ گو کہ ان علاقائی زبانوں کی نشوونما نہ ہونے اور ترقی نہ دینے کی وجہ سے یہ زبانیں اب ختم ہونے کے خطرے سے دو چار ہیں۔

گلگت میں انسانی زندگی کے آثار زمانہ قدیم سے ملتے ہیں لیکن یہ دریافت کرنا مشکل ہے کہ یہاں آبادی کا آغاز کب سے ہوا۔ اس علاقے کے قدیم راجگان کا ذکر تو ملتا ہے لیکن اس بارے میں کوئی تحقیقی مواد حاصل کرنا مشکل ہے۔ البتہ اتنا ضرور ملتا ہے کہ قدیم راجگانِ گلگت کے آخری حکمران کا دور 700ء تک ہے۔ جن خاندانوں کے حالاتِ زندگی اور ان کی حکمرانی کے ادوار تاریخ میں لکھے ہوئے ملتے ہیں ان سے آغاز کریں گے۔ اس علاقے میں بھی علاقائی خاندانی حکمران چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمران تھے۔ جس طرح گلگت، ہنزہ، نگر، یاسین، پونیال، چترال، چلاس، داریل (Dareel)، تانگیر اور اَستور میں الگ الگ حکمران اپنے اپنے علاقوں کا نظام چلاتے تھے۔ اس زمانے میں تقریباً ہر جگہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ چونکہ رسل و رسائل کے ذرائع بھی نہیں تھے۔ گلگت کو خطہ دردستان بھی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ یہاں آباد ہونے والے سب سے قدیم قبیلے کے لوگوں کو درد کہا گیا تھا اسی لیے یہ علاقہ اس درد قبیلہ کے نام سے ہی مشہور ہو گیا تھا۔ گویا یہاں قدیم زمانے سے درد قوم آباد ہے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ درد لوگ آریائی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور سندھ کے علاقے سے ہجرت کر کے گلگت میں آباد ہوئے تھے۔ گلگت کے مشرق میں بلتستان، شمال میں ہنزہ، نگر اور کوہستان پامیر کا علاقہ ہے۔ مغرب میں چترال اور اس سے آگے کافرستان (موجودہ نورستان)، داریل اور تانگیر ہیں جبکہ جنوب کی طرف چیلاس کا علاقہ ہے۔ روندو سے نیچے دریائے سندھ کے ساتھ والا علاقہ ہے۔ ان تمام خطوں کے درمیانی علاقہ کو گلگت کہا جاتا ہے۔ یہاں سے چاروں طرف راستہ نکلتا ہے۔ گلگت کو مقامی لوگ گلیت کہتے ہیں۔ گلگت کے ابتدائی خاندانی حکمران کا نام اگورتھم تھا۔ اس راجہ کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کے حسب ونسب کا بھی کوئی علم نہیں ہے۔ اس حکمران کا دور 700ء کا بتایا گیا۔ اسی راجہ کے عہد میں بلتستان کے ایک آدمی نے جس کا نام ابودگا موتھا نے

اپنے بیٹے شیری بگورتھم سے مل کر گلگت پر حملہ کر دیا اور اگورتھم کو قتل کر کے گلگت پر قبضہ کرلیا تھا۔اس حملے کا زمانہ 750ء کے قریب بتایا گیا ہے۔ابودگامو نے 750ء سے 800ء تک گلگت پر حکمرانی کی۔اس کے بعد اس کا بیٹا اس خاندان کا حکمران بنا۔اس خاندان نے کئی نسلوں تک حکومت کی۔اس خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ 1080ء میں ہوا لیکن کئی نسلوں کے بعد اسی خاندان کا ایک اور راجہ تخت نشین ہوا۔جس کا نام شیری بدت تھا۔اس خاندان کا مذہب بودھ مت تھا۔

شیری بدت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ظالم حکمران تھا جو رعایا کو بہت تنگ کرتا تھا۔لوگ اس کے ظلم سے بہت بیزار تھے اور اس سے نجات حاصل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔اس راجہ کے زمانے میں سکردو کے ایک آدمی نے اپنے بیٹوں کی مدد سے گلگت پر حملہ کیا۔یہ تراخانی خاندان کا ایک رئیس آزرتراخان تھا۔آزرتراخان کے بارے میں دوسری روایت یہ بھی ہے کہ وہ ترکستان کے دارالحکومت یارقندر کا رہنے والا تھا۔اس نے اپنے تین بیٹوں شمشیر خان، خسرو خان اور تیسرے بیٹے (نام نامعلوم ہے) کے ساتھ پہلے نگر پر حملہ کیا اور یہاں قبضہ کرنے کے بعد گِلگت پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔گِلگت میں شیری بدت کے ظلم وستم نے بیرونی حملے کے لیے راستہ صاف کر رکھا تھا۔اس کے بیٹوں نے یہاں کی رعایا کو اپنا ہمنوا بنایا اور شیری بدت کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔شیری بدت نے سخت مقابلہ کیا لیکن شمشیر خان کے تیر نے اسے اَبدی نیند سلا دیا۔گلگت پر تراخان کے بیٹے شمشیر خان کا قبضہ ہوگیا۔شمشیر خان کو گلگت کا راجہ بنا کر اس کے بھائی واپس ہنزہ اور نگر کی طرف چلے گئے۔ شمشیر خان نے شیری بدت کی بیٹی نور بخت سے شادی کر لی اور کامیابی سے گلگت پر حکومت کرنے لگا۔شمشیر خان نے 1120ء سے 1160ء تک گلگت پر حکمرانی کی ہے۔یہ کہنا مشکل ہے کہ تراخان اور اس کے بیٹے مذہبِ اسلام کے پیروکار تھے لیکن شمشیر خان کے عہد میں ہی کچھ بزرگان نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور بدھ مذہب سے لوگوں کو مسلمان بنایا۔کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں سب سے پہلے یشکن (Yaskkan)، کرمین (Karmen) اور ڈوم قوموں نے مذہبِ اسلام اختیار کیا۔شین قوم نے بعد میں اسلام قبول کیا۔شمشیر خان کا عہدِ

حکومت کافی عرصہ کا تھا۔اس نے بعد میں پونیال، یاسین اور چترال پر بھی قبضہ کر کے اپنے زیر اقتدار کر دیا تھا۔ اس کے بعد شمشیر خان کا بیٹا ملک خان حکمران بنا۔ اس نے داریل(Dareel) اور اَستور کو فتح کر کے اپنے ملک کا حصہ بنالیا تھا۔اس خطے پر اس کا دورِ حکمرانی 1160ء سے 1205ء تک ہے۔اسی خاندان سے خان راجہ نے 1205ء سے 1245ء تک اور اس کے بیٹے ترا خان نے 1245ء سے 1290ء تک گلگت پر حکمرانی کی ہے۔

اس خاندان کے ایک حکمران ترا خان کے دور میں تاج مغل نامی ایک بند نے بدخشاں سے گلگت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔وہ پونیال، یاسین اور چترال کو بھی فتح کر چکا تھا۔تاج مغل کو مذہب سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اسمٰعیلیہ فرقہ کا پیروکار تھا۔ترا خان نے اس کا مذہبی فرقہ قبول کر کے اپنے علاقے کی حکومت تاج مغل سے واپس لے لی۔تاج مغل نے شاہ رئیس نامی ایک سردار کو چترال میں تعینات کیا تا کہ وہ اس مذہب کی تبلیغ کرے۔تاج مغل نے گلگت کی حکمرانی ترا خان کے حوالے کرنے کے بعد ہنزہ پر قبضہ کر کے وہاں بھی اپنا مذہب رائج کر دیا کیونکہ راجہ ہنزہ نے بھی اپنی حکمرانی بچانے کے لئے تاج مغل کا مذہب اختیار کرلیا تھا۔ تاج مغل ہنزہ فتح کرنے کے بعد نگر پر حملہ کرنے کے بجائے پامیر سے گزر کر سیدھا کاشغر چلا گیا اور وہاں بھی اسی مذہب کی اشاعت کا کام کیا۔ 1335ء میں ترا خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سو ملک اس کا جانشین ہوا۔ اس نے 1390ء تک گلگت ،استور، پونیال اور نگر پر حکمرانی کی۔سوملک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا خسرو خان 1390ء سے 1435ء تک حکمرانی کرتا رہا۔خسرو خان کی حکومت گلگت سے باہر پونیال اور اَستور تک تھی جبکہ چترال اور یاسین پر دوسرے خاندان قابض ہو گئے تھے۔ 1435ء سے 1480ء تک خسرو خان کا بیٹا حیدر خان حکمرانی کرتا رہا۔اس کی حکومت بھی گلگت، پونیال اور اَستور تک محدود رہی۔ یاسین اور چترال پر سنگلی اور نگر میں علی داد حکمرانی کرتے تھے۔ یاسین اور چترال کے حکمران کا نام سنگین خان تھا اور وہ سنگلی کے نام سے مشہور تھا۔ 1480ء میں حیدر خان کا بھتیجا چلیس خان 1515ء تک حکمران رہا۔ 1515ء سے لے کر 1565ء تک اس کا بیٹا نور خان تختِ

گلگت پر بیٹھا رہا۔

نورخان کے بعد اس کا بیٹا مرزا خان تخت نشین ہوا۔ وہ اسمٰعیلہ فرقہ چھوڑ کر شیعہ فرقہ کا پیروکار بن گیا۔ اس نے 1565ء سے 1600ء تک گلگت پر حکمرانی کی۔ آخر کار سنگین خان نے چترال سے گلگت پر حملہ کر دیا۔ مرزا خان بھاگ کر بلتستان چلا گیا۔ وہاں اس نے شیعہ فرقہ اختیار کیا اور علی شیر خان اچن کو سنگلی خان کی سرکوبی کے لئے گلگت کی طرف لایا۔ علی شیر خان نے چترال سے لے کر گلگت تک تمام علاقے روند ڈالے اور اس طرح مرزا خان کی گلگت میں دوبارہ حکمرانی بحال ہوگئی۔ 1635ء تک علی شیر راجہ گلگت ہوا۔ علی شیر کو راجۂ یاسین خوش وقت نے یاسین بلا کر دھوکے سے قتل کر دیا اور اس کے ایک وزیر عبداللہ کو بھی قتل کر دیا۔ عبداللہ کے بیٹے ریشو نے گلگت کی حکمرانی سنبھال لی۔ اس نے 1652ء تک گلگت پر کامیابی سے حکومت کی۔ ریشو کو خوش وقت نے چین سے گلگت کی حکومت نہ کرنے دی بلکہ وہ ہر سال گلگت پر حملہ کر دیتا تھا۔ وہ راجہ گلگت ریشو کو کبھی شکست دینے میں کامیاب نہ ہوا۔ مرزا خان کی ایک بیٹی جو بعد میں راجہ نگر کے بیٹے فردوس خان سے بیاہی گئی تھی اس کا ایک بیٹا حبیب خان تھا۔ حبیب خان کی ماں نے راجہ ریشو کو سازش سے قتل کرا کر حبیب خان کو 1652ء میں راجہ گلگت بنوایا۔ حبیب خان کے تین بیٹے تھے اور ان کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ حبیب خان کی تینوں بیویاں جو کہ راجہ سکردو، راجا نگر اور راجہ یاسین کی بیٹیاں تھیں، تینوں سے ایک ایک بیٹا پیدا ہوا جو آپس میں فساد برپا کر رہے تھے۔ سکردو کا راجہ شاہ مراد اس فساد اور خانہ جنگی کو ختم کرنے کے لیے گلگت پر حملہ آور ہوا اور فساد ختم کر کے واپس سکردو چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک بار پھر فساد برپا ہوا جس میں حبیب خان مارا گیا۔ حبیب خان کے قتل ہونے کے بعد اس کے بیٹے گوری تھم کی ہاتھ حکومت آئی لیکن عملاً حکومت کا کام حبیب خان کی بیوہ جواری چلاتی رہی۔ اس کی وفات کے بعد گوری تھم کی گلگت میں 1700ء تک حکومت قائم رہی۔ 1700ء سے 1790ء تک اس خاندان کے دو یا تین حکمرانوں کے نام معلوم نہیں ہوئے ہیں۔ البتہ 1790ء سے 1814ء تک اسی خاندان کا ایک راجہ گوری تھم ثانی گلگت میں تخت پر بیٹھا اور وہ اپنے ایک ملازم کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ 1814ء سے 1821ء تک اسی

خاندان کا ایک راجہ محمد خان حکومت کرتا رہا۔

1821ء میں یاسین کے راجہ سلیمان شاہ نے گلگت پر دوسرا حملہ کیا۔ چونکہ پہلے حملے میں وہ کامیاب نہیں ہوا تھا اس لیے ایک بڑا لشکر لے کر گلگت پر حملہ کر دیا اور اس بار اُسے فتح نصیب ہوئی۔ گلگت کے بے شمار لوگ قتل ہوئے۔ خود گلگت کا راجہ محمد خان قید ہو کر یاسین آ گیا۔ سلیمان شاہ نے گلگت پر قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ جنگ کے بعد واپس یاسین آ گیا تھا۔ سلیمان شاہ کی گلگت سے واپسی پر محمد خان کا بھائی عباس خان 1822ء میں گلگت کا راجہ بن گیا۔ ابھی عباس خان کو گلگت کا راجہ بنے ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ راجہ یاسین، سلیمان شاہ نے اس کے بھائی راجہ محمد خان کو رہا کرنے کا وعدہ کیا اور دھوکے سے یاسین بلایا۔ اس کو بھی بھائی کے ساتھ قلعہ تھاؤسر میں بند کر دیا اور گلگت پر سلیمان شاہ نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ عباس خان اس خاندان کا آخری راجہ گلگت تھا۔ اس کے بعد اس خاندان کی حکومت کا گلگت سے خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد سلیمان شاہ، راجہ یاسین نے 5 سال تک گلگت پر حکمرانی کی۔ اس زمانے میں پونجی میں راجہ استور، جبار خان کی حکومت تھی۔ سلیمان شاہ نے پونجی پر حملہ کر کے اسے بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد راجہ پونیال نے گلگت پر حملہ کیا اور سلیمان شاہ کو گلگت سے یاسین کی طرف بھگا دیا۔ اس وقت پونیال کا راجہ عزت خان تھا۔ اس نے سلیمان شاہ کو شکست دے کر گلگت پر اپنی حکومت قائم کر دی۔

راجہ پونیال عزت خان نے 5 سال تک گلگت پر حکمرانی کی۔ اس دوران سلیمان شاہ نے ایک بار پھر گلگت پر حملہ کرنے کی کوشش کی جس کی اطلاع عزت خان کو ہو گئی۔ اس نے سلیمان شاہ کو گرفتار کرا کر شیر قلعہ میں قتل کر دیا۔ سلیمان شاہ کے قتل کے بعد 1833ء میں نگر کے راجہ طاہر خان نے گلگت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور عزت خان کو قتل کر دیا۔ طاہر خان نے 1833ء سے 1837ء تک کامیابی سے گلگت پر حکمرانی کی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ سکندر اس کا جانشین ہوا۔ شاہ سکندر نے 1840ء تک صرف تین سال ہی گلگت پر حکومت کی تھی کہ یاسین کے راجہ گوہر امان نے گلگت پر حملہ کر دیا۔ راجہ گوہر امان نے شاہ سکندر راجہ گلگت کو قتل کر دیا۔ حالانکہ شاہ سکندر نے 9 ماہ کے قلعہ کے محاصرے کے بعد راجہ

گوہرامان سے امان مانگی لیکن گوہرامان نے پہلے گرفتار کیا اور بعد میں راجہ گلگت کو قتل کر دیا۔ گوہرامان نے شاہ سکندر کی رانیاں بھی ذلیل کر دیں ۔ ایک کو قتل کر دیا اور دوسری نگروالی کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ شاہ سکندر کے بھائی کریم خان کی بیوی کو پکڑ کر اپنے بھتیجے اکبرامان کے حوالے کر دیا۔ راجہ گوہرامان کو صرف ایک سال تک ہی گلگت پر حکمرانی کرنے کا موقع ملا تھا لیکن اس نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور بہت سے لوگوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ راجہ گوہرامان نے شاہ سکندر کے خاندان کو ذلیل و رسوا کر دیا۔ شاہ سکندر کا بھائی کریم خان اس دوران بھاگ کر اَستور کی طرف چلا گیا۔ اَستور سے کریم خان ،لاہور خالصہ دربار کے صوبیدار شیخ غلام محی الدین کے پاس کشمیر پہنچا اور مدد کی درخواست کی۔ کریم خان کشمیر سے سکھوں کی فوج لیکر راجہ گوہرامان پر حملہ آور ہوا۔ سکھوں کی فوج نے راجہ گوہرامان کو شکست دے کر واپس یاسین کی طرف بھگا دیا۔ سکھوں نے گلگت پر قبضہ کر لیا اور کریم خان کو اپنی سرپرستی میں گلگت کا راجہ مقرر کر دیا۔ اب گلگت لاہور دربار کے صوبہ کشمیر کے ماتحت آ گیا۔ کشمیر سے کرنل نتھے شاہ دو سکھ پلٹنیں لے کر 1842 ء میں گلگت پر حملہ آور ہوا اور گوہرامان کو شکست دے کر کریم خان کو کشمیر صوبہ کے ماتحت راجہ گلگت بنوایا۔ عباس خان کے بعد تراخانی خاندان کا دورِ حکمرانی گلگت سے جونہی ختم ہوا گلگت حملہ آوروں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ پہلے راجہ سلیمان شاہ نے یاسین سے حملہ کیا اور قابض ہوا پھر راجۂ پونیال عزت خان نے حملہ کیا اور حکومت کی۔ اس کے بعد راجۂ نگر طاہر خان نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ طاہر خان کے بعد اس کا بیٹا شاہ سکندر راجہ بنا اور اس کے دور میں راجۂ یاسین گوہرامان نے گلگت پر حملہ کیا اور اس کا قبضہ ختم کرانے کے لیے اس کے بھائی کریم خان نے سکھوں کی مدد سے گوہرامان کو گلگت سے نکال کر اپنی حکومت قائم کی۔

کریم خان کی مدد کے لیے آئی ہوئی خالصہ فوج نے قبضہ کر کے گلگت کا تعلق کشمیری صوبہ لاہور دربار سے جوڑ دیا جبکہ یہ وہ زمانہ ہے جب گلاب سنگھ نے 1842 ء میں دیوان ہری چند اور وزیر رتنوں کی قیادت میں لدّاخ میں بغاوت کچلنے کے لئے ڈوگرہ فوج بھیجی تھی۔ اس وقت تک سکھوں کی کشمیر حکومت نے گلگت اور کشمیر کے درمیان اَستور کا علاقہ اپنے قبضے

میں نہیں لیا تھا بلکہ راجہ جبار خان کو سکھوں نے ہی گلاب سنگھ کی فوج کی قید سے آزاد کروا کراَستور کا دوبارہ راجہ بحال کرایا تھا۔اب گلگت کی طرف کشمیر سے آمدورفت رکھنے کے لیے سکھوں نے اَستور میں ایک چھاؤنی قائم کی جس سے راجہ اَستور کی حیثیت آہستہ آہستہ ختم ہو کر رہ گئی تھی۔اب اس کو تھوڑی سی جاگیر گزارہ کے لیے دی گئی تھی۔اسی طرح خالصہ دربار کی طرف خالصہ فوج کا سپہ سالار نتھے شاہ تو کریم خان کی مدد کے لیے آیا تھا لیکن اُس نے گلگت پر قبضہ کر کے کریم خان کے اختیارات اتنے محدود کر دیے کہ وہ برائے نام ہی راجۂ گلگت رہ گیا تھا۔ نتھے شاہ نے تمام مالی اور انتظامی اُمور کریم خان سے سَلب کر کے اپنے ہاتھ لے لئے تھے۔ اب گلگت کے یہ علاقے کشمیر کے لاہور دربار کے صوبیدار کے ماتحت آجانے سے خالصہ دربار کا حصہ تصور ہوتے تھے۔جب لاہور کا خالصہ دربار 1846ء میں انگریزوں سے جنگ ہار گیا تو ان پر انگریز نے جنگ میں پہل کرنے کی وجہ سے تاوانِ جنگ لاگو کیا۔جب لاہور دربار تاوانِ جنگ ادا نہ کر پایا تو انہوں نے کشمیر اور ہزارہ سمیت وہ تمام علاقے جو 9 مارچ 1846ء کے معاہدۂ لاہور کے تحت انگریز کے حوالے کر دیئے۔چونکہ گلگت کے یہ علاقے اَستور سمیت لاہور دربار کے صوبۂ کشمیر کے ماتحت ہونے کی وجہ سے انگریز کے پاس چلے گئے تھے،اسی معاہدہ لاہور کے تحت یہ علاقے اب ہندوستان کی انگریز حکومت کو منتقل ہو گئے۔پھر 16 مارچ 1846ء کو انگریز اور ریاستِ جموں کے حکمران مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان ایک اور معاہدہ امرتَسر کے مقام پر ہوا اور اس معاہدے کی رُو سے کشمیر سمیت گلگت کے یہ علاقے واپس جموں کی ریاست کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔گلاب سنگھ نے ان علاقوں کو ہندوستان کی انگریز حکومت سے 75 لاکھ نانک شاہی دے کر اپنی جموں کی ریاست کا حصہ بنا دیے۔معاہدہ امرتَسر کے بعد گلگت اور اَستور میں جو خالصہ فوج نتھے شاہ کی سپہ سالاری میں لاہور دربار کی طرف سے تعینات تھی نے جموں کی ڈوگرہ فوج کو ان علاقوں کا کنٹرول دیا تو نتھے شاہ جو گوجرانوالہ پنجاب کا رہنے والا تھا اس نے لاہور دربار کی نوکری چھوڑ کر جمّوں دربار کی نوکری حاصل کر لی اور ان علاقوں میں ڈوگرہ فوج کی طرف سے اپنی فوجی خدمات دینے لگا۔

گلگت کو جموں دربار کے حوالے کرنے کے لیے اس علاقے کی حد بندی کرنے کی

غرض سے انگریز یہاں آئے اور گلگت کی حد بندی کی گئی۔ انگریز حد بندی کر کے واپس گئے تو راجۂ ہنزہ نے گلگت پر حملہ کر دیا اور کئی علاقوں میں لوٹ مار کی۔ راجۂ ہنزہ نے نتھے شاہ کے ساتھ پہلے سے ہی عہد کیا تھا اور اس کی خلاف ورزی کرنے کا جواز یہ پیش کیا کہ عہد شکنی پہلے نتھے شاہ نے کی ہے کیونکہ نتھے شاہ نے انگریزوں کو ہمارا ملک دکھانے کے لیے کیوں لایا ہے۔ نتھے شاہ فوج لے کر راجۂ ہنزہ سے مقابلہ کرنے کے لئے گیا لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ راجہ ہنزہ سے لڑتے ہوئے نتھے شاہ کی فوج تباہ ہوگئی۔ نتھے شاہ جموں کی ڈوگرہ فوج کی قیادت کرتے ہوئے مارا گیا۔ کریم خان راجہ گلگت کے مارے جانے کے بعد اُس کے بیٹے محمد خان کو راجگی گلگت کا خطاب دیا گیا۔ بعد میں راجہ گوہرامان کے گلگت پر حملہ کے وقت راجہ محمد خان کشمیر میں پناہ گزین ہوا اور وہیں فوت ہوا۔

☆☆☆☆

چوتھا باب

ریاست جموں کشمیر وتبّتہا کا تاریخی پس منظر

انگریز سامراج کی ابھرتی ہوئی فوجی طاقت نے شمالی ہندوستان کی اکثر ریاستوں کو فتح کر کے اپنے سامراجی اقتدار کا حصہ بنا لیا تھا یا ان کے مقامی حکمرانوں کو اپنا اتحادی یا طفیلی بنا لیا تھا۔ ہندوستان پر برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا کنٹرول مضبوط کر چکی تھی۔ ہندوستان کی انگریز سرکار نے 1845ء کے آخر سے 1846ء کے اوائل میں شمالی ہندوستان کی سب سے طاقتور اور بڑی سلطنت کو جو پنجاب کے سِکھ حکمرانوں کی تھی، کو فتح کر لیا تھا یا اپنا زیرِ نگین بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ پنجاب کے خالصہ دربار کے زوال نے اور انگریز سامراج کی بڑھتی ہوئی طاقت نے پنجاب کے پڑوس میں ایک چھوٹی سی جموں کی ڈوگرہ ریاست کو بھی خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔ جموں کی یہ ڈوگرہ ریاست پنجاب کے شمال میں اور پنجاب دربار کے صوبہ کشمیر کے جنوب مغرب میں واقع تھی۔ پنجاب کی خالصہ سرکار نے انگریزوں کے ہاتھوں شکست کے بعد کشمیر کا صوبہ تاوانِ جنگ میں ہندوستان کی انگریز سرکار کے حوالے کر دیا تھا۔ جسکی وجہ سے جموں کے چاروں طرف انگریز کا گھیرا تنگ ہو گیا تھا ۔ لاہور دربار نے ایسا جان بوجھ کر کیا تھا۔ تا کہ گلاب سِنگھ کی جموں ریاست بھی انگریز کے قبضہ میں چلی جائے۔ جموں کی ریاست پر راجہ گلاب سِنگھ کے خاندان کی حکمرانی ساڑھے تین ہزار سالوں سے مسلسل چلی آ رہی تھی۔ گلاب سِنگھ سے پہلے اسی خاندان کی دوسری شاخ کے

پاس جموں کی حکمرانی تھی۔جس کے زوال کے بعد جموں کا اقتدار گلاب سِنگھ کے پاس آ گیا۔گلاب سِنگھ 1822ء میں جموں کا راجہ بنا تھا۔اس وقت سارا جموں کا علاقہ چھوٹی چھوٹی بائیس ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔گویا جموں ریاست گلاب سِنگھ سے پہلے ایک سیاسی انتظام کے بجائے بائیس چھوٹی چھوٹی خاندانی حکمرانیوں کے کنٹرول میں آ چکی تھی۔گلاب سِنگھ کے جموں کا راجہ بننے تک جموں میں چھ مسلمان اور سولہ ہندو خاندانوں کی آزاد ریاستوں کے حکمران مختلف علاقوں پر کئی صدیوں سے قابض تھے،کچھ سات یا آٹھ سو سالوں سے کسی علاقے پر اپنی خاندانی حکمرانی کر رہا تھا تو کوئی پچھلے ہزار سال سے کسی ریاست پر قابض تھا۔یہ چھوٹی چھوٹی خاندانی راجواڑہ شاہیاں یا خاندانی بادشاہتیں تھیں۔جن کے درمیان کوئی باقاعدہ سرحدیں تو موجود نہیں تھی البتہ اپنے اپنے علاقوں کی تقسیم موجود تھی۔راجہ گلاب سِنگھ پہلے سے ہی موقع کی تلاش میں تھا کہ وہ اردگرد کی چھوٹی ریاستوں کو بھی اپنی ڈوگرہ ریاست کا حصہ بنا لے ۔ گلاب سِنگھ نے جموں کا راجہ بنتے ہی جموں کی تمام چھوٹی چھوٹی خاندانی بادشاہتوں کو ختم کرنے کی فوجی مہم شروع کر دی تھی۔ گلاب سِنگھ نے اگلے دس سالوں میں جموں کے تمام راجوں کی ریاستوں کو ختم کر دیا تھا۔اور جموں کی ریاست کو متحد کر کے ایک مرکزی انتظام کے ماتحت لے آیا تھا۔جموں کی بائیس ریاستیں ماسوائے چند جاگیروں کے گلاب سِنگھ کی فوجی مہم جوئی کے آگے سرنگوں ہو کر ایک مرکزی سیاسی انتظام قبول کر چکی تھیں۔جموں کی ریاست کو متحد کرنے سے گلاب سِنگھ نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کر لیا تھا۔اب گلاب سِنگھ کی نظریں جموں کی ریاست سے باہر لگی ہوئی تھیں۔اپنی فوجی طاقت مضبوط کرنے سے گلاب سِنگھ کو لدّاخ پر فوجی حملہ کرنے کا خیال پیدا ہوا اور 1833ء سے 1835ء تک ڈوگرہ فوج نے لدّاخ پر مسلسل فوجی حملے کر کے ان علاقوں کو فتح کر لیا تھا۔ اب جموں کی ریاست میں لدّاخ جو تبّت کا ایک علاقہ تھا،بھی شامل ہو چکا تھا۔لدّاخ چونکہ تبّت کا علاقہ ہونے کے باوجود اِس پر اپنے مقامی خاندانوں کی علاقائی حکمرانی تھی۔1842ء کے معاہدہ لدّاخ کے تحت کئی خونریز جنگوں کے بعد تبّت کی لہاسہ حکومت نے جموں ریاست کا حصہ تسلیم کر لیا تھا۔جس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔

ریاست جموں کا حکمران گلاب سِنگھ انگریزوں اور پنجاب کے سِکھ دربار کی جنگوں میں غیر جانب دار رہتے ہوئے اس تاک میں تھا کہ انگریزوں کو کس طرح پنجاب تک روکا جائے۔ انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ معاہدہ لاہور پر ختم ہوئی۔ یہ معاہدہ 9 مارچ 1846ء کو لاہور میں ہوا۔اس جنگ میں انگریزوں کے خلاف پہل لاہور دربار نے کی تھی۔اسلئے لاہور دربار کوشکست دینے کے بعد انگریز نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ عائد کیا۔ چونکہ لاہور دربار نے پہلے ڈیڑھ کروڑ روپیہ دینے کی حامی بھری لیکن پھر نقد رقم کی جگہ لاہور دربار نے پنجاب سے باہر جن علاقوں اور ریاستوں پر قبضہ کر رکھے تھے وہ انگریز سرکار کو دینے کی شرائط طے کر دیں۔ اس طرح لاہور دربار نے 9 مارچ 1846ء کو کشمیر، ہزارہ اور دریائے سندھ کے مشرقی علاقوں کی تمام پہاڑی ریاستوں اور علاقوں کو تاوانِ جنگ کے بدلے انگریزوں کی ہندوستان سرکار کے حوالے کر دیا۔اس طرح کشمیر کی ریاست جو پنجاب دربار کے قبضہ میں اور گلگت کے وہ علاقے جو دریائے سندھ کے مشرق کی طرف تھے ہندوستان کی انگریز سرکار کا حصہ بن گئے۔ انگریز سرکار کو اس وقت پیسے کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے یہ علاقے گلاب سِنگھ کی جموں کی ریاست کو دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ گلاب سِنگھ نے پیسوں کی کمی کی وجہ سے کچھ علاقے چھوڑ کر ریاستِ کشمیر اور گلگت کے وہ علاقے جو دریائے سندھ کے مشرق کی طرف تھے، لے کر ان علاقوں کی آدھی رقم ہندوستان کی انگریز سرکار کو دینے کی حامی بھری۔

معاہدہ امرتَسر کی اہمیت

16 مارچ 1846ء کو ہندوستان کی انگریز سرکار اور جموں ریاست کے حکمران راجہ گلاب سِنگھ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ یہ معاہدہ پنجاب کے شہر امرَتسر میں ہوا۔اس لیے اس معاہدہ کو معاہدہ امرتسر بھی کہا جاتا ہے۔ معاہدہ امرتسر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ معاہدہ لاہور کو سمجھ لیا جائے۔اس معاہدہ امرَتسر کے نتیجے میں ریاستِ کشمیر، ہزارہ، مری، کہوٹہ اور وہ تمام پہاڑی علاقے جو دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب کی طرف

واقع ہیں جن میں ریاست چمبہ سمیت اور لاہول (Lahol) کے علاوہ جموں ریاست کے حکمران گلاب سنگھ اور اس کے جائز ورثاء کے قبضہ اقتدار میں دینے کی شرائط تسلیم کر لی گئی تھیں۔ یہ علاقے 9 مارچ 1846ء کے معاہدہ لاہور کی دفعہ 4 کے مطابق ہندوستان کی انگریز سرکار کو منتقل کر دیئے گئے تھے اور 16 مارچ 1846ء کے معاہدہ امرتسر کی رو سے جموں کی ریاست کو منتقل کیے جا چکے تھے۔ معاہدہ لاہور انگریز اور لاہور کے خالصہ دربار کے درمیان ہوا تھا اور معاہدہ امرتسر گلاب سنگھ کی ریاست جموں اور انگریز کے درمیان ہوا تھا۔ معاہدہ لاہور کی دفعہ 12 کے مطابق لاہور دربار راجہ گلاب سنگھ کو ایک آزاد خودمختار حکمران تسلیم کرتا ہے۔ وہ علاقے جو انگریز سرکار کی طرف سے گلاب سنگھ کی جموں کی ریاست کو ٹرانسفر کیے جائیں گے ان پر راجہ گلاب سنگھ کا اقتدار اعلیٰ کو کُلی طور پر قبول کرتا ہے۔ معاہدہ امرتسر کے دو حصے ہیں، ایک حصہ میں انگریز سرکار اور جموں کی ڈوگرہ سرکار کے درمیان انتظامی اُمور طے کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں انگریز سرکار نے کشمیر، ہزارہ، کہوٹہ اور پوٹھوہار سمیت گلگت کے علاقے جموں ریاست کو ٹرانسفر کیے ہیں۔

گلاب سنگھ نے تاوانِ جنگ کے بدلے لاہور دربار سے لیئے گئے علاقے اور ریاستوں کے لیئے رقم انگریز کو دے کر یہ ریاستیں اور علاقے جموں دربار کا حصہ بنا لیے۔ اس کے بعد نئی سلطنت کا اعلان کر دیا اور اس نئی سلطنت کا نام ریاست جموں کشمیر وتبّتہا رکھا اور گلاب سنگھ خود اس نئی ریاست کا مہاراجہ بن گیا۔ ہزارہ، کہوٹہ، مری کے علاقے بھی ریاست جموں کشمیر کا حصہ تھے لیکن یہاں کے زمینداروں نے امن وامان کا مسئلہ پیدا کر رکھا تھا اور گلاب سنگھ نے مظفرآباد کے راجگان سے معاہدہ کر کے کشمیر صوبہ کا حصہ بنا دیا لیکن ہزارہ سمیت کہوٹہ اور مری جو دریائے جہلم کے پار کے علاقے پنجاب کو دے دیئے۔ اس کے بدلے میں کھڑی اور مناور کے علاقے جموں میں شامل کر دیئے جو بعد میں انگریز کے ساتھ طے کیے گئے حد بندی کمیشن میں تسلیم کر لیے گئے۔

اس طرح پنجاب کی طرف دریائے جہلم کو ہی ریاست جموں کشمیر وتبّتہا کی سرحد بنا لیا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ معاہدہ امرتسر ہی ریاست جموں کشمیر کی تشکیل کی

بنیاد بنا۔اس معاہدے کی حقیقت تاریخی طور پر بڑی اہمیت کی حامل ہے اور ریاست جموں اور کشمیر کے درمیان اتحاد اور وحدت کی بنیاد بھی ہے۔ کچھ تاریخ اور سیاسیات کی بنیادوں سے نا بلد گروہ ایسے بھی ہیں جو معاہدہ امرتسر سے نہ صرف انکاری ہیں بلکہ اس کو غیر انسانی معاہدہ بھی کہتے ہیں۔بعض گروہ اور سیاسی پارٹیاں اس اہم تاریخی معاہدے کو خرید وفروخت کا معاہدہ بھی کہتے ہیں جب کہ اسی معاہدے کی بنیاد پر ریاست کشمیر اور گلگت کے وہ علاقے جو دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کی طرف ہیں، جموں کی ریاست کا حصہ بنے تھے اور دونوں خطوں کی تاریخی وحدت اسی معاہدہ امرتسر کی مرہون منت ہے۔ معاہدہ امرتسر دراصل معاہدہ لاہور کا ہی تسلسل ہے اور سکھوں کے لاہور دربار کی طرف سے 9 مارچ 1846ء کے معاہدہ لاہور میں تاوانِ جنگ کے بدلے یہ علاقے انگریز کے حوالے کر دیے گئے۔ایسے کئی معاہدے دنیا کی تاریخ میں موجود ہیں جن میں تاوانِ جنگ کے بدلے علاقوں اور ریاستوں کا تبادلہ کیا گیا ہے ۔اس کی ایک بڑی مثال معاہدہ وارسیلیز (Treaty of Versailles) کی ہے جو جون 1919ء کو پیرس میں کیا گیا تھا۔ یہ معاہدہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ہوا تھا اور اس معاہدے میں جرمنی اپنی آبادی اور سرزمین کا ((10 دس فیصد حصہ سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یہ جرمنی اور اتحادی ملکوں کے درمیان ہوا۔ جرمنی اپنے کئی علاقوں سمیت اپنی بے شمار نوآبادیوں سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ جرمنی پر 33 بلین ڈالر تاوانِ جنگ بھی عائد کیا گیا تھا۔اسی طرح فرانس نپولین کے دور میں جنگ ہار گیا تھا اور نومبر 1815ء کو معاہدہ پیرس کے تحت فرانس پر دس کروڑ فرانک تاوانِ جنگ عائد کیا گیا تھا۔فرانس کو اپنی کچھ نوآبادیاں اور تاوانِ جنگ کی رقم اتحادی ملکوں کو دینا پڑیں۔اس کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ اتحادی ملکوں کی فوجوں کو بھی فرانس کو اپنی سرزمین پر پانچ سال رکھنا پڑا۔

اس کے بعد 1846ء میں امریکہ اور میکسیکو کے درمیان جنگ کے خاتمے پر ایک معاہدہ ہوا۔ جسے معاہدہ گواڈالوپ (Guadalupe) بھی کہا جاتا ہے۔اس معاہدے کی رُو سے امریکہ نے میکسیکو کو ڈیڑھ کروڑ ڈالر تاوانِ جنگ ادا کرنے کا وعدہ کیا اور میکسیکو نے 35 لاکھ ڈالر کے بدلے ٹیکساس کا علاقہ امریکہ کو دے دیا تھا۔امریکہ کی تین ریاستیں کیلورنیا،

نیواڈا اور یوٹا آج ان علاقوں پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ میکسیکو سے لیے گئے علاقوں میں نیو میکسیکو، ایرِیزونا، کولوراڈو، اوکلاہاما اور کنساس کی ریاستیں قائم ہیں۔ 1871ء میں فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ ہوئی۔ جنگ کے خاتمہ پر معاہدہ فرینکفرٹ کے تحت فرانس پر تاوانِ جنگ عائد کیا گیا۔ 1897ء میں یونان اور ترکی کے درمیان جنگ ہوئی، ترکی نے یونان پر تاوانِ جنگ عائد کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی اور جرمنی پر بھاری تاوان جنگ عائد کیا گیا جس کی آخری قسط جرمنی نے 2010ء میں ادا کی۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر جرمنی سمیت کئی مما لک پر اربوں ڈالر تاوانِ جنگ عائد کیا گیا اور ان ملکوں نے مختلف ذرائع سے تاوان کی رقم ادا کی۔ دنیا کے کئی ملکوں کی تاریخ سے ایسی مزید مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان مثالوں سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ معاہدہ امرتسر کوئی انوکھا معاہدہ نہیں اور اس کو خرید وفروخت کہنے والے تاریخ سے نا بلد ہیں اور ان کے سفید جھوٹ اور گمراہ کن پروپیگنڈے کو بے نقاب کیا جائے۔

دنیا کی جدید تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں ملکوں کے درمیان علاقوں کی خرید وفروخت بھی ہوئی ہے۔ اسی طرح امریکہ نے فرانس سے 1803ء میں لوئزیانا (Louisiana) کا 8 لاکھ 28 ہزار مربع میل کا علاقہ ایک کروڑ 12 لاکھ 50 ہزار ڈالر میں خریدا تھا جس پر آج امریکہ کی پانچ ریاستیں اور دو کنیڈین صوبے قائم ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ اور میکسیکو کے درمیان گاڈسڈن پرچیز (Gadsdeb Purchase) کا معاہدہ 1854ء میں ہوا تھا جس میں امریکہ نے میکسیکو سے ملین ڈالر کے بدلے 29,670 مربع میل کا علاقہ خریدا جو بعد میں ایرِیزونا اور نیو میکسیکو کی ریاستوں کا حصہ بنایا گیا۔ امریکہ نے 1867ء میں رُوس سے الاسکا کا 586,412 مربع میل کا علاقہ 72 لاکھ ڈالر میں خریدا تھا۔ اسی طرح برطانوی حکومت نے 1857ء کی ہندوستانیوں کی ناکام بغاوت کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لیا تو کمپنی کو اگلے چالیس سال تک دس فیصد حصہ دینے کی ضمانت دی تھی۔ برطانوی حکومت نے دوسری عالمی جنگ تک یہ شیئر (حصہ) ادا کیے تھے۔ اس لیے معاہدہ امرتسر پر اعتراض کرنے والوں کے عزائم

ریاست کے قانونی وجود پر سوال کھڑا کرنے کے سوا کیا ہو سکتے ہیں؟ چونکہ معاہدہ امرتسر میں جو رقم ہندوستان کی انگریز سرکار کو دی گئی تھی وہ تاوانِ جنگ میں لاہور دربار سے لیئے گئے علاقوں کی رقم کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگر وہ رقم انگریز کو ادا نہ کی جاتی تو یہ علاقے واپس انگریز سرکار کے کنٹرول میں چلے جاتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ریاست جموں وکشمیر کا وجود قائم ہی نہ ہوتا اور نہ ہی یہ علاقے ایک ریاست کی شکل میں آج موجود ہوتے۔ اس لیے ریاست جموں و کشمیر کا تاریخی وجود ہی معاہدہ امرتسر کی وجہ سے قائم ہوا ہے۔ جو لوگ اس معاہدے کو غلط قرار دیتے ہیں وہ دراصل مذہب اور علاقائی تعصب کا شکار نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ خود بھی گمراہ ہیں اور عوام کو بھی گمراہ کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ دنیا میں کثیر القومی اور کثیر المذہبی ریاستوں کا وجود اسی طرح قائم ہوا ہے اور جاگیردارانہ دور میں طاقت ور حکمران اور بادشاہ ہی اپنی سلطنتوں کی حدود کا تعین کیا کرتے تھے اور معاہدے بھی حکمرانوں کے درمیان ہی ہوا کرتے تھے۔

اس لئے یہ اعتراض کرنا کہ 16 مارچ 1846ء کا معاہدہ امرتسر کشمیری عوام کی مرضی کے خلاف ہوا تھا، اس دور کے دستور اور طرزِ حکمرانی سے عدم واقفیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اسی طرح 9 مارچ 1846ء کا معاہدہ لاہور بھی کشمیری عوام کی مرضی سے نہیں کیا گیا تھا۔ جس میں پنجاب نے اپنا کشمیر کا صوبہ ہندوستان کے انگریز سرکار کو تاوانِ جنگ میں دے دیا تھا۔ اسی معائدے کے تحت کشمیر، گلگت سمیت ہندوستان کی انگریز حکومت کے کنٹرول میں چلا گیا تھا جبکہ کشمیری عوام کی حیثیت اس وقت بھی پنجاب دربار کی رعایا کی تھی۔ یہ دور بادشاہوں کی توسیع پسندی کا تھا اور انگریز سامراج تو خود پورے ہندوستان پر طاقت کے ذریعے قابض ہوا تھا۔ بادشاہت میں عوام کی رائے اور مرضی کو بادشاہ اپنی مرضی سے ہی استعمال کرتا ہے۔ اس سے قبل کشمیر پر پنجاب، افغان اور مغل قابض ہوئے تھے وہ بھی کشمیر پر اپنی مرضی سے حکمرانی کرتے تھے نہ کہ کشمیری عوام کی مرضی سے کشمیر پر حکومت کرتے تھے۔ اس طرح گلاب سِنگھ نے بھی کشمیر کا کنٹرول ہندوستان کی انگریز سرکار جو اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی تھی، سے لیا تھا اور باقی جموں ریاست کے علاقوں سے ملا کر ایک نیا

سیاسی،علاقائی اورانتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا تھا۔

1846.1ء کے بعدریاست جموں کشمیروتبّتہا کا تاریخی ارتقاء

مہاراجہ گلاب سِنگھ نے اس ریاستی انتظامی ڈھانچے کوتین اکائیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ایک اکائی گلاب سِنگھ کی اپنی آبائی ریاست جموں،دوسری کشمیری بولنے والے خطے اور تیسری اکائی لدّاخ، بلتستان اورگلگت پر مشتمل بنائی گئی تھی۔ان علاقوں پر مشتمل ریاست جموں کشمیر وتبّتہا کی سرحدوں کا تعین بھی پہلی بار ہوا تھا۔اس لیے ان خطوں کی پہلی بار نئی جغرافیائی اکائی وجودمیں آئی تھی۔16مارچ 1846ء کے معاہدہ امرتسر میں گلاب سِنگھ کی نئی ریاست اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان دفاعی معاہدہ بھی ہوا تھا اور خارجہ اُمور میں بھی ہندوستان کی انگریز سرکار سے مشورہ کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اگر ریاست جموں کشمیر کاکسی دوسری ریاست کے ساتھ تنازعہ ہوجائے توایسی صورت میں برطانیہ کی ثالثی کوقبول کرنا ہوگا۔اس کے باوجودمہاراجہ گلاب سِنگھ کوریاست جموں کشمیر کا آزاد حکمران تسلیم کیا گیااوراس کے علاقائی اقتدارِاعلیٰ کو برطانیہ نے قبول کیا تھا۔گویا اقتدارِاعلیٰ کا جوتصور بادشاہت کے دورمیں قائم تھاوہی ریاست جموں کشمیر کے حکمران کوحاصل تھا۔

برطانیہ کی بالا دستی ریاست کے حکمران نے قبول کی تھی کیونکہ اس وقت کی عالمی سامراجی طاقت کی حیثیت سے برطانیہ کی اس خطے میں بھی بالادستی قائم ہوچکی تھی۔ریاست جموں کشمیر کی اندرونی خودمختاری کوقبول کرنے کے باوجود برطانوی سامراج کوریاست کی جغرافیائی اہمیت کا اندازہ فوراًہی ہوگیا تھااور ہندوستانی خطے میں زارِرُوس کا خوف برطانوی حکومت کواپنی نئی حکمت عملی اپنانے پرمجبور کرنے لگا۔ریاست جموں کشمیر کی شمالی سرحدوں کی طرف سے انگریز کے لیے زارِرُوس کے خطرات اس وقت ظاہر ہونے لگے جب دوسری انگریز افغان جنگ نے پنجاب کومکمل طور پرانگریزوں کے کنٹرول میں کردیا تھا۔دوسری طرف رُوس نے بڑی تیزی سے سینٹرل ایشیا کی طرف پیش قدمی شروع کردی تھی۔رُوس کی سنٹرل ایشیا کی طرف پیش قدمی نے برطانوی سامراج کوہندوستان کورُوس کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے

مضبوط سرحد بنانے کی طرف متوجہ کیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے گلگت کا خطہ 1846ء میں کشمیر کے ساتھ ہی حاصل کر لیا تھا اور اپنا انتظامی کنٹرول گلگت پر مضبوط کر لیا تھا۔ انگریزوں کو اب یہ احساس ہوا کہ کشمیر بہت خوبصورت علاقہ ہے اور سیر و سیاحت کے لیے دلفریب جگہ ہے۔ انگریز گرمیوں کے موسم میں کشمیر کی سیر کے لیے جاتے تو واپس آ کر افسوس کا اظہار کرتے کہ اتنا خوبصورت خطہ انہوں نے گلاب سنگھ کے حوالے کیوں کیا۔ اب ہندوستان کی انگریز حکومت نے کسی طرح سے بھی مہاراجہ کی ریاست پر اپنا کنٹرول واپس حاصل کرنے کے جائز و ناجائز طریقے استعمال کرنے کی حکمت عملی اپنانی شروع کر دی۔ گلاب سنگھ نے بار بار ہندوستان کی انگریز حکومت کو معاہدہ امرتسر کا حوالہ دے کر ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ گلاب سنگھ نے اپنی زندگی میں انگریز کو اندرونی معاملات سے دور رکھا۔

1857ء میں گلاب سنگھ کی موت ہوگئی اور اس کا بیٹا رنبیر سنگھ ریاست کا مہاراجہ بنا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے باپ گلاب سنگھ کی پالیسیوں کو سختی سے جاری رکھا۔ رنبیر سنگھ رُوس اور سینٹرل ایشیا کی ریاستوں سے تجارتی تعلقات قائم کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ رنبیر سنگھ نے پہلا تجارتی وفد ترکستان کے دارالحکومت یارقند بھیجا جو 1867ء میں یارقند میں رُوس کے نمائندوں سے پہلا تجارتی معاہدہ کر کے سات ماہ بعد واپس آیا۔ ریاست جموں و کشمیر کا یہ وفد گلگت بلتستان کے راستے یارقند گیا اور راستے میں برطانیہ کے ایجنٹوں نے اس وفد پر قاتلانہ حملہ کیا اور وفد کے دو اراکین کو راستے میں قتل کر کے ان سے مہاراجہ کشمیر کا رُوسی حکومت کے لیے دیا گیا پیغام بھی چُرا لیا گیا۔ وفد کے دو اراکین عبدالرحمن خان اور سرفراز خان جان بچا کر یارقند پہنچے اور سات ماہ تک یارقند میں رُوس کے سرکاری مہمان رہے۔ رُوس اور برطانیہ کی ایمپائرز کے درمیان اس خطّے کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ان علاقوں میں کس طرح کی سازشیں اور طاقت کی کشمکشیں ایک دوسرے خلاف چل رہی تھیں وہ ریاستی وفد کے دو ارکان کی برطانیہ کے خفیہ ایجنٹوں کے ہاتھوں قتل سے لگایا جا سکتا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے دوسرا وفد 1869ء میں اور تیسرا تجارتی وفد 1870ء میں یارقند بھیجا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ

کی خواہش تھی کہ وہ رُوس کے ساتھ تجارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سفارتی تعلقات بھی قائم کرے۔ اس لئے مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے عملی اقدامات شروع کر دیے تھے۔ سنٹرل ایشیا کی طرف جانے والے راستوں کو مزید محفوظ بنانے کے لیے رنبیر سِنگھ نے ریاست کے شمالی سرحدوں کی طرف چھوٹی چھوٹی تمام ریاستوں پر اپنا کنٹرول مزید مضبوط کرنے کے اقدامات کئے۔ چیلاس، پونیال، یاسین، داریل، ہنزہ اور نگر کی ریاستوں کو ریاست کا حصہ بنا لیا تا کہ رُوس کے ساتھ سنٹرل ایشیا کے تمام تجارتی راستوں کے ذریعہ سفارتی اور سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں رنبیر سِنگھ نے سری نگر میں سب سے پہلا رُوسی زبان سکھانے والا اسکول کھولا جو ہندوستان کے علاقے میں اپنی نوعیت کا پہلا اسکول تھا۔

مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے ہندوستان کی انگریز سرکار کو اس وقت حیران کر دینے والی اطلاع دی جب یارقند کا ایک وفد 1867ء میں سری نگر آیا۔ اب ہندوستان کی انگریز حکومت نے مہاراجہ رنبیر سِنگھ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ریاست کے مہاراجہ نے سازش کی ہے اور ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ نے معاہدہ امرتسر کی خلاف ورزی کی ہے۔ مہاراجہ کی خارجہ پالیسی پر شدید تنقید شروع ہوگئی اور انگریز سرکار کی طرف سے کہا گیا کہ مہاراجہ کو اپنی ریاست کی شمالی سرحدوں کی طرف مزید توسیع پسندانہ پالیسیوں کو روکنا ہوگا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مہاراجہ گلگت کی طرف اپنی ریاست میں مزید علاقوں کا کنٹرول حاصل نہ کرے۔ انگریز سرکار نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ برطانیہ کے لئے جتنی اہمیت افغانستان کی ہے، ریاست جموں کشمیر کی شمالی سرحدوں کی اہمیت اس سے کئی زیادہ ہے۔ ہندوستان کی انگریز سرکار کے نمائندوں نے تجویز دی کہ افغانستان سے پہلے ریاست جموں کشمیر پر قبضہ کرنا چاہیے۔ دوسری طرف مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے ہندوستان کی انگریز حکومت پر الزام لگایا کہ وہ ریاستی اُمور میں مداخلت کرنے کے بہانے تلاش کر رہی ہے اور ریاست کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی سنگین خلاف ورزی کر رہی ہے۔ انگریز سرکار نے مہاراجہ رنبیر سِنگھ پر یہ الزام بھی لگایا کہ ڈوگرہ فوج نے قلعہ شاہد اللہ پر قبضہ کر کے ترکستان اور ہندوستان کی انگریز حکومت کے

درمیان جنگ کرانے کی کوشش کی ہے۔اس سے رُوس اور انگریز کی جنگ کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے کیونکہ ریاست جموں کشمیر کو بیرونی دُشمنوں سے محفوظ رکھنا ہندوستان کی انگریز حکومت کی ذمہ داری ہے جو معاہدہ امرتسر کی دفعہ 4 میں درج ہے۔اس طرح کے الزام کے بہانے مہاراجہ رنبیر سِنگھ پر شدید دباؤ بنایا گیا کہ وہ اپنے ریاستی دربار میں انگریز کا ایک سیاسی نمائندہ پورے اختیارات کے ساتھ تعینات کریں اور یہ بھی کہا گیا کہ مہاراجہ اپنی ریاست کی سرحدوں کو گلگت کی طرف دریائے سندھ مقرر کرے۔ دوسری یہ تجویز بھی دی گئی کہ مہاراجہ کی خارجہ پالیسی سے جڑی سرگرمیوں کو انگریز حکومت خود کنٹرول کرے۔اس طرح ہندوستان کی انگریز حکومت نے ریاستی اُمور پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوششیں تیز کردیں ۔ گو کہ یہ کوششیں 1848ء سے ہی شروع ہوگئی تھیں جب ہندوستان کی انگریز حکومت نے مہاراجہ گلاب سِنگھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا تھا کہ وہ انگریز حکومت کا ایک عارضی نمائندہ سرینگر میں تعینات کریں۔ یہ نمائندہ چھ ماہ کے لیے ہو جو انگریز اور یورپین سیاحوں کے لیے تعینات ہو اور ان کی دیکھ بھال پر نظر رکھے۔

دراصل یہ مہاراجہ کی حکومت اور ریاستی اُمور پر نظر رکھنے کا ایک طریقہ کار بنایا گیا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز سینٹرل ایشیا سے تجارت کے لیے بے تاب تھے اور مہاراجہ نے انگریزوں کی تجارتی سرگرمیوں پر پابندیاں لگادی تھیں چونکہ انگریز، ریاست کے شمالی علاقوں کے راستے سینٹرل ایشیا سے تجارت کرنا اور رُوس کی سینٹرل ایشیا میں سرگرمیوں پر نظر بھی رکھنا چاہتے تھے۔انگریز آفیسر کی تعیناتی سے انگریز حکومت کو ریاست میں اپنا نمائندہ رکھنے کا حق مل گیا تھا۔مہاراجہ کی عائد کردہ پابندیوں کو انگریز پریس نے خوب اچھالا اور مہاراجہ کو نپولین سے تشبیع دی اور لہہ باڈر پر کسٹم آفیسرز (Officers) تاجروں سے مال درآمد اور برآمد پر کسٹم ڈیوٹی لیتے تھے۔انگریز حکومت نے اس کو ناجائز قرار دے کر اس میں کمی کرنے پر زور دیا۔ یہ تجارتی مال سینٹرل ایشیا سے لایا جاتا تھا اور ہندوستان سمیت ریاست جموں وکشمیر تک لے جایا جاتا تھا۔ 1863ء میں مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے تجارتی محصولات کم کرنے پر زور دیا اور تین سالوں بعد 1867ء میں ہی انگریز سرکار نے لہہ باڈر پر اپنا ایک تجارتی نمائندہ (Trade

(agent تعینات کرایا۔ یہ کہا گیا کہ نمائندہ صرف ایک موسم کے لیے تعینات کیا جائے جو کسی طرح بھی ریاستی اُمور میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔ ہندوستان کی انگریز حکومت کا اصل مقصد ان تجارتی نمائندوں کے ذریعہ رُوس اور سنٹرل ایشیاء کی طرف سے آنے جانے والے افراد کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا تھا۔ اس نمائندے کا مقصد چینی ترکستان کے بارے میں معلومات اکھٹی کرنا تھا۔ اس ٹریڈ ایجنٹ کی مدت پوری ہوئی تو ہندوستان کے گورنر جنرل کو مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے اپنے سابقہ دیوان (وزیراعظم) کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ انگریز کے ہندوستانی ایجنٹ کی مدت کو دوبارہ بحال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ ایک طرح کی ریاست کے حکمران کی بے عزتی کے مترادف ہوگا، اس سے عوام میں شکوک وشبہات پیدا ہونگے اور یہ ایک طرح کی میری سلطنت میں براہِ راست مداخلت سمجھی جائے گی۔

چونکہ ہم پہلے ہی اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ میری سلطنت کو آزاد اور خودمختار تصور کیا جائے گا۔ ہندوستان کا انگریز گورنر جنرل لارڈ لارنس مہاراجہ کی خدمات اور انگریز کے ساتھ طے شدہ اُمور پر قائم رہنا چاہتا تھا لیکن اس کے باقی اہلکار خاص کر سیکریٹری آف اسٹیٹ اس پر راضی نہ ہوئے کہ لہہ سے اپنا ایجنٹ واپس بلایا جائے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لہہ میں ایجنٹ کی تعیناتی کو مستقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد 1870ء میں انگریز اور ریاستی حکومت کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہوا اس معاہدے میں انگریز ایجنٹ کو ختم کر کے اس کی جگہ انگریز کمشنر تعینات کیا گیا۔ اس طرح ریاستی حکومت نے دو آفیسرز سرینگر اور دولہہ میں تعینات کرنے کی اجازت دی لیکن دونوں ملکوں کے درمیان اعتماد کی شدید کمی پیدا ہوگئی۔ ان آفیسرز کے ذریعہ انگریز حکومت نے ریاست میں اپنا اثر ورسوخ مزید بڑھانا شروع کر دیا۔ ریاست جموں کشمیر کے شمالی سرحدی علاقوں کی اہمیت کا اندازہ انگریز کو مہاراجہ گلاب سِنگھ کے زمانے سے ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی انگریز سرکار نے جس طرح ان علاقوں میں سرگرمیوں کو تجارت اور سیر وسیاحت کے نام پر شروع کیا تھا وہ ظاہر کرتا تھا کہ برطانیہ اور رُوس اس علاقے کے راستے سینٹرل ایشیا کے خطے پر اپنا زور آزمائی کرنا اور ریاست کے شمالی صوبہ میں ان کے خفیہ ایجنٹوں کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بنانا چاہتے ہیں۔

انگریز رُوس کو ہر قیمت پر ہمالیہ کے اس پار سینٹرل ایشیا میں روکنا چاہتے تھے۔ رُوس کی پوری کوشش تھی کہ انگریز کو افغانستان تک روکا جائے۔رُوس کے سرکاری نمائندوں نے ریاست جموں کشمیر کے ساتھ تعلقات کو تجارت تک محدود رکھا ہوا تھا لیکن انگریز کی طرف سے ریاست میں اپنے اہلکاروں کی تعیناتی سے ڈوگرہ حکومت کو خطرات لاحق ہوئے۔ ان خطرات سے نمٹنے کے لیے مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے اپنے وفود تاشقند جو اُزبکستان کا دارالحکومت ہے اور یارقند ترکستان کے دارالحکومت بھیجے تھے۔گو کہ ہندوستان کی انگریز حکومت کے علم میں لانے کے بعد یہ تجارتی وفود بھیجے گئے تھے لیکن اندرون خانہ ان وفود کو انگریز شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ کسی حد تک درست ہے کہ مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے ان وفود کے ذریعے رُوس سے اپنے سفارتی اور سیاسی تعلقات بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ دوسری طرف رُوس کی حکومت ریاستِ جموں کشمیر کی جغرافیائی اہمیت سے آگاہ تھی لیکن رُوس کی زار حکومت کو خطرہ تھا کہ اگر ریاست جموں کشمیر کی حکومت سے سفارتی اور سیاسی تعلقات آزادانہ بنیادوں پر قائم کیے تو ہندوستان کی انگریز حکومت ان تعلقات کا بہانہ بنا کر سنٹرل ایشیا کی ریاستوں کے ساتھ آزادانہ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی جو رُوس کی زار حکومت کے لیے کسی قیمت پر قابل قبول نہیں تھے۔اس لیے ریاستِ جموں کشمیر کے مہاراجہ کی طرف سے کئی وفود تاشقند اور یارقند بھیجنے کے باوجود بھی رُوسی حکومت بہت محتاط رویہ کے ساتھ ریاست کے ساتھ اپنے تعلقات کو آگے بڑھانے کی پالیسی پر قائم تھی۔ یہ 1873ء کے وسط کی بات ہے کہ ایک کشمیری جو تجارت کی غرض سے یارقند سے ابھی واپس لوٹا تھا، نے یہ اطلاع دی کہ وہ یارقند میں رُوسی مشن کے ایک اہلکار سے ملا اور اس نے رُوس اور ریاستِ جموں کشمیر کے درمیان براہِ راست رابطے کی تجویز پیش کی۔اس کشمیری تاجر کا نام خالق ڈار تھا۔اس کی بات پر انگریز نے بھروسہ کیا یا نہیں لیکن ان باتوں کو بہانہ بنا کر ریاستی حکومت کی تجارتی پالیسی جو پہلے ہی رُوسی حکومت کے ساتھ طے ہو چکی تھی میں مزید مداخلت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد انگریز حکومت نے اپنا ایک وفد سنٹرل ایشیاء میں تجارت کے بہانے بھیجا جس کا مقصد اپنا کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ایک تجارتی مشن چین کے معاملات دیکھنے کے لئے کاشغر میں بھی قائم کیا گیا تھا۔

ہندوستان کی انگریز حکومت نے یارقند وفد بھیج کر اور کاشغر میں اپنا تجارتی مشن قائم کر کے ریاست جموں کشمیر کے مہاراجہ کے لیے ایک نئ صورتِ حال پیدا کر دی تھی کیونکہ مہاراجہ کو رُوس اور برطانیہ کی کشمکش میں زیادہ فائدہ تھا۔ اب انگریز نے رُوس سے تجارتی تعلقات قائم کر کے وقتی طور پر رُوس کی طرف سے دباؤ کم کر دیا تھا۔لیکن تجارتی تعلقات کے بہانے انگریز سنٹرل ایشیاء میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانا چاہتے تھے۔اب ہندوستان کی انگریز سرکار نے اس افواہ سے مزید فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے رُوسی حکومت سے خفیہ خط و کتابت کی ہے۔اس الزام کو مہاراجہ رنبیر سِنگھ کے خلاف خوب پروپگنڈے کی نیت سے پھیلایا گیا اور کہا گیا کہ ریاستِ جموں کشمیر کی سرحدوں کے باہر انگریز کے خلاف بہت کچھ ہو رہا ہے۔اس سے نمٹنے کے لیے مہاراجہ کے دربار میں اور لدّاخ کے باڈر پر انگریز کے ایجنٹوں کی تعیناتی بہت اہم اور وقت کا تقاضا ہے۔

لارڈ نوٹ بروک(Lord Not Brock) جو ہندوستان کے لیے نئے گورنر جنرل تھے نے اِن اقدامات کی نہ صرف تعریف کی بلکہ اِن اقدامات کے ذریعہ ریاست کے معاملات کو کنٹرول کرنے اور سنٹرل اشیاء کی طرف سے حاصل ہونے والی معلومات کا بہترین ذریعہ بھی قرار دیا۔مہاراجہ رنبیر سِنگھ کو بھی اطلاع دی گئی کہ ان اقدامات کا مقصد سنٹرل ایشیاء کی طرف سے درست معلومات حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

یہ بھی کہا گیا کہ ریاستی معاملات میں طے شدہ حُدود سے زیادہ مداخلت نہیں کی جائے گی لیکن مہاراجہ رنبیر سِنگھ ان باتوں سے مطمئن نہ ہوا۔اُس نے انگریز آفیسر جو دربار میں سپیشل ڈیوٹی پر تعینات تھا کو اپنی شدید تشویش سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ وہ کسی ذمہ دار حکومتی نمائندے سے ملنا چاہے گا۔اس تشویش پر مہاراجہ سے بات چیت کے لیے پنجاب کا لیفٹینینٹ گورنر آر ایچ ڈویز(R.H.Davies) کو بھیجا گیا۔گورنر نے جموں میں مہاراجہ رنبیر سِنگھ سے 5-6 دسمبر 1873ء میں دو ملاقاتیں کیں اور یقین دہانی کرائی کہ گورنر جنرل نے جو اقدام اٹھائے ہیں وہ پالیسی میں ہرگز تبدیلی نہیں ہے۔نہ ہی مہاراجہ کی ریاستِ جموں وکشمیر کی پوزیشن میں تبدیلی کی طرف اشارہ ہے بلکہ انگریز حکومت مہاراجہ کی ریاست کے ساتھ کیے

گئے معاہدے پر پوری طرح قائم ہے۔ اس پر مہاراجہ نے اپنا ایک تحریری میمورنڈم گورنر جنرل کے نام دیا اور شکایت کی کہ دو مواقع پر اس سے قبل میری ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی گئی۔ میمورنڈم میں بہت سختی سے دو انگریز آفیسرز کی تعیناتی پر اعتراض کیا گیا جو ریاست میں انگریز حکومت کی طرف بھیجے گئے تھے اور کہا گیا کہ انگریز حکومت ان کے اختیارات میں اضافہ کرتی جا رہی ہے۔

مہاراجہ نے یہ بھی لکھا کہ 1852ء میں انگریز حکومت نے صرف یورپی سیاحوں کی مدد کے لئے اپنا نمائندہ سرینگر میں تعینات کرنے کے لیے ریاست سے اجازت مانگی تھی۔ اس کے بعد 1877ء میں نہ صرف انگریز نمائندے کی یہاں رہنے کی مدت میں اضافہ کیا گیا بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ وہ صرف سنٹرل ایشیا کے بارے میں انگریز حکومت کو معلومات دینے کی حد تک محدود رہے گا۔ ریاستی حکومت نے بھی اس نمائندے کو یہاں رہنے کی اجازت مزید مدت کے لیے دے دی۔ اب انگریز حکومت ان نمائندوں کے ذریعے اپنے تمام حربے ہماری ریاست کی شمالی سرحدوں کو کنٹرول کرنے کی طرف استعمال کر رہی ہے اور ریاست کی شمالی سرحدوں کی اہمیت کی وجہ سے وہ نہ صرف سنٹرل ایشیا میں اپنا اثر ورسوخ اور کنٹرول حاصل کرنا چاہتی ہے بلکہ ریاست جموں وکشمیر نے رُوس کے ساتھ جو تجارتی تعلقات قائم کیے ہیں ان پر بھی اپنا کنٹرول حاصل کرنا چاہتی ہے اور یہ سارکام ان نمائندوں کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ ریاستی حکومت کو ان کے مقاصد کچھ اور ظاہر کیے گئے تھے۔ دراصل پہلے مہاراجہ حکومت کا ایک نمائندہ دہلی میں انگریز حکومت کے دربار میں تعینات تھا جو انگریز حکومت اور ریاست کی ڈوگرہ حکومت کے درمیان معلومات کا اصل ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ انگریز حکومت پنجاب حکومت کے ذریعہ ریاست کی حکومت سے سرکاری معلومات کا تبادلہ کیا کرتی تھی جو طے شدہ سرکاری ذرائع بھی مانے جاتے تھے۔ 1877ء تک ریاست میں تعینات یہی انگریز نمائندے ہی ریاست کی ڈوگرہ حکومت اور ہندوستان کی انگریز حکومت کے درمیان بہترین ذریعہ معلومات بن چکے تھے۔ پنجاب کی انگریز حکومت کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اب ضروری معلومات چاہے سیاسی یا تجارتی نوعیت کی ہوں ریاست میں تعینات شدہ انگریز

اہلکاروں کے ذریعہ ہی حاصل کی جائیں گی۔

ہندوستان کی انگریز حکومت نے ان اہلکاروں کو آہستہ آہستہ وہ تمام اختیارات دے دیئے تھے جو مہاراجہ کی اپنی پوزیشن کے لیے نقصان دہ تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ریاست میں تعینات انگریز اہلکاروں کے اختیارات کو مزید بڑھانے کے خلاف انگریز حکومت سے شدید احتجاج کیا لیکن اب انگریز حکومت کی پالیسی نہ سننے اور نہ توجہ دینے والی ہو چکی تھی۔ انگریز حکومت کی پالیسی ریاست میں مزید سخت ہو چکی تھی اور اپنے ایجنٹوں کی ریاست میں تعیناتی کے ذریعے وہ مہاراجۂ ریاست جموں وکشمیر کی اتھارٹی کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔ گلگت میں مہاراجہ حکومت کا خاتمہ کر کے گلگت ایجنسی کی بحالی کی کوشش کر رہے تھے تا کہ انگریز رُوس کے توسیع پسندانہ عزائم کے خطرے کو ریاست کی شمالی سرحدوں کی طرف آنے سے روک سکیں اور ان علاقوں پر اپنا کنٹرول حاصل کر کے ان کی نگرانی خود کر سکیں۔ اب انگریز سامراج رُوس کے خطرات کے پیش نظر ریاست جموں وکشمیر کے ساتھ طے کیے گئے تعلقات میں تبدیلیاں کرنے کا سوچ رہا تھا۔

انگریز حکومت کو پہلے یہ خطرہ تھا کہ رُوس ہندوستان پر افغانستان کے راستہ فوجی حملہ کرے گا لیکن رُوسی فوجیں دریائے آموں کے پار ہی رک گئی تھیں۔ دونوں یورپی ایمپائرز کا ٹکراؤ اسی سنٹرل اشیاء کے خطے میں ہونا تھا جو بعد میں دونوں کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کی وجہ سے رک گیا۔ یہ معاہدہ 1893ء میں رُوس اور انگریز کے درمیان ہوا۔ اس معاہدے میں افغانستان کو دونوں ملکوں کے درمیان بَفر زون تسلیم کیا گیا۔ انگریز افغانستان سے آگے سنٹرل ایشیاء کی طرف نہیں جائیں گے اور رُوس افغانستان کے باڈر سے آگے نہیں جائے گا۔ واہ خان کی چالیس میل لمبی پٹی جو افغانستان اور ریاست جموں وکشمیر کی شمالی سرحد کے درمیان اور سنٹرل اشیاء کے درمیان حد مقرر کر دی گئی۔ اس طرح رُوس کو دریائے آموں کے پار روک لیا گیا تھا۔ انگریز حکومت پہلے ہی سے ریاستِ جموں کشمیر کی ڈوگرہ حکومت سے معاہدہ امرتسر میں طے کیے گئے معاملات سے تجاوز کر چکی تھی۔ ریاست کی شمالی سرحد کی طرف سے رُوسی مداخلت کو روکنے کے لیے اور سنٹرل ایشیاء کے ساتھ تجارت کے بہانے ریاست

میں بار بار اپنے حربے استعمال کرچکی تھی۔اسی وجہ سے مہاراجہ رنبیر سِنگھ اور انگریز کے درمیان شکوک وشبہات ، بداعتمادی کی سطح تک پہنچ گئے تھےلیکن رنبیر سِنگھ کی مضبوط شخصیت اور مزاحمت کی وجہ سے انگریز ریاست میں کوئی بھی انتظامی تبدیلی کرنے کی ہمت نہیں کر پائے تھے۔

مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے اپنے پورے دور میں اپنے باپ مہاراجہ گلاب سِنگھ کی پالیسی کو سختی سے جاری رکھا اور انگریز حکومت کو ہر حال میں ان حدود کے اندر رکھنے کی پوری کوشش کی جو معاہدہ امرتسر میں طے کی گئی تھیں۔مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے ایک طرف انگریز حکومت کو ریاستی اُمور میں مداخلت کرنے پر مزاحمت اور کشمکش جاری رکھی تو دوسری طرف ریاست جموں کشمیر کے اندرونی معاملات درست کرنے پر توجہ دی۔رنبیر سِنگھ نے تجارتی، سیاسی اور سفارتی تعلقات طے کرنے کے لئے وفود سنٹرل ایشیاء میں بھیجے اور کامیاب مذاکرات کرنے کے بعد رُوسی حکومت سے تجارتی تعلقات قائم کئے اور تجارتی معاہدہ بھی کیا۔

اندرونِ ریاست مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے کافی انتظامی تبدیلیاں کرنے کا آغاز کیا اور ریاست میں اداروں کی تشکیل کیلئے عملی اقدامات اٹھائے۔رنبیر سِنگھ نے پہلی بار ریاست کو خاندان کی مرضی کے بجائے کسی قاعدے قانون کے مطابق چلانے کا عملی اقدامات کرتے ہوئے کشمیر کونسل کا قیام عمل میں لایا۔گویا یہ ابتدائی نوعیت کا صوبائی اسمبلی طرز کا ادارہ قائم کیا گیا تھا۔1882ء میں کشمیر کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا جو ریاست کے انتظامی اُمور چلانے کے لیے مشاورتی طرز کا ادارہ تھا۔کشمیر کونسل کے ابتدا میں سات اراکین تھے۔جن کے نام حسب ذیل ہیں۔1۔پنڈت سورج مل 2۔پنڈت زنہ کاک ۔3۔پنڈت پیرانز 4۔مرزا اکبر بیگ 5۔مرزا محی الدین 6۔خواجہ ثناء اللہ شال 7۔دیوان بدری ناتھ شامل تھے۔کونسل کے ارکان کو وزیر ریاست کا درجہ حاصل تھا۔کشمیر ریاست کا دوسرا بڑا صوبہ تھا۔اس کا صوبائی صدر مقام سری نگر رکھا گیا تھا اور سرینگر کو ریاست کا بھی گرمائی دارالحکومت رکھا گیا تھا۔صوبہ کشمیر کے انتظامی اُمور چلانے کے لیے شروع سے ہی جموں سے صوبیدار لائے جاتے تھے جو کشمیر کی ثقافت سے واقف نہ تھے۔اسی لیے مہاراجہ رنبیر سِنگھ

نے کشمیر کونسل بنائی اور اس کا سربراہ دیوان بدری ناتھ (Devan Badri Nath) کو بنایا گیا۔ یہ کونسل مہاراجہ کو ریاست کے تمام امور چلانے میں مشورے دیتی تھی۔ اس کونسل نے تعزیراتِ جموں کشمیر کا مجموعہ قوانین مرتب کیا۔

رنبیر سنگھ نے کشمیر میں سری نگر کے مقام پر ریشم تیار کرنے کا ایک کارخانہ لگایا۔ کشمیر میں شہتوت کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں اس لیے ریشم کی صنعت نے بہت فروغ پایا اور لوگوں کو اس کی وجہ سے روزگار ملا۔ رنبیر سنگھ نے ریاست کے انتظام کو نئے خطوط پر چلانے کے لئے ریاست کے باہر سے بھی انتظامی اُمور چلانے والے تعلیم یافتہ افراد کو ریاستی اداروں میں ملازمتیں دی تھیں۔ ان ریاستی محکموں میں پولیس کا محکمہ، ڈاک کا محکمہ، صحت کا محکمہ اور بجلی کا محکمہ قائم کیا گیا۔ ان اداروں کی راہنمائی کے لیے دیوانی اور فوجداری قوانین مرتب کیے گئے۔ ٹیلی فون کا محکمہ قائم کر کے جموں کو سیالکوٹ اور سری نگر سے ملایا گیا۔ یہ 1877ء میں کیا گیا اور 1883ء میں سری نگر کو گلگت، اَستور اور سکردو سے ملا دیا گیا۔ یہ ریاست کو جدید نظام کے ذریعہ سے جوڑنے کی ابتدا کی گئی تھی۔ رنبیر سنگھ نے اکھنور کے مقام سے دریائے چناب پر ایک نہر کھدوائی جو تحصیل سانبہ کے ایک حصے کو سیراب کرتی تھی۔ اس حکمران نے سرکاری سرپرستی میں سڑکیں بنوائیں، مسافر خانے بنوائے اور بار برداری کا نظام پوری ریاست میں درست کرایا۔ رنبیر سنگھ کے زمانے میں ہی سرینگر کو ہالہ روڈ کا آغاز ہوا جسے جہلم ویلی روڈ کا نام دیا گیا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے پوری ریاست میں صنعت وحرفت کو ترقی دی۔ سری نگر کے کئی علاقوں میں پھولوں سے عرق کشید کرنے کے کئی کارخانے لگائے جن سے پھولوں کا عرق اور عطر حاصل کیا جاتا تھا۔ جموں میں شراب کشید کرنے کا کارخانہ لگایا۔ اس کے علاوہ ریاست میں باغات لگوائے، کشتواڑ میں نیلم کی کان دریافت ہوئی۔ اس سے نیلم نکال کر دوسرے ملکوں میں برآمد کیا جانے لگا۔ ریاست میں سیاسی قیدیوں اور عادی اخلاقی مجرموں کے لیے الگ الگ جیلیں بنوائی گئیں۔ فوج کے محکمہ کو دوبارہ منظم کیا گیا۔

مہاراجہ نے فوج کو چار بڑی کمانڈز (Commands) میں تقسیم کر رکھا تھا، ہر ایک کمانڈ کا الگ الگ جرنیل تھا۔ فوج میں ایک محکمہ شاہراہوں کو کشادہ کرنے کے لیے بنایا گیا

جسے آج انجینئر نگ کور بھی کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ فوج میں گارڈ، بندوقچی اور اردلی بھی بھرتی کیے جاتے تھے۔فوج کی اس کمانڈ کی تقسیم کو بیڑے کہا جاتا تھا۔ریاستی فوج کے دو بیڑے جموں میں تعینات تھے۔ایک بیڑا سری نگر اور ایک بیڑا شمالی علاقے کے دفاع کے لیے گلگت اور لدّاخ میں رکھا گیا تھا۔مہاراجہ رنبیر سِنگھ ایک علم دوست حکمران تھا اور اس نے اپنی ریاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مکمل مذہبی آزادی یقینی بنا رکھی تھی۔اس حکمران کے اندر دوسرے مذاہب کی رعایا کے لیے مذہبی تعصّبات بالکل نہیں تھے بلکہ مسلمانوں کے ساتھ اس کا سلوک روادارانہ اور منصفانہ تھا۔رنبیر سِنگھ کا سرمائی دربار جموں،منڈی کے وسیع صحن میں لگتا تھا۔جہاں لوگوں کی ہمیشہ بھیڑ رہتی تھی۔ریاست کے ہر حصے سے لوگ یہاں آتے تھے۔انصاف حاصل کرتے تھے۔صبح ((9نو بجے سے ((12 بجے تک دربارِ عام ہوتا تھا جبکہ رات کو دربارِ خاص ہوتا تھا۔اس دربار میں وزیر مہاراجہ سے ملکی معاملات اور حالاتِ حاضرہ پر بات چیت کرتے تھے۔اس دربارِ خاص میں دنیا کے حالات پر بھی کُھل کر بات چیت ہوتی تھی اور یہ سلسلہ ہر روز رات آٹھ بجے تک جاری رہتا تھا۔ان اوقاتِ کار پر باقاعدگی سے عمل کیا جاتا تھا۔

مہاراجہ رنبیر سِنگھ نے 1857ء سے لے کر 1885ء تک ریاست جموں کشمیر پر حکمرانی کی اور 12 ستمبر 1885ء کو جموں میں انتقال کر گیا۔رنبیر سِنگھ کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا پرتاب سِنگھ ریاست کا حکمران بنا۔پرتاب سِنگھ کے دو چھوٹے بھائی تھے۔رام سِنگھ اور امر سنگھ۔رام سِنگھ کو فوج کا کمانڈر انچیف یا آرمی چیف بنایا گیا اور امر سِنگھ کو وزیر داخلہ بنایا گیا جو داخلہ امور کا نگران کہلاتا تھا۔رنبیر سِنگھ نے اپنے دورِ حکمرانی میں انگریز سامراج کی ہندوستانی حکومت کو ریاست کے اندرونی معاملات میں براہِ راست مداخلت نہ کرنے دی تھی۔گو کہ آفیسرز آن سپیشل ڈیوٹی کا رول محدود تھا۔اب رنبیر سِنگھ کی موت کے بعد انگریز حکومت کو ایک اچھا موقع مل گیا تھا کہ وہ ریاست کے انتظامی معاملات پر کسی طریقے سے اپنی گرفت حاصل کریں جس کی رنبیر سِنگھ کے دور میں کوشش کی گئی تھی مگر اس میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

پرتاب سنگھ کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ اپنے باپ کی نسبت کمزور حکمران تھا اور انگریز یہ سوچ رہے تھے کہ کسی حربے سے ریاست جموں وکشمیر کا کنٹرول براہِ راست ان کے ہاتھوں میں آجائے تاکہ وہ اپنے مفادات کا سینٹرل ایشیا میں بہتر طریقے سے تحفظ کرسکیں۔ انگریز نے رنبیر سنگھ کے دور میں گلگت ایجنسی کو بحال کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی تھیں وہ کامیاب نہ ہوسکی تھیں کیونکہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی قدآور شخصیت ان کے راستے میں بڑی رکاوٹ بن کر کھڑی تھی۔ اب جونہی رنبیر سنگھ کی موت ہوئی انگریز نے ایک بار پھر گلگت ایجنسی کو بحال کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ پرتاپ سنگھ کے تخت نشین ہوتے ہی انگریز حکومت نے ریاست جموں کشمیر کے اندرونی معاملات میں پھر زیادہ دلچسپی ظاہر کرنا شروع کر دی۔ فوراً ریاست کے دربار میں تعینات آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی کی جگہ ریزیڈنٹ یا سیاسی نمائندہ تعینات کر دیا جو ریاستی انتظامیہ کو سپروائز (Supervise) کرے گا۔ اس پر مہاراجہ پرتاب سنگھ نے خوب شور ڈالا لیکن انگریز حکومت نے اس پر کوئی زیادہ توجہ نہ دی۔ یہ انگریز حکومت کی وہ چالیں تھیں جس کے ذریعے ریاست کے اندرونی معاملات کے بہانے مہاراجہ پر شدید دباؤ ڈالنا تھا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں انگریز حکومت نے کئی بار ریاست کا کنٹرول براہِ راست اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی جبکہ مہاراجہ کو تخت نشین ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے تھے۔ انگریز حکومت کے لیے ریزیڈنٹ آفیسر ریاست کے دربار میں تعینات ہونے سے کسی حد تک آسانی پیدا ہوچکی تھی کہ وہ ریاست کا کنٹرول براہِ راست اپنے ہاتھ لیں اور رُوس کو ریاست کی شمالی سرحدوں پر خود نگرانی کریں۔

انگریز حکومت جو کسی بہانے کی تلاش میں تھی اور اچانک کرنل پری نسبت (Col. Parry Nisbet) جو ریاست کے دربار میں ریزیڈنٹ آفیسر تعینات تھا، یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے مہاراجہ پرتاب سنگھ کا ایک خفیہ خط پکڑا ہے جو رُوس کی زار حکومت کو لکھا گیا تھا۔ اچانک یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ رُوسی فوج کی ریاست کے شمالی سرحدی علاقوں میں بڑی سرگرمیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ گویا یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ رُوس کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دے رہا ہے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی سازش

کر رہا ہے۔ اس سازش کا بہانہ بنا کر انگریز نے پرتاب سنگھ کو اس کے اختیارات سے محروم کر دیا اور کونسل آف سٹیٹ یا ایجنسی کونسل کے قیام کا اعلان کر دیا جو ریاست جموں کشمیر پر حکمرانی کرے گی۔ انگریز حکومت نے فوراً گلگت ایجنسی کا قیام بھی عمل میں لایا اور اس کا کنٹرول گلگت میں تعینات انگریز سیاسی ایجنٹ کو دے دیا۔ کیونکہ انگریز کو رُوس کا خوف تھا، کرنل ڈیورنڈ (Col. Durand) جو گلگت میں پہلا سیاسی ایجنٹ تعینات ہوا تھا نے کہا کہ سارا کچھ رُوس کی وجہ سے ہوا ہے۔ انگریز حکومت نے چترال پر بھی قبضہ کر لیا اور کہا کہ انہیں رُوس سے خطرہ لاحق ہے اور ان علاقوں کا کنٹرول حاصل کرنا ہندوستان کی سلامتی سے جُڑا ہوا ہے۔

اسی دوران 1890ء میں رُوسی فوجیں پامیر کے قریب پہنچ کر افغان باڈر پر رُکی ہوئی تھیں۔ اس طرح انگریز حکومت نے ڈوگرہ حکومت کے کنٹرول سے چھوٹی چھوٹی خاندانی جاگیروں کو اپنے کنٹرول میں کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ انگریزوں کی پالیسی کو دیکھتے ہوئے ہنزہ کے میر صفدر علی خان نے اپنا ایک مشن تاشقند بھیجا۔ اس نے رُوس سے انگریز کے خلاف مدد مانگی لیکن رُوس نے ہنزہ کے میر کی کوئی مدد نہ کی۔ انگریز حکومت نے 1891ء میں ہنزہ اور نگر کی خاندانی ریاستوں پر قبضہ کر لیا اور ریاستِ جموں کشمیر کی شمالی سرحدوں کی طرف سے انگریز سامراج کے مفادات کا تحفظ کر لیا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کو انگریز حکومت نے دراصل محلاتی سازش کے ذریعے طاقت سے محروم کیا تھا۔ اس سازش میں اس کا اپنا چھوٹا بھائی امر سنگھ بھی ملوث تھا۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ انگریز تو اپنے لئے موقع کی تلاش میں تھے اور ریاست میں اسپیشل آفیسرز کی جگہ ریذیڈنٹ تعینات کرانا چاہتے تھے۔ تا کہ ریاست کے انتظامی اُمور میں دخل دے سکیں جو پچھلے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں بہت کوششوں کے باوجود نہیں کر پائے تھے اور یہ معاہدۂ امرتسر کی بھی خلاف ورزی تھی۔ اب اختیارات سٹیٹ کونسل کو منتقل ہو چکے تھے۔ اس کونسل کا ایک صدر ہوتا تھا، ایک نائب صدر اور تین کونسل کے ممبرز ہوتے تھے۔ یہ کونسل 1889ء سے لے کر 1905ء تک قائم رہی۔ 1898ء میں ریاست کا آرمی چیف اور پرتاب سنگھ کا بھائی رام سنگھ فوت ہو گیا۔ آرمی چیف کا عہدہ بھی دوسرے بھائی امر سنگھ کو دیا گیا جو وزیر داخلہ بھی تھا۔

دراصل انگریز حکومت نے پرتاب سنگھ کے خلاف محلاتی سازش کیسے بنائی اس کا حال کچھ اس طرح ہے کہ پرتاب سنگھ کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ امر سنگھ اس کا چھوٹا بھائی جو داخلہ اُمور کا نگران اور فوج کا بھی نگران بن گیا تھا یہ خیال کرتا تھا کہ پرتاب سنگھ کے بعد تخت وتاج کا مالک وہی بنے گا۔ پرتاب سنگھ نے پونچھ کے راجہ بلدیو سنگھ کے بیٹے جگت دیو سنگھ کو اپنا جانشین بنا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا جو انہی کے خاندان سے تھے۔ پرتاب سنگھ کے اس اقدام کی وجہ سے امر سنگھ ناراض ہو گیا اور دونوں بھائیوں میں کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ آخر طے پایا کہ جگت دیو سنگھ مہاراجہ پرتاب سنگھ کی ریاستی حکومت میں جانشین نہیں ہو گا بلکہ اس کے ذاتی معاملات تک محدود رہے گا اور مہاراجگی اس کو نہیں دی جائے گی۔ یہ بات دونوں بھائیوں میں طے پا گئی لیکن تلخی قائم رہی۔ انگریز کو مداخلت کر کے پرتاب سنگھ کو اس کے عہدے سے ہٹانے کی یہی وجہ بنی تھی۔ دراصل پرتاب سنگھ کے دونوں بھائی بھی اس کو کسی طرح کا عہدہ دینے کے حق میں نہ تھے تا کہ دوسرے خاندان کے گود لیے گئے بچے کو اپنا جا نشین نہ بنا سکے۔

انگریز حکومت کے ایجنٹوں کو موقع مل گیا اور اس سازش میں کامیاب ہو گئے۔ سٹیٹ کونسل کا 1905ء میں خاتمہ کر دیا گیا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کو دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا لیکن مہاراجہ کا پرائیویٹ سیکرٹری جو انگریز حکومت کا سرکاری افسر تھا وہ مہاراجہ کے انتظامی اُمور کا نگران بن گیا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اس کا عہدہ ختم کر کے اس سے نجات حاصل کی۔ سٹیٹ کونسل کے ممبران کے عہدے ریاست کے وزیروں کے عہدوں میں بدل دیئے گئے۔ اس دوران سٹیٹ کونسل نے ریاست میں پچھلے دور کی ترقیاتی پالیسیوں کو جاری رکھا اور رنبیر سنگھ نے ریاست کے جو محکمے بنائے تھے اس میں مزید اضافہ کیا گیا۔ سٹیٹ کونسل کے دور میں ریاست جموں کشمیر میں درج ذیل اہم منصوبے شروع کئے گئے۔

1۔ محکمہ مال

ریاست جموں کشمیر میں بندوبستِ اراضی کا کام شروع کیا گیا۔ ریاست کے

انتظام زمین کے بندوبست کو جدید اصولوں کے مطابق چلانے کے لیے محکمہ مال قائم کیا گیا تھا۔ اس بندوبستِ اراضی کا فائدہ کسانوں اور زراعت پیشہ لوگوں کو ہوا اور زراعت کے شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی۔ محکمہ مال کے پرانے آفیسرز کے طریقہ کار کو بدل کر اس کی جگہ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد کو بھرتی کیا گیا۔ اس محکمہ کو حساب کا محکمہ کہا جاتا تھا یا دفتر دیوانی نام تھا۔ اس کو بدل کر اکاونٹینٹ جنرل کا دفتر قائم کیا گیا۔ اس محکمہ کو اتنا بہتر بنایا گیا کہ ریاست میں صاف ترین کام کرنے والا یہی محکمہ تسلیم کیا جاتا تھا۔

2۔ محکمہ جنگلات

محکمہ جنگلات کو بھی جدید اصولوں کے مطابق ترتیب دیا گیا۔ اس کام کے لیے لوگوں کو انگریز حکومت کے زیر اہتمام چلنے والے فاریسٹ کالج کی تعلیم و تربیت کے لئے دہرہ دون بھیجا جانے لگا اور تربیت یافتہ انگریز افسروں کو محکمہ میں بھرتی کیا گیا۔ اس اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست بھر کے جنگلات ہرے بھرے رہنے لگے اور محکمہ جنگلات کی آمدنی ریاست کے ہر محکمے سے زیادہ ہوگئی تھی۔ فوج کی تشکیل نو کی گئی اور کشمیر سے گلگت تک اور گلگت سے ہنزہ تک اور دوسری طرف بونجی سے چیلاس تک فوج کی آمدورفت کے لیے سڑکیں تعمیر کی گئیں ۔ دریاؤں اور ندی نالوں پر پُل بنائے گئے۔

3۔ محکمہ تعمیرات

محکمہ تعمیرات قائم کیا گیا اور اس محکمہ کو چلانے کے لیے قابل افسروں کی خدمات لی گئیں ۔ وادی جہلم کی سڑک جو زیر تعمیر تھی اس محکمہ کو فعال بنانے کی وجہ سے جلد مکمل ہوگئی اور اس کو پختہ کیا گیا۔ مالِ تجارت جو پہلے انسانوں اور حیوانوں پر لاد کر لائے جاتے تھے، سڑک کی تعمیر سے چھکڑوں اور ٹرکوں پر لاد کر آنے اور جانے لگے۔ بعد میں سری نگر سے جموں تک پختہ سڑک تعمیر کی گئی۔ ریاست کے دونوں دارالحکومتوں کے درمیان سفر کی سہولتوں کی وجہ سے آمدورفت میں آسانی ہوگئی۔ مظفر آباد کو بھی پختہ سڑک کے ذریعہ ایبٹ آباد سے ملا دیا گیا۔

اس طرح سری نگر کو جموں، ایبٹ آباد اور راولپنڈی سے ملا دیا گیا تھا۔لدّاخ اور سکردو کی سڑک کو مزید ترقی دی گئی اور دریائے توی کے اوپر ایک پُل تعمیر کیا گیا۔

4۔محکمہ آبپاشی

آبپاشی کا محکمہ قائم کیا گیا اور اس محکمے نے دریائے چناب کاٹ کر اکھنور کے پاس ایک نہر تعمیر کی گئی تھی۔ یہ نہر رنبیر سِنگھ پورہ اور جموں تحصیلوں تک پہنچائی گئی۔ اس کو مزید وُسعت دے کر سیالکوٹ تک پانی پہنچایا گیا۔اس نہر سے بہت بڑے رقبہ کو آبپاشی کے لیے پانی مہیا کیا گیا تھا۔

5۔بجلی کا محکمہ

جموں میں بجلی پیدا کرنے کے لیے بجلی گھر بنایا۔اس کے ذریعہ جموں شہر کو بجلی مہیا کی جاتی تھی اور مشینیں چلائی جاتی تھیں۔ کشمیر میں نہرِ لولاب کو صاف کر کے آبپاشی کے قابل بنایا گیا اور آبپاشی کے رقبہ میں اضافہ کیا گیا۔زینہ گیر کے علاقہ کو سیراب کرنے کے لیے دریائے بنڈ پورہ سے ایک بڑی نہر نکالی گئی تھی اور اس سے زینہ گیر کا سارا خشک رقبہ آبپاشی کے قابل ہوا ۔دریائے پھلگام سے بھی ایک نہر تعمیر کی گئی جس کی بدولت ایک بڑا بارانی رقبہ سیراب ہوا۔ اس محکمہ نے دریائے توی سے پائپ کے ذریعہ شہر میں پانی کو لایا اور شہر میں پینے کے پانی کی قلت دور کی گئی۔

6۔ٹیلی فون کا محکمہ

ٹیلی فون کا نظام قائم کیا گیا۔راولپنڈی سے سری نگر، سری نگر سے گلگت، چترال، بونجی، چیلاس اور گلگت سے سکردو تک ٹیلی فون کا انتظام کیا گیا اور انگریز حکومت کی مدد حاصل کی گئی۔ایک ٹیلی فون لائن سری نگر سے لدّاخ تک بچھائی گئی جو کارگل سے سکردو تک جاتی تھی۔ ٹیلی فون کی وجہ سے جموں، سری نگر، گلگت، بلتستان اور سکردو تک تعلق قائم ہو گیا اور رابطہ

کرنے میں آسانی پیدا ہوگئی۔اس کے ساتھ محکمہ ڈاک بھی قائم کیا گیا۔

7۔محکمہ کسٹم

محکمہ کسٹم ڈیوٹی کے ذریعہ چونگی وصول کیا جانے لگا اور اس کا سرکاری انتظام ہونے سے ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔ کسٹم ڈیوٹی کا محکمہ قائم ہونے سے پہلے چونگی محصول ٹھیکیداروں کے ذریعہ وصول کیا جاتا تھا۔ٹھیکیداری نظام ختم کر دیا گیا تھا۔

8۔کارخانہ داری

ریشم کا کارخانہ لگایا گیا۔اس سے لوگوں کو روزگار میسر آیا اور ریاست کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا۔

9۔محکمہ شکار

جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے محکمہ قائم کیا گیا جو شکار کا محکمہ کہلاتا تھا اور شکار کو محدود کرنے کے لیے لائسنس جاری کیا جاتا تھا۔ٹراؤٹ مچھلی یورپ سے لا کر کشمیر کے ندی نالوں میں پھیلائی گئی اس مچھلی کے شکار کے خصوصی قواعد وضوابط بنائے۔

10۔کُتب خانہ

کشمیر اور جموں میں کُتب خانے، ریڈنگ روم اور کلب بنائے گئے جہاں علم کے شوقین کے لئے مطالعہ کا انتظام ہوتا تھا۔

11۔محکمہ صحت

ہسپتال قائم کیے گئے اور ان کو جدید اصولوں کے مطابق ڈھالا گیا۔سری نگر اور جموں میں بڑے ہسپتال بنائے گئے جبکہ قصبوں اور دیہاتوں میں چھوٹے صحت کے سنٹر یا ڈسپنسریاں قائم کی گئیں۔

12۔ جانوروں کے ہسپتال

جانوروں کے لیے بھی شفا خانے کھولے گئے جہاں مویشیوں اور دیگر جانوروں کا علاج کیا جانے لگا۔ ہر ضلع میں ایک ڈاکٹر بھی مہیا کیا گیا۔

13۔ پَن بجلی گھر

انگریز اور امریکی انجنیئر وں کی مدد سے مہورہ کا بجلی گھر قائم کیا گیا۔ یہ ایک طرف اوڑی، دوسری طرف سری نگر اور گلمرگ تک بجلی سپلائی کرتا تھا۔ روشنی کے علاوہ کئی کارخانے بھی اسی پاور ہاؤس سے چلتے تھے۔ یہ بجلی گھر ریاست کے علاوہ ہندوستان کے تمام بجلی گھروں سے بڑا تھا۔ ہندوستان میں ٹاٹا بجلی گھر بن جانے سے مہورہ بجلی گھر نمبر دو پر ہو گیا۔

14۔ تعلیم کا محکمہ

تعلیم کا محکمہ پہلے ہی قائم کیا گیا۔ مہاراجہ پرتاب سِنگھ نے تعلیم پر کافی توجہ دی۔ جموں میں ہائی سکول کے علاوہ ایک آرٹس کالج بھی بنایا گیا جس کے ساتھ ایک بورڈنگ ہاؤس بھی بنایا گیا تھا۔ اس کا انتظام نہایت ہی اچھا تھا۔ سری نگر میں بھی ایک آرٹس کالج قائم کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ بھی ایک بورڈنگ ہاؤس بنایا گیا تھا۔ سرینگر میں ایک دستکاری کالج بھی قائم کیا گیا تھا۔ متعدد مقامات پر ہائی سکول اور مڈل سکول کھولے گئے تھے اور ہر گاؤں میں پرائمری سکول کھولے گئے تھے۔ افسرانِ مال کے لیے بندوبستِ اراضي کا کام سیکھنا اور قانونی امتحان پاس کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے پرانا طریقہ ختم ہو گیا اور نئے آفیسرز بھرتی کئے گئے جن کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ تمام محکموں کے کاموں کو الگ الگ کیا گیا تھا۔

15۔ عدالتی نظام

عدالتوں کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ فوجداری، دیوانی عدالتوں کو کام کے لحاظ سے تقسیم

کیا گیا تھا۔عدالتوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا تھا۔ ہر تحصیل میں ایک ایک سب جج اور ہر ضلع میں ایک جج تعینات کیا گیا تھا۔ ان ججوں کو فوجداری اختیارات بھی دیے گئے تھے۔ ہر ایک شعبہ کے لیے قوانین اور قواعد مرتب کیے گئے تھے اور کام کو قوانین کا پابند کیا گیا تھا۔ عدالتوں میں وکیلوں کا رواج تھا۔ بیگار کا خاتمہ کر کے سفر کے لیے مزدوری کا استعمال شروع ہوا تو ان کی مزدوری کا تعین کیا گیا تھا لیکن یہ بیگار پوری طرح ختم نہ ہوئی۔ 1905ء میں سٹیٹ کونسل کا خاتمہ ہوا اور مہاراجہ پرتاب سنگھ کے تمام اختیارات واپس بحال ہو گئے۔ اختیارات کے بحال ہوتے ہی مہاراجہ نے ریاست کی تعمیر و ترقی کے ساتھ سرحدوں کی حفاظت پر کافی توجہ دی۔ 1915ء مہاراجہ پرتاب سنگھ نے تعلیمی اصلاحات کے لیے انگریز حکومت کے سیکرٹری تعلیم کو ریاست میں بلایا۔ اس نے ایک جامع تعلیمی پروگرام بنا کر ریاستی حکومت کو دیا۔ اس تعلیمی منصوبے کے تحت ریاست میں کئی کالج اور سکول کھولے گئے۔ گو کہ وہ تعلیمی پالیسی ریاستی حکومت پوری طرح لاگو نہ کر سکی۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے راولپنڈی سے سری نگر تک ایک ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ بھی بنایا تھا جو کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں انتقالِ اراضی اور حقوقِ ملکیت کا قانون نافذ کیا گیا تھا۔ اسی دور میں ریاست کے شہری علاقوں میں غیر سیاسی انجمنیں بھی بننا شروع ہو گئی تھیں۔ جموں شہر میں 1909ء میں "ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ "ڈوگرہ صدر سبھا" جیسی تنظیم بن گئی تھی۔ ریاستی سماج نئی سوچوں کے ساتھ انگڑائی لینے لگا۔ 1909ء میں وزیر داخلہ اور فوج کا نگران اَمر سنگھ وفات پا گیا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ خود فوج کا نگران بن گیا۔ اَمر سنگھ کے مرنے کے بعد اس کے جواں سالہ بیٹے راجہ ہری سنگھ کو مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اپنا جانشین بنا لیا تھا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں کشمیر کے کئی گورنر تعینات کیے گئے۔ کسی بھی گورنر کی مدت تو مقرر نہیں تھی لیکن کسی ایک بندے کو زیادہ عرصہ کے لیے کسی بھی صوبے کا گورنر نہیں رہنے دیا گیا تھا بلکہ کچھ سالوں بعد نئے گورنر کی تقرری کی جاتی تھی۔ پرتاب سنگھ کے زمانے میں کشمیر کے بارہ ((12 گورنر لگائے گئے تھے۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے زمانے میں حیدر آباد دکن کی ریاست کے بعد 562

ہندوستانی ریاستوں میں جموں کشمیر تعمیر وترقی کے درجہ میں دوسرے نمبر پر تھی۔ مہاراجہ پرتاب سِنگھ کا دورانگریز کیلئے بڑا اہم تھا کیونکہ انگریز حکومت کی مداخلت ریاستی اُمور میں کافی بڑھ گئی تھی اور طے شدہ حدود سے تجاوز کرگئی تھی۔ ہندوستان کی انگریز حکومت نے سب سے زیادہ سازشیں مہاراجہ پرتاب سِنگھ کے دور میں کیں اور ریاستی حکومت سے کیے گئے معاہدوں کی بار بار خلاف ورزی بھی کی۔ ان حدود سے تجاوز کیا جو معاہدہ امرتسر میں ریاست کے مہاراجہ گلاب سِنگھ کے ساتھ طے کی تھیں۔ انگریز نے ریاست میں ریذیڈنٹ تعینات کر نے کی بار بار کوشش کی لیکن وہ مہاراجہ رنبیر سِنگھ کی مضبوط شخصیت کی وجہ سے ایسا کرنے سے گھبراتے تھے۔ پرتاپ سِنگھ کے دور میں انگریز حکومت کی سازشیں رنگ لائیں اور ریذیڈنٹ مسلط کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مہاراجہ پرتاب سِنگھ نے اپنی بہتر حِکمت عملی سے ریاست میں انگریز کی اندرونی معاملات میں مداخلت کو کم کرایا، اپنے اختیارات بھی بحال کرائے اور اسٹیٹ کونسل کا بھی خاتمہ کرایا۔ مہاراجہ پرتاب سِنگھ کا دور ترقی اور ریاست کی سرحدوں کی وسعت کے لحاظ سے سب سے اچھا دور تصور کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ریاست کے اِنتظامی افسران انگریز کے صوبہ پنجاب کے افسران کی برابری کا دعوٰی کرتے تھے۔ ریاست کی حدود کی وسعت کے لحاظ سے اس دور میں ہندوستان کی کوئی بھی ریاست جموں کشمیر کی برابری کا دعوی نہیں کرسکتی تھی اور یہ کہا جاتا تھا کہ ریاست کی شمالی سرحدیں وہ علاقے ہیں جہاں تین سلطنتیں (ایمپائرز) آپس میں ملتی ہیں۔ مہاراجہ پرتاب سِنگھ 23 دسمبر 1925ء کو وفات پا گیا اور اس کی جگہ مہاراجہ ہری سِنگھ حکمران بنا۔

دنیا میں خاندانی بادشاہتوں کا دور کافی طویل رہا ہے۔ کئی بادشاہوں نے اپنی سلطنتیں قائم کیں اور ان پر حکمرانی کی لیکن کسی بادشاہ نے کبھی انصاف کو اپنا مذہب قرار نہیں دیا۔ شخصی حکمرانی میں انصاف کرنا رعایا پر احسان کرنے کے مترادف ہوا کرتا تھا۔ مہاراجہ ہری سِنگھ نے 9 جولائی 1925ء میں ریاست جموں کشمیر کا حکمران بنتے ہی انصاف کو اپنا مذہب قرار دیا۔ اس پر مہاراجہ ہری سِنگھ نے کتنا عمل کیا اس کا اندازہ اس کے دور حکمرانی میں انصاف کے لیے کیے گئے اقدامات سے لگایا جاسکتا ہے۔ چونکہ انصاف کے تقاضے کسی حکمران کے

دعوے سے نہیں بلکہ اس کے انصاف کے لئے اٹھائے گئے عملی اقدامات ہی پیمانہ تصور کیے جائیں گے۔ کسی بھی حکمران کے لیے بہترین پیمانہ اُس کی کارکردگی ہوگی۔ اس لئے ہم مہاراجہ کے دعوی کو بھی اس معیار پر پرکھیں گے۔ گو کہ شخصی راج میں انصاف کے معیار اور پیمانے بھی جمہوری دور سے مختلف ہوتے تھے لیکن پھر بھی انصاف کا کوئی معیار ضرور موجود تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ جدید انگریزی سکولوں سے تعلیم یافتہ تھے اور جدید زمانے اور سماج کے تقاضوں سے واقف تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ جدید تعلیم کے علاوہ 1922ء میں بننے والی اسٹیٹ کونسل کے سینئر ممبر کی حیثیت سے ریاستی اُمور اور عوامی مسائل سے آگہی حاصل کر چکے تھے۔ یہ اسٹیٹ کونسل مہاراجہ پرتاب سنگھ کی ریاستی اُمور چلانے میں مدد کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس سے پہلے مہاراجہ ہری سنگھ ریاست کی فوج کے چیف کے عہدے پر بھی رہ چکے تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے 1927ء میں ایک شاہی فرمان جاری کرتے ہوئے (State Subject Rule) باشندہ ریاست قانون بنانے کا حکم جاری کیا۔ یہ قانون ریاستی عوام کے لئے دو طرح سے فائدہ مند تھا۔ اس قانون کے بن جانے سے ایک طرف ریاست کے شہریوں کی زمین اور دوسری پراپرٹی کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا تو دوسری طرف ریاست کے اندر رہنے والی قوموں اور قومیتوں کی شناختوں کو تحفظ دینے کے لیے ایک مستقل قانونی نظام نافذ کیا گیا۔ اگر مہاراجہ ہری سنگھ یہ قانون باشندہ ریاست نافذ نہ کرتا تو ریاست میں بسنے والی قوموں اور قومیتوں کے لیے اپنی زمین اور ثقافتی شناخت بچانا بہت مشکل ہوتا۔ ریاست میں بسنے والی کشمیری، لدّاخی، بلتی، گلگتی، ڈوگرہ اور پہاڑی زبان بولنے والی قومیں اپنی الگ الگ ثقافتی پہچان رکھتی ہیں۔ انھوں نے یہ شناختیں چاہے لسانی، علاقائی یا ثقافتی ہوں ایک تاریخی ارتقاء کے مراحل سے گزر کر حاصل کی ہیں اور آج یہ ساری شناختیں ایک تاریخی ارتقاء کے نتیجہ میں حقیقت کا روپ اختیار کر چکی ہیں۔

اس باشندہ ریاست کے قانون یا سٹیٹ سبجیکٹ رول (S.S.R) کے تحت کوئی غیر ریاستی باشندہ ریاست میں زمین اور دوسری جائیداد خریدنے کا اہل نہیں ہوگا۔ اس قانون کے نفاذ کی وجہ سے ریاست کے باہر سے آنے والے افراد کی جگہ ریاستی لوگوں کو نوکریوں میں

ترجیح دی جائے گی اور نوکری میں پہلا حق ریاستی شہری کو دیا گیا تھا۔ اس قانون کی وجہ سے ریاستی شہریوں کی منفرد حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ قانون آج بھی ریاستی شہریوں کی شناخت بچانے کا ضامن بنا ہوا ہے۔ ریاست کی جبری تقسیم کی وجہ سے اس قانون پر مختلف ریاستی حصوں میں حملے کیے گئے ہیں لیکن ریاستی باشندے اس قانون کو بحال رکھنے کی حمایت کرتے ہیں اور مہاراجہ ہری سنگھ سے ریاست کے پڑھے لکھے طبقے کی ایسی ہی توقعات وابستہ تھیں۔

1۔ مہاراجہ نے 1926ء میں ایک زرعی قانون بنایا جس کی رو سے سود خور ساہوکاروں سے کسانوں کو نجات ملی۔ یہ کسانوں کو تھوڑا سا قرض دے کر اس رقم سے دوگنا سود بنا کر ان کی زمین ہتھیا لیتے تھے۔

2۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے 1928ء میں ایک شاہی فرمان جاری کرتے ہوئے ریاست میں ہائی کورٹ کی تشکیل کا حکم دیا اور ریاست میں ہائیکورٹ قائم ہوئی۔

3۔ عدلیہ کو شہریوں کے بنیادی حقوق سمیت سِول اور سیاسی حقوق کا ضامن اور ان کے تحفظ کا ذمہ دار بنایا۔ ہائی کورٹ اور سیشن کورٹ کے ججوں کو اختیار دیا کہ وہ دوران انوسٹی گیشن بھی کسی شہری کی آزادی اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزی نہ ہونے دیں۔

4۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے ذات پات اور چھوت چھات کی قدیم ہندو رسم کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوئے اسے جُرم کے درجہ میں ڈال لیا۔ شیڈول کاسٹ (Scheduled) کے ریاستی شہریوں کو عبادت گاہوں اور عوامی جگہوں میں جانے کا قانون بنایا۔ یہ ریاست ہندوستان کی پہلی ریاست تھی جس نے بچھڑی ہندو جاتی کے شہریوں کے لیے ایسے اقدامات اٹھائے تھے۔

5۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے پرائمری تک ضروری تعلیمی ایکٹ بنایا جسکی رو سے بچوں کے والدین کو پابند کیا گیا کہ وہ اپنے بچوں کو سکول بھیجنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس کو جبری تعلیم بھی کہا جاتا ہے کیونکہ بچوں کو سکول نہ بھیجنے پر والدین کو جرمانہ عائد ہوسکتا تھا۔

6۔ مہاراجہ ہری سِنگھ نے بچوں کی شادی کے روک تھام کے لیے چائلڈ میرج

ایکٹ(Child Marriage Act) بنایا۔اس قانون کی رو سے بچوں کی شادی 18 سال سے کم کرنے پر والدین کو مجرم قرار دیا جائے گا تاہم لڑکی کی شادی کی عمر 14 سال مقرر کی گئی۔

7۔ جسم فروشی اور نشہ کرنا قانوناً ممنوع قرار دیا گیا تھا۔مہاراجہ نے ایک سخت آرڈیننس جاری کرتے ہوئے بلتستان کی عورتوں کو دوسرے علاقوں میں لے جانے پر قانونی پابندی عائد کردی تھی۔

8۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے 22-1921ء کے زمانے میں خوراک کی قلت کا مسئلہ حل کرنے کے لیے جان توڑ کوششیں کی اور وادی کشمیر میں قحط جیسی صورتحال پیدا ہونے والی تھی جس کو مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی ذہانت اور قابلیت سے روکا تھا۔

9۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے مذہبی رواداری قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کے ساتھ سرینگر میں عید کی نماز میں بھی شمولیت کی تاکہ عوام کو یہ احساس نہ ہو کہ ان کا حکمران کسی دوسرے مذہب کا پیروکار ہے۔اس نے مسلم عوام کو اس طرح اپنے ساتھ ہونے کا احساس دلایا۔ریاست کی انتظامی نوکریوں میں مہاراجہ نے ریاستی شہریوں کو اولیت دی اور اس میں ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے شہری شامل تھے۔یہ ابھی ابتدائی دور حکمرانی ہے بعد میں کسی حد تک ریاستی بیوروکریسی اور حکومت کے اہلکاروں کی انتظامی اُمور سے عدم دلچسپی کی وجہ سے عوام میں مہاراجہ کی حکمرانی پر بھی سوال اٹھنے لگے کیونکہ خودغرض لوگ عوام کو تنگ کرنے لگے۔ریاست میں حکومتی اہلکاروں سے کشمیری بولنے والوں کی شکایت خاص کر بڑھ گئی تھی۔ریاست میں تعلیم عام ہونے کی وجہ سے نوجوانوں میں بے روزگاری بڑھنے لگی اور اس کا شکار ہندو اور مسلمانوں دونوں ہی تھے۔بدقسمتی سے اس بے روزگاری کے مسئلے کو بھی مذہبی رنگ دیا جانے لگا۔مسلمان کیونکہ دیر سے تعلیم حاصل کرنا شروع ہوئے تھے اس لیے سرکاری نوکریوں میں ان کی شرح بھی کم تھی۔اسی دوران چند ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ریاست میں جونہی فرقہ وارانہ سیاست پھیلنے لگی تو

ہندوستان کی انگریز حکومت نے خفیہ طریقے سے اس کی حوصلہ افزائی شروع کردی۔ یہ انگریز حکومت کی طرف سے مہاراجہ ہری سِنگھ پر دباؤ ڈالنا تھا چونکہ مہاراجہ ہری سِنگھ نے 1925ء سے انگریز حکومت سے مطالبہ کرنا شروع کردیا تھا کہ گلگت ایجنسی کا خاتمہ کرکے ان علاقوں کو واپس مہاراجہ کی ریاستی حکومت کے انتظامی کنٹرول میں دیا جائے۔گلگت ایجنسی کے خاتمے کا مطالبہ اور 1930ء میں لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں مہاراجہ کی تقریر انگریز حکومت کے لیے تشویش کا باعث بن گئی تھی۔مہاراجہ گول میز کانفرنس میں ہندوستانی شاہی ریاستوں کی نمائندگی کرنے گئے تھے جس میں انہوں نے خطاب کے دوران کہا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں سے برابری کا سلوک کریں۔اندرونِ ریاست انگریز حکومت کے تعینات سیاسی نمائندوں کی جگہ واپس مہاراجہ رنبیر سِنگھ کے دور میں تعینات برائے نام اسپیشل آفیسرز پر زور دیا اور پولیٹکل ایجنٹ تعینات کرنے کو معاہدہ امرتسر کی خلاف ورزی قرار دیا۔گلگت کے اس وقت دو انتظامی حصے تھے۔ایک گلگت ایجنسی جو انگریز حکومت کے تعینات کیے گئے سیاسی ایجنٹوں کے ذریعے ہندوستان کی انگریز حکومت کے انتظامی کنٹرول میں تھے اور دوسر حصہ گلگت وزارت کا تھا جو براہِ راست مہاراجہ ہری سِنگھ کی حکومت کے زیر انتظام تھا۔

مہاراجہ انگریز پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ گلگت ایجنسی بھی واپس ریاستی حکومت کے کنٹرول میں دی جائے اور انگریز مہاراجہ حکومت سے گلگت وزارت کا کنٹرول بھی مانگ رہے تھے۔ یہ کشمکش مہاراجہ حکومت اور انگریز کی ہندوستان حکومت کے درمیان شروع کے چند سالوں میں شروع ہوگئی تھی۔مہاراجہ نے ابھی تک گلگت وزارت انگریز حکومت کے حوالے کرنے کے بجائے گلگت ایجنسی کی واپسی کا مطالبہ جاری رکھا ہوا تھا۔اب انگریز نے مہاراجہ ہری سِنگھ کا گول میز کانفرنس میں خطاب سننے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مہاراجہ کو دباؤ میں لانے کے لیے ریاست کی مسلم سیاسی تنظیموں کو استعمال کیا جائے۔اس مقصد کے لیے انگریز حکومت نے ہندوستان میں ہندو مسلم کی منقسم سیاست کا فائدہ اٹھانے کے لیے مذہبی حربے استعمال

کرنے کا پروگرام بنایا۔ ریاست میں کسی حد تک انگریز حکومت کے ایجنٹ فرقہ وارانہ ماحول پیدا کر چکے تھے جو انگریز کے لیے موقع تیار کر چکا تھا۔ عبدالقدیر خان نامی ایک خفیہ کردار نے اس فرقہ وارانہ آگ کو تیلی لگائی جب اس نے خانقاہ شاہ ہمدان میں ایک نفرت بھری فرقہ پرستانہ ہجوم کو مشتعل کرنے والی تقریر کی جو ریاستی قانون کی خلاف ورزی تھی۔ یہ عبدالقدیر نامی خفیہ کردار کسی یورپین سیاح کے ساتھ باورچی بن کر سرینگر آیا ہوا تھا۔ اس کو ریاستی پولیس نے گرفتار کرلیا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا۔

13 جولائی 1931ء کے دن عبدالقدیر خان کو عدالت میں پیشی کیلئے لایا گیا تو ایک بڑا مجمع ہجوم کی شکل میں عدالت کے باہر اکٹھا ہو گیا۔ عبدالقدیر خان کو جب عدالت میں سماعت کے لیے لایا گیا تو اس مشتعل ہجوم نے زبردستی عدالت کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو بے قابو ہجوم پر پولیس نے فائر کر دیا جس کے نتیجے میں کئی شہری ہلاک ہو گئے۔ یہ ہجوم جیل کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹیلی فون کی تاریں کاٹ دی گئیں اور جیل کے قیدیوں میں بھی بے چینی پھیل گئی۔ اس ہجوم کی وجہ سے ہی سماعت کی جگہ عدالت کے بجائے سینٹرل جیل منتقل کر دی گئی تھی۔ مہاراجہ ہری سِنگھ نے اس پولیس فائرنگ کی انکوائری کا حکم دے دیا لیکن اس کے باوجود فرقہ پرستی کی آگ سارے علاقوں میں پھیل گئی۔ ہندوں کی دوکانوں پر حملے کیے گئے کئی، دوکانیں لوٹ لی گئیں۔ تین ہندو قتل ہو گئے چونکہ مسلم فرقہ پرستوں نے پولیس فائرنگ کو مذہبی مسئلہ بنا دیا جس کا فائدہ انگریز کو ہوا اور انہوں نے مذہبی عناصر کو مزید حوصلہ دینا شروع کر دیا۔

مہاراجہ نے ایک انگریز کی قیادت میں پولیس فائرنگ کی انکوائری کے لیے کمیشن تشکیل دیا۔ جسے گلنسی (Glancy) کمیشن بھی کہا جاتا ہے۔ اس کمیشن کی دی گئی رپورٹ پر فوراً عمل درآمد کیا گیا اور گولی چلانے والے پولیس اہلکاروں کو سزائیں دی گئیں۔ ہم آج کے جمہوری دور میں بھی اس طرح کے عدل و انصاف سے محروم ہیں۔ مہاراجہ ہری سِنگھ کو گلگت ایجنسی ختم کرنے اور ان علاقوں کا کنٹرول اس کی ریاستی حکومت کے حوالے کرنے کا مطالبہ مہنگا پڑا اور وہ اس مصیبت سے اس وقت جان چھڑا پایا جب اس نے انگریز حکومت سے گلگت

ایجنسی کی واپسی کرنے کا مطالبہ بند کردیا کیونکہ فرقہ پرستوں نے ریاست بھر میں مذہب اور فرقے کی آگ کے شعلے بھڑکانا شروع کردیے تھے۔ دوسری طرف پنجاب کی مسلم پریس نے مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کردیا۔ اسکی حکومت کو ہندو حکومت قرار دے کر ریاستی مسلمانوں کی دُشمن قرار دینے کے لیے خوب پروپیگنڈہ مہم چلائی۔

انگریز پریس نے بھی ان مذہبی ایشوز کو ہندوستانی پریس میں خوب اُچھالا اور مہاراجہ کو مجبور کر دیا کہ وہ انگریزوں سے گلگت ایجنسی کا انتظام واپس لینے کے بجائے 1935ء میں گلگت وزارت جو ریاستی حکومت کے انتظامی علاقے میں تھی، انگریز حکومت کو 60 سال کی لیز (Lease) پر دینے پر مجبور ہوگیا۔ مسلم فرقہ پرستی نے ریاست میں سیاست کا رخ ہی بدل دیا۔ کیونکہ ریاست میں اکثریت مسلمان آبادی ہونے کی وجہ سے ہندو مہاراجہ کے شخصی راج کے خلاف چلنے والی سیاسی تحریک کا رخ بھی ہندو مسلم اور کشمیری اور جموں کی علاقائی سیاست کی طرف مڑ گیا۔ ریاست میں فرقہ پرستی کی سیاست کی وجہ سے انگریز حکومت کی خُفیہ مداخلت بھی بڑھ گئی۔ فرقہ پرستی کا حاوی رجحان، ریاستی سیاست میں انگریز کے لیے مہاراجہ حکومت کے خلاف راستے ہموار کرنے کا باعث بنا۔

ریاست میں 1932ء میں پہلی باقاعدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کی گئی اور اس جماعت کا نام ہی مسلم فرقہ پرستی کی عکاسی کرتا تھا۔ اس جماعت میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مسلم کانفرنس خالص مُسلم مذہبی سوچ کی عکاسی کرنے والے چند فرقہ پرست مسلم نوجوانوں نے بنائی تھی اور یہ جماعت ہندوستان کی فرقہ پرست جماعت مسلم لیگ سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ حالانکہ ریاست جموں کشمیر میں 77% مسلم آبادی والے سماج میں ایک فرقہ پرست جماعت بنا کر اپنے دوسرے مذاہب کے ہم وطنوں کو کوئی مثبت پیغام کیسے دیا جاسکتا ہے۔ چونکہ جاگیردارانہ سماج میں مذہب کا کردار زندگی کے ہر شعبے میں حاوی ہوتا ہے۔ ریاست جموں کشمیر کے عوام بھی جاگیردارانہ نظام سے نجات حاصل کرنے کے خواہاں تھے لیکن وہ ہندو مسلم کی آڑ میں کھیلے جانے والے کھیل سے ابھی ناواقف تھے۔ وہ بھی مذہبی فرقہ پرستی کی رجعت پسندانہ آگ میں جھلسنے لگے۔ یہ ریاست جموں وکشمیر

میں سیاسی سرگرمیوں کا ابتدائی زمانہ تھا۔ بہرحال مہاراجہ ہری سِنگھ ایک طرف ہندوستان کی انگریز حکومت کے دباؤ کے تحت شمالی سرحدوں میں رُوسی خطرے کے پیش نظر ان علاقوں کے کنٹرول پر انگریز کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے، دوسری طرف اندرونِ ریاست، سیاست اور انتظامی اصلاحات کے لیے ڈالے جانے والے سیاسی دباؤ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ اس لیے 1934ء میں مہاراجہ نے نمائندگی کی بنیاد پر پارلیمانی نظام کے نفاذ کا اعلان کرتے ہوئے ریاستی پارلیمنٹ کی تشکیل کی جس کا نام پرجا (Praja) سبھا تھا۔ اس ریاستی پارلیمنٹ کے 75 ممبران تھے جن میں 33 براہِ راست ووٹوں سے منتخب ہو کر آتے تھے۔ پرجا سبھا سوالات کرنے، قراردادیں پیش کرنے، بل متعارف کرانے کے ساتھ ریاست کے بجٹ پر بحث کر سکتی تھی۔ وزیراعظم مہاراجہ کا منتخب کیا ہوا ہوتا تھا اور وہ کسی بھی پارلیمانی بل کو دوبارہ بحث کے لیے واپس پرجا سبھا میں بھیج سکتا تھا۔ گو کہ یہ پارلیمنٹ عوام کی مکمل نمائندہ جمہوری ادارہ نہیں تھی بلکہ محدود نمائندگی کی بنیاد پر تھی جو کسی بھی بادشاہت کے نظامِ حکومت میں اہم قدم سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ پارلیمنٹ محدود ہی سہی لیکن عوامی نمائندگی کا ادارہ ریاست میں قائم کیا جا چکا تھا۔

پارلیمنٹ کے پہلے انتخابات 1934ء میں ہوئے۔ مسلم کانفرنس نے 21 مسلم نشستوں میں 19 پر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پارلیمنٹ مختلف مذہبی فرقوں، کمیونیٹز اور یکساں مفاد کے لوگوں کو ایک ایسی جگہ مہیا کر رہی تھی جہاں یہ سارے لوگ ایک دوسرے کی مشکلات اور مسائل سے آگاہ ہوں۔ اسی طرح 1932ء میں ہی مہاراجہ نے ریاست میں پریس کی آزادی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں کے لیے ریاست میں پریس کی آزادی بنیادی ضرورت تھی۔ اس طرح ایک شخصی راج میں جمہوری اصلاحات کا نفاذ عوامی شعور بلند کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

1935ء میں مہاراجہ نے انگریز حکومت کو گلگت وزارت بھی 60 سال کی لیز (lease) پر دے دی اور 29 مارچ 1935ء میں مہاراجہ حکومت اور ہندوستان کے وائسرائے کے نمائیندوں کے درمیان لیز (Lease) کے کاغذات پر دستخط ہوئے۔ لیز

معاہدے میں یہ طے پایا کہ ان علاقوں کا انتظامی کنٹرول انگریز کے پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس ہوگا لیکن یہ علاقے ریاست جموں کشمیر کا حصہ تصور کیے جائیں گے۔اس علاقے میں قدرتی وسائل بھی ریاست کی ملکیت تصور کیے جائیں گے۔گلگت وزارت کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد انگریز حکومت نے مہاراجہ کے خلاف مسلم جماعتوں کی طرف سے مذہبی دباؤ بھی ختم کرا دیا۔آل انڈیا کشمیر کمیٹی اور دیگر مسلم فرقہ پرست تنظیمیں جو پنجاب میں پروپیگنڈا کے لیے بنائی گئی تھیں 1933ء میں ہی ختم ہوگئی تھیں۔سر محمد اقبال آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے یہ کہتے ہوئے مستعفی ہوگئے کہ یہ احمدیہ فرقے سے جڑی ہوئی ہے اور کشمیریوں کے سیاسی حقوق سے زیادہ کمیٹی اپنے مذہبی عقائد پھیلانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ریاست جموں کشمیر میں 1931ء میں مہاراجہ حکومت کے خلاف جو بھی پرتشدد مظاہرے کرائے گئے تھے اس کے پیچھے لاہور اور شملہ میں قائم کی گئی کشمیر کمیٹی تھی جس کو ہندوستان حکومت کے چند انگریز آفیسرز اور پریس نے مدد کی تھی اور احتجاج کے لیے اُکسایا تھا۔اس کشمیر کمیٹی کو ایک بار پھر علامہ اقبال کی صدارت میں دوبارہ زندہ کیا گیا تھا تاکہ کشمیر میں مذہب کے نام پر ہندو مسلم سیاست کو مزید فروغ دیا جائے لیکن وہ دوسری بار پھر ناکام ہوئے۔اسی دوران ریاستی مسلمانوں کی لیڈر شپ یہ بھی سمجھنے لگی تھی کہ ہندوستان کی مذہبی سیاست کے پیچھے انگریز حکومت کا ہاتھ ہے اور کشمیر میں ہندو مسلم سیاست سے انگریز کو تو فائدہ ہوا ہے لیکن ریاستی مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ انگریز نے مہاراجہ سے اپنا مطلب حل ہونے کے بعد مہاراجہ حکومت پر کوئی دباؤ ڈالنے والا حربہ استعمال کیا نہ ریاست میں چلنے والی سیاسی تحریک کے مطالبات پر کوئی دھیان دیا۔اس طرح سیاسی لیڈر شپ کو یہ بھی سمجھ آ گئی کہ جماعت احمدیہ مسلمانوں کے حقوق کی آڑ میں مسلم عوام کو مذہبی فرقہ پرستی اور ہندو مسلم سیاست کی طرف دھکیل رہی ہے۔

ریاست جموں کشمیر میں ہندو مسلم فرقہ پرستی کی سیاست پہلے پہل جماعت احمدیہ کی مدد سے لائی گئی اور ہندوستان کی انگریز حکومت نے اس کی خوب حوصلہ افزائی کی۔جماعت احمدیہ کا ریاست کی سیاست میں اثر و رسوخ دیکھ کر ہندوستان کی ایک دوسری مذہبی جماعت مجلس احرار بھی ریاستی سیاست میں کود پڑی۔چونکہ احمدیہ جماعت ہندوستان میں مسلم لیگ کی

مذہبی سیاست کی بھرپورحمایت کرتی تھی جبکہ مجلس احرار کی ہمدردیاں انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ تھیں۔ ریاست میں ہندو مسلم فرقہ پرست سیاست کا آغاز ہندوستان کی انہی دو جماعتوں نے کیا تھا۔ دوسری طرف ریاست میں مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ یہ سمجھنے لگی تھی کہ ان مذہبی فرقہ پرست جماعتوں کے ذریعہ فوائد حاصل کرنے کے بجائے ہندوستان کی بڑی جماعتوں سے براہِ راست رابطے قائم کئے جائیں۔ مسلم کانفرنس کی ابتدائی لیڈرشپ میں جموں سے چودھری غلام عباس اور کشمیر سے شیخ عبداللہ پیش پیش تھے۔ گو کہ مسلم کانفرنس کی بنیاد ہی مذہبی فرقہ پرستانہ سیاست تھی اور انگریز حکومت بھی ریاست میں ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ شیخ صاحب جلد ہی کانگریس کی سیاست میں دلچسپی لینے لگے اور بظاہر فرقہ پرست ہندو مسلم سیاست سے بیزار ہونے لگے تو پنڈت پریم ناتھ بزاز نے انہیں اس مذہبی سیاست سے نکلنے میں مدد دی تھی۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے ہی شیخ عبداللہ کو پنڈت جواہر لال نہرو سے متعارف کرایا تھا اور نہرو سے کہا کہ شیخ عبداللہ ریاست جموں کشمیر کا سب سے بڑا عوامی لیڈر ہے لیکن شیخ صاحب کی سیاست صرف کشمیری مسلمانوں تک ہی محدود ہے۔ شیخ عبداللہ کی نہرو سے ملاقات کے بعد سیاسی خیالات میں بدلاؤ شروع ہوگیا اور شیخ صاحب اپنے آپ کو نظریاتی لحاظ سے قوم پرست سیاست دان ثابت کرنے لگے۔ اسی دوران مسلم کانفرنس نے 8 مئی 1936ء کے دن ساری ریاست میں ذمہ دار حکومت کا دن منانے کا اعلان کیا۔ شیخ عبداللہ نے ہندوؤں اور سکھ شہریوں سے بھی اس میں شامل ہونے کی اپیل کی۔ شیخ صاحب کی اپیل پر ریاست کے ہندو اور سکھ شہری بھی نہ صرف شامل ہوئے بلکہ حوصلہ افزائی کا باعث بنے اور اس دن ساری ریاست میں ہندو، مسلم اور سکھ لیڈروں نے اکھٹے ہو کر عوامی جلسوں سے خطاب کیا۔ سب لیڈروں نے ریاست میں اکھٹے ہو کر جدو جہد کرنے پر زور دیا اور ایک مشترکہ سیاسی پارٹی کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ 26 مارچ 1938ء میں مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں شیخ عبداللہ نے اپنے صدارتی خطاب میں واضع اعلان کیا کہ ہمیں ہندو مسلم فرقہ پرستی کی سیاست کا خاتمہ کرتے ہوئے سب کے لیے جدو جہد کے راستے کھول دینے ہوں گے اور اس مذہبی تفرقہ بندی سے نکلنا ہوگا۔

ایک ذمہ دار نمائندہ حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا۔ شیخ عبداللہ نے جب دیکھا کہ ریاست کے ہندو اور سِکھ شہری بھی اس کی اپیلوں پر کان دھرنے لگے ہیں اور سب کی خواہش ہے کہ ریاست میں ایک نمائندہ جمہوری حکومت قائم کی جائے جو ریاست کے تمام شہریوں کو برابری کے حقوق دے اور یہ مطالبہ مہاراجہ ہری سِنگھ کی بادشاہت کے اندر رہتے ہوئے کیے جا رہے تھے۔ ریاست میں کوئی بھی مہاراجہ کی بادشاہت کے خاتمے کا مطالبہ نہیں کر رہا تھا۔ اس طرح کی تبدیلی دیکھ کر شیخ عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سے مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم تشکیل دینے کے لیے مشورے شروع کر دیئے۔ 28 جون 1938ء میں مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، اس اجلاس میں یہ قرارداد پاس کی گئی کہ ریاست میں ایک ایسی سیاسی جماعت ہونی چاہیے جو ہر شہری کو بلاتفریق رنگ ونسل، مذہب، فرقہ اور علاقہ اپنا رُکن بنا سکے۔ دوسرے سال 1939ء میں مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کے اجلاس میں ورکنگ کمیٹی کی تجاویز کو قبول کر لیا گیا اور ہر شہری کو اس سیاسی جماعت کا رکن بننے کا حق دیا گیا۔ مسلم کانفرنس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھ لیا گیا۔ اس طرح ریاست میں مسلم کانفرنس جیسی ایک مذہبی کمیونٹی تک محدود جماعت کا خاتمہ کر کے ایک نئی قومی ریاستی جماعت تشکیل دی گئی۔ اس طرح کی جماعت بنانے سے ریاستی عوام کے شعور میں بھی تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی لیکن بدقسمتی سے شیخ عبداللہ نے ہندوستان کی کانگریس پارٹی کی سیاست کو ریاست میں پروموٹ کرنا شروع کر دیا۔

اس طرح ریاست میں مسلم فرقہ پرستوں کو بھی موقع مل گیا کہ وہ ہندوستان کی مسلم لیگ کی ریاست میں حمایت کریں۔ نیشنل کانفرنس بننے سے مسلم کانفرنس کے جو عناصر ناراض تھے وہ ایک بار پھر سرگرم ہو گئے۔ یہ ریاست جموں وکشمیر کی سرزمین کو ہندوستانی سیاست کا اکھاڑا بنانے کی ابتدا ہو چکی تھی اور ریاست کی وحدت اور آزاد حیثیت پر سمجھوتہ کرنے کا آغاز تھا۔ اس طرح ریاست میں نیشنل کانفرنس بننے کے باوجود مذہبی رجحان رکھنے والے عناصر نے اس کی قومی سیاست کا نظریہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ نیشنل کانفرنس نے کانگریس کا ہمنوا بن کر ریاست میں مسلم لیگ کے حامی عناصر کو موقع دے دیا تھا کہ وہ ریاست

میں ہندوستان میں جاری ہندو مسلم سیاست کو پھر سے بحال کر دیں۔ چند سالوں بعد ہی 1941ء میں جناح صاحب اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے کہنے پر مسلم کانفرنس کو ریاست میں ازسرنو زندہ کر دیا گیا۔ اس طرح ریاست میں دونوں جماعتیں ہندوستان کی ہندو مسلم سیاست کا حصہ بن گئیں۔ نیشنل کانفرنس بھی کانگریس پارٹی کی طرح ریاست میں تمام مذاہب کی نمائندگی کا دعوی کرتی تھی لیکن حقیقی معنوں میں کانگریس ہی کی طرح تمام مذاہب کے لوگوں کو سیکولرازم کے نام پر اپنا حامی بنانے کی کوشش کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ مسلم کانفرنس کی لیڈر شپ ریاست میں ایک بار پھر فرقہ پرستی کی سیاست کو ہوا دینے کے لیے سرگرم ہوگئی تھی چونکہ دونوں ریاستی جماعتیں اب ہندوستان کی سیاست کا حصہ بن چکی تھیں اس لیے دونوں کے درمیان ریاست کے بجائے ہندوستانی سیاست کی بنیاد پر شدید اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ہندوستان میں 1937ء کے انتخابات میں مسلم صوبوں میں مسلم لیگ کی شکست کے بعد سیاست کا رخ مکمل طور پر بٹوارے کی طرف بڑھنا شروع ہوگیا اور جناح صاحب واپس برطانیہ چلے گئے۔ واپسی پر انہوں نے ہندوستان کے بٹوارے کی سیاست شروع کر دی۔

مسلم لیگ کو ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بنانے کا دعوی کرنے لگے۔ ہندوستان میں مسلم لیگ اور کانگریس کی لیڈرشپ ہندوستان کو تقسیم کرنے کی سیاست پر شدید الجھتی جاری تھی۔ اس طرح کی سیاست کا حصہ بن کر ریاستی جماعتوں کی لیڈرشپ، سیاست کو ہندو مسلم سیاست کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ بدقسمتی کا یہ عالم تھا کہ مسلم کانفرنس نے ازسرِنو بحال ہونے کے بعد پوری ریاست کے بجائے جموں خطے کے اشرفیہ مسلمانوں کی جماعت بن کر رہ گئی جب کہ کشمیری صوبے میں نیشنل کانفرنس نے پوری طرح اپنا کنٹرول حاصل کر لیا اور ہندو مسلم اتحاد کی بھی داعی بن گئی حالانکہ کشمیری صوبہ میں غیر مسلم آبادی پانچ فیصد کے لگ بھگ تھی۔ جموں صوبہ مسلم اکثریتی ہونے کے باوجود غیر مسلم آبادی بھی بہت زیادہ تھی۔ اس صوبے میں ہندو مسلم اتحاد کی سیاست کی شدید ضرورت تھی لیکن مسلم کانفرنس کی کوتاہ اندیش لیڈرشپ نے جموں صوبے میں ہندو مسلم فرقہ پرستی کی بھیانک اثرات پیدا کرنے والی سیاست کو رواج دیا۔ شیخ عبداللہ کا نعرہ تمام مذاہب کے لوگوں کو ساتھ

لے کر ریاست میں غیر فرقہ وارانہ سیاست اورایک جمہوری نظام کی تشکیل کا مطالبہ درست تھا۔ ریاست کی دونوں سیاسی جماعتوں نے ہندوستانی پارٹیوں کا ہمنوا بننا شروع کر دیا۔شیخ عبداللہ نے سیکولر سیاست کی آ ڑ میں کانگریس پارٹی کی ریاست میں نمائندگی کرنا شروع کر دی اور مسلم کانفرنس نے مسلم لیگ کی فرقہ پرست سیاست کی نمائندگی شروع کر دی۔ اس طرح دونوں ریاستی جماعتیں ریاست کی تباہی کی مہم کا حصہ بن گئیں، یہ سمجھے بغیر کہ مستقبل میں اس سیاست کی ریاست کی وحدت اور اتحاد پر کتنے بھیانک اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی فرقہ پرستی سیاست کو ریاست میں آنے سے روکنے کے لیے مہاراجہ پوری کوشش کر چکا تھا اوراس کے پیچھے انگریز کی سازش کا کھیل ریاست میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔اس لئے مہاراجہ ہری سنگھ دونوں ریاستی جماعتوں کے لیڈروں کو علاقائی اور مذہبی فرقہ پرستی کی سیاست سے باز رہنے کی تلقین کر چکا تھا۔

بدقسمتی سے مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ پوری ریاست میں مذہبی فرقہ پرستی کو ہوا دینے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ بھی کشمیری مسلمان اور جموں کے ہندو ڈوگرہ حکمران کی مخالفت کے پردے مذہبی اور علاقائی تعصب سے باہر نکلنے میں ناکام ہوگئی تھی۔ چونکہ ریاست کثیر المذہبی تھی اس لیے ہندو مسلم سیاست سے ریاست کی وحدت کو شدید خطرات پیدا ہو گئے تھے کیونکہ ہندوستان کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم سے ریاست کی جموں کشمیر کی تقسیم کیلئے شدید خطرات پیدا ہو سکتے تھے لیکن خطرے کو نہ مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ نے محسوس کیا نہ نیشنل کانفرنس نے کوئی توجہ دی بلکہ اس اتحاد اور وحدت میں دونوں مل کر دراڑیں ڈالنے میں مصروف رہے۔شیخ عبداللہ کا مذہبی رجحان کتنا بڑھا ہوا تھا،اس کا اندازہ شیخ صاحب کی مذہبی محفلوں کے انعقاد کے ساتھ مذہبی تقریروں سے بھی نمایاں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 1940ء میں شیخ صاحب کی پارٹی کے انتہائی اہم پنڈت لیڈروں میں پنڈت جیالال کلیم، پنڈت کشپ بندھو اور پنڈت پریم ناتھ بزاز جیسے دانشور بھی کنارہ کشی کر چکے تھے۔شیخ عبداللہ ہندوستان کی کانگریس پارٹی کی لیڈرشپ کی طرح اپنے مذہبی خیالات سے بھی چمٹے رہنا چاہتے تھے اور کسی حد تک دوسرے مذاہب کے لوگوں کی سیاسی حمایت بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس طرح کا تضاد نہ کسی شخص کو مذہبی لوگوں کے اعتماد کے قابل چھوڑتا ہے نہ سیکولر لوگوں کا اپنے لیڈر پر یقین پختہ ہوتا ہے۔ شیخ عبداللہ دونوں کشتیوں کے سوار رہ کر بیڑہ پار لگانے کی حِکمت عملی پر چل رہے تھے۔ کشمیر میں صدیوں سے لوگ مذہبی رواداری سے ایک سماج کا حصہ بن کر رہ رہے تھے جبکہ جموں صوبے کی عوام میں بھی مذہبی رواداری کشمیر کی طرح ہی موجود تھی۔

ریاست کی پہلی پرجا سبھا کی مدت ختم ہوگئی تو 1938ء میں پرجا سبھا کے دوسری بار الیکشن ہوئے۔ مسلم کانفرنس نے اس بار بھی مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل کرلی تھی۔ اس بار مسلم کانفرنس کے اراکین نے پارلیمنٹ کا رکن بنتے ہی حلف اٹھایا اور اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئے۔ مسلم کانفرنس ریاست میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کر رہی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی ریاست میں اکثریت مسلم عوام کی ہے اس لیے ریاست کا وزیر اعظم کسی مسلم شخص کو ہونا چاہیے۔ اگر مسلم لیڈر شپ کی شعوری کیفیت کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے مطالبات سے لگایا جا سکتا ہے۔ عوامی حقوق سے زیادہ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ ان کا حاکم ان کا ہم مذہب ہو گویا ان کے نزدیک عوام پر ظلم و جبر اور استحصال کا حق صرف اپنے اپنے مذہب کے ماننے والوں کا ہونا چاہیے۔ گو کہ مہاراجہ ہری سِنگھ پہلے سے ہی پارلیمنٹ میں نمائندگی کا نظام متعارف کرا چکے تھے اور اس کی وجہ سے مسلم کانفرنس والے دوسری بار مہاراجہ کی بنائی ہوئی پارلیمنٹ پرجا سبھا کا حلف اٹھا چکے تھے۔ یہ درست ہے کہ مہاراجہ کی بنائی گئی پارلیمنٹ محدود نمائندگی کی بنیاد پر تھی۔ سارے ممبران پارلیمنٹ براہِ راست منتخب نہیں ہوتے تھے بلکہ کونسل آف منسٹرز کی تعداد میں ابھی تک مہاراجہ کے منتخب کیے گئے ممبران کی تعداد زیادہ تھی لیکن 1938ء کے الیکشن میں مہاراجہ نے سات ممبران کی تعداد مزید بڑھا دی تھی۔ اس کے باوجود سیاسی جماعتوں کا مطالبہ مکمل بااختیار ذمہ دار جمہوری نظام کی تشکیل تھا۔ مہاراجہ نے اس محدود نمائندگی والی پارلیمنٹ میں بھی ریاست بھر سے عظیم سیاسی کارکنوں اور قانون کے ماہرین کو اپنی کابینہ کا حصہ بننے کا موقع فراہم کیا تھا۔ جموں کشمیر پہلی ریاست تھی جس نے مہاراجہ ہری سِنگھ کی راہنمائی میں ایک آزاد ریاستی آئین تشکیل دیا تھا۔ ممبران کی تعداد بڑھ جانے سے اب پچھتر ((75 پرجا سبھا کے ممبران میں سے چالیس ((40 ممبرز منتخب ہو کر آئے تھے جبکہ پہلی پرجا سبھا میں براہِ

راست ممبران کی تعداد تینتیس (33) تھی۔ 1942ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا آغاز کر دیا اور ہندوستان کی انگریز حکومت نے کانگریس کی ساری لیڈر شپ کو گرفتار کر لیا اور کانگریس کو خلاف قانون قرار دے دیا۔

ریاست میں نیشنل کانفرنس نے فوراً پریس کانفرنس کر کے کانگریس کے حق میں قرار داد پاس کی اور انگریز حکومت کے ظالمانہ اقدامات کی شدید مذمت کرتے ہوئے اسے ریاستی دہشت گردی قرار دیا جبکہ کانگریس کی طرف سے تمام شاہی ریاستوں کے عوام کے لیے ہدایات جاری کر رکھی تھیں کہ وہ کانگریس کی تحریک میں زیادہ سرگرمی سے حصہ نہ لیں۔ نیشنل کانفرنس نے کانگریس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے جنگ کے دور میں اپنی توجہ کا مرکز مقامی سطح پر عوامی خدمت کی سرگرمیوں تک محدود رکھا بلکہ 1944ء میں "نیا کشمیر" کے نام سے پارٹی کا ایک سوشلسٹ طرز کا پروگرام لکھا اور نئی طرز کا سماج قائم کرنے کا اعلان کیا۔ یہ نیشنل کانفرنس کا سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے اور عام آدمی کے لیے جدوجہد سے لیکر ایک نمائندہ جمہوری نظام تشکیل دینا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان میں آزادی کی تحریک جوں جوں کانگریس کی قیادت میں زور پکڑ رہی تھی، مسلم لیگ کی قیادت اتنا تیزی سے ہندوستان کی تقسیم کے مطالبے کو سامنے لا رہی تھی۔ جناح صاحب ہندوستان کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے اور دو قومی نظریہ کو اس کی بنیاد قرار دے رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو قومیں آباد ہیں انہیں دو ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ 1940ء میں مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان پاس کی اور انگریز سے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک بنایا جائے۔ ریاست جموں کشمیر کی آبادی کی اکثریت تو مسلمان تھی جبکہ اس ریاست کا حکمران ہندو تھا۔ ہندوستان کی سیاست کے گہرے اثرات ریاست پر پڑنے شروع ہو گئے تھے۔

مسلم کانفرنس جناح صاحب اور مسلم لیگ کے ایجنڈے کو پہلے ہی ریاست میں اختیار کر چکی تھی اور نیشنل کانفرنس کانگریس کی ہمنوا بن چکی تھی۔ جبکہ مہاراجہ ہری سنگھ پہلے سے ہی اس خطرے کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے 1931ء میں فرقہ پرستی کی تحریک کا نتیجہ دیکھ

لیا تھا۔ انگریز حکومت نے ریاست میں مسلم فرقہ پرستوں کے ذریعہ مہاراجہ پر شدید دباؤ بڑھایا اور گلگت وزارت کے علاقے بھی ریاست کے کنٹرول سے لیکر اپنے پولیٹیکل ایجنٹ کے انتظام میں دے دیئے۔ اس کا ذمہ دار مہاراجہ نے مسلم گروپوں کو قرار دیا تھا۔ مسلم کانفرنس کے صدر چوہدری غلام عباس نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ گلگت ہاتھ سے جانے کا مہاراجہ کو شدید صدمہ ہوا اور اس کا ذمہ دار مہاراجہ نے ریاست میں چند فرقہ پرست مسلم جماعتوں کو قرار دیا تھا جو انگریز اہلکاروں کے ڈائریکٹ اکسانے سے احتجاجی تحریک میں خون خرابہ کے ذمہ دار تھے۔ چوہدری غلام نے تسلیم کیا کہ 1931ء کی تحریک میں ریاستی اداروں سے خونی تصادم نہ ہوتا تو شاید مہاراجہ انگریز کے دباؤ میں نہ آتا اور گلگت کا کنٹرول ان کے حوالے کبھی نہ کرتا۔ وہ مہاراجہ کو قصوروار قرار دیتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہیں کیے بلکہ تشدد کا سہارا لیا۔ عبدالقدیر نامی مشکوک آدمی کا سارا کردار ہی انگریز حکومت کے خفیہ پلان کا حصہ تھا اور مسلمانوں کی تحریک کا دباؤ بنا کر مہاراجہ سے اپنے دیرینہ مطالبہ منظور کروانا تھا جس کے بعد انگریز حکومت نے پُرتشدد احتجاج کی حمایت بھی ترک کردی تھی۔ جبکہ احراری اور احمدیہ جماعت نے ریاستی اداروں سے براہِ راست تصادم کی راہ اپنائی تھی اور پنجاب سے ان کے مسلح جتھے ریاست میں داخل کرائے گئے تھے۔

اب جناح صاحب ایک بار پھر ریاستی مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے دوقومی نظریہ کا سہارا لے رہا تھا اور 1944ء کے موسم بہار میں جناح صاحب نے کشمیر کا غیر سیاسی دورہ کیا۔ چونکہ کشمیر میں مسلم کانفرنس کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے نیشنل کانفرنس نے جناح صاحب کو استقبالیہ دیا۔ انہوں نے جناح صاحب کو ہندوستان کے ایک بڑے لیڈر کے طور پر عزت دینے کی کوشش کی لیکن جناح صاحب نے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو وہی مشورہ دیا کہ وہ مسلم کانفرنس کی مذہبی سیاست کا حصہ بنیں جو کشمیری مسلمان دس سال پہلے ترک کر چکے تھے اور نیشنل کانفرنس بنا کر متحدہ جدوجہد کا راستہ اپنا چکے تھے۔ جناح صاحب کا دعوٰی تھا کہ وہ غیر سیاسی دورے پر کشمیر آئے ہیں اور آرام کی نیت سے یہاں ہیں لیکن انہوں نے مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور خطاب

کرتے ہوئے نیشنل کانفرنس کو غنڈوں کا ایک گروہ قرار دیا۔ یہ کشمیری مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ تھا۔ چند دنوں کے بعد جناب صاحب نے بارہ مولا میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرنا تھا جب وہاں پہنچے تو ایک مشتعل ہجوم نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں عوامی غضب سے بچانے کے لیے محفوظ جگہ چھپانا پڑا۔ جناح صاحب کشمیر سے مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔ 1945ء میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر نیشنل کانفرنس نے کانگریس کی مکمل حمایت حاصل کر لی اور اسی سال گرمیوں میں نیشنل کانفرنس کا اجلاس بلایا گیا۔

نیشنل کانفرنس کا یہ اجلاس غیر معمولی نوعیت کا تھا کیونکہ اس میں آل انڈین سٹیٹس (States) پیپلز کانفرنس کے نمائندے بھی مدعو کیے گئے تھے۔ آل انڈیا اسٹیٹس (States) پیپلز کانفرس کے نمائندے کئی ہندوستانی ریاستوں سے اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ نہرو بھی اس اجلاس میں شریک ہوا اور اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں نے غور وخوض کے بعد کئی فیصلے کیے تھے اور یہ کہا گیا کہ ہندوستانی ریاستوں کے جاگیردارانہ ڈھانچوں کو توڑا جائے جنہیں انگریز نے بنایا اور مضبوط کیا تھا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے چوٹی کے کانگریس لیڈروں میں خان عبدالغفار خان، مولانا آزاد نے بھی خطاب کیا۔ تمام مندوبین نے ریاستی عوام کی سیاسی اور سماجی شناخت کو باقی ہندوستانی عوام کے ساتھ سانجھی قرار دیا اور کشمیری عوام کی سیاسی بیداری کی سب نے تعریف کی۔

یہ زمانہ صرف عوامی ہلچل اور سیاسی ہنگامہ خیزیوں کا نہ تھا بلکہ ہر طرف حکمرانوں کے ایوانوں میں ہلچل کے واضح اثرات موجود تھے۔ ایک طرف انگریز سامراج ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی سیاسی اور انتظامی گرفت ہندوستان سے کمزور کرتا جا رہا تھا تو دوسری طرف ریاستوں کی عوام بھی سیاسی تبدیلی سے متاثر ہو رہی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ اندرون ریاست بدلتی ہوئی صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کے لیے کئی تبدیلیاں کر چکا تھا لیکن سیاسی دباؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کانگریس پارٹی کی لیڈرشپ اپنے نظریات کی آڑ میں جموں کشمیر ریاست میں نیشنل کانفرنس کو اس کی لیڈرشپ سمیت اپنے کنٹرول میں کر چکی تھی۔ سوپور کے اجلاس میں

ریاستوں کے خاتمے کا اعلان ریاست کے مہاراجہ کے لیے تشویش کا باعث تو تھا ہی لیکن ریاست کی دونوں سیاسی جماعتوں کا اپنی ریاست کے حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہونا مہاراجہ کے لیے اور ریاست کے مستقبل کے لیے شدید خطرات پیدا کر رہا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا پلان ریاست کے مستقبل کے بارے میں بالکل مختلف تھا اور ریاست کی سیاسی پارٹیوں کا ایجنڈا ہندوستانی سیاست سے جڑ چکا تھا۔ مہاراجہ کو یہ تشویش پیدا ہو گئی تھی کہ انگریز ہندوستان کی تقسیم کے ایجنڈے پر پوری طرح عمل پیرا ہیں اور ہندوستانی سیاست بٹوارے کا اکھاڑہ بنے گی تو ریاستی جماعتیں بھی اس ایجنڈے کے مطابق ریاست کو ہندو مسلم سیاست کا اکھاڑہ بنا کر تباہی اور بربادی لا سکتی ہیں۔ اس لیے مہاراجہ نے اب ہندوستانی لیڈروں کی ریاست میں آمد اور سرگرمیوں کو محدود کرنے کا فیصلہ کیا اور ریاستی جماعتوں کو خبردار کیا کہ ہندوستان کی انگریز سرکار کی چالوں سے ریاست میں فرقہ وارانہ فضا متاثر ہو گی۔ دوسری طرف مہاراجہ نے انتظامی اُمور کے لیے اسی عرصے میں کئی وزیر اعظم بدلے تا کہ کوئی موثر بندہ وزراء کی کونسل کو لیڈ کرے اور ریاستی اُمور میں بہتری لا سکے۔

آخر کار ایک کشمیری پنڈت رام چندر کاک کو 1945ء میں ریاست کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ رام چندر کاک پرجا سبھا میں وزراء کی کونسل کا ہیڈ بنا تو اس کی کابینہ میں دو پاپولر وزیر بھی شامل کیے گئے تھے۔ نیشنل کانفرنس نے اس وزراء کے اضافے کو سراہتے ہوئے اپنے ایک پرجا سبھا کے ممبر کو کابینہ میں وزیر بنوا دیا۔ بعد میں نیشنل کانفرنس کے ممبر نے یہ الزام لگایا کہ وہ اپنے محکمے اور وزارت کا کام درست طریقے سے سرانجام نہیں دے پا رہا کیونکہ انتظامی اُمور میں دوسرے وزراء بھی اس کے ساتھ تعاون نہیں کرتے اور وزیر نے 17 مارچ 1946ء کو وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ایک ماہ بعد مئی 1946ء میں نیشنل کانفرنس نے کشمیر چھوڑ دو تحریک کا آغاز کر دیا۔ وزیر اعظم رام چندر کاک نے نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے خلاف سخت کاروائی کرتے ہوئے انہیں جیل میں ڈال دیا اور کچھ بھاگ کر ہندوستان کے علاقوں میں چلے گئے۔ دراصل نیشنل کانفرنس نے یہ تحریک کانگریس پارٹی کی ایماء پر ہی چلائی تھی۔ کشمیر

چھوڑ دو تحریک کے پیچھے وہی مقاصد کارفرما تھے جو سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے منعقدہ اجلاس سوپور کشمیر جس میں ہندوستان کی ریاستوں کے بارے میں فیصلہ، ہندوستانی ریاستوں کے جاگیردارانہ ڈھانچوں کو ختم کرنے پر زور دیا گیا تھا اور ان ریاستوں کو انگریز کی بنائی گئی ریاستیں کہا گیا تھا۔ نیشنل کانفرنس کی کشمیر چھوڑ دو تحریک بھی ریاست جموں کشمیر کی اکائیوں کو توڑنے کا نعرہ لگا رہی تھی۔

اس تحریک کا آغاز ہی کشمیری بولنے والوں نے کیا تھا۔ اس تحریک کا سب سے مشہور نعرہ تھا،"معاہدہ امرتسر توڑ دو کشمیر ہمارا چھوڑ دو"۔ نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ سے پہلے کانگریس کے لیڈر گاندھی بھی معاہدہ امرتسر کو بکری پتر کہہ چکے تھے۔ اس کا مطلب سیدھا صاف یہ تھا کہ کشمیر کا جموں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس خطے کو جموں کے ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے پیسے دے کر خریدا تھا۔ اب جموں کے ڈوگرہ حکمرانوں کو کشمیر کو چھوڑ دینا چاہیے اور دونوں خطوں کو الگ کر دیا جائے۔ ریاست جموں میں گلگت بلتستان اور لدّاخ بھی شامل تھے لیکن ہندوستانی اور نیشنل کانفرنس کے لیڈرز ریاست کے ایک صوبہ کی علیحدگی کی بات کر رہے تھے۔ کشمیری بولنے والے لیڈرز کانگریس پارٹی کی سیاست کی حمایت کر رہے تھے اور بدلے میں ریاست سے الگ ہو کر ہندوستان میں شامل ہونے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ یہ صورتحال کانگریس کے راہنماؤں کی پیدا کردہ نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے انگریز حکومت کے نمائندوں اور چند خفیہ کرداروں کا منصوبہ تھا جو پہلے ہی ریاست کے مہاراجہ ہری سنگھ کو قابل اعتماد نہ سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ اگر مہاراجہ نے ان شمالی سرحدوں پر مسائل کھڑے کیے تو اس کا سوویت یونین بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے ہندوستان کے بٹوارے سے پہلے ریاست جموں کشمیر میں ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جس کی وجہ سے مہاراجہ اپنی من مانی کرنے سے باز رہے۔ بہرحال جب نہرو کو علم ہوا کہ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو مہاراجہ حکومت نے جیلوں میں بند کر دیا ہے تو وہ فوراً شیخ عبداللہ کی مدد کے لیے کشمیر روانہ ہو گیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے پہلے ہی ہندوستان کی انگریز حکومت سے تحریری درخواست کر رکھی تھی کہ وہ کسی بھی ہندوستانی پارٹی کے لیڈر کو ریاست میں آنے سے روکیں کیونکہ

ہندوستان کی فرقہ وارانہ مذہبی سیاست کی وجہ سے جموں صوبے میں ہندو مسلم فسادات کا خطرہ پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے باوجود نہرو نے فوراً ریاست میں داخل ہونے کے لیے کوہالہ کے راستے مظفرآباد اور کشمیر جانے کا سفر کیا۔ جونہی نہرو پنجاب کے راستے کوہالہ پہنچا، ریاستی پولیس نے گرفتار کرلیا۔ اس کا پورے ہندوستان میں بڑا گہرا اثر ہوا اور کانگریس پارٹی کے رہنماؤں نے آپس میں مشورہ کرکے نہرو کو بلالیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہندوستانی لیڈروں کے ریاست میں داخلے پر مہاراجہ نے پہلے محدود پابندی عائد کررکھی تھی۔ دوسری طرف جناح صاحب نے کشمیر چھوڑدو تحریک کو چند مایوس لوگوں کی تحریک قرار دیتے ہوئے انہیں ریاست میں امن وامان کی خراب صورتحال کا ذمہ دار قرار دیا۔

مسلم کانفرنس نے بھی کشمیر چھوڑ دو تحریک کی مخالفت کی۔ چودھری غلام عباس نے نیشنل کانفرنس پر یہ الزام بھی لگایا کہ وزیراعظم رام چندر کاک کے ریاست کا وزیراعظم بننے پر نیشنل کانفرنس نے اسے پہلا کشمیری وزیراعظم کہہ کر خوب جشن منایا تھا۔ اس تحریک کا آغاز ہی اس بات سے شروع کیا گیا کہ نیشنل کانفرنس کے پاپولر منسٹر کے مستعفی ہونے سے رام چندر کاک نے نیشنل کانفرنس کے ایک دوسرے آدمی کو اپنی کابینہ میں پاپولر منسٹر بنالیا۔ دوسری اہم بات مسلم کانفرنس کے صدر چودھری غلام عباس نے یہ کی کہ نہرو نے معاہدہ امرتسر توڑ دو نعرے کی مخالفت کی اور شیخ عبداللہ کو عدالت میں اس بیان کو بدلنے کا مشورہ دیا اور شیخ عبداللہ نے عدالت میں کہا کہ اس نعرے کا مطلب یہ ہے کہ مہاراجہ کی سربراہی میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کا مطالبہ ہے۔ اس طرح شیخ عبداللہ اس معاہدہ توڑ دو والے نعرے سے منحرف ہو گیا کیونکہ اس کا مطلب نہرو کے نزدیک بھی قانونی طور پر ریاست کے حصے بخرے کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ نعرہ ریاستی قانون کے مطابق شیخ عبداللہ کے لیے خطرات سے پُر تھا۔ اس لیے نہرو نے شیخ سے اس نعرے کا مفہوم بدلوا ڈالا اور شیخ عبداللہ اور اس کی پارٹی آئندہ اس نعرے سے تائب ہوگئے۔

چونکہ نہرو نے 'معاہدہ امرتسر توڑ دو' کا قانونی پہلو شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس کو سمجھا دیا تھا اور اس کے اثرات کا بھی اس کو ادراک تھا۔ اسی لیے نہرو قانونی طریقے

سے ہندوستانی ریاستوں کا خاتمہ کر کے انہیں ہندوستان میں ضم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ شیخ عبداللہ ایک جذباتی نعرے کی بنیاد پر ایک طرف تو ریاستی عوام کا ہندو ڈوگرہ حکمران کی مخالفت کی آڑ میں مذہبی اتحاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا تو دوسری طرف کشمیری عوام کو جموں کی عوام سے دور کرنے کے حربے استعمال کر رہا تھا۔ شیخ عبداللہ کو یہ غلط فہمی تھی کہ مذہبی نعرے سے ریاست کے سارے مسلمانوں کا لیڈر بننا اس کے لیے آسان ہوگا لیکن دوسری طرف وہ کانگریس کے اثر ورسوخ میں چلے جانے سے ریاست کو ہندوستان میں شامل کرنے کی مہم کا بھی حصہ بن چکا تھا۔ شیخ عبداللہ کی حالت یہ تھی کہ وہ جس جگہ ضرورت محسوس ہوتی، مذہبی حربے سے کام چلاتا، جہاں سیکولر بننے کی ضرورت ہوتی وہاں وہ سیکولر حربے کو استعمال کرتا۔ اس طرح اس پر مذہبی اور سیکولر طبقے دونوں کا اعتماد نہ رہا جو آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ کس طرح شیخ عبداللہ کے اپنے ہی ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ عبداللہ کی سیاسی جدوجہد بڑی طوفانی تھی اور ان کی عوام میں پاپولرٹی بہت زیادہ تھی خاص کر کے شیخ صاحب کشمیری بولنے والے خطے کے غیر متنازعہ لیڈر بن چکے تھے جوانہوں نے اپنی سیاسی کلابازیوں سے کسی حد تک متنازعہ بنالی تھی لیکن عوام میں شیخ صاحب کی شہرت میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ مہاراجہ کی حکومت کے خلاف دونوں سیاسی پارٹیوں کا نقطہ نظر کسی حد تک ملتا جلتا تھا جو بظاہر مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی مانگ تھی کہ وہ ایک ذمہ دار حکومت کی ہی تھی۔ ابھی ریاست کی یہ دونوں جماعتیں مہاراجہ کی بادشاہت کو ختم کرنے کے بجائے اس میں تبدیلیوں کا مطالبہ کر رہی تھیں بلکہ مسلم کانفرنس نے مہاراجہ ہری سنگھ کو مستقبل میں آئینی مہاراجہ یا آئینی بادشاہ تسلیم کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ اب ہم جب تک اس وقت کے سارے ریاستی اور غیر ریاستی کرداروں کا تاریخی تجزیہ ان حالات کو سامنے رکھ کر نہیں کریں گے ہم درست نتائج اخذ نہیں کر سکیں گے۔ ہندوستان میں انگریز کے خلاف چلنے والی آزادی کی تحریک کے جو اثرات ریاست جموں وکشمیر کے اندرونی سیاست پر پڑھ رہے تھے اس پہلو کو سامنے رکھنا ضروری ہے تا کہ تصویر کا ہر پہلو اچھی طرح سامنے رکھا جائے اور ہر تاریخی کردار کے رول کو سمجھا جائے۔

اندرون ریاست مہاراجہ سے یہ مطالبہ تو جائز تھا کہ وہ ریاست میں جمہوری حقوق بحال کرے اور ایک ذمہ دار نمائندہ حکومت قائم کرے لیکن ہندوستانی سیاست کا حصہ بن کر ریاست کا فیصلہ کرنے کا موقف مسلم لیگ اور کانگریس کی ایماء پر کرنے کا مطالبہ کرنا اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ دونوں ریاستی سیاسی جماعتوں کی سیاست نہ صرف غیر حقیقی بنیادوں پر تھی بلکہ وہ انگریزوں کے اصل منصوبے اور مسلم لیگ اور کانگریس کی لیڈرشپ کے اصل منصوبوں اور ان کے اثرات سے بے خبر تھے یا جان بوجھ کر اس میں پھنس چکے تھے۔ شیخ عبداللہ کی سیاست کا محور کشمیری خطہ تھا اور وہاں شیخ صاحب کی پارٹی اور شخصیت دونوں کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ تھا۔ مسلم کانفرنس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو جموں میں اتنی پاپولر تھی کہ اپنی مرضی سے کوئی ریاستی معاملات میں سودے بازی کرنے کے قابل ہو سکے نہ کشمیر میں اس کا کوئی اثر ورسوخ تھا۔ جموں صوبے میں ہندو آبادی بھی کافی زیادہ تھی۔ مسلم اکثریت میں ہونے کے باوجود غیر مسلم آبادی اتنی زیادہ تھی کہ جموں صوبے میں اگر ساری مسلم آبادی کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی تو پھر بھی 40% یا 45% غیر مسلم آبادی کی حمایت کے بغیر اس صوبے میں بھی کوئی بڑا عوامی فیصلہ کرنا کسی بھی جماعت کے لیے ممکن نہ تھا۔ گو کہ نیشنل کانفرنس کا تھوڑا اثر و رسوخ جموں میں بھی تھا لیکن مسلم کانفرنس کا کشمیری صوبے میں اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔

صوبہ کشمیر میں مسلم کانفرنس کے حامی وہ لوگ تھے جو میر واعظ یوسف شاہ کی قیادت کو تسلیم کرتے تھے اور مسلم کانفرنس کی جموں کی لیڈرشپ کو وہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس جموں کی مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنا سہارا ریاست سے باہر پنجاب میں تلاش کرتے تھے۔ پنجاب میں اس وقت فرقہ پرستی کی لہر اس قدر شدید تھی کہ وہاں سول جنگ کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ چوہدری غلام عباس کی سیاسی قیادت کشمیری مسلمانوں کی حمایت سے محروم ہونے کی وجہ سے کافی نالاں تھی جبکہ وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ ان کی تحریک خالصتاً فرقہ پرستی اور ہندوؤں کے خلاف تھی۔ اس کی سوچ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شیخ عبداللہ کو ہندو کانگریس اور کافروں کا ایجنٹ تک کہتے تھے۔ ایسے ذہنی پسماندہ لیڈر کا ایسے صوبے میں جہاں ہندو اور مسلم دونوں بڑی تعداد میں موجود تھے، اسکی سیاسی فکر کو

آبادی کا بڑا حصہ تو مذہب کے تعصب کی وجہ سے ہی قبول نہیں کرے گا۔ دوسرا حصہ ہندوؤں کے ساتھ معاشرت سانجھی ہونے کی وجہ سے دور ہو جائے گا اور صرف مفاد پرست، فرقہ پرست اور ذہنی طور پر پسماندہ سماج کا گروہ ہی ایسی سیاسی جماعت کا حصہ بن سکتا ہے۔ آخر مسلم کانفرنس کی لیڈر شپ کی ایسی کیا مجبوری تھی کہ جو ایک ہندو مہاراجہ کو مستقبل کے لیے آئینی بادشاہ بھی تسلیم کر چکی تھی لیکن اپنے ساتھ رہنے والے غیر مسلم شہریوں کو اپنی سیاسی تحریک کا حصہ بنانے کے لیے تیار نہ تھی؟ یہ سیاسی پارٹی اور سیاسی لیڈر شپ کا پسماندہ ذہنی فکری اظہار تھا جو ریاستی عوام کے مشترکہ مسائل کو سمجھنے اور اجاگر کرنے کے بجائے ہندوستان کی فرقہ پرست سیاست کا حصہ بن کر اپنی ریاست میں پرائی آگ کو زبردستی لگانے پر تلی ہوئی تھی۔ جبکہ نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ نہرو کے مکمل اثر ورسوخ میں جانے کی وجہ سے جموں صوبے کو اپنے ساتھ ملانے کے بجائے دونوں صوبوں کی آبادی کو ایک دوسرے سے دور کرنے کی حِکمت عملی پر چل رہی تھی۔ آخر نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کو ایسی کیا مجبوری تھی کہ وہ ہندوستانی سیاست میں اس قدر ملوث ہو کر ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکی تھی؟ یہ سمجھے بغیر کے اپنی ریاست کے حالات اور آبادی کا کثیر المذہبی ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی مذہبی تقسیم کے اثرات ریاست میں بھیانک تباہی لا سکتے ہیں۔ کانگریس پارٹی کی لیڈر شپ خاص کر کے نہرو، شیخ عبداللہ کو، مہاراجہ کے خلاف استعمال کرتے ہوئے ڈبل گیم اور خطرناک کھیل میں ملوث تھا کیونکہ وہ ریاست کو مستقبل میں ہندوستان میں ضم کرنے کے لیے ریاست کے مہاراجہ کی اتھارٹی کے لیے اندر سے بڑا چیلنج پیدا کر کے سیاسی قوتوں کے ذریعہ اسے قابو کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

دوسری طرف انگریز ریاست میں اپنے الگ کھیل میں ملوث تھے۔ وہ اس ریاست کو علاقائی اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر کے ہندوستان کے دوقومی نظریے کی سیاست میں فٹ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ یہ بات کسی حد تک انگریز حکومت کے علم میں تھی کہ ریاست کی ساری اکائیوں کو مستقبل کے تقسیم شدہ ہندوستان کے دوملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ مطمئن کر کے ایڈجسٹ کرنا ممکن نہیں ہوگا، اس لیے انگریز حکومت کے خفیہ ایجنٹ ریاست میں بہت پہلے سے ہی سرگرم تھے۔ ہندو مسلم خلیج بھی ریاست میں انہی ایجنٹوں کی

وجہ سے وسیع ہوئی تھی۔ 1946ء تک تو انگریز حکومت کو یقین ہو چکا تھا کہ ریاست جموں کشمیر کا مہاراجہ اندرونِ ریاست ایسے اقدامات کر رہا ہے جس سے وہ ریاست کو متحد اور انڈیا پاکستان سے باہر رکھ کر ریاست کی سیاسی قوتوں سے سودے بازی کی بنیاد پر اپنی پوزیشن کو قائم رکھے گا اور ریاست کو بھی دونوں ملکوں کی گرفت سے باہر رکھے گا۔ دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ کو 1946ء تک یہ غلط فہمی تھی کہ انگریز، ہندوستان کی بڑی ریاستوں سے نہیں چھیڑے گا اور کسی حد تک ان ریاستوں کو اپنا وجود برقرار رکھنے کی اجازت دے گا۔

یہی وجہ تھی کہ مہاراجہ نے ریاست میں اس حد تک سیاسی اصلاحات کر لی تھیں کہ لوگوں کو گمان ہونے لگا تھا کہ ریاست کے مستقبل کے لیے مہاراجہ ایسے جمہوری ڈھانچے کی بنیاد ڈال چکا تھا، جس ڈھانچے پر ریاست کا مستقبل ایک مکمل جمہوری نظام پر کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی بھی مطلق شخصی نظام حکومت میں ریاستی اداروں کا قیام ہی شخصی اتھارٹی کو کمزور کرنا ہوتا ہے۔ مہاراجہ نے پرجا سبھا بنا کر اپنے سیاسی اختیار کو ان نمائندوں کی طرف منتقل کر دیا تھا جو کوئی بھی سیاسی اتھارٹی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ یہ مہاراجہ کے مثبت اقدام تھے جو ریاست کے عام شہری کو پرجا سبھا میں نمائندگی کا احساس دلا رہے تھے۔ گو کہ یہ نمائندگی محدود تھی لیکن کسی اتھارٹی کے مقابلہ میں دوسری سیاسی اتھارٹی پیدا کرنا، اپنے اختیارات کو سرنڈر کرنا یا اس اتھارٹی کے ساتھ سانجھی کرنا بھی مثبت اقدام ہی ہوتا ہے۔ یہ سارے اقدامات مہاراجہ کے لیے ریاستی شہریوں میں اچھی امیج پیدا کرنے کا باعث بن رہے تھے۔ سیاسی پارٹیوں کی لیڈر شپ کے لیے مہاراجہ کے خلاف ریاستی عوام میں کوئی بڑی شکایت کھڑی کرنا ممکن نہیں تھا اور مسلم کانفرنس کی لیڈر شپ تو مہاراجہ کے نظام پر حملہ کرنے کی بجائے اس کے مذہب پر حملہ کر رہی تھی کہ وہ ہندو حکمران ہے اور اسے مسلم اکثریتی ریاست پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے جبکہ نیشنل کانفرنس ایک طرف مہاراجہ کو غیر کشمیری ڈوگرہ ہونے اور جموں خطے کا ہونے کی وجہ سے کشمیری مسلمانوں کا حکمران نہیں سمجھتی تھی۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں کی سوچ ساری ریاستی عوام کو تقسیم کرنے والی تھی۔ دوسری طرف پورے ہندوستان میں کئی ایسی ریاستیں تھیں جہاں حکمرانوں اور رعایا کا مذہب ایک نہیں تھا۔ بے شمار ایسی

ریاستیں تھیں جن کی رعایا غیر مسلم تھی اور حکمران مسلمان تھے۔ یہ صرف ایک جگہ ہی تھا کہ ریاست جموں کشمیر کا حکمران ہندو تھا حالانکہ حکمران کے مذہب سے زیادہ اس کی حکمرانی زیادہ اہم ہوتی ہے۔

مہاراجہ کے آباؤ اجداد نے اس ریاست کے کئی علاقوں کو معاہدوں کے ذریعہ اور کئی علاقوں کو زبردستی فتح کر کے اپنی جموں کی ریاست کا حصہ بنایا تھا۔ کشمیر کی ریاست جو آج جموں کشمیر ریاست کا صوبہ تھا اس سے پہلے پنجاب کی خالصہ حکومت کا صوبہ تھا اور ایک معاہدے کے تحت جموں کی حکمرانی میں آیا تھا جبکہ جموں کے لوگ ایک ہی خطے کے ہونے کے باوجود مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بدقسمتی کا یہ عالم تھا کہ جموں صوبہ جہاں ہندو مسلم آبادی کے تناسب میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا وہاں مسلم لیڈرشپ فرقہ پرست پارٹی مسلم کانفرنس چلا رہی تھی۔ اسی طرح جموں کی ہندو لیڈرشپ بھی ایک فرقہ پرست پرجا پرشید بنا کر دونوں مذہبی فرقہ پرستی کو ہوا دے رہی تھیں۔ کشمیر کے 95 فیصد مسلم آبادی والے علاقہ میں نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ بظاہر سیکولر لیکن کشمیری علاقائی سیاست کی وجہ سے جموں صوبے میں دونوں، ہندو اور مسلم کمیونٹیز میں غیر پاپولر سیاسی جماعت تھی۔ حالانکہ ریاست میں جموں صوبہ ہی ایسی جگہ تھی جہاں مذہبی ہم آہنگی کی شدید ضرورت تھی۔ جموں صوبہ کی فرقہ پرست مذہبی جماعتیں سیاست میں پنجاب کی مذہبی سیاست سے خوب آکسیجن لے رہی تھیں۔ اب ہندوستان میں انگریز سامراج کے قدم جوں جوں اکھڑتے جا رہے تھے ہندوستان کے بٹوارے کا مطالبہ بھی زور پکڑتا جا رہا تھا۔ ریاست جموں کشمیر کے صوبہ جموں کی فضا مذہبی فرقہ پرستی کی وجہ سے کافی آلودہ ہو چکی تھی۔ مسلم کانفرنس کے رہنماؤں کو جناح صاحب نے اب یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ مہاراجہ ہری سِنگھ کی حمایت کرنے کی حکمت عملی اپنائیں کیونکہ نیشنل کانفرنس مکمل طور پر کانگریس پارٹی کی سیاست کا حصہ بن چکی تھی اور مہاراجہ کی حمایت سے کشمیر میں کانگریس کا اثر و رسوخ کم کیا جائے۔

1946ء کے اس دور میں ہندوستان کے بٹوارے کے آثار نمایاں ہو چکے تھے اور ریاست میں بھی اس کے اثرات واضح ہو چکے تھے۔ مسلم کانفرنس نے جولائی 1946ء میں

ہی اپنا نیا پارٹی منشور پیش کیا اور اس میں الحاق پاکستان کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا اور ساتھ ہی مہاراجہ کو ریاست کے آئینی حکمران کا درجہ دینے کا ایک بار پھر اعادہ کیا۔ اب مسلم کانفرنس پہلے والے خول سے مکمل باہر آ چکی تھی اور کھل کر ریاست کا الحاق پاکستان سے کرنے کا مطالبہ کرنے لگی تھی۔ اب اس مسلم کانفرنس کی لیڈر شپ کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جائے کہ اس کی اپنی باتوں میں کتنا تضاد ہے۔ ایک طرف مسلم کانفرنس کی لیڈر شپ اپنے ہی ریاست کے ہندو شہریوں سے شدید نفرت کا اظہار کرتی ہے اور الحاق پاکستان کے مطالبے سے ریاست کے ہندوؤں کے دلوں میں اس نے آگ لگا دی ہے۔ چوہدری غلام عباس، صدر مسلم کانفرنس ہندوؤں کو مسلمانوں کا دُشمن اور مہاراجہ ہری سِنگھ کو ریاستی مسلمانوں کا دُشمن قرار دے رہے ہیں۔ دوسری طرف مہاراجہ کو ریاست کا آئینی حکمران بھی تسلیم کر رہا ہے۔

مسلم کانفرنس کی ساری لیڈر شپ کی باتوں سے جہاں شدید قسم کی مذہبی منافرت کی بو آ رہی ہے وہاں ریاست کے مستقبل کے بارے میں سوچ میں اتنا بوگس پن اور جھوٹے دعوؤں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ دوسری طرف نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کا حال بھی مسلم کانفرنس کی لیڈر شپ سے ملتا جلتا ہے۔ مسلم کانفرنس ساری ریاست کے مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوی کرتی ہے جبکہ کشمیر کی وادی سے میر واعظ یوسف شاہ پر خود ہی الزام لگاتی ہے کہ وہ حکومت سے ملا ہوا ہے۔ بقول چودھری غلام عباس صاحب، جولائی 1946ء میں سری نگر کے اجلاس میں مسلم کانفرنس نے سول نافرمانی کا اعلان کیا لیکن دوسرے ہی دن مولانا میر واعظ یوسف شاہ سول نافرمانی کی تحریک سے مہاراجہ کی حکومت کے کہنے پر الگ ہو گیا جبکہ چوہدری غلام عباس خود انفرادی سول نافرمانی کر کے چند ساتھیوں سمیت جیل چلا گیا۔ تین سال بعد قیدیوں کے تبادلے میں پاکستان پہنچایا گیا تھا۔ اس قدر غیر ذمہ دارانہ رویہ اور دوسری طرف سیاست میں شدید قسم کی ہندو مسلم منافرت کو ہوا دینا اور اپنی تحریک کو ریاست کے ہندوؤں کے خلاف تحریک قرار دینا، اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی سیاسی قیادت نے ریاستی عوام کو دھوکا اور فریب میں مبتلا کیا۔ ریاست میں فرقہ وارانہ نفرت پیدا کی اور بیرونی قوتوں کی ایماء پر ریاست کو توڑنے کی سازش کی۔ دونوں ریاستی پارٹیوں کی

قیادت کو ہندوستانی کانگریس اور مسلم لیگ کی قیادت نے اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا جو بعد میں ریاست میں فرقہ وارانہ فسادات اور ریاست کی تقسیم کا باعث بنا۔ مسلم کانفرنس کا نعرہ ہے کہ ریاست میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائے جبکہ وہ خود اپنی ریاست کی پرجا سبھا کے انتخابات کے لیے پہلی بار 1934ء میں، دوسری بار 1938ء میں اور تیسری بار 1946ء حصہ لے کر مہاراجہ کی پرجا سبھا کا حصہ بنی رہی۔ مسلم کانفرنس نے پرجا سبھا میں تبدیلی کے لیے، اس کے آئین میں تبدیلی کے لیے یا الیکشن میں طریقہ کار کی تبدیلی کے لیے اس پورے عرصہ میں نہ کوئی بل لایا، نہ کوئی آئینی اصلاحات پرجا سبھا میں متعارف کرانے کے لیے کوئی بل لایا اور نہ کوئی تجاویز پیش کیں۔ یہ دونوں جماعتیں مہاراجہ کی حکومت سے مراعات بھی حاصل کرتی رہیں اور مہاراجہ کی حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا بھی ڈھونگ کرتے رہے۔ دونوں ریاستی پارٹیوں کے لیڈرز ایک دوسرے پر مہاراجہ حکومت کے حامی ہونے کے اور مراعات لینے کے سنگین الزامات لگاتے رہے۔

دوسری طرف ریاست میں کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندے بن کر ایک جماعت ریاست کو ہندوستان کا حصہ بنانے اور دوسری ریاست کو پاکستان کا حصہ بنانے کی مہم چلا رہی ہے۔ ایک جماعت کشمیری صوبے میں ہندوستان سے الحاق کا نعرہ بلند کر رہی ہے تو دوسری جماعت جموں میں الحاق پاکستان کا نعرہ لگا رہی ہے۔ جبکہ مسلم کانفرنس اپنے صوبے کی ساری غیر مسلم آبادی کی خواہش جاننا بھی گوارا نہیں کر رہی۔ مسلم اکثریت کے نشے میں چُور ہندوستانی سیاست جو بٹوارے کی سیاست بن چکی تھی کو اپنی ریاست میں لا کر فرقہ واریت کا زہر پھیلا کر ریاست کی تقسیم کا راستہ ہموار کر چکی تھی۔ نیشنل کانفرنس بھی کشمیری صوبے میں مسلم اکثریت کی نمائندہ بن کر ہندوستان سے الحاق کی پُرجوش مہم چلا رہی تھی۔ اب دوسری طرف مہاراجہ حکومت پہلے ہی ضروری انتظامی اور سیاسی اصلاحات کر چکی تھی۔ مہاراجہ دونوں جماعتوں کو انتقالِ اقتدار کا اشارہ بھی دے چکا تھا اور اپنے لیے بھی مستقبل میں ریاست کا آئینی حکمران رہنے کے لیے تیار تھا لیکن یہ سارا کام تب ممکن تھا کہ ریاست جموں کشمیر ہندوستان اور پاکستان میں شامل نہ ہو۔ کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کا آئینی حصہ بن جانے

سے ریاست دونوں میں سے کسی ایک کا صوبہ یا حصہ بن جائے گی اور اس کی حیثیت کا تعین ہندوستان اور پاکستان کے آئین کے مطابق طے ہوگا۔ اب اس صورتحال میں مہاراجہ کا آئینی حکمران رہنا تو ممکن ہی نہیں تھا اور ریاست کی حیثیت بھی ختم ہو جانی تھی۔ یہ ساری صورتِ حال مہاراجہ کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ وہ ریاست کی حیثیت پر سودے بازی یا سمجھوتہ کرنے کے لئے راضی نہیں تھا۔ ایسی صورتِ حال میں اس کے لئے ریاست کی آزاد حیثیت کو بچانا ضروری تھا تب ہی اس کی آئینی حکمران کی حیثیت بھی بحال رہ سکتی تھی۔

اب مہاراجہ کی شدید خواہش تھی کہ کسی طریقے سے ریاست کو ہندوستان اور پاکستان کا حصہ بننے سے روکے لیکن اس کام کے لیے مہاراجہ کو ریاست کی دونوں سیاسی جماعتوں اور ان کی لیڈرشپ کا تعاون چاہیے تھا۔ ریاست کی دونوں جماعتیں مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاست کے اتنی زیادہ زیرِ اثر چلی گئی تھیں کہ مہاراجہ کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ اس بات کو سوچ کر مزید کنفیوژ ہو گیا تھا کہ اس کی ریاست مسلم اکثریتی ہونے کے باوجود جموں صوبے میں غیر مسلم آبادی بھی اچھی خاصی موجود تھی ۔ اگر مہاراجہ ریاست کا الحاق شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے مطالبے کے مطابق ہندوستان سے کرے گا تو جموں کی مسلم اکثریتی آبادی پاکستان میں شامل ہونے کے لیے بغاوت کرے گی اور اگر وہ پاکستان میں شامل ہوتا ہے تو جموں کی ہندو آبادی اور کشمیری بولنے والی نیشنل کانفرنس کی حامی آبادی دونوں بغاوت کریں گی۔ ایسی خطرناک صورتحال میں ریاست میں سِول جنگ شروع ہو جائے گی۔

ایسی صورتِ حال میں مہاراجہ کے لیے کسی بھی ملک سے الحاق کا فیصلہ ریاست کے لئے تباہ کن ہو سکتا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے پہلے دونوں سیاسی جماعتوں سے بات چیت کی اور کسی حد تک مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ نے پہلے اس بات کی حامی بھری کہ ریاست آزاد رکھنے میں مسلم کانفرنس مہاراجہ کا ساتھ دے گی۔ چوہدری حمید اللہ خان، قائم مقام صدر مسلم کانفرنس نے ایک پریس کانفرنس میں مہاراجہ کے اس موقف کی حمایت کا اعلان کیا اور ایک بار پھر یہ دعویٰ کیا کہ مسلم کانفرنس ریاست کے 80 فیصد مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے،

مہاراجہ کی اس تجویز کی حمایت کرتی ہے کہ ریاست کو ہندوستان اور پاکستان میں شامل کرنا مشکل ہے کیونکہ ریاست میں آبادی کا ایک بڑا حصہ غیر مسلموں کا ہے جو پاکستان سے الحاق کی صورت میں خوش نہیں ہوں گے اور ہندوستان سے الحاق کی صورت میں مسلمانوں کی آبادی کا بڑا حصہ خوش نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں مہاراجہ کی تجویز معقول اور بہتر معلوم ہوتی ہے اور ہم سب ملکر ریاست میں رہتے آئے ہیں اور آئندہ بھی ہندو اور مسلم مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔
اس کیساتھ چوہدری حمید اللہ نے یہ بھی کہا کہ اگر ہماری ریاست پر کسی پڑوسی ملک نے حملہ کیا تو میں چوہدری حمید اللہ سب سے پہلے تلوار لے کر حملہ آوروں سے لڑوں گا۔ جب کہ کچھ ماہ بعد ہی چوہدری حمید اللہ خان، قائم مقام صدر مسلم لیگ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان قیوم خان کو ریاست کے سرحدی علاقوں میں حملہ کرنے کی دعوت دیتا ہے اور ریاستی فوج کو سرحدی علاقوں میں مصروف رکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ جبکہ شیخ عبداللہ بھی بدستور مہاراجہ پر مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ ہندوستان سے الحاق کی یقین دہانی کرائے۔ کیونکہ کشمیری صوبے اور جموں کی ہندو آبادی الحاق ہندوستان کی حامی ہے۔ شیخ عبداللہ پہلے ہی کئی بار اس بات کا اظہار سرِ عام کر چکا تھا کہ ریاست جموں کشمیر جس معاہدے کے تحت وجود میں آئی تھی وہ معاہدہ ڈوگرہ راج کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا اور کشمیری خطہ ثقافتی لحاظ سے الگ تھلگ ہے۔ جموں کے ڈوگرہ خاندان نے اس خطۂ کشمیر کو انگریز کی ایسٹ انڈیا کمپنی سے امرتسر معاہدہ میں 75 لاکھ نانک شاہی دے کر خریدا تھا اور کشمیری اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

دراصل شیخ عبداللہ کے معاہدہ امرتسر کے بارے میں یہ خیالات کیسے پیدا ہوئے جبکہ یہی معاہدہ کشمیر اور جموں کو آپس میں ملانے کا تاریخی دستاویز تھا۔ دراصل شیخ صاحب کی پوری کوشش یہ تھی کہ کسی طریقے سے کشمیر کو جموں سے الگ کر کے ہندوستانی یونین کا حصہ بنایا جائے۔ اندرون خانہ کوئی بھی کشمیری جموں، لدّاخ اور گلگت بلتستان کے علاقوں سے کوئی خاص ذہنی لگاؤ نہیں رکھتا تھا اس لئے شیخ عبداللہ کو اس بات کا علم تھا کہ یہ وقت اچھا ہے کہ کشمیر کو الگ ریاست یا ملک تسلیم کرا لیا جائے اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے کشمیر کا نجات دہندہ لیڈر بن جائے گا۔ کشمیر چھوڑ دو تحریک کی بنیاد بھی ریاست سے ڈوگرہ خاندان کی حکمرانی کے خاتمے

کے ساتھ ریاست کے دیگر علاقوں سے تعلق بھی ختم کرانے کی کوشش تھی لیکن نہرو نے قانونی پیچیدگی کا حوالہ دے کر شیخ عبداللہ کو عدالتی کارروائی سے بچانے کے لیے اس وقت اس نعرے سے باز رہنے کی تلقین کی تھی۔ شیخ عبداللہ نے اپنی کتاب آتش چنار میں صفحہ 357 سے 58 3 پر معاہدہ امرتسر کو بکری پٹر کہتے ہوئے اس کی حیثیت کو چیلنج کرنے اور مہاراجہ کو چندہ کر کے وہ رقم واپس کرنے کی بات کی ہے۔ یہ ارادہ شیخ عبداللہ کے ریاستی کردار کو مشکوک بناتا ہے کیونکہ شیخ عبداللہ نے کیبنٹ مشن پلان کے سامنے صرف کشمیری ثقافت اور کشمیری علاقے کی بات کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا وطن صرف کشمیر ہے، جس کی اپنی منفرد تاریخی حیثیت ہے۔

کیبنٹ مشن نے 19 اپریل 1946ء کو سرینگر کا دورہ کیا تھا۔ شیخ عبداللہ کا وہ خط جو کیبنٹ مشن کو لکھا تھا، اس کا متن اپنی کتاب آتش چنار میں دیا ہوا ہے۔ اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ کو سو سال بعد کشمیر پر کیا گیا معاہدہ کیوں منسوخ کرانا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کو جموں کے ساتھ رہنے میں کیا مسئلہ ہے جبکہ ریاست میں ڈوگرہ راج ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس وقت شیخ عبداللہ نے ہندوستان کے ساتھ رہنے کے لئے تو سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے لیکن ریاست کی دوسری اکائیوں کے ساتھ رہنے میں کیا مسائل حائل ہیں؟ اگر کشمیر کی ریاست سے علیحدگی اتنی ضروری تھی تو اس تحریک کا آغاز ہی ریاست سے الگ ہونے کے لیے کیوں نہ کیا گیا تھا۔ اگر کشمیری زبان اور ثقافت جموں صوبے سے الگ تھی تو کیا ہندوستانی کشمیری ثقافت اور زبان سے تعلق رکھتے تھے؟ اس نعرے کے پیچھے کیا عوامل تھے؟ کیا انگریز اس سوچ کو ہوا دے رہے تھے کہ ریاست کو دو قومی نظریہ کی بنیاد پر توڑ دیا جائے اور اس کے حصے کر کے مستقبل میں ہندوستان اور پاکستان کو دے دیئے جائیں؟ شیخ عبداللہ کی تحریک کا یہ نعرہ 1940ء کے بعد کیوں کشمیری علاقوں کی بنیاد بنا؟ شیخ عبداللہ مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف چلنے والی اپنی تحریک کو واضح طور پر آزادی کی تحریک بھی کہتا ہے جب کہ مسلم کانفرنس جو خود جموں کی علاقائی قیادت اور علاقائی وجود پر قائم ہے وہ بھی اپنا نعرہ ہندوؤں سے آزادی کی بنیاد اور نجات بتا رہی ہے۔ اگر دونوں جماعتوں کے پیشِ نظر عوامی حقوق کی جدوجہد تھا اور مہاراجہ کا ڈوگرہ شخصی راج کا خاتمہ کر کے ایک جمہوری نظام قائم کرنا مقصد تھا تو دونوں

جماعتوں کی لیڈرشپ کی سمت (Direction) ریاست کی مخالفت کیوں تھی؟ کیا ڈوگرہ حکمران کی مخالفت کی آڑ میں دونوں جماعتوں کی لیڈرشپ ریاست جموں کشمیر کی تقسیم کی مہم چلا رہی تھیں اور ان کے پیچھے ہندوستان کے چند سیاستدانوں اور انگریز حکومت کی خفیہ حمایت تو موجود نہیں تھی؟

یہ بات مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو اس لیے مشکوک بناتی ہے کہ وہ ہندو حکمران کی حکومت ختم کرنے کے بجائے اسی ہندو مہاراجہ کے خاندان کی بنائی ہوئی ریاست کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ اس تحریک کا رخ مہاراجہ سے حقوق لینا نہیں تھا بلکہ کسی طریقے سے ریاست کے حصے بخرے کر کے ہندوستان اور پاکستان کے کنٹرول میں دینا تھا۔ جو بعد میں دونوں جماعتوں نے ثابت بھی کیا۔ دونوں جماعتوں کی ہندوستان اور پاکستان کے لیے مہم چلانا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں ریاست کے چند حصے کرنا اور انہیں اپنی مرضی کے پڑوسی ملک کا حصہ بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جبکہ مسلم کانفرنس کا یہ دعوی کرنا کہ وہ ساری ریاست کی مسلم آبادی کی نمائندہ جماعت ہے اور مسلم عوام کے مفادات کے لیے کام کر رہی ہے، بے بنیاد ہے۔ اگر مسلمان عوام کا مفاد مسلم کانفرنس کی ریاست میں حکومت قائم کرنا تھا تو مہاراجہ کی حکومت کا خاتمہ کرنے کے بعد یا شراکت اقتدار کرنے سے وہ سارے مسلمانوں پر خوشی اور مرضی سے حکومت کر سکتی تھی۔ دوسرا اگر نیشنل کانفرنس کا مقصد بھی ریاستی عوام کو شخصی راج سے نجات دلا کر عوامی جمہوری حکومت قائم کرنا تھا تو وقت بالکل قریب پہنچ گیا تھا اور مہاراجہ کی حکومت کے خاتمے کے دن تو گنے جا چکے تھے۔

آخر دونوں جماعتوں کو کیا مصیبت پڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنے ریاستی عوام کے حقوق کی بحالی اور مہاراجہ حکومت کے خاتمے کے بجائے مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ ریاست میں شدید مذہبی منافرت کی فضا پیدا کرنے میں لگی ہوئی تھی اور نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کا فوکس بھی صرف کشمیری بولنے والا علاقہ اور اس کو ہندوستان میں شامل کرنے کی شدید فکر لگی ہوئی ہے۔ ریاست میں مہاراجہ کا اقتدار ختم کر کے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ بھی ریاستی عوام کی اکثریت کی مرضی سے کرنا آسان کام تھا۔ آخر دونوں جماعتوں کی لیڈرشپ نے سیدھا راستہ

اختیار کرنے کے بجائے سازش کا راستہ کیوں اختیار کیا جو آگے چل کر ریاست کے خاتمے کا باعث بنا تھا۔ ایسی صورتحال میں ہم مہاراجہ ہری سنگھ کا کردار دیکھتے ہیں کہ وہ ریاست کو اکٹھا رکھنے اور ہندوستان کے فرقہ وارانہ بٹوارے کے اثرات سے ریاست کو بچانے کے لیے کیا اقدامات کرتا ہے۔ مہاراجہ کے لئے دونوں ریاستی جماعتوں نے اور ان کی کوتاہ اندیش لیڈرشپ نے ریاست میں بہت ہی پیچیدہ حالات پیدا کر دیے تھے۔

ابھی ہندوستان میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریز سامراج کو ہندوستان پر اپنا سامراجی تسلط جاری رکھنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ بوڑھا سامراج ہارنے کے بجائے ہندوستان سے نکلنے کی نئی حکمت عملی بنا رہا تھا اور اندرونِ خانہ ہندوستان کا خونی بٹوارہ کرانے کا منصوبہ بنانے میں مصروف تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شدت آ چکی تھی انگریز کے لیے ہندوستان پر مزید قبضہ قائم رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لئے برطانوی حکومت نے وائسرائے ہند کی تجویز پر ہندوستان کے بٹوارے کا منصوبہ شائع کیا اور 17 جون 1947ء کو قانون آزادی ہند (Indian Independence LaW) پاس کیا گیا۔ قانون آزادی ہند میں کہا گیا کہ 15 اگست 1947ء تک برطانیہ ہندوستان سے اپنا اقتدار ختم کر دے گا اور ہندوستان 15 اگست سے ایک آزاد ملک کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ ہندوستان کے وہ علاقے جن میں اکثریتی آبادی مسلمانوں کی ہے وہ پاکستان بن جائیں گے اور آزاد ملک کی حیثیت اختیار کر لیں گے ۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں تمام ہندوستانیوں نے اکٹھے حصہ لیا تھا اور بے پناہ قربانیاں بھی اکٹھے دی تھیں۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں 1937ء کے انتخابات کے بعد دراڑیں آ چکی تھیں۔ ہندوستان کی تحریک مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہو چکی تھی ۔ ایک دھڑا انگریزوں سے زیادہ اپنے ہم وطن ہندوؤں کی اکثریت آبادی سے آزادی حاصل کرنے کی مہم چلا رہا تھا اور اس کی قیادت مسلم لیگ کے رہنما محمد علی جناح اور ان کے ساتھی کر رہے تھے ۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہندوستان کو انگریز آزاد کرنے سے پہلے ہندو آبادی اور مسلم آبادی میں تقسیم کر دیں تا کہ مسلم آبادی آزاد ہندوستان میں اکثریتی ہندو آبادی کے رحم وکرم پر نہ ہو بلکہ اپنے مسلم اکثریتی علاقوں میں ان کی

اپنی حکومت قائم ہو۔ دوسرے الفاظ میں جناح صاحب اور اس کی مسلم لیگ کے ساتھیوں نے متحدہ ہندوستان میں دوسرے مذہبی فرقوں سے مل کر نظام حکومت تشکیل دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب انگریز حکومت ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں کو ہندوستان سے الگ کر کے ایک مسلم اکثریتی ریاست قائم کرنے کا اعلان کر چکی تھی۔

3 جون کا منصوبہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کا منصوبہ تھا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کر لیا تھا۔ اس برطانوی پارلیمنٹ کے بنائے گئے قانون کے مطابق ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس قانون کو قانونِ آزادِ ہند کہا گیا تھا۔ مذہبی تقسیم کے پیچھے جن عناصر کا ہاتھ تھا، ان کے مقاصد مذہبی نہیں تھے بلکہ وہ ایک نئی علاقائی ریاستی شناخت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان میں مذہبی تقسیم کا یہ ہرگز مطلب نہیں تھا کہ سارے ہندوستانی مسلمان ایک طرف چلے جائیں گے اور سارے غیر مسلم دوسری طرف چلے جائیں گے، نہ ایسا کرنا ممکن تھا۔ ہندوستان کے بٹوارے کے پیچھے جہاں اندرونِ ہندوستان کچھ تضادات موجود تھے جن سے سیاسی قوتیں فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں تو کچھ اس تقسیم کے پیچھے بڑی طاقتوں کی خطے میں کشمکش کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس خطے میں پہلے زارِ روس اور برطانوی سامراجی طاقت کا شدید ٹکراؤ تھا۔ اب یہ ٹکراؤ سوویت یونین کی کیمونسٹ حکومت اور برطانوی سامراج کے علاوہ نئے ابھرتے ہوئے امریکی اثر و رسوخ کے درمیان شدت اختیار کر چکا تھا۔ ہندوستان کے بٹوارے کے پیچھے ان بڑی طاقتوں کے مفادات کا ٹکراؤ بھی بڑا فیکٹر تھا جس کی وجہ سے انگریز ہندوستان میں سویت یونین کی مداخلت اور کیمونسٹوں کے اثر کو کم کرنے کے لیے افغانستان کے راستے سے اور ہمالیائی پہاڑوں کی طرف سے ملنے والے راستوں کو محفوظ بنانے کے لیے اس تقسیم کی حِکمت عملی پر عمل کر رہے تھے۔ انگریز ہندوستان کے افق پر ابھرنے والے سرخ انقلاب کو روکنے کے لیے سوویت یونین اور ہندوستان کے درمیان ایک بفر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے جس کی مدد سے سوویت یونین کا ہندوستان میں داخلہ روکا جا سکے۔ انگریز کیمونسٹ نظریات کو ہندوستان کے لئے نہایت ہی خطرناک قرار دے چکے تھے۔ سرخ انقلاب کی آندھی ہندوستان میں انگریز کا اثر و

رسوخ ختم کر کے اسے سویت یونین کے کنٹرول میں دے سکتی تھی۔انگریز اس کے خاتمے کیلئے پورا منصوبہ تیار کر چکے تھے اور ہندوستان برصغیر کو آزاد کرنے کے باوجود اپنے نظام کو اس خطے پر مسلط رکھنا چاہتے تھے۔قومی ریاستوں کا قیام پہلے یورپ میں ہوا تھا اور قومی شناخت اور جدید ریاست کے تصورات سرمایہ دارانہ جمہوری انقلابات کا باعث بنے تھے۔ یورپ کی شہنشاہیت یا بادشاہتیں قومی جمہوری ریاستوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں لیکن ان کی علاقائی حدود بادشاہوں کے زمانے سے ہی چلی آئی تھیں۔ یورپ میں قومی ریاستوں کے قیام کی بنیاد مشترکہ علاقہ ، مشترکہ معاشی اور سیاسی نظام اور مشترکہ تاریخی سفر بھی شامل تھا۔لیکن نئی ریاستوں کا نظام جمہوری اصولوں پر چلایا جائے تمام شہریوں کو برابری کے حقوق حاصل ہوں گے اور قومی جمہوری حکومت میں مذہب اور فرقے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا بلکہ مذہب کو ریاستی امور سے الگ کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی شاہی نظام کے خاتمے کے بعد ہندوستان کے بٹوارے کو بھی مذہبی رنگ دیا گیا۔دونوں نئی ریاستوں کے قیام کی بنیاد ہندو اور مسلم قوم بنایا گیا اور یہ بات تسلیم کی گئی کہ ہندو اور مسلم دو قومیں ہیں۔ یہ دونوں مذہبی کمیونٹیز تھیں اور ہیں۔

یورپ کی قومی جمہوری ریاستوں کے لیے بنیاد علاقوں ، سیاسی ،معاشی نظام، زبان اور ثقافت قرار دیا گیا لیکن برطانوی سامراج ہندوستان میں دو قومی ریاستوں کی تشکیل مذہب کو قرار دے رہا تھا۔ یہ کسی بھی سیاسی اور سماجی علوم کے دائرے میں آنے والی تشریح نہیں مانی جاسکتی کیونکہ دونوں ریاستوں کا قیام علاقائی شناختوں کی بنیاد پر ہی تھا۔آخر انگریز سامراج کی کیا مجبوری ہوسکتی ہے کہ وہ ہندوستان میں دو مذاہب کے پیروکاروں کو دو قومیں تسلیم کرنے کے لیے اپنی پارلیمنٹ سے ہی اس کے حق میں ایک قانون منظور کرواتا ہے جبکہ ہندوستان میں دو قومیں نہیں تھی بلکہ کئی قومیں آباد تھیں جو اپنے تاریخی تسلسل کے نتیجے میں وجود میں آئی تھیں اور وہ ہندوستانی سماج کی تاریخی حقیقت بن چکی تھیں۔ان کے تاریخی وجود سے انکار کر کے دو مذہبی فرقوں کو قومیں قرار دینا اور اس کو بنیاد بنا کر ہندوستان میں دو علاقائی شناختیں قائم کرنا اور ہندوستان کو تقسیم کرنا ایک نئی طرز کے جھگڑے اور فساد کو جنم دینے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دوسری طرف ہندوستان میں ہزاروں سالوں کا تاریخی ارتقاء طے کر کے ہندوستان کی مقامی قوموں

کے وجود کو مٹانے کی کوشش کرنا اور ان کی شناختوں سے انکار کرنا انگریز سامراج اور اس کے مقامی حمائیتیوں کی رجعت پسندی کا واضع ثبوت ہے۔

انگریز حکومت کے دور میں ہندوستان کو دو انتظامی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے ایک حصے کو برطانوی ہند یا برٹش انڈیا کہا گیا تھا اور دوسرے حصے کو فیوڈل بادشاہی ریاستوں کا ہندوستان کہا گیا تھا۔ برٹش انڈیا یا برطانوی ہند کے علاقے انگریز کے براہِ راست کنٹرول میں تھے جنہیں برطانوی بادشاہ یا ملکہ کی براہِ راست عملداری میں یا ماتحت بھی کہا جا سکتا ہے جبکہ ہندوستان کا دوسرا حصہ انگریز حکومت کے براہِ راست کنٹرول میں نہیں تھا۔ ان علاقوں پر مقامی نواب اور راجے مہاراجے انگریز حکومت سے معاہدات کر کے اپنے اپنے علاقوں یا فیوڈل ریاستوں میں انتظامی امور چلا رہے تھے۔ یہ شاہی ریاستیں برطانوی ہند کے 40% زمین یا علاقوں پر مشتمل تھیں اور 23% آبادی ان علاقوں میں رہتی تھی۔ ان شاہی ریاستوں کی تعداد انگریزوں کے ہندوستان سے جاتے وقت یعنی 1947ء میں 565 تھی۔ قانون آزادی ہند کی رو سے ہندوستان کے ان علاقوں کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا جو برطانوی ہند کے علاقے ہیں۔ شاہی ریاستوں کو اس قانون میں مذہب کا پابند نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ اختیار دیا گیا تھا کہ ان ریاستوں کے حکمران ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کا حصہ بن جائیں۔ گویا 40% ہندوستان میں بسنے والے ہندو اور مسلم اس دو قومی نظریہ کی تعریف میں نہیں آتے تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کا بٹوارہ ایک خاص بین الاقوامی حالات کو مدنظر رکھ کر کیا جا رہا تھا نہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے جو بعد میں ثابت بھی ہو گیا کہ اس خطے میں بڑی طاقتوں کی رسہ کشی نے تقسیمِ ہند کے حالات پیدا کیے تھے۔ ہندوستان کی شاہی ریاستوں کے مستقبل کے سوال کو کیبنٹ مشن کے 12 مئی 1946ء کے ایک میمورنڈم میں پیش کیا گیا۔ اس میمورنڈم میں ریاستوں کے ساتھ معاہدات اور برطانوی اقتدار کے خاتمے کا معاملہ کیبنٹ مشن نے ہندوستانی ریاستوں کے راجوں اور مہاراجوں کے چانسلر کے سامنے پیش کیا تھا۔ کہا گیا کہ ہندوستانی ریاستوں کے حقوق جو برٹش کراؤن یا برطانوی اقتدار کی طاقت سے جڑے ہوئے

ہیں انگریز کی پیراماؤنٹسی (Paramountcy) ختم ہوتے ہی، ختم ہوجائیں گے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ شاہی ریاستوں نے جو اختیارات اور امور برطانیہ کے ساتھ شیئر یا مشترکہ کر رکھے تھے وہ ریاستوں کو واپس ہوجائیں گے۔گویا قانونی اعتبار سے شاہی ریاستیں مقتدرہ یا اقتدار اعلیٰ کی مالک ہو جائیں گی لیکن برطانوی ہند کے خاتمے سے ریاستوں کے انگریز حکومت سے تعلقات کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔

برطانوی ہند کے خاتمہ سے یہ ریاستیں، نئی ہندوستانی ریاست یا دونوں ریاستوں (پاکستان، ہندوستان) کے درمیان نئے سرے سے تعلقات قائم کرنا چاہئیں یا کسی ایک ریاست کے وفاق کا حصہ بن جائیں یا دونوں سے اپنی مرضی کے معاہدات کرلیں۔قانون آزادی ہند کے دونوں ایکٹ ریاستوں کے ہندوستان اور پاکستان سے الحاق کرنے کا طریقہ کار واضع کرتے ہیں۔دونوں ایکٹ 1935 اور 1947ء کا ایکٹ برطانوی پارلیمنٹ کے منظور کردہ ہیں جو ہندوستان کی آزادی کی قانونی بنیاد مہیا کرتے ہیں ۔ ہندوستان کی شاہی ریاستوں کے حکمرانوں کو قانونی اختیار مہیا کرتے ہیں کہ وہ الحاق کی دستاویزات کو قبول کرتے ہوئے پاکستان سے الحاق کریں۔جو پاکستان سے الحاق کریں گی وہ پاکستان کا حصہ بن جائیں گی اوراس کا اندرونی حصہ کہلائیں گی۔اس طرح جو ریاستیں الحاق کی دستاویز پر دستخط کریں گی وہ ہندوستانی یونین میں ضم ہو جائیں گی اور ہندوستان کا اٹوٹ انگ یا اندرونی حصہ کہلائیں گی۔

اس قانونی حیثیت کو پاکستان کے بانی اور گورنر جنرل محمد علی جناح نے کئی مواقع پر دہرایا تھا،اس کو قبول بھی کیا تھا اور درست قرار دیا تھا۔دوسری قانونی حیثیت جو ریاستوں کو دی گئی تھی وہ معاہدہ جاریہ (Stand Still Agreement) کرنے کا راستہ تھا۔ اس حیثیت میں ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ آپشن دیا گیا تھا کہ اگر وہ الحاق کے معاملات کے لیے تیار نہیں ہیں تو 17 جون 1947ء سے جب قانون آزادی ہند منظور ہوا تھا اور 15 اگست 1947ء کے درمیان کسی ایک نئی تشکیل پا جانے والی ڈومینین (Dominion) یعنی انڈیا سے معاہدہ جاریہ (Stand Still Agreement) کرنے یا دوسری

ڈومینین (Dominion) پاکستان سے معاہدہ جاریہ (Stand Still Agreement) کرلیں یا ریاستیں دونوں سے یہ معاہدہ جاریہ (Stand Still Agreement) کرلیں۔ الحاق نہ ہونے کی صورت میں ہندوستانی یونین کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ہندوستانی شاہی ریاستوں کا دفاع کرے اور ان کو تحفظ مہیا کرے کیونکہ ہندوستان کی موجودہ ڈومینین (Dominion) کو برطانیہ کی جانشین حکومت کا درجہ حاصل تھا۔ جس طرح انگریز حکومت نے مغل حکومت سے ہندوستان کا اقتدار لیا تھا، اقوام متحدہ نے بھی ہندوستان کی موجودہ حکومت کو ہی آزادی سے پہلے والی انگریز حکومت کا تسلسل تسلیم کرتے ہوئے اس کی ممبر شپ پرانی والی ہی بحال رکھی اور ہندوستان کو اسی ممبر شپ کے ساتھ اقوام متحدہ میں کام جاری رکھنے کی اجازت دی لیکن پاکستان کو نئے سرے سے اقوام متحدہ کا ممبر بننے کے لیے درخواست دینا پڑی۔ اس کو اقوام متحدہ نے ایک نئی ممبر شپ کے طور پر ایک نیا ملک تسلیم کرتے ہوئے اپنا ممبر بنایا تھا۔

یہ اس وقت کی قانونی پوزیشن تھی جب 1947ء میں ہندوستان آزاد ہونے والے دن ہی تقسیم ہو رہا تھا۔ اس وقت ریاست جموں کشمیر کیلئے ہندوستان اور پاکستان سے الحاق کرنے میں بے پناہ پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ان تمام سالوں کے دوران مہاراجہ ہری سنگھ ریاست کو آزاد ملک بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ برطانوی حکومت اس کی آزاد ریاست کو تحفظ فراہم کرنے میں اس کی مدد کرے گی جبکہ مہاراجہ کو یہ احساس نہیں تھا کہ ہندوستان سے برطانیہ کا اقتدار ختم ہو جانے کے بعد کی صورت بدل چکی ہوگی۔ مہاراجہ کو یہ بھی علم تھا کہ اس کی ریاست کثیر المذہبی اور مختلف علاقائی شناختوں پر مشتمل ہے۔ صرف مذہبی حوالہ ہی ریاست کے فیصلہ میں کارآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ مہاراجہ اپنی ریاست کی آزاد ملک کی حیثیت کی سوچ اور خواہش کو اتنا بڑھا چکا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ ریاست کے دونوں ملکوں سے اچھے اور دوستانہ تعلقات قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دوسری وجہ اس کی یہ بھی بن چکی تھی کہ وہ ہندوستان سے الحاق بالکل بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ کانگریس پارٹی شیخ عبداللہ کی کھلے عام مدد کر رہی تھی اور شیخ عبداللہ ریاست میں مہاراجہ کی آزاد اور الگ ریاست کی

شدید مخالفت کر رہا تھا۔ مسلم کانفرنس اپنی دوغلی پالیسی کی وجہ سے ڈبل گیم کھیل رہی تھی۔ ایک طرف مسلم کانفرنس مہاراجہ کی ریاست کو الگ رکھنے اور اسے آئینی حکمران تسلیم کرنے کا تاثر عام ریاستی عوام کو دے رہی تھی جب کہ اندرونِ خانہ پنجاب کی مسلم لیگ اور انگریز حکومت کے کچھ اہلکاروں سے خفیہ رابطہ بھی رکھے ہوئے تھی۔ تمام شاہی ریاستوں نے 15 اگست تک یا بعد میں ہندوستان اور پاکستان سے الحاق کر لیا تھا جبکہ مہاراجہ ہری سنگھ اپنی ریاست کا الحاق ٹالنا چاہ رہا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں مہاراجہ کی اس پالیسی کے خلاف الگ الگ منصوبوں پر غور کیا جا رہا تھا۔ ایک طرف انگریز حکومت کے اہلکاروں کے اپنے منصوبے تھے جبکہ کانگریس اور مسلم لیگ کی لیڈرشپ کے ریاست کے بارے میں اپنے الگ منصوبے تھے۔

جب مہاراجہ نے کوئی فیصلہ نہ کیا تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن 19 جون 1947ء کو ریاست میں مہاراجہ سے ملنے آیا اور اسے خطرناک صورتحال سے آگاہ کرنے لگا کہ مہاراجہ الحاق کا فیصلہ نہ کر کے سنگین غلطی کر رہا تھا اور چار دن تک ریاست میں رہا لیکن مہاراجہ نے ماؤنٹ بیٹن سے کوئی بات چیت نہ کی۔ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مہاراجہ کی جتنی ملاقاتیں اس دوران ہوئیں وہ کار میں کئی بار سوار ہو کر دوسری جگہ جانے کے دوران مختصر وقت ہوئیں۔ کار میں بیٹھ کر ملاقاتوں میں ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ اور ریاست کے وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک کو بار بار کہا کہ وہ ریاست کی آزادی کا اعلان نہ کریں بلکہ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ پر زور دیا کہ وہ کسی طریقے سے عوام کی مرضی دریافت کرے اور 14 اگست تک اپنی ریاست کا الحاق لازمی طور پر کسی ایک ڈومینین (Dominion) سے کر دے اور اس حساب سے اپنی ریاست کے نمائندے، ان میں سے کسی ایک کی آئین ساز اسمبلی میں بھیج دے۔ ماؤنٹ بیٹن نے بار بار اسی بات پر زور دیا کہ مہاراجہ 14 اگست 1947ء تک ہر حال میں ریاست کے الحاق کا فیصلہ کرے۔ بقول ماؤنٹ بیٹن، مہاراجہ نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ اگر مہاراجہ 14 اگست سے پہلے پاکستان سے الحاق کر لیتا تو میں ہندوستان کی طرف سے یقین دہانی کرا لیتا کہ وہ اس کے اس اقدام پر اعتراض نہیں کریں گے اور اگر وہ 14 اگست

سے پہلے ہندوستان سے الحاق کر لیتا تو اس وقت پاکستان کا وجود ہی ابھی قائم نہیں ہوا تھا اور پاکستان کی طرف سے ریاست میں مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن مہاراجہ ہری سنگھ کے رویہ سے مایوس ہو کر واپس لوٹ جاتا ہے۔ اگست کے پہلے ہفتے میں نیشنل کانفرنس کے چند لیڈروں کے کہنے پر مہاتما گاندھی کشمیر آتے ہیں اور سری نگر میں مہاراجہ سے ملاقات کرتے ہیں، مہاراجہ پر زور دیتے ہیں کہ وہ ہندوستان سے الحاق کی حامی بھرے لیکن مہاراجہ نے مہاتما گاندھی کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ 12 اگست 1947ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت نے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو معاہدہ جاریہ یا معاہدہ قائمہ (Stand Still Agreement) کرنے کے لئے ٹیلیگرام بھیجا اور دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم سے ریاست جموں کشمیر کے ساتھ ایک ہی طرح کے امور طے کرنے کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس ٹیلی گرام پیغام میں دونوں ملکوں کی حکومتوں سے کہا گیا کہ وہ تمام معاہدے جو ریاستی حکومت نے ہندوستان کی انگریز حکومت سے کیے گئے تھے وہ ریاستی حکومت دونوں ملکوں سے برقرار رکھنا چاہتی ہے اور یہ بھی کہا کہ ریاستی حکومت وہی معاہدے جاری رکھنے کے لیے دونوں ملکوں سے درخواست کرتی ہے۔ معاہدۂ امرتسر میں موجود دفاعی انتظام اور دیگر اُمور بھی اس میں شامل ہیں، وہ بھی ریاستی حکومت دونوں سے دفاعی معاہدہ برقرار رکھنا چاہتی ہے جو بیرونی حملے اور اندرونی بغاوت کی صورت میں ہندوستان کی افواج کو بلانے کا معاہدہ بھی تصور کیا جاتا ہے۔

اگر کوئی ملک ریاست پر حملہ کر دے تو اس دفاعی معاہدے کے مطابق ہندوستانی افواج ریاستی فوج کی مدد کے لیے آئیں گی۔ اس دفاعی معاہدے کو ریاست جموں کشمیر کی حکومت دونوں ملکوں سے کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ ہندوستان کی حکومت نے ریاستی حکومت کی طرف سے کی گئی معاہدے کی آفر کو قبول نہ کیا بلکہ واپس ٹیلیگرام کیا کہ اگر ریاستی حکومت کی طرف سے وزیر اعظم خود یا اس کا کوئی وزیر معاہدہ قائمہ پر مزید بات چیت کرنے کیلئے دہلی آئے تو حکومت ہند کو خوشی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ ریاستی حکومت کا کوئی نمائندہ دہلی جا کر معاہدے پر مزید ہندوستانی حکومت سے بات چیت کرتا، ریاست پر پاکستان کی طرف

سے حملہ ہوگیا اور اس حملے نے نئی صورتحال پیدا کردی۔اس معاہدے کے معاملات میں گڑبڑ پیدا ہوگئی اور معاہدہ تکمیل تک نہ پہنچ پایا۔حکومت پاکستان نے مہاراجہ حکومت سے یہ معاہدہ کرلیا جو 15 اگست سے لاگو بھی ہوگیا تھا۔اس معاہدے پر دستخط ہونے سے پاکستان اور ریاست کی حکومت نے آپس میں انتظامی امور پر عمل شروع کر دیا،جس کی رو سے حکومت پاکستان نے ریاست میں خوراک، پٹرول اور دیگر ضروری اشیائے زندگی کی سپلائی شروع کر دی۔ڈاک اور تار، ٹیلی گرام اور دیگر کمیونی کیشن کا نظام بھی ریاستی حکومت کی مدد کے لئے شروع کر دیا تھا۔یہ نظام سنبھالنے کے بعد ریاستی حکومت کو اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ پاکستان اندرون خانہ خفیہ طریقے سے ریاست جموں کشمیر پر حملے کی تیاری کررہا تھا۔

1947ء کے اوائل میں ہی پنجاب صوبے میں مذہبی فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔پنجاب کے فرقہ وارانہ فسادات ریاست کے صوبہ جموں میں بے چینی کا سبب بن چکے تھے ،خاص کر مغربی پنجاب کی طرف لمبی سرحد جموں صوبے سے ملتی تھی۔پنجاب میں فسادات کی وجہ سے آبادی کا انخلا شروع ہوگیا تھا۔لوگ پنجاب کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں آنے جانے لگے تھے۔پنجاب کے لوگوں کا فسادات کی وجہ سے ہجرت شروع ہونے سے جموں صوبے میں خطرات پیدا ہوگئے تھے کیونکہ کچھ لوگ پنجاب سے جموں کے علاقوں میں داخل ہورہے تھے جس کی وجہ سے جموں میں ہندو مسلم فسادات پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔اس خطرے کے پیش نظر مہاراجہ نے ریاستی فوج کا ایک بڑا حصہ پنجاب کے باڈر کے ساتھ تعینات کر دیا تھا جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں پورے باڈر علاقے میں پھیلا دی تھی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاستی فوج کا کوئی مزید ریزرو (Resrve) حصہ موجود نہیں تھا جو بیرونی حملے کی صورت میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا اور ریاست کا دفاع کرتا۔ایسی حالت میں کسی بڑے حملے کے لیے مطلوبہ فوج کی نفری موجود ہی نہیں تھی۔پاکستان نے ریاست پر حملے کی تیاری بہت پہلے ہی کر لی تھی حالانکہ پاکستان نے ریاست کے ساتھ معاہدہ قائمہ کرلیا تھا۔ریاست کے معاملات میں معاہدے کے مطابق اقدامات بھی شروع کر دیے تھے لیکن پاکستان نے ستمبر کے پہلے ہفتے میں ہی ریاست کے سرحدی علاقوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔

پاکستان کے حملے کی سہولت کاری کے لیے جموں صوبے میں مسلم کانفرنس کی قیادت سمیت بے شمار لوگ پاکستان کی مدد کر رہے تھے۔ یہ پاکستان کی ریاست کی طرف سے جموں صوبے کے علاقوں میں ابتدائی حملے تھے۔ ان حملوں میں پاکستانی فوج کے اہلکاروں اور کچھ فوج کے مددگار گروپ حصہ لے رہے تھے۔ گویا پاکستان ریاست کے مہاراجہ کو زبردستی پاکستان سے الحاق کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور دباؤ ڈال کر ریاست کا فیصلہ کرانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ بقول ماونٹ بیٹن، ریاست کو آزاد رکھنے کا خواب دیکھ رہا تھا اس لیے وہ حیلے بہانے تلاش کر کے ہندوستان اور پاکستان سے الحاق کے مسئلے کو ٹالنے کی بھرپور کوشش میں لگا ہوا تھا۔ مہاراجہ کے لیے اس وقت یہ فیصلہ کرنا آسان تھا کہ وہ ہندوستان سے الحاق کر لیتا کیونکہ ریاست کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ کشمیر اور اس صوبے کی لیڈرشپ ہندوستان سے الحاق کے لیے مہاراجہ پر شدید دباؤ ڈال رہی تھی۔ جموں صوبے میں ہندو پرجا پرشید، ایک ہندو انتہاء پسند گروپ بھی مہاراجہ پر شدید دباؤ ڈال رہا تھا تاکہ وہ ہندوستان سے الحاق کرے۔ شمالی صوبہ گلگت اور لدّاخ میں بھی صورتِ حال مہاراجہ کے حق میں ہرگز نہ تھی لیکن اس شمالی صوبے میں آبادی بہت کم تھی۔ جموں صوبے میں مسلم کانفرنس مکمل طور پر اندرون خانہ پاکستان کے خفیہ منصوبے کی تیاری میں مددگار تھی۔

☆☆☆☆

پانچواں باب

پاکستان کا ریاست جموں کشمیر پر حملہ

ریاست جموں کشمیر کی فوج کے کمانڈر میجر جنرل سکاٹ نے ستمبر کے پہلے ہفتے میں ریاستی حکومت کو پاکستانی ریاست کی طرف سے فوجی مداخلت کی پہلی رپورٹ پیش کی۔ ریاستی فوج کے کمانڈر نے پنجاب کے سرحدی علاقوں میں ریاستی فوج کو ٹکڑیوں میں تعینات کیا ہوا تھا۔ ریاستی فوج کا یہ کمانڈر برطانوی تھا اور فوج کا کمانڈر انچیف بھی یہی تھا۔ اس کی رپورٹ کی روشنی میں ریاستی حکومت نے مغربی پنجاب کی حکومت کو 4 اکتوبر کو ٹیلی گرام کے ذریعے ایک احتجاجی مراسلہ بھیجا اور کہا کہ راولپنڈی سے کچھ مسلح گروہوں نے بار بار ریاستی حدود کے اندر آ کر سرحدوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ دو دن کے بعد میجر جنرل سکاٹ نے ریاستی حکومت کو ایک اور رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا کہ پنجاب کے سرحدی علاقوں سے ریاست کی سرحدوں کی مزید خلاف ورزی کی گئی تھی اور کئی پاکستانی شہری اور فوج کے اہلکار 13، 17، 18 اور 28 ستمبر کو ریاستی سرحد کے اندر مسلح داخل ہوئے ہیں اور ریاستی شہریوں میں خوف و ہراس پھیلانے کا باعث بنے ہیں۔ 3 اکتوبر 1947ء کو ریاستی حکومت نے حکومت پاکستان کو ایک مزید احتجاجی مراسلہ بھیجا اور کہا کہ کئی مسلح گروہ مری کی پہاڑیوں سے پونچھ کے علاقوں میں داخل ہوئے ہیں اور اس کے بعد ریاست میں کئی مسلح گروہوں نے اکتوبر کے مہینے میں ریاست میں مداخلت کی۔ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر وہ ریاست کا

الحاق پاکستان سے کرے گا تو ہندوستان اعتراض نہیں کرے گا اور یہ کام مہاراجہ کو اسی قانونی طے شدہ طریقہ کار کے مطابق کرنا تھا۔ پاکستان اس وقت ریاست کے حکمران کو مسلح کاروائیوں کے ذریعے خوف زدہ کرکے جبراً الحاق پر مجبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ پاکستان ریاستی حکمران کے ساتھ معاہدہ قائمہ بھی کر چکا تھا اور معاہدہ قائمہ پر 15 اگست سے عمل درآمد بھی شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان ریاست کے ساتھ دوستانہ تعلقات کئی مہینے سے قائم کر کے روزمرہ زندگی کے معاملات نارمل حالات میں چلا رہا تھا۔ اب پاکستان نے سرحدی حملے کے ساتھ ساتھ معاشی اور تجارتی سرگرمیوں پر بھی روک لگا دی تھی۔ ریاست میں خوراک سمیت پیٹرولیم کی ترسیل روک دی، روزمرہ زندگی کی ضروریات پر بھی ریاست میں داخلے پر اچانک پابندی لگا دی۔ مسلح حملے سے یہ حملہ پاکستان کا زیادہ خطرناک تھا کیونکہ ریاست میں پٹرولیم اور خوراک کے داخلے پر پابندی نے نظام زندگی مفلوج کرنا شروع کر دیا۔ خوراک کی کمی شروع ہوگئی، پٹرولیم کے رکنے کی وجہ سے ٹرانسپورٹ کا نظام ریاست بھر میں مفلوج ہو گیا تھا۔ کمیونیکیشن کا نظام بھی پاکستان نے درہم برہم کر دیا اور لوگوں کے ریاست سے باہر جانے اور ریاست میں آنے پر زبردست روک لگا دی۔ ریاستی حکومت کی طرف سے پاکستان کو کئی مراسلے بھیجے گئے کہ وہ ریاست کے خلاف معاشی پابندیاں ختم کریں لیکن ریاست کی بار بار کی گئی درخواست کے باوجود پاکستان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا اور پاکستان مسلسل ریاست میں انسانی زندگیوں کو اجیرن کرنے میں لگا ہوا تھا۔

حالات کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے مہاراجہ ہری سنگھ نے 15 اگست 1947ء کو برطانوی وزیراعظم کو ایک سرکاری مراسلہ بھیجا جس میں کہا گیا کہ پاکستان نے ایک طرف ضروریات زندگی کی اشیاء کو ریاست میں داخلے پر پابندی لگا دی اور دوسری طرف پاکستان ریاست کے سرحدی علاقوں سے حملے کی تیاری کر چکا ہے۔ ریاست کی سرحد گورداس پور سے گلگت تک حملے کی دھمکی دے رہا ہے اور اس حملے کا آغاز پونچھ سے شروع کر دیا گیا ہے۔ مہاراجہ یہ سوچ رہا تھا کہ برطانوی وزیراعظم ابھی تک ہندوستان کی شاہی ریاستوں کے تحفظ کا ذمہ دار تھا اور پاکستان کو ریاست پر معاشی پابندی عائد کرنے اور پونچھ پر حملے سے روکے گا یا

مددگار ہوگا۔ یاد رہے کہ پاکستان اکتوبر میں اپنے فوجی اہلکاروں کی اچھی بڑی تعداد ریاست کے ان علاقوں میں داخل کر چکا تھا جو آج کل آزاد کشمیر کہلاتے ہیں۔ یہ فوجی ہندوستان کی برطانوی فوج کے ممبر تھے جو اسوقت پاکستان کے حصے میں آ گئے تھے۔ یہ فوجی ریاست جموں وکشمیر کے ان علاقوں کے ہی رہنے والے تھے جنہیں آزاد کشمیر کہتے ہیں۔ یہی علاقے تھے جن پر پاکستان نے بعد میں پوری طرح فوج اور قبائلیوں سے حملہ کیا تھا اور یہ علاقے ریاستی حکومت سے چھین کر اپنے انتظام کے تحت کر لیے تھے۔ آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے برطانوی فوجیوں کو پاکستانی آفیسروں نے ریاست پر حملے کی راہ ہموار کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں کو چھٹی گزارنے کے بہانے بھیجا تھا لیکن یہ پاکستانی فوج کے بڑے حملے کا حصہ تھے۔ چونکہ یہ ریاست میں ایسے حالات میں بھیجے گئے تھے جب پورا ہندوستانی پنجاب کا صوبہ مذہبی فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔

آزاد کشمیر کے یہ فوجی بظاہر ان تشویش ناک حالات کی وجہ سے اپنے خاندانوں کی فکر لے کر سویلین روپ میں گھروں کی طرف آئے تھے لیکن ان میں سے اکثر کے پاس اپنی فوجی بندوقیں بھی تھیں۔ یہ فوجی اہلکار جب علاقوں میں داخل ہوئے تو اپنے ساتھ مذہبی پروپیگنڈہ اور پنجاب کے مذہبی فسادات کا حال احوال بھی لائے تھے۔ ان فوجی اہلکاروں نے مقامی ہندو سِکھ آبادی میں خوف و ہراس کے ساتھ مسلم آبادی میں بھی خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی تھی اور لوگوں میں عدم تحفظ پیدا کر دیا کہ ہندو اور سِکھ ان پر حملہ کریں گے۔ چونکہ پنجاب سے ہندو اور سِکھ خاندان جموں صوبے کے سرحدی علاقوں میں فسادات کے ڈر سے داخل ہو کر پہلے ہی ایسی مذہبی فسادات کی فضا پیدا کر چکے تھے جب یہ فوجی ان علاقوں میں آ کر پروپیگنڈہ کرنے لگے تو لوکل مسلم ، ہندو اور سِکھ آبادی کے حملے کے خوف سے ان کے پروپیگنڈے کو درست سمجھ کر ان کے منصوبے کے حامی بن گئے یا مقامی سطح پر ساتھ رہنے والے ہندو سِکھ ہموطنوں کے تحفظ سے غافل ہو گئے۔ مذہبی جذبات میں آ کر ان کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے اور کچھ عناصر ان کے قتلِ عام میں شامل ہونے کی تیاری بھی کرنے لگے۔ جموں کی مسلم آبادی کی اکثریت یہ سمجھنے لگی کہ اگر وہ پاکستان میں شامل

ہونے کی حمایت نہیں کریں گے تو ان پر ہندو اور سکھ ہندوستان کی فوج سے مل کر حملہ کریں گے اور خاندانوں کا قتلِ عام کریں گے جس طرح یہ غیر مسلم پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔ یہ یک طرفہ مذہبی پروپیگنڈہ اس قدر عام پھیلا دیا گیا تھا کہ ایک ہی وطن، ایک ہی گاؤں محلے میں رہنے والے ہندو، سکھ اور مسلم ایک دوسرے کو دُشمن سمجھنے لگے اور خوف زدہ ہونے لگے۔ دراصل ریاست جموں کشمیر کے رہنے والے یہ برطانوی فوج کے اہلکار، پنجاب کے سینئر آفیسرز نے ایک فوجی منصوبے کے تحت ہی ریاست میں داخل کیے تھے۔ ان لوگوں کا ریاست میں داخلہ اس لئے آسان تھا کہ یہ فوجی اہلکار انفرادی طریقوں سے اپنے اپنے علاقوں کی طرف آئے تھے اور ان پر کسی قسم کا شک کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ دراصل ان فوجیوں کو اپنے اپنے علاقوں میں گڑبڑ پھیلانے کے لیے بھیجا گیا تھا اور ان کے رابطے ان کے علاقوں کے ریٹائرڈ برطانوی فوجیوں سے کرائے گئے تھے جو پہلے ریاست میں مقامی سیاسی لوگوں کی مدد سے کچھ علاقوں میں امن وامان کی صورتحال خراب کر چکے تھے۔ بعض علاقوں میں ریاستی فوج پر حملے بھی شروع ہو چکے تھے۔ خاص کر پونچھ کی دو تحصیلوں سدھنوتی اور باغ میں کافی حالات خراب ہو چکے تھے۔ یہاں ریٹائرڈ فوجیوں کی ایک بڑی تعداد پہلے سے ریاستی فوج کے خلاف منظم ہو چکی تھی اور مقامی نمبردار، چوکیدار اور ذیلدار بھی اس گڑبڑ کا حصہ بن چکے تھے۔

یہ ہندوستان کے بٹوارے سے پیدا کیے گئے حالات کا اثر تھا اور اس کے شدید ترین اثرات پنجاب کے ساتھ لگنے والے صوبہ جموں کی آبادی پر پڑ رہے تھے۔ ان حالات کا پاکستان بھی بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ پاکستان ریاست جموں و کشمیر میں جو کچھ کر رہا تھا، وہ جونا گڑھ کی ریاست کا ردعمل تھا۔ جونا گڑھ کے مسلمان نواب نے اپنی ریاست کا الحاق پاکستان سے کر دیا اور پاکستان نے نواب کے الحاق کو قبول بھی کر لیا تھا۔ جونا گڑھ کے ایک لیڈر سمل داس گاندھی نے بمبئی سے نواب کے خلاف جلاوطن حکومت کا اعلان کر دیا اور جونا گڑھ کی عوام کو نواب کے خلاف بغاوت کرنے کی اپیل کی۔ جونا گڑھ کی آبادی کی اکثریت غیر مسلم تھی اور نواب مسلمان تھا۔ اس کے فیصلے کو عوامی امنگوں کے خلاف

قرار دے کر ہندوستان نے جوناگڑھ کی ریاست کو متنازعہ قرار دے کر ایک پیراملٹری ایکشن کے ذریعے قبضہ کر لیا۔

دوسرا معاملہ حیدرآباد کی ریاست کا پیش آیا۔ حیدرآباد کے مسلمان نواب نے ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کی بجائے آزاد ملک کی حیثیت سے رہنے کا اعلان کر دیا جو ہندوستان نے ایک فوجی آپریشن کے ذریعے حیدرآباد دکن کی ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ پاکستان نے دیکھا کہ ہندوستان زبردستی ریاستوں پر قبضہ کر چکا ہے جو ہندوستان سے الحاق کی حامی نہیں تھی۔ ریاست جموں وکشمیر کا مہاراجہ بھی اپنی ریاست کو ہندوستان اور پاکستان سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اس لیے پاکستان نے بھی ہندوستان کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ریاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور 22 اکتوبر 1947ء میں ریاست پر بھرپور منظم فوجی حملہ کر دیا۔ اس 22 اکتوبر کے حملے سے پہلے پاکستان اپنے حامی ریاستی شہریوں کو اپنے فوجی حملے کا حصہ بنا چکا تھا۔ اس پاکستانی حملے کی حمایت میں جموں صوبے سے مسلم عوام سمیت اس علاقے کے فوجی سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئے تھے۔ اس حملے میں مقامی سطح پر پاکستان کا ساتھ دینے والے فوج کے حاضر سروس اہلکاروں کی اچھی خاصی تعداد شریک تھی۔ ان حاضر سروس فوجی اہلکاروں کے ساتھ ریٹائرڈ انگریز فوج کے ممبرز بھی اچھا تعاون کر رہے تھے۔ چونکہ یہ اپنے علاقوں سے ہی اس فوجی حملے کو شروع کرنے کے لئے تیار کیے گئے تھے۔ ان میں سے دو طرح کے لوگ اس فوجی آپریشن کا حصہ تھے جو مذہبی جوش وجذبے کی بنیاد پر اپنی ریاست کے غیر مسلم حکمران کے خلاف اس جنگ میں پاکستان کا ساتھ دے رہے تھے جنہیں کسی بڑی سازش کا علم تھا، نہ اس کا حصہ تھے۔ وہ خلوص دل سے اپنے پڑوس میں بننے والے ملک کا حصہ بننے کے لیے اپنی ریاست کے حکمران کے خلاف لڑ رہے تھے۔ انہیں اتنا بتایا گیا تھا کہ ریاست کا ہندو حکمران، مسلم پاکستان کا حصہ بننے کے لیے تیار نہیں ہے جبکہ ان کے نزدیک ریاست کے مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے ریاست پاکستان کا حصہ بنے۔ یہ ان کی اپنی خواہش تھی اور جائز خواہش تھی۔ دوسرا گروپ جو اپنا فوجی اسلحہ لے کر ریاست میں بغاوت کرانے اور پاکستانی حملے کے لیے حالات پیدا کرنے کی نیت سے

ریاست میں ایک منصوبے کے تحت داخل ہوا تھا۔ انہیں ریاست پر پاکستانی حملے کا علم بھی تھا اور وہ دلی خواہش بھی رکھتے تھے کہ ریاست، مسلم پاکستان کا حصہ بنے۔ ان میں سے چند لوگ جو اس جنگ میں انچارج بن کر لیڈ (Lead) کر رہے تھے شاید پاکستانی فوج کے خفیہ منصوبے سے بھی آگاہ ہوئے ہوں خاص کر کے وہ لوگ جو پاکستانی فوج میں آفیسرز رینک کی سروسز میں تھے۔ جو عام سپاہی تھے انہیں محض مذہبی جذبے کے تحت ہی استعمال کیا گیا تھا۔ اس جنگ میں ریاستی فوج کے مسلم اہلکاروں کا ایک گروپ بھی حصہ لے رہا تھا۔ اس فوجی گروپ میں ریاست جموں وکشمیر کی اپنی فوج کے ممبرز بھی شامل تھے جنہوں نے ریاستی فوج کے اندر ایک خفیہ کونسل بنا رکھی تھی۔ اس گروپ میں ریاستی فوج کے مسلم اہلکاروں کے جونیئر آفیسرز حصہ لے رہے تھے۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ان فوجی آفیسروں کا گروپ اپنے طور پر فوج کے اندر بغاوت کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا یا ان کے بھی خفیہ رابطے پاکستانی فوج کے اندر موجود تھے۔ البتہ ان ریاستی فوجی اہلکاروں کا مقصد بھی وہی تھا جو باقی ریاستی لوگوں پر مشتمل انگریز فوج کے اہلکاروں اور ریٹائرڈ فوج کے افراد کا تھا۔

گویا ریاستی فوج کے جونیئر اہلکار بھی ریاست کا الحاق پاکستان سے کرنے کے خواہشمند تھے۔ اگر بات ان کی پاکستان سے ریاست کے الحاق کی خواہش تک محدود ہوتی تو یہ سمجھ آنے والی تھی لیکن 22 اکتوبر کو جونہی پاکستانی فوج، قبائیلیوں کے ساتھ ریاست پر حملہ آور ہوئی ریاستی فوج کے مسلم اہلکاروں نے ریاست کا دفاع کرنے کے بجائے جس کا انہوں نے حلف لیا ہوا تھا، حملہ آور پاکستانی فوج اور قبائلیوں کا ساتھ دیا اور اپنا فوجی اسلحہ لے کر حملہ آوروں سے مل کر ریاستی شہریوں کے قتلِ عام میں حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے ہندو اور سِکھ کامریڈز کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس وقت ریاستی فوج کی کل تعداد نو ہزار کے لگ بھگ تھی اور ان میں چار ہزار کے قریب ریاستی مسلمانوں کی تعداد تھی لیکن حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک بھی مسلمان فوجی کے مارے جانے کی کوئی اطلاع یا ثبوت موجود نہیں ہیں۔ اس حد تک ریاست کے اداروں کے اندر نفرت بھری فضا بنائی گئی تھی کہ ریاستی فوج کے ممبرز بھی اپنے ساتھ کام کرنے والے غیر مسلم فوجیوں کو اپنا دُشمن اور پاکستانی فوج کے ممبرز کو

اپنا دوست اور قبائلیوں کو اپنا نجات دہندہ تصور کرتے تھے۔ان حالات کا اگر غور سے تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس قدر سماج کے اندر مذہبی تقسیم کے عمل سے سیاسی جماعتوں اور ان کے لیڈروں کی مکمل ناکامی کے ساتھ ان کے بوگس سیاسی نظریات کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ سیاسی جماعتوں نے ریاست کے خلاف اس قدر زہریلا پروپیگنڈا پھیلا دیا تھا کہ لوگ اپنی ہی ریاست کے وجود کے خلاف ہو گئے تھے اور اس کے وجود کو مٹانے کی کوشش میں لگ گئے تھے ۔اس کی وجہ سیاسی جماعتوں کا عوام کی تربیت نہ کرنا اور ان کے درمیان جھوٹا مذہبی جذباتی شعور پیدا کر کے ان کے جذبہ حب الوطنی کو ختم کر دینا بھی شامل تھا۔سیاسی جماعتوں کے اس مذہبی پروپیگنڈا کی وجہ سے ریاستی اداروں سمیت فوج کے اندر بھی مذہبی دُشمنی کا ماحول پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مسلمان ریاستی فوجی اپنی ریاست پر قبضہ کرنے والوں کا ساتھ دے رہا تھا۔اب اس طرح کے سماج میں لوگوں کی سوچ اور فکر کو ہمیشہ عوام دُشمن قوتیں استعمال کرتی ہیں۔ریاست کی سیاسی جماعتوں نے عوام کو خطرناک حالات اور خطرات کے لئے تیار رہنے کے بجائے ان کی سوچوں کو اتنا پست کر دیا تھا کہ وہ اپنے غیر مسلم حکمران سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اپنی ریاست کا وجود ہی مٹانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔اگر ریاست کی دونوں جماعتوں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ کی تقریروں پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عوام کو اپنی ریاست کے وجود سے نفرت کا درس دینے میں لگے ہوئے تھے۔عوام کے اندر سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے کے بجائے مذہب پرستی اور ریاست دُشمنی کیلئے تیار کر رہے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ریاستی عوام کی بڑی تعداد حملہ آوروں سے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے خاص کر کے جموں صوبے میں مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ نے عام مسلمان ریاستی شہریوں کے سیاسی شعور کو تباہ و برباد کرنے اور ہندو مسلم نفرت پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

ریاست پر برا وقت آیا تو لوگوں نے مذہبی نفرت کے جذبے کے تحت ریاست کا ساتھ دینے کے بجائے خود حملہ کرنے والوں کا ساتھ دیا۔اپنے ہم وطن ہندو،سکھ پڑوسیوں کو قبائلیوں اور پاکستانی فوج سے ملکر خود بھی جہاں موقع ملا قتل کیا اور حملہ آوروں کو ان کی نشاندہی

بھی کی۔سویلین آبادی کے بڑے حصے نے خاموشی اختیار کر کے حملہ آوروں کا ساتھ دیا اور کچھ نے لوٹ مار میں حصہ لیا۔صدیوں سے ساتھ رہنے والے انسانی رشتوں کو بھی پامال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن علاقوں میں مسلم اکثریت آبادی تھی وہاں غیر مسلم ریاستی شہریوں کے ساتھ گھناؤنا سلوک کیا گیا جبکہ یہی سلوک جموں صوبے میں مسلم شہریوں کے ساتھ بھی کیا گیا ۔جن علاقوں میں ہندو، سِکھ آبادی اکثریت میں تھی وہاں مسلمانوں کا بھی قتلِ عام کیا گیا۔وہی قوتیں جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہی تھیں اور اسی ذہنیت کے لوگ مذہب کے نام پر جموں کی مسلم اکثریتی علاقوں میں ہندو سِکھ آبادی کا نام و نشان مٹا چکے تھے۔اس قدر مذہبی جنونیت لوگوں پر چھا چکی تھی کہ صدیوں سے اکٹھا رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔مہاراجہ کو علم ہو گیا تھا کہ کراؤن برطانیہ ان حالات میں مدد دینے سے قاصر ہے تو اس نے اپنے ریاستی عوام کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ ان کو اپنا ہمنوا بنا کر ریاست میں حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جائے اور ریاست کی وحدت کو بحال رکھا جائے۔

ریاستی حکومت کے موجودہ وزیراعظم رام چندر کاک نے کچھ ایسے اقدامات کیے جن کی وجہ سے مہاراجہ کی پوزیشن کو عوام میں مزید خراب کر دیا گیا تھا۔مہاراجہ نے عوام کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے پہلا اقدام ریاستی وزیراعظم رام چندر کاک کو برطرف کر کے کیا۔مہاراجہ نے رام چندر کاک کو وزیراعظم اس لیے بنایا تھا کہ وہ انتظامی امور کو بہتر کر کے عوامی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس نے سیاسی جماعتوں کے لیڈروں اور کارکنوں کو جیل میں ڈال کر عوام کی ناراضگی بڑھا دی تھی۔ اس کے اقدامات سے منفی نتائج نکلے تھے۔ وزیراعظم رام چندر کاک کو عہدے سے ہٹانے کے بعد مہاراجہ نے ریاست میں قید سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کو رہا کر دیا جس میں شیخ عبداللہ بھی شامل تھے۔نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کی رہائی کے بعد اس کے ایک لیڈر جی۔ایم۔صادق نے دوبار پاکستانی وزیراعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کی اور اسے پیغام دیا کہ پاکستان اپنا فیصلہ زبردستی ریاست کے عوام پر مسلط نہ کرے لیکن پاکستان نے اس کا جواب فوجی حملے کی صورت میں دیا تھا۔ پاکستان نے

ریاست پر حملہ کچھ اس انداز اور طریقے سے کیا تھا کہ کسی دوسرے ملک کو یہ گمان نہ ہو کہ اس حملے کا منصوبہ پاکستانی فوج نے تیار کیا تھا۔ اس فوجی حملے کا نہ اعلان کیا گیا تھا نہ بظاہر اس میں فوج کے ملوث ہونے کے ثبوت نظر آرہے تھے۔ اس حملے کی منصوبہ بندی خفیہ انداز میں کی گئی تھی کہ حملے میں ملوث لوگ سویلین لوگوں کی صورت میں ریاست میں داخل ہوئے تھے اور ان جتھوں کی بڑی تعداد جو فرنٹ لائن پر حملے کے لیے تیار کی گئی تھی وہ سارے قبائلی پٹھان تھے لیکن ان کو لیڈ کرنے والے کمانڈر کمانڈنگ آفیسرز پاکستان فوج کے حاضر سروس اور کچھ ریٹائرڈ ملٹری آفیسرز بھی ملوث ہوئے تھے۔ اس حملے کے بارے میں درست معلومات اس وقت کسی کے پاس بھی نہیں تھیں جب تک پاکستان کے اپنے ملٹری آفیسرز نے کتابیں لکھ کر اس فوجی آپریشن کی تفصیلات عام نہ کیں۔

اس سے قبل پاکستان نے اقوام متحدہ میں اپنی فوج کے ملوث ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ بظاہر اس حملے کو قبائلی حملہ ہی کہا جاتا ہے جب کہ اس حملے کا کمانڈر اور کنٹرول سسٹم مکمل طور پر پاکستانی فوج کے پاس تھا۔ اس کو ناکام کیوں بنایا گیا ابھی تک اس فوجی حملے کی ناکامی کا ذمہ دار قبائلیوں کو ٹھہرایا جاتا ہے لیکن پنجاب مسلم لیگ کے ایک سینئر لیڈر اور اس حملے کی نگرانی کا دعویٰ کرنے والے سردار شوکت حیات خان نے اس حملے کی ناکامی کی ذمہ داری میجر خورشید انور پر ڈالی ہے جو ایک قبائلی لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ میجر خورشید انور جو ریلوے بٹالین کا ایک ریزرو آفیسر تھا، اس وقت پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد کا رشتہ دار تھا۔ یہ ایک قبائلی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بارہ مولا تک پہنچ گیا تھا۔ بقول سردار شوکت خان وہاں پہنچ کر قبائلیوں نے میجر خورشید انور سے اس آپریشن کے لیے حکومت پاکستان کے خزانے سے لیا گیا تین لاکھ روپیہ مانگا اور آگے جانے سے انکار کر دیا۔ میجر خورشید انور نے قبائلیوں کو تین لاکھ روپے دینے سے انکار کر دیا اور قبائلی پٹھان بگڑ گئے اور بارہ مولا ٹاؤن میں لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی۔ سردار شوکت حیات کے بقول میجر خورشید انور کو اس فوجی مہم میں اس نے شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا تاہم وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزیر خزانہ غلام محمد کی سفارش پر اس کو ایک قبائلی دستے کی کمانڈ سونپی گئی تھی اور اس فوجی مہم کا حصہ بنانے سے پہلے کئی پابندیاں لگائی گئی تھیں۔

بقول سردار شوکت حیات میجر خورشید انور نے ان پابندیوں کی خلاف ورزی کی اور غیر متعلقہ افراد کو اس فوجی مہم میں شامل کر لیا جن میں محسود قبائل کے لوگ بھی شامل تھے۔ سردار شوکت حیات کی نگرانی میں جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس میں سوات کے پہاڑوں کے قبائلیوں کو کشمیر کے پہاڑ عبور کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ دوسرا منصوبہ یہ بنایا گیا تھا کہ ریاست پر دونوں طرف سے بیک وقت حملہ کیا جائے گا۔ ایک حملہ مظفر آباد کے راستے سری نگر کی طرف کیا جائے گا اور دوسرا حملہ کٹھوعہ کے راستے جموں کے علاقے پر کیا جائے گا۔ ہندوستانی فوج کا ریاست سے زمینی راستہ کاٹ دیا جائے گا۔ سردار شوکت نے اپنی نگرانی میں کشمیر پر اچانک حملہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور اس میں رازداری کو بھی ملحوظ رکھا گیا تھا۔ دوسرے قبائلیوں کو اس جنگ سے دور رکھنے کی ہدایت دی گئی تھیں۔ میجر خورشید انور نے اپنی بے وقوفی کی وجہ سے ایک طرف حملے کا راز فاش کر دیا اور دوسری طرف غیر متعلقہ لوگوں کو اس مہم کا حصہ بنا کر بارہ مولا پہنچ کر رات کے اندھیروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور قبائلیوں کے تین لاکھ روپے کی مانگ کے ڈر سے وہاں سے بھاگ کر راولپنڈی پہنچ کر غائب ہو گیا۔

میجر خورشید انور نے وزیرستان کے قبائل کو جہاد کے نام پر ابھارا اور انہیں اس خفیہ فوجی مہم کا حصہ بنا دیا تھا۔ دوسری بڑی غلطی اس کی یہ بتائی گئی ہیکہ وہ نوشہرہ میں بریگیڈیئر افتخار کے پاس فوجی بندوقیں مانگنے چلا گیا جو وہ قبائلیوں کو دینا چاہتا تھا۔ بریگیڈیئر افتخار نے یہ بندوقوں کا مطالبہ اپنے کمانڈر انچیف تک پہنچا دیا اور کمانڈر انچیف نے یہ اطلاع آگے فیلڈ مارشل کلاڈے آکنلک (Field Marshal Claude Auchinleck) تک پہنچا دی جو ہندوستان اور پاکستان کی دونوں فوجوں کا جوائنٹ کمانڈر انچیف تھا تک پہنچا دی۔ اسی دوران یہ خبر سرحد کے گورنر کنگھیم تک پہنچ گئی اور اس نے قبائلی حملے کی اطلاع انڈیا کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دے دی۔ اچانک حملہ کر کے ریاست پر قبضہ کرنے کا پلان میجر خورشید انور نے ناکام بنا دیا۔ یہ کہانی سردار شوکت حیات نے اپنی کتاب " گُم شدہ قوم " کے آٹھویں باب میں کشمیر پر حملہ کے عنوان سے تفصیل سے لکھ رکھی ہے۔ اسی کتاب میں سردار شوکت حیات نے انڈین نیشنل آرمی کے سابق آفیسروں کی شمولیت کی تفصیل دی ہے۔

ریاست پر پاکستان کے حملے کا بڑا منصوبہ ساز میجر جنرل سید اکبر تھا جو بعد میں جنرل طارق کے نام سے آزاد کشمیر فوج کا کمانڈر انچیف بنایا گیا تھا۔ اس حملے میں قبائیلوں کے ایک ہزار کے بیس لشکر بنائے گئے تھے اور ان سب قبائلی لشکروں کو صوبہ سرحد کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں تربیت دی گئی تھی۔ اس جنگ میں انڈین نیشنل آرمی کے سابق آفیسروں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس حملے کے لیے 3 سیکٹر بنائے گئے تھے اور ہر سیکٹر کی کمانڈ ایک سنئیر فوجی آفیسر کو دی گئی تھی جو انڈین نیشنل آرمی کے سابق آفیسرز تھے۔ اس حملے کے لیے ایک نارتھ سیکٹر بنایا گیا تھا جس کا ہیڈ کوارٹر ایبٹ آباد تھا۔ اس سیکٹر کا انچارج میجر خورشید انور تھا جس نے مظفر آباد کے راستے سے سرینگر پر حملہ کرنا تھا۔ دوسرا سینٹرل سیکٹر بنایا گیا تھا جس کا ہیڈ کوارٹر راولپنڈی کو بنایا گیا تھا۔ اس کا انچارج کرنل تاج خانزادہ کو بنایا گیا تھا جو آئی۔ این۔ اے کا سابق آفیسر تھا۔ تیسرا سیکٹر ساؤتھ بنایا گیا تھا جس کا ہیڈ کوارٹر سیالکوٹ میں بنایا گیا تھا۔ اس سیکٹر کا انچارج میجر جنرل زمان کیانی تھا جس نے سانبہ (Sanba) اور کٹھوعہ کی طرف سے جموں صوبے پر حملہ کرنا تھا۔ کرنل تاج خانزادہ نے راولپنڈی سے پونچھ کے علاقوں پر حملہ کرنا تھا اور پونچھ میں پہلے سے لڑنے والی قوتوں کی رہنمائی اور مدد بھی کرنا تھی۔ پونچھ میں لڑنے والی قوتوں کو پاکستانی منصوبہ سازوں نے خفیہ تحریک کا نام بھی دیا تھا۔ کرنل تاج خانزادہ پونچھ میں مہاراجہ کی ریاستی فوج سے لڑنے والی خفیہ تحریک کو امداد اور رہنمائی کرنے کا ذمہ دار تھا۔ ایک سیکٹر ہیڈ کوارٹر جہلم میں قائم کیا گیا تھا اور اس کا انچارج کرنل آر۔ ایم۔ ارشد کو بنایا گیا تھا۔ یہ سیکٹر کمانڈنگ آفیسر میرپور میں ہونے والے آپریشن کی مدد اور نگرانی کر رہا تھا۔ یہ کارروائیاں اکتوبر کی 22 تاریخ کو باقاعدہ حملے سے شروع کر دی گئی تھیں۔ اس حملے کا دوسرا بڑا کردار اور منصوبہ ساز میجر جنرل اکبر خان تھا۔ بقول جنرل اکبر خان، میجر خورشید انور اور سردار شوکت حیات کے درمیان چپقلش چل رہی تھی اور سردار شوکت حیات، میجر خورشید انور کو قابل بھروسہ آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ میجر خورشید انور کو وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزیر خزانہ غلام محمد کی سفارش پر کشمیر کی طرف حملے کا نگران بنایا گیا تھا۔ بقول جنرل اکبر، خورشید انور نے ایک میٹنگ کے بعد لاہور میں کہا تھا کہ وہ سردار شوکت حیات کے احکامات کو نہیں مانے گا، جبکہ شوکت حیات

نے بھی کچھ ایسے خطرات کا ذکر کیا تھا۔ کشمیر پر حملے کے کئی کردار تھے اور کئی منصوبہ ساز تھے۔ سب اپنے اپنے منصوبوں کے مطابق ایک دوسرے کو کچھ بتائے بغیر کام کر رہے تھے۔ جنرل اکبر یہ بھی لکھتا ہے کہ اس نے پورا جنگی منصوبہ کاغذ پر لکھ کر لاہور وزیر اعظم لیاقت علی خان کے ساتھ کشمیر پر حملے کے سلسلے میں ہونے والے اجلاس میں شریک تمام لوگوں میں تقسیم کیا تھا اور وہ یہ دیکھ کر خوش ہوا تھا کہ کشمیر پر حملے میں سارے شرکت کرنے والے سنجیدہ تھے۔

جنرل اکبر کے بقول ایک ہزار آدمیوں کو کٹھوعہ پر حملے کے لیے بھیجا گیا تھا تا کہ وہ ہندوستان کی فوج کا زمینی راستہ ریاست میں داخلے سے پہلے ہی کاٹ دیں اور دو سو بندے سرینگر ائیر پورٹ پر حملے کے لیے بندوقیں مہیا کر کے بھیجے گئے تھے۔ کٹھوعہ پر حملہ کرنے والوں کو غلط بندوقیں دے کر بھیجا گیا جو وہاں پہنچتے ہی ناکارہ ہوگئی تھیں اور حملہ کرنے والے فوجی مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے تھے۔ دوسری طرف جن دو سو افراد نے سرینگر ایئرپورٹ پر حملہ کر کے قبضہ کرنا تھا تا کہ ہندوستانی فوج سرینگر ایئرپورٹ پر اتر ہی نہ سکے، ان کو میجر خورشید انور نے وہ رائفلیں دی ہی نہیں تھیں۔ اب اگر دیکھا جائے تو پاکستان کے منصوبہ ساز حملے میں ملوث ان خفیہ کرداروں کا کھل کر کوئی ذکر نہیں کرتے جن کی وجہ سے پاکستان کا حملہ ناکام ہوا۔ جنرل اکبر کہتا ہے کہ حملہ کرنے والے قبائلی سرینگر سے چار میل دور موجود تھے۔

سردار شوکت حیات کہتا ہے کہ قبائلی بارہ مولا میں تین دن تک رُک گئے اور میجر خورشید انور سے تین لاکھ کی رقم کا تقاضہ کرنے لگے جو اس آپریشن کے لیے حکومت پاکستان نے مہیا کی تھی۔ قبائلی اتنا وقت ضائع کر چکے تھے کہ اب سرینگر ایئرپورٹ پر قبضہ کرنا ناممکن ہو گیا تھا چونکہ ہندوستان کی فوج سرینگر ایئرپورٹ کا کنٹرول حاصل کر چکی تھی۔ اب یہ کہنا کہ جموں پر حملہ کے لئے گئے ہوئے افراد رائفلیں ناکارہ ہونے سے وہ واپس آ گئے تھے درست نہیں ہے کیونکہ سیالکوٹ سیکٹر کے انچارج میجر جنرل زمان کیانی نے سانبہ کے کئی دیہات پر حملے کیے تھے اور آپریشن شروع کیا تھا۔ زمان کیانی نے مولانا مودودی اور احمدیہ جماعت کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد سے اسلحہ اور دیگر اشیاء کی فراہمی کی درخواست کی تھی۔ اب یہ سوال بہت اہم ہے کہ جموں سیکٹر کی طرف چند حملے کر کے میجر جنرل زمان کیانی اور اس کے ساتھی

واپس کیوں گئے جس کے بعد میں ان علاقوں کی مسلمان آبادی کے لئے بھیانک نتائج نکلے جبکہ ریاست کے یہی علاقے مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک بھی تھے۔ جموں صوبے میں انہی علاقوں میں ہندو اکثریتی آبادی آزاد کشمیر اور میر پور کے علاقوں کے بدلے میں مسلم آبادی کا قتلِ عام کرسکتی تھی۔ یہ علاقے ہندوستانی پنجاب کے باڈر سے قریب بھی تھے جہاں سے ہندوستانی مسلح جتھے بھی داخل ہو کر مسلمانوں کی قتل و غارت گری میں حصہ لے سکتے تھے۔ یہ خدشات درست ثابت ہوئے جن کا ذکر آئے گا۔ کیا پاکستان کے منصوبہ سازوں کو ریاست کے جموں صوبے میں جہاں ہندو مسلم فسادات کرانے کا سنہری موقع ملا تھا اسی کے مغربی علاقے لینے اور گلگت کے موجودہ علاقے لینے تک دلچسپی تھی یا ان کی ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے پاکستان کا حملہ ناکام ہوا۔ کیونکہ یہ صوبہ کشمیر سمیت لدّاخ کے دو حصوں لہہ اور کارگل کا کنٹرول حاصل کرنے میں ناکام ہوئے تھے۔ دوسری طرف پونچھ، میر پور اور مظفر آباد کے علاقوں پر حملے کی منصوبہ بندی اور حکمت عملی بہت بہتر بنائی گئی تھی اور ان علاقوں میں موجود پاکستان کی حامی قوتوں سے رابطے اور رہنمائی کا طریقہ کار بھی بہتر تھا۔

ان علاقوں میں پہلے دو فوجی گروپ پاکستان کے قبضے کے لیے کارروائیوں میں ملوث کیے گئے تھے۔ ایک گروپ میں سارے فوجی انہی علاقوں کے رہنے والے مقامی باشندے تھے ان میں پاکستان آرمی کے حاضر سروس ممبرز جو اسلحہ دے کر پنجاب سے بھیجے گئے تھے۔ دوسرا فوجی گروپ جو ریٹائرڈ برطانوی فوج کے سابق ممبروں پر مشتمل تھا، یہ لوگ ان سے مل کر مسلح کارروائیاں کر رہے تھے۔ یہ فوجی اپنے اپنے علاقوں میں مسلح کارروائیاں کرنے لگے تھے اسلئے انہیں لوکل سویلین آبادی کی حمایت حاصل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ فوجی اپنے ہی لوکل کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم کے تحت اپنی مسلح کارروائیاں کر رہے تھے اور یہ لوگ اپنے ٹارگٹ اور مقاصد سے پوری طرح آگاہ تھے۔ یہ فوجی اپنی کاروائیوں میں ریاستی فوج کے ساتھ مقامی غیر مسلم آبادی کو بھی نشانہ بنا رہے تھے اور یہ ایک خاص انداز میں آبادی کے غیر مسلم حصے کو نشانہ بنا رہے تھے۔ اس سے واضح ہوتا تھا کہ ان کا مشن مذہبی اور فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا اور ان کا کنٹرول مکمل طور پر ان کے ہی فوجی اہلکاروں

کے پاس تھا۔ مسلح کاروائیوں میں پہلے برطانوی فوج کے بھیجے گئے اور ریٹائرڈ فوجی گروپ ہی حصہ لے رہے تھے اور کچھ سویلین افراد بھی ان کی مسلح کارروائیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ اب ایک تیسرا فوجی گروپ بھی ان کے ساتھ شامل ہو چکا تھا۔ وہ فوجی گروپ ریاست جموں و کشمیر فوج کے مسلم ممبرز تھے۔ جونہی مسلح کاروائیاں میرپور اور پونچھ کی تحصیل سدھنوتی اور باغ کے علاقوں میں پوری طرح سے پھیل گئیں تو ریاستی فوج کے مسلم اہلکار اسلحہ سمیت ان باغیوں سے ملتے گئے۔ اس دوران پاکستان کی طرف سے قبائلیوں سمیت مزید جتھے ریاست میں داخل ہوئے۔ ریاستی فوج کے مسلم ممبرز پوری طرح ان سے مل گئے اور ان کا حصہ بن کر مسلح کارروائیاں کرنے لگے۔ اب اس حملے میں کئی مسلح گروہ باہر سے اور ایک اندرون ریاست سے اس کا حصہ بن چکے تھے۔ ان کے مقابلے میں ریاست کی فوج میں صرف ہندو اور سکھ ممبرز ہی رہ گئے تھے جن کی تعداد بہت کم تھی۔ یہ ریاستی فوج گلگت بلتستان، لدّاخ سے لے کر سیالکوٹ کی سرحد تک پھیلائی گئی تھی۔ اتنے بڑے حصے میں پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تعینات ریاستی فوج اتنے بڑے فوجی حملے کا مقابلہ کرنا بھی چاہتی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود ریاستی فوج کے ہندو سکھ ممبرز نے اپنے وطن کے دفاع کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے میں کوئی کنجوسی نہیں کی تھی۔ انہوں نے اس دھرتی کے بہادر سپوتوں کی طرح حملہ آور دُشمن کا زبردست مقابلہ کیا اور جس وطن کے دفاع کا حلف لے رکھا تھا اس کی پاسداری کی اور وطن سے بھی وفا کی۔ ریاست کے ٹوٹ جانے سے ان عظیم ریاستی سپاہیوں کی بہادری اور وطن پرستی کی لازوال قربانی کو فراموش کر دیا گیا جبکہ ریاستی فوج کے چیف آف اسٹاف اور کمانڈر انچیف بریگیڈیئر راجندر سنگھ جموال نے خود محاذ پر لڑتے ہوئے اپنی جان دھرتی پر قربان کر دی تھی۔

شاید جنگوں کی تاریخ میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی فوج کا سربراہ بھی اپنے وطن کا دفاع کرتے ہوئے حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے مارا گیا ہو۔ جموں کشمیر فوج کے سربراہ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ضرورت کے وقت کسی فوج کا سربراہ خود دشمن سے اگلے مورچوں میں جا کر لڑتے ہوئے جان دے سکتا ہے لیکن اس کے ہم وطنوں کی اکثریت نے اُس کے اِس ریاستی دفاع کی جنگ کو اُن کے مذہب کی شناخت سے جوڑ کر دیکھا۔ ان لوگوں کو ہیرو قرار دیا جنہوں

نے ریاست پر حملہ کیا اور جنہوں نے ملک کی وردی پہن کر اسی ریاست کے حملہ آوروں سے مل کر اس دھرتی کے تحفظ کے لیے کھائی قسم بھی توڑ دی اور ریاست کی آزادی کا تقدس بھی پامال کر دیا تھا جس سرزمین کے تحفظ کا حلف اٹھایا تھا۔ دفاع کرنے کے وقت دُشمن حملہ آوروں کا ساتھ دے کر اس سرزمین کو شرمندہ کر دیا۔

اپنی ہی ریاست کی وردی پہن کر اس دھرتی کی عزت تار تار کرنے والوں کا ساتھ دیا اور ستم یہ کیا کہ یہ سب کچھ اپنے مقدس مذہب کے نام پر کیا۔ اپنی دھرتی کا ساتھ دینے کے بجائے اپنے ہم مذہب حملہ آوروں کا ساتھ دیا اور تاریخ کے سارے وطن پرستوں کے سر جُھکا دیے۔ یہ تو ریاستی فوج کے اہلکاروں کا حال تھا جن کی ڈیوٹی ہی ریاست کا دفاع تھا تو باقیوں سے گِلہ ہی کیا ہوسکتا ہے جو خود بھی ریاست پر حملے کر رہے تھے اور باہر کے حملہ آوروں کا ساتھ بھی دے رہے تھے۔ جب قبائلی ریاست میں داخل ہوئے تو ان کا سب سے بڑا نشانہ غیر مسلم ریاستی شہری آبادی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بھی ایک پورے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے سویلین آبادی کو ٹارگٹ بنا رہے تھے۔ ان کے مقاصد اور پہلے سے ریاست میں مسلح کارروائیاں کرنے والے ایک ہی سمت میں، ایک ہی حکمنامے کے تحت یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ یہ ایک خاص فرقہ وارانہ مذہبی انداز تھا جو کشمیر کے علاقوں میں رہنے والے غیر مسلموں کے خلاف اپنایا گیا تھا۔ غیر مسلم آبادی کے ان علاقوں پر حملے تھے جو جموں صوبے کے پنجاب اور کشمیر صوبے کے ساتھ ہزارہ سے لگتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ پاکستان کے منصوبہ سازوں نے جموں صوبے کے مسلم اکثریتی علاقوں سے غیر مسلم آبادی کا مکمل صفایا کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا اس کی انجام دہی میں ایسا طرز اپنایا گیا تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ پاکستانی منصوبہ ساز مذہبی فرقہ واریت کی آگ کو پورے جنوبی صوبے میں پھیلانا چاہتے تھے کیونکہ مذہبی فرقہ پرستی کے لیے ریاست کا یہی صوبہ موزوں ترین تھا کیونکہ صوبہ کشمیر اور گلگت لدّاخ میں ایک تو غیر مسلم آبادی بہت کم تھی اور دوسرا وہاں مذہبی فسادات کرانے کا فائدہ نہیں تھا۔ جموں صوبہ مذہبی فسادات کے لئے دو طرح سے اہم تھا ایک تو اس میں ہندو مسلم آبادی اس تناسب سے تھی کہ یہاں ایسا کرنا آسان تھا دوسرا یہ صوبہ پنجاب کے قریب تھا اور پہلے ہی یہاں کے فرقہ پرست

ہندو اور مسلم گروپ مذہبی نفرت کو ہوا دے چکے تھے۔ یہاں محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ پنجاب میں ہونے والے مذہبی فسادات پوری کر چکے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جموں مہاراجہ ہری سنگھ کا آبائی صوبہ بھی تھا۔ یہاں سے ہی اس کو تھوڑی بہت حمایت ملنے کی بھی توقع تھی کیونکہ صوبہ کشمیر سے مہاراجہ کی حمایت بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔ چونکہ ریاست کے مہاراجہ کے خلاف سب سے بڑی تحریک بھی اسی صوبہ کشمیر سے چل رہی تھی اور ریاست میں مہاراجہ مخالف سیاسی جماعت نیشنل کانفرنس اور اس کی قیادت شیخ عبداللہ کا تعلق بھی اسی صوبہ سے تھا۔

جموں صوبے میں مسلم کانفرنس کی قیادت صوبے بھر میں پہلے ہی مذہبی فسادات کی فضا پیدا کر چکی تھی اور ہندو پرجا پرشید بھی اسی کام میں لگی ہوئی تھی۔ اس طرح ریاست کے اس صوبے میں مذہبی فساد ہوسکتا تھا۔ اس کی پوری تیاری کر لی گئی تھی۔ جموں صوبے کے مسلم اکثریتی علاقوں میں جس میں میرپور اور پونچھ کے علاوہ علاقے شامل تھے غیر مسلم آبادی کے خلاف ایسی کارروائیاں کرنے سے اس کا اثر جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں پر لامحالہ پڑے گا۔ وہاں اسی طرح کی قتل و غارتگری ہندو اور سکھ مسلمان آبادی کے خلاف کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت آبادی تھی کہ غیر مسلم آبادی کو نہ صرف نکالا جا رہا تھا بلکہ انہیں قتل بھی کیا جا رہا تھا۔ فرقہ پرست مذہبی فسادات کرانے والے سیاستدانوں کو علم تھا کہ ایسی ہی کاروائی ہندو اکثریتی علاقوں میں ہونے سے وہاں سے مسلم آبادی کا مکمل صفایا ہو جائے گا اور وہ علاقے ہندوستان کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ مسلم اکثریتی علاقے جموں صوبے کے پاکستان کے قبضے میں چلے جائیں گے اس طرح جموں صوبہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم ہو جائے گا۔ یہ ایسا طریقہ اپنایا گیا تھا کہ دونوں ملکوں کو آبادی کے دونوں حصوں یعنی ہندو سکھ ہندوستان میں اور مسلمان پاکستان میں شامل ہونے کے لیے مدد کریں گے۔ ایسے جنونی حالات پیدا کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ کسی کو اس منصوبے کی مخالفت کی جرات بھی نہ ہو۔

جن لوگوں نے اس قتل و غارتگری کی مخالفت کرنے کی بھی کوشش کی، ان کا انجام

موت کے سوا کچھ نہ ہوا۔ پاکستان میں بیٹھ کر منصوبہ بنانے والوں نے سری نگر فتح کرنے کا محض واویلا ہی کر رکھا تھا، اس کا کوئی عملی پروگرام نہیں تھا۔ اصل پروگرام موجودہ آزاد کشمیر کے علاقوں اور گلگت بلتستان کو ہی پاکستان کا حصہ بنانا تھا اور یہی انگریز حکومت کے منصوبہ سازوں کا بھی پروگرام تھا۔ آزاد کشمیر کے علاقوں کا کنٹرول حاصل کرنے سے اس طرف سے ہندوستان کا پنجاب سے بارڈر دور ہو جاتا تھا جس سے پاکستان کا دفاع مضبوط ہو جاتا تھا اور گلگت بلتستان کا کنٹرول پاکستان کے حوالے کرنے سے سوویت یونین کے خطرے سے کسی حد تک نجات حاصل کرنا مقصود تھا۔ چونکہ یہ علاقہ ہندوستان کے کنٹرول میں آ جانے سے سوویت یونین سے اس کا براہِ راست رابطہ بن جانے سے ہندوستان سوویت یونین کے خلاف کسی قسم کی کارروائیوں کی اجازت کبھی نہ دیتا اس لیے ان علاقوں کو پاکستان کے کنٹرول میں دینا بہت ضروری تھا۔ انگریز دفاعی ماہرین کا یہ خیال بھی تھا کہ واہگہ بارڈر سے ہندوستان پاکستان کی فوجی تنصیبات اور فوجی چھاؤنیوں کو آرام سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس لئے انگریز چاہتے تھے کہ پنجاب اور دیگر علاقوں کے علاوہ جموں کی طرف ملنے والے علاقوں سے ہندوستان کا بارڈر دور رکھا جائے تا کہ پاکستان کا دفاع ہر وقت ہندوستانی فوج کے نشانے پر نہ رہے۔ اس لئے ریاست کے صوبہ جموں کا یہ علاقہ مغربی پنجاب کی سرحدوں کے بہت قریب تھا۔ ہندوستانی فوج کا پریشر ہمیشہ پاکستان پر رہتا اس لیے یہ علاقے پاکستان کے کنٹرول میں لینے کے لیے انگریز کی ہی تائید حاصل تھی ورنہ گلگت بلتستان میں انگریز آفیسرز گلگت سکاؤٹس (Scounts) کی مدد سے ان علاقوں میں ریاست کے خلاف بغاوت کر کے علاقے پاکستان کے حوالے کیوں کرتے۔ بہر حال پاکستان کے منصوبہ سازوں کو اچھی طرح علم تھا کہ ریاست کے صوبہ کشمیر کا اپنی قیادت کی وجہ سے پاکستان کا حصہ بننا مشکل تھا کیونکہ کشمیر کی قیادت اس وقت شیخ عبداللہ کے پاس تھی اور وہ کسی صورت پاکستان سے الحاق کا حامی نہیں تھا۔ وہ کھلم کھلا ریاست کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی وکالت کر رہا تھا اور شیخ عبداللہ کشمیری صوبے کی عوام کا غیر متنازعہ لیڈر تھا۔ اس کا کشمیری بولنے والے خطے میں بہت اثر و رسوخ تھا اور اس کی سیاست نہرو اور کانگریس کی قیادت کے کنٹرول میں تھی۔ پاکستان

سرینگر پر آسانی سے قبضہ کرسکتا تھالیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں اجازت نہیں تھی یا انہیں اس پر قبضہ کرنے سے زیادہ اسے متنازعہ بنانے میں دلچسپی تھی چونکہ انگریز کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان ایسا تنازعہ موجودرہے جوان کوقریب نہ آنے دے۔

اس خطے میں سوویت یونین کے اثر کوکم کرنے کا بھی یہی کاریگر طریقہ تھا کہ سرد جنگ کی حِکمت عملی کے تحت ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے درمیان نفرت پیدا کرنے کا کوئی مستقل ذریعہ موجودرہے۔ چونکہ انگریزوں کوشک تھا کہ شاید ہندوستان کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم رکھنا زیادہ پائیدار اور لمبے عرصے کے لئے مشکل ہوگا کیونکہ ان پرعوام کا پریشر بڑھ جانے اورعوام تقسیم کوختم کرنے کا مطالبہ نہ شروع کر دیں۔یہی وجہ تھی کہ بٹوارے کے دوران پنجاب اور بنگال میں سب سے زیادہ مذہبی فسادات کرائے گئے۔ چونکہ عملاً ہندوستان کے بٹوارے سے مراد پنجاب اور بنگال کی تقسیم تھی۔یہی دونوں قومیں ہندوستان میں سب سے ترقی یافتہ بھی تھیں اور ایک لمبا تاریخی ارتقاء طے کر کے مکمل قومی شعور تک پہنچ گئی تھیں۔ فیوڈل دور میں قومی شعور کا اظہار درست انداز میں نہیں ہوتا بلکہ فیوڈل دور کے خاتمے کے بعد قومی تشخص اور قومی پہچان مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ پنجاب میں جاگیرداری کا زور زیادہ تھا کیونکہ یہاں زراعت پر انحصار زیادہ تھا۔ اس لئے یہاں فیوڈل دور کی باقیات اور شناختیں ابھی مضبوط تھیں۔اس کے باوجود ایک بڑے سماجی اور سیاسی گروہ میں قومی شعور اور جدید دور کا احساس بھی موجودتھا۔

انگریز سامراج نے دوقومی نظریہ کی بنیاد پر انہی دوقوموں کوتقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔اگران قوموں میں قومی شناخت کا احساس پیدا ہوجاتا توان دو بڑی قوموں کی تقسیم ممکن نہیں تھی۔اس لیے انگریزوں کی ہندوستانی حکومت نے ان قوموں کے اندر فیوڈل دور کی شناختوں کومضبوط رکھنے کے لیے پہلے ہی مذہبی بنیادوں پر جداگانہ طریقِ انتخاب اختیار کیا تھا۔ یہاں مذہبی شناختوں کوخوب مضبوط کرنے کے لیے اسی مذہبی شناخت کوسیاسی شناخت بنانے کے لئے پوری کوشش کی تھی۔اب بٹوارے کے بعد کے خطرے سے نمٹنے کے لئے ایک طرف مذہبی دنگے اور فسادات کرا کر مذہبی شناختوں کی بنیاد اور نفرتوں کومضبوط کیا گیا تھا تو دوسری

طرف دونوں ملکوں کے درمیان ریاست جموں وکشمیر کا تنازعہ پیدا کیا جا رہا تھا۔ اس کی منصوبہ بندی پہلے سے ہی کر لی گئی تھی۔ ریاست کے مہاراجہ کو کہا گیا تھا کہ کسی ایک ملک میں شامل ہو جاؤ۔ جب اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو پہلے ریاست پر حملہ کرایا گیا، پھر مدد کے بہانے ریاست کی ہندوستان سے الحاق کرنے کی شرط رکھ لی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان سے نکلنے کے باوجود اس کو دو ملکوں میں تقسیم کر کے اس کے معاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے نئی حکمت عملی اپنائی تھی تاکہ وہ اپنے حمایت یافتہ لوگوں کے ذریعہ اس خطے میں ان کی مداخلت کو یقینی بنائے رکھیں۔

چونکہ ہندوستان کا بٹوارہ انگریز حکومت کے ہی طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا تھا اس لیے ریاست جموں وکشمیر کی تقسیم کے پیچھے بھی انگریزوں کا منصوبہ کارفرما تھا۔ انگریزوں نے ہر سیاسی پارٹی، فرقہ اور مذہب کے لوگوں کو اندر سے اپنے رابطوں کا حصہ بنایا ہوا تھا اور اس طرح جس گروہ، فرد، پارٹی یا لیڈر کی جہاں بھی ضرورت ہوتی تھی اس کو اسی جگہ اپنے حق میں یا فائدے کے لئے استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ ریاست جموں کشمیر پر پاکستان کے حملے کی نہ صرف انگریز اہلکاروں کو پورا علم تھا بلکہ ان میں سے کئی اس حملے کے منصوبہ ساز بھی ہوئے ہونگے۔ ریاست میں دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کا کردار واضع طور پر ریاست کی وحدت کے خلاف تھا اور اس ریاست کو ختم کرنے کی سب سے بڑی مہم بھی ریاست کے اندر دونوں سیاسی جماعتوں کے کچھ لیڈروں کی ایماء پر ہی چل رہی تھی کیونکہ دونوں ہی سیاسی جماعتوں کی مانگ تھی کہ ریاست کا الحاق ہو اور وہ بھی ان کی مرضی اور پسند کے ملک سے ضروری ہے جبکہ ریاست کا مہاراجہ دونوں ملکوں سے الحاق سے گریزاں تھا۔ اس وقت جو ریاست میں حملے کے بعد صورتحال پیدا ہوئی تھی اس کے پیچھے ریاست کی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کا ہی ہاتھ تھا۔ پاکستان نے ریاست پر حملے کی تیاری کے لیے اور اس حملے کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے ایک لبریشن کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی کے پانچ ممبرز تھے۔ ان ممبران کے نام تھے: 1۔ سردار ابراہیم خان، 2۔ خواجہ عبدالرحیم، 3۔ غلام محمد، 4۔ میجر جنرل اکبر خان، 5۔ میجر یوسف۔ بقول جنرل اکبر، خان لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان نے اس

کمیٹی کے ممبران کو بتایا کہ ریاست جموں وکشمیر میں ان کا فوجی نوعیت کا کام یہ ہوگا کے تین ماہ تک جنگ جاری رکھنی ہوگی تاکہ وقت حاصل کیا جاسکے اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ دراصل پاکستان کے کچھ سیاستدان انگریز کی ایماء پر ہی یہ سب کچھ ریاست میں کر رہے تھے۔ گوکہ پاکستان کے ریاست میں اپنے مفادات بھی تھے۔

ریاست کے مہاراجہ نے جب دونوں ملکوں سے برابر کے تعلقات قائم کرنے کے لئے معاہدہ کی پیشکش کی تھی اور پاکستان نے ریاست سے معاہدہ کر بھی لیا تھا تو اس طرح پاکستان کے مفادات کو ریاست کی وحدت بحال رکھنے میں زیادہ فائدہ تھا۔ اس کے باوجود پاکستان نے حملہ کر کے ریاست کے مہاراجہ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان سے الحاق کر لے۔ پاکستان کے حملے سے اور اس کے بعد کی کارروائیوں سے بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ پاکستان کے حکمرانوں کی دلچسپی ریاست پر قبضہ کرنے کی تھی نہ الحاق کرنے کی۔ انگریز کے منصوبے کے مطابق اس ریاست کو تقسیم کرنا اور اسے متنازعہ بنانا تھا جو آگے چل کر ہم دیکھیں گے۔ اس مسئلے کا تعلق اس خطے میں سرد جنگ کی پالیسی کے تحت ہندوستان اور پاکستان کو الجھا کر رکھنا مقصود تھا۔ پاکستان نے ریاست پر حملے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا انگریز حکومت کے چند اہلکار اس کا حصہ نہ بھی ہوئے ہوں لیکن وہ اس سے آگاہ ضرور تھے۔ بعد میں نہرو کا اقوام متحدہ میں ریاست کا تنازعہ لے کر جانا اور اس کی شکایت چیپٹر (Chapter 6) چھ کے تحت درج کرانا بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کو لمبا کرنا تھا۔ اگر اسے حل کرنا ہوتا تو حیدرآباد اور جوناگڑھ کی طرح یہاں بھی رائے شماری کرائی جاتی لیکن ایسا نہ کیا گیا بلکہ اس تنازعہ کو بنیاد بنا کر ہندوستان اور پاکستان نے کئی جنگیں بھی لڑیں اور ان کا نتیجہ بھی کوئی نہ نکلا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے وزیراعظم نے ریاست میں تین ماہ تک جنگ لڑنے کا حکم کیوں دیا؟ جس طرح پاکستان نے ریاست پر حملہ کیا تھا اور جتنے لوگوں کو ریاست پر حملے کے لیے تیار کیا گیا تھا، اندرون ریاست جتنے فوجی اور سویلین لوگوں کی حمایت پاکستان کو حاصل ہوئی تھی، پاکستان ساری ریاست پر آرام سے قبضہ کر سکتا تھا لیکن ریاست پر قبضہ کرنا ان کے اصل پلان کی حصہ ہی نہیں تھا بلکہ جو علاقے پاکستان نے اپنے کنٹرول میں

لئے تھے یہی علاقے پاکستان کو اس منصوبے کے تحت دیئے گئے تھے۔ بعد میں پونچھ اور راجوری کے علاقے پاکستان کو واپس دینے کے لیے انڈیا پر دباؤ ڈالا گیا تھا لیکن ہندوستان نے انکار کر دیا تھا۔ گو یا ریاست کا تنازعہ کھڑا کرنا دونوں ملکوں کے درمیان ایک بڑے کھیل کا حصہ تھا یا ریاست کو مذہب کی بنیاد پر ہی تقسیم کر کے دونوں ملکوں کو کچھ علاقے حوالے کرنا تھے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ برطانیہ کے اپنے منصوبے اور حکمت عملی تھی اور وہ اپنے ہی بنائے گئے منصوبوں کے مطابق چل رہے تھے۔ اس کا اظہار برطانوی وزیر اعظم کے رویے سے بھی ہوتا ہے جب ہندوستانی وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے پاکستانی حملہ کے تین دن بعد 25 اکتوبر 1947ء کو برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی کو پاکستان کے ریاست پر حملے کی شکایت کی تھی۔ مسٹر ایٹلی نے نہرو کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہاں اس ریاست کو ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ مستقبل کے حوالے سے مشکلات رہی ہیں لیکن یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس پر کوئی بحث کرے۔ برطانوی وزیر اعظم کا نہرو کو جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز حکومت کے منصوبہ ساز ہندوستان میں اپنی طے شدہ حکمت عملی اور منصوبوں کے مطابق ہی عملدرآمد کر رہے تھے۔ چونکہ برطانوی حکومت کی ریاست جموں وکشمیر کے بارے میں پالیسی کا اظہار سیکرٹری آف سٹیٹ نے 31 اکتوبر 1947ء کو دہلی اور کراچی میں تعینات برطانوی ہائی کمشنر کو اپنے ایک خفیہ ہدایت نامہ کے ذریعہ کیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ریاست کا الحاق پاکستان سے طے شدہ طریقہ کار اور اصول کے مطابق ہونا چاہیے۔

برطانوی حکومت بظاہر ریاست کا الحاق پاکستان سے ہونے کی پالیسی کی حامی نظر آتی تھی لیکن ہندوستان سے سمجھوتہ کر کے جیسے شمال مغربی سرحدی صوبے (NWFP) میں کیا گیا تھا۔ برطانوی حکومت کا خیال تھا کہ ریاست پر ہندوستان سے سمجھوتہ دو طریقے سے کیا جا سکتا تھا۔ ایک ریاست کو دونوں ملکوں میں تقسیم کر کے اور دوسرا طریقہ ہندوستان کا کسی دوسری طرح ازالہ کر کے یا فیور (Favour) دے کر جس طرح حیدر آباد کی ریاست پر انگریز حکومت ہندوستان کی حمایت کر سکتی تھی۔ انگریز حکومت ریاست جموں وکشمیر کو دو طرح سے بہت اہم سمجھتی تھی، ایک طرف برطانیہ عالمی حکمت کے تحت ریاست کو اہمیت دیتی تھی دوسری

طرف پاکستان کی سکیورٹی کے حوالے سے وہ اس کو بہت اہم خیال کرتے تھے۔ برطانیہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان اپنے تحفظ کے لیے ہندوستان کا محتاج ہو۔ اس لیے برطانوی حکومت دو طرح سے ریاست کو پاکستان کے لیے یقینی بنانا چاہتی تھی۔ ریاست کے شمالی علاقوں کی سرحد ایک طرف چین کے صوبے سنکیانگ سے ملتی تھی تو دوسری طرف سوویت یونین سے اس کی سرحد ملتی تھی۔ گلگت ایجنسی کی ایک تنگ پٹی افغانستان کو سوویت یونین سے جدا کرتی تھی۔ گلگت کے دو ماتحت علاقے ہنزہ اور نگر چترال اور مالاکنڈ کے علاقوں سے ملتے تھے۔ یہاں سے پاکستان اور افغانستان کا بارڈر آپس میں ملتا تھا۔ انگریز کے لیے ریاست جموں کشمیر کے ان علاقوں کی اہمیت شمال مغربی سرحدی صوبے (NWFP) سے کم نہیں تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے بہت کوشش کر کے یہ علاقے پاکستان کے حوالے کیے تھے۔ انگریز چاہتے تھے کہ شمال کے یہ ریاستی علاقے ان کے زیرِ اثر رہیں۔

4 اور 24 اکتوبر 1947ء کی حکومت کا افسانہ اور حقیقت

22 اکتوبر 1947ء کو پاکستان ریاست پر حملہ آور ہوتا ہے اور 24 اکتوبر 1947ء کو پاکستان نے ریاست کے جن حصوں کا کنٹرول حاصل کیا ان علاقوں کی ایک آزاد حکومت کا اعلان کرایا گیا تھا۔ آزاد حکومت کا اعلان مسلم کانفرنس کے ان لوگوں سے کرایا گیا تھا جو پاکستانی حملے کی بھرپور مدد کر رہے تھے یا اس کا حصہ بن کر حملہ کر رہے تھے۔ پاکستان نے جن علاقوں پر مشتمل اپنی حمایتی حکومت بنوائی ان میں جموں صوبے کا پرانا ضلع میرپور، ڈسٹرکٹ پونچھ کی پرانی دو تحصیلیں سدھنوتی اور باغ کے علاوہ پرانا مظفر آباد ضلع شامل تھا۔ یہ چار ہزار مربع میل علاقہ تھا جس میں حکومت کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس سے قبل 4 اکتوبر 1947ء کو بھی ایک حکومت کا اعلان کیا گیا تھا لیکن 4 اکتوبر 1947ء والی حکومت کی حقیقت اخباری بیان کی حد سے زیادہ نہیں تھی۔ اس حکومت کی حقیقت سے ہر کوئی انکاری اس لیے تھا کہ اس کا اعلان صرف اخباری بیان تک محدود تھا اور اس حکومت کے سارے نام بھی فرضی تھے۔ ایک سردار ابراہیم خان کا نام درست تھا لیکن اس حکومت کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی تھی۔ جماعت

احمدیہ اور مسلم کانفرنس کے بندے غلام نبی گلکار کو اس حکومت کا صدر بنایا گیا تھا لیکن مسلم کانفرنس کے کسی لیڈر نے اس کی کبھی تصدیق نہیں کی نہ ہی گلکار جس کا نام انور خان رکھا گیا تھا کبھی اس کی تصدیق کی تھی۔ بہرحال کئی افراد نے بعد میں انور ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ بقول سردار عبدالقیوم جو بعد میں مسلم کانفرنس کا ایک لیڈر اور آزاد کشمیر کا صدر اور وزیر اعظم بھی رہا ہے انور خان کے حوالے سے بتایا تھا کہ وہ میجر خورشید انور تھا جس نے قبائلیوں کے لشکر کو لیکر مظفر آباد شہر پر حملہ کیا تھا اور بارہ مولا کے مقام پر پہنچا کے واپس بھاگ آیا تھا۔ دوسرا نام بھی جس نے انور خان ہونے کا دعوی کیا تھا وہ دھیر کوٹ کے ایک گاؤں چمنکوٹ کے انور شاہ صاحب کا بتایا جاتا ہے۔ بہرحال قطع نظر اس بات کے وہ جعلی انور تھا یا اصلی ،کیا مسلم کانفرنس کے ان لیڈروں کا یہ عمل درست قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ درست بھی مان لیا جائے کہ یہ ریاست کی خودمختاری کے حامی تھے تو یہ بات بالکل جائز نہیں رہتی کہ 14 اگست کی رات سے ریاست کا حکمران بھی خودمختار بن گیا تھا۔ برطانیہ سے جو ریاستی امور مشترکہ تھے وہ معائدات ختم ہو گئے تھے اور ریاست کے حکمران کو اقتدار اعلیٰ مکمل بحال ہو گیا تھا۔

حکمران نے دونوں ملکوں سے الحاق کرنے سے انکار کر دیا تھا اور دونوں پڑوسی ملکوں کو معاہدہ قائمہ کرنے کی پیشکش کر چکا تھا۔ پاکستان نے معاہدہ قبول بھی کر لیا تھا۔ یہ واضع اعلان تھا کہ ریاست کا حکمران الحاق کے بجائے موجودہ پوزیشن کو بحال رکھنا چاہتا تھا۔ اب ریاست میں پہلے سے ہی ایک آزاد اور خودمختار حکومت موجودہ تھی جو 14 اگست سے اقتدار اعلیٰ بھی حاصل کر چکی تھی۔ ایسی ریاستی حکومت کے خلاف کوئی نئی حکومت قائم کرنے کا دعویٰ کرنا ریاست سے دوستی نہیں دُشمنی تصور کی جائے گی۔ اگر مسلم کانفرنس کا کوئی گروہ ایسا دعویٰ کرتا بھی ہے کہ وہ آزاد ریاست کے حق میں تھے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نہ 4 اکتوبر کی قائم حکومت کوئی الگ عمل تھا بلکہ یہ 24 اکتوبر 4 اکتوبر کے اخباری بیان کا عملی قدم تھا۔ 4 اور 24 اکتوبر کے کسی کردار نے ساری زندگی ایسا کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا کہ وہ آزاد ریاست کے حامی تھے۔ دراصل یہ بعد کے چند لوگوں کی بنائی ہوئی افسانوی کہانی ہے اس کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ جونا گڑھ کی جلاوطن حکومت کا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اخبارات میں اس کا صرف اعلان کرایا

گیا تھا اور عملی جامہ اس حکومت کو 24 اکتوبر کو پاکستان کے حملے کے نتیجے میں علاقوں پر اپنا مضبوط کنٹرول حاصل کرنے کے بعد کیا گیا تھا۔ چونکہ آزاد کشمیر کے علاقوں میں حکومت قائم کرنے والے سارے کردار اس کا اعتراف اپنی تحریروں میں بھی کر چکے ہیں کہ وہ پاکستان کے نہ صرف حامی تھے بلکہ پاکستان کے حملے میں پوری طرح مددگار بھی تھے۔

سردار ابراہیم صاحب جن کا نام دونوں حکومتوں میں شامل تھا، پاکستان کی طرف سے بنائی گئی لبریشن کمیٹی کے واحد ممبر تھے جو آزاد کشمیر کے علاقے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ وہ پاکستان کے سرگرمِ حامی تھے اور اس کا واضع اعتراف اپنی کتابوں میں بھی کر گئے ہیں بلکہ ساری زندگی اپنے اسی سیاسی نظریے پر قائم رہے۔ آزاد کشمیر کے چند افراد نے 4 اکتوبر کے افسانے کو جو ایک اخباری بیان سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، محض بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہوا ہے جو بہت بعد میں شاید اس لیے بھی یہ کہانی بنائی گئی تا کہ الحاق پاکستان کے حامیوں کا مقابلہ کیا جائے۔ آزاد کشمیر میں آزادی پسندوں کے بے شمار گروہ ایسے ہی افسانوں کے سہارے سیاسی نظریات پھیلاتے رہے ہیں اور حقیقی معنوں میں ان کی واضع اکثریت 1947ء کے حملے کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اس حکومت اور علاقے کو آزاد ہی سمجھ رہے ہیں۔ وہ آج تک نہ تو کوئی ٹھوس تجزیہ 1947ء سے پہلے والی سیاسی تحریک کا پیش کر سکے نہ اپنے علاقوں میں کوئی ٹھوس منصوبہ بندی سے علاقائی حقوق ہی لے سکے۔ ان کا بیانیہ بھی چند نعروں کے سوا مسلم کانفرنس سے ہی ملتا جلتا ہے۔ یہ 1947ء کے بعد آزاد کشمیر میں بیٹھ کر وادی کشمیر کی آزادی کے خواب دیکھتے آئے ہیں۔ ان کے پاس نہ تو اپنے حقوق اور عوام کی حقیقی آزادی حاصل کرنے کا پروگرام ہے نہ ان کے سیاسی نظریات عوام کے لیے قابل قبول ہیں۔ الحاق نواز پارٹیاں ریاست کے دونوں طرف عوام کو کنٹرول کرتی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے بھی تعاون کرتی ہیں گو کہ دونوں طرف الحاق نواز جماعتیں مفاداتی گروہ بن چکی ہیں۔ ان کا مقابلہ ان سے بہتر اور ٹھوس عوامی فلاح و بہبود کا پروگرام پیش کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال 1947ء میں آزاد کشمیر کے علاقوں میں بننے والی حکومت بنیادی جمہوری اصولوں کے منافی تھی۔ اس کے اراکین کو پاکستان کی حکومت کی مرضی سے اقتدار کی کرسی پر بٹھایا جاتا

تھا۔ 22 اکتوبر سے 27 اکتوبر 1947ء تک قبائلیوں کے لوٹ مار قتل وغارتگری سے مقامی مسلح گروہوں کا ان کے ساتھ شامل ہونے سے آزاد کشمیر کے علاقوں سے غیر مسلم شہریوں کا مکمل صفایا کر دیا گیا تھا۔ ان غیر مسلم شہریوں کو بچانے والے چند ہی مقامی ہمدرد تھے، زیادہ مارنے والے ہی تھے۔ بقول جنرل اکبر خان جب وہ بارہ مولا ٹاؤن میں پہنچا تو 14 ہزار نفوس کی یہ بستی قبائیلیوں کے ہاتھوں مکمل اُجڑ چکی تھی۔ صرف تین ہزار افراد اس تباہی سے بچ نکلے تھے باقی سارے قتل کر دیے گئے تھے۔

جنرل اکبر جو اپنا نام طارق رکھتا ہے اس قتل وغارتگری کو پٹھانوں کا عظیم کارنامہ قرار دیتا ہے۔ بہر حال قبائلی واپس ہونا شروع ہوئے اور لوٹ مار کا سامان اور عورتیں بھی ٹرکوں اور بسوں میں بھر کر لے گئے۔ آزاد کشمیر حکومت کے کنٹرول میں اسوقت تک کچھ بھی نہیں تھا۔ جلد ہی پاکستانی فوج وردیوں سمیت ریاست میں داخل ہو چکی تھی۔ دوسری طرف اس مار دھاڑ اور قتل وغارتگری سے بچے کُھچے لوگ آزاد کشمیر سے جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں سمیت شہر کی طرف آنے لگے اور ان علاقوں میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ بالکل آزاد کشمیر کی طرف جموں کے نزدیک پنجاب سے مسلح جتھے جموں میں داخل ہو کر قتلِ عام اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے لگے۔ جموں کے قتلِ عام میں بھی ریاستی فوج کے اہلکار، برطانوی فوج کے ریٹائرڈ ممبرز، انڈین نیشنل آرمی کے سابق آفیسرز، ہندو اور سِکھ انتہا پسندوں کے گروہ اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ کر رہے تھے جو آزاد کشمیر کے علاقوں میں غیر مسلموں کے ساتھ ہوا تھا گویا دونوں حصوں میں بے گناہوں کا خون بہایا گیا تھا۔ ریاست کے صوبہ جموں میں آگ اور خون ہر طرف تھا اور انسانوں کی آہ وبقا تھی۔

ایسے حالات میں مہاراجہ ہری سنگھ نے ماؤنٹ بیٹن کو ایک خط لکھا جس میں پیدا ہونے والی صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے فوجی مدد کی اپیل کی لیکن ماؤنٹ بیٹن اور وزیراعظم نہرو نے یہ کہہ کر فوجی مدد دینے سے انکار کر دیا تھا کہ ریاست کا کوئی معاہدہ ہندوستان سے موجود نہیں تھا اور ایک آزاد ملک میں کسی دفاعی معائدے کے بغیر فوج بھیجنا بین لاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس لیے مہاراجہ کو الحاق کی دستاویز پر دستخط کرنے کے

لئے کہا گیا۔مہاراجہ نے 26 اکتوبر 1947ء کو الحاقِ ہندوستان کی دستاویز پر دستخط کر دیئے لیکن ہندوستان سے دفاع، خارجہ اور کمیونیکیشن کے امور مشترکہ کرنے پر اکتفا کیا۔ریاست کو ہندوستان میں مکمل ضم کرنے والی دستاویز پر الگ دستخط نہ کر کے ریاست کے مستقبل کو عوام کی رائے سے جوڑ دیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بھی الحاق کی دستاویز قبول کرتے ہوئے ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اس الحاق کو عارضی قرار دیا اور اس پر نوٹ لکھ دیا کہ یہ الحاق ریاست میں امن بحال ہونے کے بعد عوامی رائے سے فائنل ہوگا۔الحاق کی دستاویز پر دستخط ہونے کے بعد ہندوستان کی فوج ایک سو((100 سِول طیاروں کے ذریعے سرینگر ایئرپورٹ پر اتاری گئی اور اس فوج نے سب سے پہلے سرینگر ایئرپورٹ کا کنٹرول سنبھال لیا۔اگلے چند دنوں میں ہندوستانی فوج نے قبائیلیوں پر حملے شروع کر دیے۔قبائلی ایک تربیت یافتہ فوج کے آگے نہیں ٹھہر سکتے تھے اس لیے کشمیر سے بھاگنے لگے اور چند ہی دنوں میں قبائلی کشمیر چھوڑ چکے تھے۔قبائلیوں کے جانے سے پہلے ہی پاکستانی فوج ان علاقوں پر اپنا کنٹرول مضبوط کر چکی تھی۔اب ریاست عملاً ٹوٹ چکی تھی۔ دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کا سامنا کر رہی تھیں۔دونوں کے درمیان جنگ چھڑ چکی تھی۔ریاست کے اپنے اپنے حصے پر دونوں فوجیں اپنا کنٹرول مضبوط کرنے میں لگ چکی تھیں۔

ایک طرف نیشنل کانفرنس کی قیادت شیخ عبداللہ کی رہنمائی میں ہندوستانی فوج کی مدد کرنے میں دن رات محنت کر رہی تھی۔دوسری طرف مسلم کانفرنس کے چند لیڈر مقامی سطح پر پاکستانی قبضہ مضبوط کرانے میں جان توڑ جدوجہد کر رہے تھے۔ایک طرف ریاست کی لُٹی ہوئی تباہ حال،غمزدہ عوام تھی جن پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ہر طرف شہری ماتم کر رہے تھے۔ ہزاروں بے گناہ ریاستی شہری موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے جو خاندان بچ بھی گئے تھے وہ بھی بھوک اور بیماریوں کے گھیرے میں آ چکے تھے۔کچھ خاندان اپنے پیاروں کی موت پر نوحہ کناں تھے۔دوسری طرف حکمران تھے جو ان کی موت پر جشن منا رہے تھے اور اس نیم مردہ مخلوق پر حقِ حکمرانی حاصل ہونے پر چراغاں کر رہے تھے۔دونوں ملکوں کی فوجوں کے درمیان بارود کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔دونوں کی فوجیں ریاست کو میدانِ جنگ بنا چکی تھیں اور

یہ ان کا اپنا مرضی کا چنا ہوا میدان تھا۔ یہ اجنبی فوجی اس دھرتی پر پہلی بار اترے تھے اور کسی کی سرزمین کو اپنا بنانے کی جنگ لڑ رہے تھے۔ جناح صاحب کراچی سے لاہور منتقل ہو چکے تھے تا کہ اس خونی کھیل کا تماشا قریب سے دیکھ سکیں۔ جناح صاحب کو قبائیلیوں کی نا کامی کی خبر مل چکی تھی اور سرینگر پر قبضہ نہ ہونے پر بھارتی فوج کے اترنے کی خبر سے جناح صاحب میں کڑواہٹ بڑھ گئی اور اس نے فورا اپنی فوج کے سربراہ ڈیگلس گریسی(Douglas Gracy) کوحکم دیا کہ وہ فوج کو حملے کیلئے بھیجےلیکن جنرل گریسی اپنی فوج کی حالت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ جناح صاحب کا حکم ماننے کے لئے تیار نہ ہوا کیونکہ اسے پہلے سُپریم کمانڈر مارشل آکن لیک سے (Marshal Auchinleck) جو دونوں تقسیم شدہ فوجوں کا سُپریم کمانڈر اورانچارج تھا سے اجازت لینا ضروری تھی۔ جنرل گریسی نے سپریم کمانڈر سے درخواست کی کہ وہ جناح صاحب سے خود بات کرنے کے لیے دہلی سے لاہور آئے اور جناح صاحب کو کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم واپس لینے پر قائل کرے۔ سُپریم کمانڈر مارشل آکن لیک لاہور پہنچا اور جناح صاحب کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ فوجی حملے کا حکم واپس لے۔ جناح صاحب نے فوجی حملے کا حکم واپس لے لیا اور بات چیت کے لیے ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کو لاہور آنے کی دعوت دی۔

نہرو صحت کی خرابی کا بہانہ بنا کر لاہور نہ آیا اور ماؤنٹ بیٹن اکیلا یکم نومبر 1947ء کو لاہور پہنچ گیا۔ اس کی جناح صاحب سے طویل گُفت وشنید شروع ہوئی جس دوران جناح صاحب نے تین نکاتی تجویز پیش کی کہ کس طرح ریاست کی سنگین صورتِ حال سے نمٹا جائے۔ جناح صاحب نے جنگ بندی، ہندوستانی فوج اور قبائیلیوں کے انخلاء اور گورنر جنرل کے مشترکہ کنٹرول میں ریاست میں رائے شماری کرانے کی تجاویز سامنے رکھیں لیکن ماوئنٹ بیٹن نے جناح صاحب کی تجاویز ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کابینہ کے مشورہ کے بغیر ایسا کرنے کا آئینی اختیار نہیں رکھتا۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے یہ بھی پوچھا تھا کہ اگر اس کا قبائیلیوں پر کوئی کنٹرول نہیں تھا تو وہ انہیں کشمیر سے نکالنے کی ذمہ داری کیسے لے سکتا ہے۔ جناح صاحب نے جواب دیا کہ اگر ماوئنٹ بیٹن یہ تجاویز مان لے تو وہ یہ سارا معاملہ ختم

کرا سکتا تھا۔ اسی میٹنگ میں ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے کہا کہ رائے شماری ریاست میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ہوگی لیکن جناح صاحب نے اس تجویز کو فوراً مسترد کر دیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کی جناح صاحب سے ہونے والی بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دراصل ریاست کا مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا اور نہرو کو شاید پہلے ہی اس کے لئے قائل کر چکا تھا۔ نہرو نے 22 دسمبر 1947ء کو پاکستانی وزیراعظم کو ایک خط لکھا تھا کہ اگر پاکستان ریاست میں حملہ آوروں کی مدد بند نہیں کرے گا تو ہندوستان کو مجبوراً پاکستان کے خلاف ایکشن لینا پڑے گا لیکن پاکستانی وزیراعظم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ہندوستان نے کوئی ڈائریکٹ ایکشن لینے کے بجائے یکم جنوری 1948ء کو پاکستان کے خلاف اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں شکایت درج کرادی اور حیران کن کام یہ کیا کہ شکایت چیپٹر 6-(Chapter) آرٹیکل 35 کے تحت درج کرائی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کی مرضی کے بغیر سکیورٹی کونسل کچھ نہیں کرے گی۔ ہندوستان کو ریاست پر پاکستانی حملے پر تو ضرور اعتراض تھا لیکن ریاست سے پاکستان کو نکالنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اگر ہندوستان پاکستان کو درحقیقت ریاست سے نکالنے کا حامی ہوتا تو پاکستان کے خلاف سکیورٹی کونسل کے چیپٹر (Chapter 7) سات کے تحت شکایت درج کراتا جس میں سکیورٹی کونسل کے پاس ممبر ملک کے خلاف ایکشن لینے کا اختیار بھی ہوتا ہے جبکہ ہندوستان نے پاکستان کے خلاف ایک اخلاقی نوعیت کا کیس درج کرایا۔ اس شکایت میں یہ کہا گیا کہ پاکستان نے ہندستانی علاقوں پر حملے، لوٹ مار اور قتل و غارتگری کی تھی اور ہندوستان کو پاکستان کے حملہ آوروں کو اپنے علاقوں سے نکالنے اور نئے حملے روکنے کے لیے اس کے علاقوں کے اندر داخل ہو کر حملہ کرنے والوں کے سنٹرز کو تباہ کرنا پڑے گا۔ حملہ آوروں کی مدد کرنے کا عمل انڈیا کے خلاف جارحیت اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی تصور کیا جائے گا۔ ہندوستان نے اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 35 کے تحت اس صورتحال کو رپورٹ کیا تھا اور سکیورٹی کونسل کو کہا گیا تھا کہ وہ پاکستان کو ریاست میں مندرجہ ذیل کاموں سے روکے۔

1۔ پاکستان اپنے سویلین اور فوجی اہلکاروں کو ریاست جموں کشمیر میں حملہ کرنے والوں

کی مدد کرنے اور اس حملے میں حصہ لینے سے روکے۔

2۔ پاکستان اپنے شہریوں کو ریاست جموں کشمیر میں لڑائی میں حصہ لینے سے روکے۔

3۔ حملہ آوروں کو ریاست میں آنے سے روکے۔

4۔ حملہ آوروں کو اپنے علاقوں سے ریاست پر حملہ کرنے سے روکے اور رسائی نہ دے۔

5۔ حملہ کرنے والوں کو فوجی مدد اور دیگر سپلائی دینے سے پرہیز کرے۔

6۔ ایسی تمام امداد دینا بند کرے جو موجودہ جدوجہد کو طویل کردے۔

سیکیورٹی کونسل نے جب مسئلہ اپنے ایجنڈے میں بحث کے لیے منظور کیا تو پاکستان نے ہندوستانی الزامات کی تردید کرتے ہوئے ریاست پر حملے میں ملوث ہونے سے صاف انکار کردیا تھا۔ جواباً پاکستان نے سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان کے خلاف شکایت درج کراتے ہوئے الزامات لگائے اور کہا کہ مسئلہ کشمیر ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ساتھ کئی اور مسائل بھی موجود ہیں۔ اس طرح پاکستان نے ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کے ساتھ ہندوستان کا پاکستان اور مسلمانوں کے بارے میں رویہ اور جونا گڑھ کا مسئلہ بھی شکایت کی لسٹ میں شامل کردیا تھا۔ پاکستانی نمائندے نے سیکیورٹی کونسل میں ریاست کے مسئلے کی اہمیت کو کم کرتے ہوئے اس کو ہندوستان کے ساتھ کئی دوسرے مسائل میں سے ایک مسئلہ قرار دیا تھا۔ یہ دراصل ہندوستان کی شکایت کی طرح ریاستی مسئلہ کو عوام کا قومی سوال بننے سے روکنے کا ایک طریقہ تھا اور اس سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بٹوارے کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک ریاست کے عوام کے قومی سوال اور حق خود ارادیت کو دونوں ملکوں کا دوطرفہ علاقائی مسئلہ بنانے کی شعوری کوشش تھی۔ اس طرح اقوام متحدہ میں اس مسئلے کی حیثیت دوطرفہ علاقائی مسئلہ کی ہوگئی تھی۔ یہ مسئلہ دونوں ملکوں کی ملی بھگت سے اقوام متحدہ میں بڑی طاقتوں کے درمیان تماشا بن گیا تھا۔ ہندوستان ریاست کا مسئلہ اقوام متحدہ میں کیوں لے گیا اور اس کو دوطرفہ مسئلہ کیوں بنایا گیا تھا؟ اگر اقوام متحدہ میں اس مسئلے کی نیچر اور بنیادی حیثیت پر غور کیا جائے تو اس کو وہاں لے جانے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا تھا کیونکہ ریاست کے مسئلے کا حل قانون آزادی ہند کے مطابق ہونا تھا جس قانون کے تحت ہندوستان کا

بٹوارہ کیا گیا تھا۔ بعد میں اقوام متحدہ نے ریاست کے مسئلے کا وہی حل تجویز کیا تھا جو ہندوستانی ریاستوں کے لیے قانون آزادی ہند میں موجود تھا۔ چونکہ ہندوستانی ریاستوں پر دوقومی نظریئے کا اطلاق نہیں ہوتا تھا اس لئے ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کا حصہ بن جائیں اگر کوئی ریاست متنازعہ بن جائے تو اس کے حکمران کا فیصلہ آخری تصور نہیں کیا جائے گا بلکہ وہاں رائے شماری کے ذریعہ عوام کو حق دیا جائے گا کہ وہ فیصلہ کریں کہ کس ملک کے ساتھ رہنا ہے۔

کچھ لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ریاستوں کو تین جون کے پلان میں آزاد رہنے کا حق بھی دیا گیا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ ریاستوں کو یہ ضرور کہا گیا تھا کہ انگریزوں کے ساتھ ان کے تمام معاہدات ختم ہو جائیں گے لیکن ان کو ساتھ ہی کسی ایک ملک سے الحاق کا کہا گیا۔ ریاستوں کی آزادی سے مراد ان کے اقتدار اعلیٰ کی واپسی تھی جو پہلے برطانوی ہند کے ساتھ مشترکہ یا شیئر تھی۔ گویا ریاستوں کے حکمرانوں کو اقتدار منتقل کیا گیا تھا تا کہ ان کی اتھارٹی بحال ہونے سے وہ الحاق ہندوستان یا الحاق پاکستان آزادی سے کرسکیں۔ کوئی بھی اتھارٹی اگر اقتدار اعلیٰ کی مالک نہیں ہے تو وہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرسکتی جس کے لیے (Sovereignty) اقتدار علیٰ کی ضرورت ہوتی ہے حالانکہ ریاستوں کو فوراً یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کرنے کی مجاز نہیں ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کے مہاراجہ نے الحاق سے انکار کیا تھا تو ماؤنٹ بیٹن نے فوراً سرینگر پہنچ کر اس سے ملاقات کی تھی اور مہاراجہ ہری سنگھ راو راس وقت کے ریاست کے وزیر اعظم دونوں کو پہلے اس چیز سے منع کیا تھا کہ آپ ریاست کو آزاد ملک بنانے کا اعلان نہ کریں بلکہ کسی ایک ملک سے الحاق کریں جس پر مہاراجہ نے ماؤنٹ بیٹن سے اس موضوع پر بات کرنا ہی چھوڑ دیا۔ بقول ماؤنٹ بیٹن مہاراجہ سے اس کی ملاقاتیں کار میں بیٹھ کر دوسری جگہ تھوڑی دیر کے لیے جاتے ہوئے ہی ہوتی تھیں کیونکہ مہاراجہ کسی صورت ہندوستان اور پاکستان سے الحاق نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر اس کی تھوڑی سی گنجائش بھی ہوتی تو انگریز اتنی بڑی سازش پر بھی خاموش نہ رہتے جس سازش کے تحت ریاست پر حملہ کیا گیا تھا اور بعد کے سارے واقعات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ

انگریز ہر جگہ خود اگر ملوث نہیں بھی تھے تو اس سارے عمل کو ہونے دے رہے تھے اور بعض معاملات میں اور جگہوں پر خود بھی اپنے عناصر کو مدد اور حوصلہ دے رہے تھے جس طرح گلگت بلتستان کے واقعات میں انگریز اہلکار خود ساری فوجی بغاوت کا حصہ تھے۔ گو کہ بغاوت کرنے والے اہلکار ریاست کے ملازم تھے لیکن ان کی پہلے سے ہی کچھ سرگرمیاں ایسی تھیں جو انہیں مشکوک بناتی ہیں۔ مثال کے طور پر گلگت سکاؤٹس کے مسلم اہلکاروں سمیت اپنا حلف بھی دھوکے سے انگلش ڈکشنری پر لیا گیا جو ان کے ارادوں کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ حلف اٹھانے میں دھوکہ دہی کا مظاہرہ کیوں کر رہے تھے۔ اس کی وجہ بعد میں ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھانا اور اپنے ماتحت سکاؤٹس کو اس کے لیے اپنے حکم، ڈائریکشن (Direction) کے مطابق چلانا ،ان سکاؤٹس کے ذریعے ریاست کی فوج کو گلگت میں تباہ کرانا اور ریاستی فوج کے مسلم اہلکاروں کو استعمال کرنا بھی شامل تھا۔ بہر حال ہندوستان اور پاکستان جس طرح اقوام متحدہ میں ایک دوسرے پر الزامات لگاتے ہیں اور اس مسئلے میں بڑی طاقتوں کی دلچسپی یہ ظاہر کرتی تھی کہ ریاست کا مسئلہ وہاں پیش ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے کئی تنازعے پیش کئے گئے تھے ان میں سے ایک مسئلہ ریاست جموں کشمیر کا بھی بنایا گیا تھا۔

اگر ہندوستان اس مسئلے کو حل کرنے میں سنجیدہ ہوتا تو اسے کبھی اقوام متحدہ میں نہ لے جاتا اور اس کو اسی طرح حل کیا جاتا جس طرح جونا گڑھ اور حیدر آباد کا مسئلہ حل کیا گیا تھا۔ جونا گڑھ میں 20 فروری 1948ء کو ریفرنڈم ہوا تھا اور عوام نے نواب کے پاکستان سے الحاق کے فیصلہ کے خلاف ہندوستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ حیدر آباد نے آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور کراچی میں اپنے سفارتکار بھی تعینات کر دیئے تھے۔ سفارت خانہ کھولنے کی اجازت پاکستان نے ہی دی تھی جبکہ جموں کشمیر کے مہاراجہ نے آزادی کا اعلان بھی نہیں کیا تھا بلکہ قانون آزادی ہند کا دیا ہوا آپشن ہی چُنا تھا کہ وہ دونوں ملکوں سے معاہدہ قائمہ کرتا ہے لیکن پاکستان نے حیدر آباد کی آزاد حیثیت اور جونا گڑھ کے مسلمان نواب کا الحاق دونوں قبول کر لیے تھے۔ حیدر آباد تو ہندوستان کا حصہ نہیں بن رہا تھا شاید اس لئے پاکستان نے آزاد ملک کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا جبکہ جونا گڑھ کی پاکستان سے کوئی سرحد بھی نہیں ملتی تھی۔ یہ

گجرات کے ساحلی علاقوں میں واقع ریاست تھی پھر بھی پاکستان نے اس کا الحاق اپنے ساتھ تسلیم کرلیا تھا۔ اس بے اصولی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان نے جموں وکشمیر کا الحاق بھی قبول کرلیا تھا اور جونا گڑھ اور حیدرآباد پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ ریفرنڈم بعد میں کرایا گیا تھا۔

پاکستان کی لیڈرشپ صرف جذباتی مذہبی نعرے لگانے میں ہی خوش تھی یا مسلم لیگ کی لیڈرشپ انگریز حکومت پر زیادہ انحصار کرتی تھی جبکہ انگریز حکومت ہندوستان کو نظرانداز کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی اس کے باوجود انگریز حکومت کا جھکاؤ پاکستان کے حق میں واضح تھا۔ برطانوی وزیراعظم اٹیلی (Attlee) نے مہاراجہ کے ہندوستان سے الحاق کے بعد بھی ماؤنٹ بیٹن کے الحاق کے عمل کو قبول کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ قبائلی حملے سے آگاہ ہونے کے باوجود نہرو کی شکایت میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ برطانوی وزیراعظم نے لیاقت علی خان کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر ہندوستان کسی معقول سمجھوتے پر راضی نہیں ہوتا اور الحاق کی دستاویز کی بنیاد پر ہی کشمیر پر اپنا جواز پیش کرتا ہے تو ان حالات میں قبائلیوں کو کشمیر سے نکالنے کا حکم نہ دیا جائے۔ رائے شماری کی صورت میں پاکستان کو اپنے تمام شہریوں کو جو لڑنے کے ارادے سے ریاست میں داخل ہوئے تھے نکالنا ضروری تھا جبکہ جناح صاحب کو نہ تو ریفرنڈم جیتنے کی امید تھی اور نہ وہ اس بات پر راضی تھے کہ ہندوستانی فوج جموں کشمیر میں رہے بلکہ ان کا مطالبہ تھا کہ ہندوستانی فوج کو بھی نکالا جائے۔ دونوں ملکوں کی مشترکہ فوج کی تجویز بھی پیش کی گئی تھی لیکن مسئلہ کہیں نہ کہیں کچھ قوتوں نے مزید پیچیدہ بنایا ہوا تھا اور اس کو مزید اُلجھایا ہوا تھا۔

ہندوستانی فوج ریاست کے چند علاقے ہی اپنے کنٹرول میں کر پائی تھی جو علاقے پاکستان نے حملہ کر کے قبضہ میں لیے تھے وہ ہندوستانی فوج واپس نہیں لے سکی تھی۔ البتہ نومبر 1947ء میں ہندوستانی فوج نے پاکستانی پنجاب کے بارڈر کے نزدیک ریاست کے علاقے واپس لینے کا پلان ترتیب دیا تو ہندوستانی فوج کے کمانڈر ان چیف رائے باؤچر نے اس پلان کو مسترد کر دیا اور کہا کہ یہ بہت زیادہ خطرات سے پر ہے اور ماؤنٹ بیٹن نے بھی باؤچر کی حمایت کی جبکہ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کی کابینہ کی دفاعی کمیٹی کا چیئرمین بھی تھا۔ نہرو اور کابینہ کے دوسرے ممبران نے ریاست کے پنجاب کے ساتھ لگنے والے علاقوں پر حملے پر

بہت زور دیا اس حملے کو ترتیب دینے والا کمانڈر کلونت سنگھ اس پلان پر عمل کرتے ہوئے کوٹلی، جہانگڑ اور نوشہرہ پر حملے کر کے ان کا کنٹرول لینے میں کامیاب ہو گیا اور پونچھ ٹاؤن اور اس کے گردونواح کے علاقے بھی پاکستان سے لینے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ میر پور اور مظفر آباد کے علاقے لینے میں ناکام ہوا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے 14 نومبر 1947ء کو برطانیہ سے واپسی پر نہرو کو خط لکھا اور کہا کہ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مغربی پنجاب کے بارڈر علاقوں پر حملے کر کے پونچھ اور میر پور کے عوام پر اپنی فوج کے ذریعہ مرضی مسلط کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ ماؤنٹ بیٹن پر لندن دورے کے دوران چرچل نے الزام لگایا تھا کہ وہ ہندوستان کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا اس نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمان برطانیہ کے دوست ہیں اور انگریز کو مسلمانوں کے دُشمن کی مدد نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بعد میں ماؤنٹ بیٹن نے خود تسلیم کیا تھا کہ چرچل نے اس پر الزام لگایا تھا کہ اس نے ہندوستانی فوج کشمیر بھیج کر مسلمانوں کو دبانے کی کوشش تھی اور برطانیہ کے تربیت یافتہ سپائیوں کو کشمیری مسلمانوں پر ظلم کرنے کے لیے نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔

انگریز حکومت کا خیال تھا کہ راجوری، پونچھ اور گلگت بلتستان کے علاقے جو پاکستان کے کنٹرول میں چلے گئے تھے وہ انڈیا واپس نہ لے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ 3 دسمبر 1947ء میں ہندوستانی فوج کے انگریز کمانڈر ان چیف جنرل رائے باؤچر نے ہندوستانی کابینہ کی دفاعی کمیٹی سے پونچھ کے علاقے خالی کرانے اور انہیں پاکستان کے حوالے کرنے کی تجویز منظور کرانے کوشش کی تھی۔ جنرل رائے باؤچر کو ماؤنٹ بیٹن کی حمایت حاصل ہونے کے باوجود نہرو نے یہ تجویز منظور نہ ہونے دی۔ لیکن جنرل رائے باؤچر اوڑی، دومیل اور جہلم ویلی کے علاقوں میں فوجی آپریشن آئندہ موسم بہار تک بند کرانے میں کامیاب ہو گیا اور ساتھ ساتھ کمانڈر ان چیف دریائے کشن گنگا (نیلم) پر بنائے گئے پل تباہ کرنے کا بھارتی فوجی منصوبہ بھی ختم کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی پُل مظفر آباد کا پاکستان سے زمینی رابطہ قائم رکھنے کا واحد ذریعہ تھا۔ ریاست کے ان علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے 1948ء کا سارا سال جدوجہد ہوتی رہی۔ ہندوستانی فوج کے ایک نئے جی او سی (GOC) کی تعیناتی

سے راجوری، نوشہرہ کے علاقوں پر ہندوستانی فوج نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو بتائے بغیر قبضہ کر لیا تھا۔ جنرل کریپہ (General Criyapa) نے اپنے آپریشنز (Operations) ہائی کمانڈ سے خفیہ بنا لیے تھے۔ یہ بات جنرل رائے باؤچر نے پاکستانی کمانڈر ان چیف جنرل گریسی کو بتائی تھی کہ جنرل کریپہ ((Criyapa°) پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہے اس لیے اس نے سازشوں کے ذریعہ اپنی فوج کو آگے بڑھنے سے روکا ہوا تھا۔ کراچی میں تعینات برطانوی ہائی کمشنر نے اپنی ایک رپورٹ لندن بھیجی تھی جس میں اس نے اپنی حکومت کو لکھا تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے دونوں آرمی چیف نے پرائیویٹ طور پر آپس میں ملاقات کی تھی جس میں ہندوستانی آرمی چیف جنرل رائے باؤچر نے پاکستانی آرمی چیف جنرل گریسی کو بتایا تھا کہ اس کی آزاد کشمیر کا علاقہ جو میر پور، مظفر آباد اور پونچھ سیکٹر پر مشتمل تھا انڈیا کے لیے واپس لینے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ہائی کمشنر نے اپنی حکومت کو آگاہ کیا تھا کہ پاکستانی وزیر اعظم کو دونوں ملکوں کے آرمی سربراہوں کی ملاقات کا علم تھا لیکن وہ سرکاری سطح پر ایسی کسی ملاقات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

جنرل گریسی نے 2 مئی 1948ء کو دہلی کا دورہ کیا تھا اور ماؤنٹ بیٹن نے گریسی کو بتایا تھا کہ اگر ہم دونوں طرف کی حکومتوں کو باور کرا دیں کہ وہ جنگ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں تو شاید ہم دونوں ملکوں کو جنگ کے خطرے سے دور رکھ سکتے ہیں، لیکن دہلی میں تعینات برطانوی ہائی کمشنر نے 14 مئی 1948ء کو اپنی حکومت کو ایک وارننگ لیٹر (خط) بھیجا کہ نہرو اور اس کی کابینہ اوڑی سے دومیل اپنا فوجی حملہ کرنے کا ارادہ بنا چکے تھے۔ 8 مئی کو امریکی ملٹری اتاشی نے اپنی حکومت کو واشنگٹن میں رپورٹ بھیجی تھی کہ پاکستان کی تین فوجی بٹالین ریاست جموں کشمیر میں موجود ہیں ان میں ایک بٹالین اوڑی، دوسری پونچھ اور تیسری میر پور میں موجود ہے۔ پاکستان بہاولپور بارڈر سے لے کر دومیل تک عملاً جنگ کی حالت میں ہے۔ ہندوستانی بارڈر کے ساتھ سپلائی اور ریزرو (Reserve) کی کمی کی وجہ سے جنگ طویل نہیں ہوگی لیکن یقینا بہت خونریز ہوگی تاکہ جلد فتح حاصل ہو سکے۔ ہندوستانی فوج نے دومیل اور مظفر آباد پر حملہ کیا تھا لیکن وہ دومیل اور مظفر آباد لینے میں ناکام ہوگئی۔ اوڑی کے

شمال کا علاقہ ٹٹوال ہندوستانی فوج نے حاصل کرلیا تھا لیکن اوڑی کے مغرب میں جہلم روڈ پر ہندوستانی فوج 10 کلومیٹر سے آگے نہ بڑھ سکی اور جلد ہی اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا پاکستان کے ممبران وہاں اس دوران پہنچ گئے اور ہندوستان نے اس وقت تک فوجی آپریشن معطل کردیا جب تک اقوام متحدہ کے کمیشن کے اراکین برصغیر پاک وہند میں موجود رہیں گے۔22اکتوبر 1947ء سے لے کر یکم جنوری 1949ء تک دونوں ملکوں کی فوجوں کے درمیان ریاست جموں کشمیر میدان جنگ بنا رہا اور بارود کا کھیل جاری رہا۔اور یکم جنوری 1949ءکو جنگ بندی کا اعلان ہو۔اجنگ بندی کا اعلان اقوام متحدہ کی مداخلت سے ہوا تھا۔

☆☆☆☆

چھٹا باب

اقوام متحدہ اور ریاست جموں وکشمیر کا مسئلہ

نہرو پر ماؤنٹ بیٹن نے دباؤ ڈالا تھا کہ وہ ریاست کا مسئلہ اقوام متحدہ میں لے جائے۔ ماؤنٹ بیٹن اس بات پر پریشان تھا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو اس کا بین الاقوامی سطح پر رد عمل ہوگا۔ یہ بات ایلین کیمبل جانسن نے اس طرح بیان کی ہے جو گورنر جنرل کا پریس اتاشی تھا۔ جب ماؤنٹ بیٹن لندن سے دہلی آیا تھا وہ اس وقت گاندھی اور وی۔ پی مینن سے ملا تھا۔ وہ دونوں (گاندھی ،مینن) بھی اقوام متحدہ کی مدد کے حق میں تھے۔ 11 نومبر 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن نے نہرو سے ملاقات کی لیکن نہرو کا رویہ اب اس خیال کے بارے میں بالکل ہی غیر متحرک لگ رہا تھا جس طرح وہ لاہور میں لیاقت علی سے ملاقات کے دوران لگ رہا تھا بلکہ اس کے برعکس تھا۔اوائل ستمبر 1947ء میں گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن سے رابطہ کیا اور یہ تجویز دی کہ برطانیہ کا وزیراعظم اٹیلی (Attlee) ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ثالثی یا صلح کار کا کردار ادا کرے تا کہ دونوں ملکوں کو مسلح تصادم سے بچایا جائے۔ گاندھی نے یہ بھی تجویز کیا کہ برطانوی وزیراعظم یہ معلوم کریں کہ کونسا فریق غلط ہے اور کونسا درست ہے اور جو فریق غلط ہو وزیراعظم ایٹلی (Attlee) برطانوی فوج کے تمام آفیسرز کو اس فریق کی فوج سے باہر نکال لے۔ لیکن وزیراعظم ایٹلی نے گاندھی کی اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے گاندھی کو اطلاع دی کہ جب سیاسی حادثات واقع ہوتے ہیں تو یہ بڑا آسان ہوتا ہے کہ الزام کسی ایک فریق کے سر تھوپ دیا جائے چاہیے کسی پر کیا گیا شک درست

ہو یا نہ ہو۔ گاندھی کو برطانوی وزیر اعظم کے اس جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ گاندھی اور ماؤنٹ بیٹن کی بات چیت کے ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی لیڈروں کے درمیان اختلافات واضع طور پر ظاہر ہو چکے تھے جس کی وجہ سے ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کو ڈیل کرنے پر اس اختلاف کے واضع اثرات موجود تھے۔ ہندوستانی لیڈروں کی سوچ کا یہ عالم تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے ریاست جموں کشمیر پر پاکستانی حملے کے بعد نہرو کے لیے لاہور جانے کا سارا بندوبست کیا تا کہ وہ جناح صاحب سے ملاقات کرے اور اس مسئلے پر بات چیت کرے لیکن سردار پٹیل اور ساری ہندوستانی کابینہ ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے لاہور جانے کے خلاف تھے۔ بعد میں نہرو نے لاہور جانے سے گریز کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی سے 29 اکتوبر 1947ء کو یہ سوال پوچھا کہ سردار پٹیل اور باقی کابینہ کے ممبرز نہرو اور گورنر جنرل کے لاہور جانے کے کیوں خلاف تھے تو گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ ہمارے لیڈروں کے دماغوں میں یہ شک بہت مضبوط ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں تمام انگریز اور برطانوی سول اور ملٹری آفیسرز ہندوؤں کے خلاف ہیں اور مسلمانوں کے حامی ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے 16 ستمبر 1947ء کو گاندھی سے فرقہ وارانہ مسئلے پر بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ لوگوں کو اچھی باتیں سمجھانے کی بجائے پہلے یہ باتیں اپنے لیڈروں کو سمجھاؤ، خاص کر سردار پٹیل کو یہ باتیں ضرور سمجھاؤ اور اپنی ساری صلاحیتیں لیڈروں پر لگاؤ۔ اس کا صاف مطلب یہ بھی ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کو پوری طرح علم تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کرانے والے لیڈرز ہی تھے۔ اگر فرقہ واریت کو روکنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ لیڈروں کو روکا جائے تا کہ وہ فرقہ واریت کو ہوا نہ دیں۔

سردار پٹیل نے ہندوستانی کابینہ کے دوسرے ممبران کو بھی قائل کر لیا تھا کہ وہ پاکستان کے حصے کے اثاثہ جات ادا نہ کریں کیونکہ پاکستان اسی پیسے سے اسلحہ خرید کر ہمارے ہی سپاہیوں پر کشمیر میں گولی چلائے گا۔ پاکستان کے حصے میں آنے والے 55 کروڑ روپیہ روک لیا گیا تھا۔ صرف پاکستان کو پہلی قسط ہی ملی تھی جو 200 ملین روپیہ تھا۔ پاکستان کو اپنے حصے کا پیسہ نہ ملنے کی وجہ سے بہت مالی مسئلہ پیدا ہو گیا اور پاکستان نے حیدر آباد کے نواب سے 20 کروڑ روپے کا قرض لیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو علم تھا کہ سردار پٹیل نے کابینہ کے دوسرے

اراکین کو اس کام کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے پاکستان کے حصے کے اثاثے نہ دینے پر قائل کیا تھا۔نہرو نے بھی پاکستان کو 55 کروڑ روپیہ دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا پاکستان کو یہ رقم دینا بیوقوفی ہوگی۔اس طرح کے حربے سے ہندوستان کی لیڈرشپ نے پاکستان کو کشمیر میں جنگ سے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی جی سے یہ شکایت کی کہ ہندوستان نے جو چیز تقسیم ہند کے فارمولے میں طے کر رکھی ہے اس کو پورا کرے گا۔ندھی نے ماؤنٹ بیٹن سے وعدہ کیا کہ وہ وزیر اعظم نہرو اور ڈپٹی وزیر اعظم سردار پٹیل سے بات کرے گا اور اگر وہ گاندھی کی بات نہ مانے تو وہ بھوک ہڑتال کرے گا۔پاکستان کو 55 کروڑ کی رقم دلوا کر ہی رہے گا۔یہ بات 23 جنوری 1947ء کو ہندوستان کے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ نے ماؤنٹ بیٹن کو بتائی کہ گاندھی نے ہندوستانی کابینہ کے ممبران کو بھوک ہڑتال کر کے مجبور کر دیا تھا کہ وہ پاکستان کو ان کے حصے کا 55 کروڑ روپیہ فوراً دیں۔کابینہ کے اراکین نے رقم دے دی لیکن اسی رقم دینے کے چند دنوں بعد گاندھی کو قتل کر دیا گیا تھا۔4 اکتوبر 1947ء کو ماؤنٹ نے سردار پٹیل سے ملاقات کی اور تفصیل سے بات چیت کی لیکن اس ملاقات میں پٹیل نے نہرو پر شدید تنقید کی اور کہا کہ وہ نہرو کی غیر حقیقت پسندانہ تصوراتی سوچ پر افسوس کا اظہار ہی کر سکتا ہے کہ نہرو زمینی حقائق سے بالکل آگاہ نہیں ہے۔یہ ردِعمل پٹیل کی طرف سے مزید سخت ہو گیا جب نہرو نے مہاراجہ ہری سنگھ کی ہندوستان سے الحاق کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک شیخ عبداللہ کی سربراہی میں ریاست میں حکومت قائم نہ کی جائے وہ الحاق کو قبول نہیں کرے گا۔ ہندوستان کی کابینہ نے ریاست پر پاکستانی حملے کی شکایت اقوام متحدہ میں کرنے پر رضامندی ظاہر کی تو ان کا خیال تھا کہ اگر پاکستان نے ریاست سے اپنے حملہ آوروں کو تھوڑے ہی وقت میں باہر نہ نکالا تو ہندوستانی فوج پاکستان کے اندر جا کر حملہ آوروں کے سنٹرز کو تباہ کر دے گی اور ان کا کمیونیکشن کا نظام ختم کر دے گی۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان نے پاکستان کے خلاف اقوام متحدہ میں شکایت تو یکم جنوری 1948ء کو درج کرائی تھی لیکن ہندوستانی فوج

کے انگریز سی این سی نے اس وقت تک فوجی آپریشن کے لیے کوئی فوجی تیاری نہیں کی تھی۔ نہرو کو خطرہ تھا کہ جنگ کی صورت میں انگریز فوجی آفیسرز پر کافی اثرات مرتب ہوں گے اور گورنر جنرل کا ردعمل شاید یہ ہو کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر چلا جائے۔ یہ 29 دسمبر 1947ء کو نہرو نے پٹیل کو لکھا تھا اسی دن 29 دسمبر 1947ء کو ہی سر پال پیٹرک (Sir Poul Patric) جو کامن ویلتھ ریلیشن آفیسر (Common Wealth Relation Officer) تھا، نے نہرو کے 22 دسمبر 1947ء کے خط کا ذکر کیا جو نہرو نے لیاقت علی خان کو لکھا تھا۔

سر پال پیٹرک (Sir Poul Patrick) نے لندن میں امریکی چاج ڈی آفیسرز کو اطلاع دی کہ نہرو نے لیاقت علی خان کو دھمکی آمیز الٹی میٹم دیا ہے جو سنجیدگی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس پر امریکی چارج ڈی آفیسر نے واشنگٹن کو اطلاع دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان سیکیورٹی کونسل میں پاکستان کے خلاف شکایت درج کراتے ہی اچانک پاکستان پر حملہ کرے گا۔ کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا کا موقف یہ ہے کہ ریاست جموں کشمیر اب ہندوستان کا حصہ ہے یہ خبر جب برطانوی وزیراعظم اٹیلی (Attlee) تک پہنچی تو اس نے کہا کہ ہندوستان کا یہ کہنا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے اپنی فوجوں کو پاکستان کے اندر بھیجے گا اور یہ بین الاقوامی قوانین کے عین مطابق عمل ہوگا کافی مایوس کن بات لگی ہے اور بین الاقوامی قانون کے مطابق یہ درست مانا جائے گا۔ وزیراعظم (Attlee) کو شک ہے اور یہ عمل خطرناک اور تباہ کن ہوسکتا ہے۔ برطانوی وزیراعظم کے ردعمل کے بعد امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ایک نوٹ دہلی اور کراچی میں اپنے سفارتکاروں کے ذریعہ دونوں حکومتوں تک پہنچایا اور اس میں کہا گیا کہ دونوں ملک غیر ذمہ دار عناصر کو روکیں اور بین الاقوامی خیرسگالی کے جذبے کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اب صورتحال کو امریکی اور برطانوی حکومتیں نئی سمت کی طرف لے جانا چاہتی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ دنیا پاکستان کی موجودگی کو ریاست میں تسلیم کرتے ہوئے ریاست میں اقوام متحدہ کی زیرِ نگرانی رائے شماری کے حل کو تسلیم کرے اور شیخ عبداللہ کی ریاستی حکومت کو ختم کیا جائے ہندوستانی فوج کو ہندو اکثریتی علاقہ جموں منتقل کیا جائے اور پاکستانی فوج کو جموں کے مغربی اور شمالی علاقوں سمیت کشمیر وادی میں تعینات کیا جائے۔ یہ تجاویز نول بیکر (Noel

Baker) نے نیو یارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سامنے رکھی تھیں۔ امریکی اور برطانوی آفیشلز (Officials) کو یہ خطرہ تھا کہ اگر ہندوستان پاکستان پر حملہ کرتا ہے تو پاکستان کا خاتمہ یقینی ہے۔ اگر پاکستان کا جنگ میں منظر سے غائب ہونا ہوتا ہے تو اس کے نتائج دوطرح کے ہوسکتے ہیں۔ ایک سرحدی صوبہ کے قبائلی پٹھان اور افغانستان کے کچھ قبائل اس جدوجہد کا حصہ بن جائیں گے اور سوویت یونین کے لیے بھی ممکن ہو جائے گا کہ وہ بھی اس عمل کا حصہ بن جائے اور مداخلت کرے۔ دوسرا اس کے اثرات مشرق وسطی پر بھی بہت زیاد ہوں گے۔ ایسے حالات میں برطانوی وزیر اعظم نے سیکرٹری کامن ویلتھ (Common wealth) نول بیکر (Noel Baker) کو نیو یارک میں یہ ہدایات بھیجی تھیں۔

۱۔ ہندوستان پر سیکیورٹی کونسل میں بحث کے ذریعہ دباؤ ڈالا جائے کہ وہ پاکستان پر حملہ کرنے سے باز رہے۔

۲۔ ہندوستان سیکیورٹی کونسل کی تجاویز کو قبول کرے اور قانونی پراسیز (Process) پر عمل کرے۔

۳۔ پاکستان کو یہ تاثر دینا بند کرے کہ برطانیہ پاکستان کے خلاف ہندوستان کا ساتھ دے رہا ہے۔ 10 جنوری 1948ء میں برطانوی وفد واشنگٹن میں امریکی انڈر سیکرٹری آف اسٹیٹ رابرٹ لاوٹ (Robert Lovert) سے ملا یہ دورکنی وفد نول بیکر (Noel Baker) اور لارڈ اسمے (Lord Ismay) پر مشتمل تھا۔

اس وفد نے امریکی اور برطانوی حکومتوں کی مشترکہ پالیسی اقوام متحدہ میں اپنانے کی تجاویز پیش کیں جو مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ پاکستان فوج کو شمالی علاقوں میں موجودگی کے لیے انہیں وہاں بھیجنا۔

۲۔ ہندوستانی افواج کو جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں میں بھیجنا۔

۳۔ وادی کشمیر پر ہندوستانی اور پاکستانی فوجوں کا مشترکہ قبضہ۔

۴۔ سرینگر میں اقوام متحدہ کا ایک کمیشن قائم کرنا اور اس کمیشن کا ملٹری کمانڈر کشمیر میں عارضی انتظامی حکومت کے فرائض سرانجام دے گا۔ شیخ عبداللہ کو نکال دیا جائے گا۔

برطانوی نمائندے نول بیکر نے امریکی انڈر سیکرٹری کو بتایا کہ اگر غیر جانب داری سے رائے شماری کرائی گئی تو کشمیر پاکستان کو مل جائے گا کیونکہ ریاست میں اکثریتی آبادی مسلم ہے۔ 1948ء میں اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں پاکستان کی حمایت اس لئے بڑھ گئی تھی کہ برطانیہ نے اس بنیاد پر لابنگ کر رکھی تھی کہ ریاست میں 77% آبادی مسلم ہے اور ریاست فطری طور پر پاکستان کے ساتھ جانی چاہیے۔ سابقہ نوآبادیاتی طاقت کو اقوام متحدہ میں مغربی ممالک نے زیادہ اہمیت دی تھی۔ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں ہندوستانی وفد کی رائے بھی پاکستان کے حق میں شامل کی گئی کیونکہ ہندوستانی وفد نے سیکیورٹی کونسل میں پاکستان کو براہِ راست حملہ آور اور جارح ہونے کا الزام نہیں لگایا تھا بلکہ قبائلی لٹیروں اور پاکستان فوج میں واضح فرق کرتے ہوئے صرف قبائلیوں کو ریاست پر حملے کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ ہندوستانی وفد کے سربراہ گوپالاسوامی آئینگر نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے رائے شماری سے مشروط ہے۔ اس بات کو ہندوستان کی طرف سے پاکستان کو ریاست میں حصہ دار سمجھنے کا اشارہ مانا گیا اور یہ کہا گیا کہ ہندوستان ریاست کے معاملہ پر پاکستان کے خدشات دور کرنے کے لیے تیار تھا۔ جبکہ پاکستانی وفد کے سربراہ سر ظفر اللہ خان نے سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان پر الزام لگایا کہ اس نے ریاست کا الحاق زبردستی اور تشدد سے حاصل کیا تھا۔ پاکستانی وفد کے سربراہ نے ہندوستان پر کئی مزید الزامات بھی لگائے جو دوسرے معاملات سے تعلق رکھتے تھے جبکہ ہندوستانی وفد کا رویہ معذرت خواہانہ تھا۔ شیخ عبداللہ جو ہندوستانی وفد کا حصہ تھا 28 جنوری 1948ء کو نیو یارک میں امریکی وفد سے ملاقات کرتا ہے اور اپنی طرف سے تجویز پیش کرتا ہے کہ کشمیر کو آزادی کا آپشن بھی دیا جائے وہ مزید کہتا ہے کہ کشمیر کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ ایک آزاد ملک بن جائے اور ترقی کے لیے امریکہ اور برطانیہ کی مدد حاصل کرے۔ لیکن امریکی وفد کے سربراہ مسٹر آسٹن (Austin) نے اس تجویز کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔

شیخ عبداللہ نے یہی تجویز دہلی میں تعینات امریکی سفیر امباراڈوف (Ambarradov) کے سامنے 21 جنوری 1948ء کو بھی رکھی تھی لیکن اس بار صرف

وادی کشمیر کا مشترکہ کنٹرول ہندوستان اور پاکستان کو دینے کی تجویز تھی۔ مشترکہ کنٹرول میں صرف دفاع اور خارجہ امور دونوں ملکوں کے حوالے کرنے کی تجویز دی گئی تھی، باقی تمام امور میں وادیٔ کشمیر کی ریاست اندرونی طور پر خود مختار ہوگی۔ جوسف کاربل (Josef Korbel) جو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا پاکستان کا ممبر تھا یہ بات اپنی کتاب (Danger in Kshmir) میں کنفرم کی ہے۔ جوسف کاربل نے لکھا ہے کہ جب جولائی 1948ء میں کمیشن نے سرینگر کا دورہ کیا تھا تو اس وقت شیخ عبداللہ نے ریاست کو تقسیم کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کے اراکین حیران تھے کہ یہ خیالات شیخ عبداللہ کے اپنے ہیں یا ہندوستان نے اپنی سوچ تبدیل کر لی اور یہ خیالات اسی تبدیل شدہ سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ شیخ عبداللہ کا خیال تھا کہ اگر ریاست پر ہندوستان اور پاکستان کی جنگ جاری رہی تو ریاست کے لوگوں کی مصیبت بھی جاری رہے گی۔

9 فروری 1948ء کو ہندوستانی وفد نے سیکیورٹی کونسل میں ریاست کے مسئلے پر بحث کو وقتی طور پر روک دینے کی درخواست کی اور یہ وفد واپس ہندوستان آ گیا۔ ہندوستانی وفد کے اس عمل سے یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ ہندوستان اقوام متحدہ سے صلح کرانے کی مدد لینے سے دستبردار ہونے جا رہا ہے۔ سیکیورٹی کونسل میں ہونے والی بحث اور اس کی سمت بدلنے کا جو طریقہ اپنایا گیا تھا اس نے ہندوستان میں غم وغصہ کی لہر پیدا کر دی تھی۔ ہندوستان سیکیورٹی کونسل میں پاکستان کے خلاف شکایت لے کر گیا تھا لیکن سیکیورٹی کونسل میں بحث مباحثہ میں ایسے لگ رہا تھا کہ ہندوستان خود مجرم تھا۔ 28 فروری 1948ء کو دہلی میں تعینات امریکی سفیر ہنری گریڈی (Henry Gradi) نے واشنگٹن یہ رپورٹ بھیجی تھی۔ اس نے کہا ''ہندوستانی وفد کے سربراہ گوپالاسوامی آئیگر نے کھلے عام برطانوی اور امریکی حکومت سمیت سیکیورٹی کونسل پر الزام لگایا ہے کہ ان کا جھکاؤ ایک طرف ہے'' اور نہرو نے بھی سیکیورٹی کونسل پر شدید الزامات لگائے ہیں جبکہ دوسری طرف کراچی کا ایک اخبار ڈان بار بار اس یقین کا اظہار کر رہا ہے کہ سیکیورٹی کونسل میں پاکستان کی کامیابی کی تنازعہ کشمیر کے حوالے سے زیادہ

گنجائش ہے جبکہ شیخ عبداللہ واحد لیڈر ہے جسے عوام پر سب سے زیادہ اعتماد حاصل ہے جو کسی بھی دوسرے کشمیری لیڈر میں نہیں ہے۔ ہندوستان میں سخت ردعمل کے نتیجہ میں امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ جارج مارشل (George Marshal) کو اس مسئلے پر زیادہ احتیاط سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جارج مارشل نے 29 فروری 1948ء کو وارن آسٹن (Warren Austin) جو امریکی وفد کی اقوام متحدہ میں نمائندگی کر رہا تھا کو اپنے پیغام میں لکھا تھا۔

اس نے لکھا کہ ہمیں شک ہے کہ ہندوستان برطانیہ کے موجودہ منصوبہ کو قبول کرے گا اور اس پر عمل درآمد کرے گا کیونکہ اس منصوبے میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ کشمیر کو غیر معینہ مدت کے لیے اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ میں دیا جائے۔ اس میں پاکستانی فوج کو کشمیر میں تعینات کرنے کی تجویز کو ہندوستان قبول نہیں کرے گا اور نہ ہی اقوام متحدہ کی طرف سے بنائی جانے والی عارضی حکومت کو قبول کرے گا جو موجودہ کشمیر حکومت کی جگہ لے گی۔ برطانیہ نے ہر اس حل کو اس منصوبے سے باہر نکال دیا جو کسی کمپرومائز کی طرف جاتا ہو اور جس میں دونوں فریق (ہندوستان پاکستان) تعاون کر سکیں۔ برطانیہ کا تیار کیا ہوا اقوام متحدہ کے لیے کشمیر پر ڈرافت جو ایک طرف عارضی حکومت جو سول اور ملٹری انتظامی امور چلائے گی اور پھر ایک پاپولر حکومت قائم کرنے کی بات کرنا جو رائے شماری کے بعد قائم ہوگی اور ان کو انتظام سونپا جائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہوگا کہ برطانیہ کی اس سکیم کو سیکیورٹی کونسل میں کم از کم جو 7 ووٹ ضروری ہیں حاصل ہو جائیں اور سویٹ یونین کے ویٹو کرنے کے امکانات بھی موجود ہیں جسے ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرا اس منصوبے میں جنگ روکنے کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے نہ کہ سمجھوتے پر زور دیا جائے جس طرح برطانوی منصوبے میں کہا گیا ہے"۔

اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں ریاست کے مسئلے پر برطانیہ اور امریکہ کی سوچ میں کافی فرق پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے برطانیہ کے ایک وفد کو واشنگٹن بھیجا گیا تھا تاکہ امریکی حکومت کے اہلکاروں سے مشورہ کیا جائے اور سیکیورٹی کونسل میں ایک ہی موقف اختیار کیا جائے۔ واشنگٹن میں کشمیر پر بات چیت کے دوران انگریز وفد کے اراکین نے امریکیوں سے کہا کہ جموں کشمیر ایک علاقہ ہے جس پر تنازعہ پیدا ہو گیا تھا۔ امریکی وفد کے سربراہ ڈین

روسک (Dean Rusk) نے برطانوی وفد کی بات کی درستگی کرتے ہوئے کہا تھا کہ جموں کشمیر ایک ریاست تھی جس کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ پیدا ہوگیا ہے۔ ڈین روسک (Dean Rusk) نے یہ بھی کہا کہ امریکہ کے لیے اس بات سے انکار کرنا مشکل ہوگا کہ ریاست کا قانونی الحاق ہندوستان سے ہو چکا ہے۔ امریکی اتنا کر سکتے ہیں کہ پاکستانی فوج کو بھی ریاست میں استعمال کرنا شامل کرا سکتے ہیں اگر جموں کشمیر کی حکومت اور ہندوستان پاکستان کی حکومتوں کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے۔ اس بات چیت کے بعد برطانوی وفد کے اراکین بھی شیخ عبداللہ کی حکومت جاری رکھنے پر جو اعتراض کرتے آئے تھے اب اس سے دستبردار ہو گئے تھے۔

جارج مارشل جو امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ تھا نے 4 مارچ 1948ء کو وارن آسٹن (Warren Austin) کو ایک ٹیلگرام پیغام بھیجا جو امریکی وفد کا اقوام متحدہ میں سربراہ تھا اس پیغام میں واضع کیا گیا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کی ریاست جموں وکشمیر کے مسئلے پر ایک دوسرے سے علیحدگی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس سے بچا جائے۔ جارج مارشل نے یہ بھی کہا کہ سیکیورٹی کونسل چیپٹر 6 کے تحت کوئی حل لاگو نہیں کر سکتی بلکہ وہ صرف دونوں فریقوں کے لیے سفارشات پیش کر سکتی ہے اور یہ سفارشات ہندوستان کی ریاست میں موجودہ قانونی حیثیت کی روشنی میں مرتب کی جانی چاہیں۔ ریاست کی تقسیم کی تجویز پر بات کرتے ہوئے مارشل نے کہا کہ ہمیں یقینا اس طرح کی چیزوں پر پہل نہیں کرنی چاہیے لیکن اس طرح کی تجاویز کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سمجھوتے کے لیے ضرور احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔ دوسری طرف لندن میں بھی برطانوی پالیسی پر دوبارہ غور وخوص کیا جا رہا تھا۔ 8 فروری 1948ء کو برطانوی وزیراعظم ایٹلی (Attlee) کو نہرو کا ایک پیغام ملا جس میں نہرو نے نول بیکر (Noel Baker) کی شکایت کی تھی کہ اس نے شیخ عبداللہ سے بات چیت میں اس حقیقت سے انکار کیا تھا کہ پاکستان نے قبائلی حملہ آوروں کی مدد کی تھی اور اس کو جھوٹ بتایا تھا۔ نہرو نے نول بیکر کے رویے اور بات چیت پر برطانوی وزیراعظم سے کہا کہ اس طرح کے رویے کی موجودگی میں ہندوستان اور برطانیہ کے دوستانہ تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔

ماؤنٹ بیٹن نے بھی ایک پیغام برطانوی وزیر اعظم کو بھیجا اور لکھا کہ یہاں ہندوستان میں ہر کوئی اس بات پر یقین کر چکا ہے کہ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں سارا کھیل سیاسی طاقت کا ہے اس کے انتظام اور رویئے میں کہیں بھی غیر جانبداری نہیں پائی جاتی۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان برطانوی کامن ویلتھ (Common Wealth) چھوڑ کر سوویت یونین کے ہاتھوں میں جاسکتا ہے۔ برطانوی وزیر اعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو فوراً جواب دیتے ہوئے کہا کہ سوویت یونین کا مقصد ہے کہ ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہونے دیا جائے اور پورے برصغیر میں انارکی اور انتشار پھیلا دیا جائے۔ اس وقت تک اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر بنیادی تجاویز اور اس کے حل کے لیے کئی منصوبے امریکہ اور برطانیہ کے درمیان زیر بحث لائے گئے تھے۔ سیکیورٹی کونسل میں ڈرافٹ بحث کے لیے پیش کیا گیا تھا وہ برطانیہ کے نمائندوں کا تیار کیا ہوا تھا۔ اس وقت تک یعنی 1948ء کے دور میں سوویت یونین نے جموں کشمیر کے مسئلے میں سیکیورٹی کونسل کی کاروائی میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ سٹالن نے ہندوستان میں آزادی کے بعد بھی کوئی ذرا بھر دلچسپی نہیں دکھائی تھی کیونکہ وہ ہندوستان کو ابھی تک انگریز کی ہدایت اور مرضی سے چلنے والا ملک ہی سمجھتا تھا۔ تب نہرو نے اپنی بہن وجے لکشمی پنڈت کو سوویت یونین میں ہندوستان کا سفیر بنا کر بھیجا تھا لیکن اسے ایک بار بھی سٹالن سے پبلک میں ملاقات کا موقع نہیں دیا گیا تھا جب تک وہ ماسکو میں رہی تھی۔ برطانوی حکومت اس بات پر پورا زور لگا رہی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کسی صورت بھی برٹش کامن ویلتھ سے الگ نہ ہوں اور امریکہ اور برطانیہ کی پالیسیوں کے پیچھے چلیں۔ اس لئے ماؤنٹ بیٹن جیسے لوگ ہندوستان کو اقوام متحدہ کے فورم پر برطانوی حکومت کی طرف سے جموں کشمیر کے مسئلے پر ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن یہ بھی چاہتا تھا کہ برطانیہ ہندوستان کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرے اور امریکہ کو ہندوستان سے اس معاملے میں دور رکھنا چاہیے۔ بہر حال مارچ 1948ء میں چین کی سیکیورٹی کونسل کی صدارت حاصل کرنے کی باری تھی۔ چین نے سیکیورٹی کونسل کی صدارت حاصل کرتے ہی 10 مارچ 1948ء کو ایک ڈرافٹ سیکیورٹی کونسل میں پیش کیا۔ یہ ڈرافٹ ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر مندرجہ ذیل

شفارشات پیش کرتا ہے۔

ا۔ حملہ آوروں کو ریاست سے نکالا جائے۔

۲۔ رائے شماری کرانے کے لیے حالات سازگار بنائے جائیں۔

۳۔ یہ یقین دہانی کرائی جائے کہ اقوام متحدہ کا (ایڈمنسٹریٹر) انتظامی امور کے سربراہ کو اقوام متحدہ کا جنرل سیکرٹری منتخب کرے اور وہ جموں کشمیر کی حکومت کا آفیسر بن کر کام کرے۔ عارضی حکومت جموں کشمیر میں مزید وسعت حاصل کرے تاکہ دوسرے سیاسی گروپوں کو بھی اس کا حصہ بنایا جائے۔

امریکہ نے چین کے تیار کیے ہوئے ڈرافٹ کی پہلی دو تجاویز تو قبول کرلیں لیکن اقوام متحدہ کے کمیشن کا مضبوط کنٹرول حاصل کرنے کی سفارش کی۔ جبکہ برطانوی وفد نے چین کے اس ڈرافٹ کی مخالفت کی اور انگریز وفد نے پاکستانی فوج کی ریاست جموں کشمیر میں تعیناتی پر اور شیخ عبداللہ حکومت کو نکالنے پر اپنی لابنگ جاری رکھی۔ سیکیورٹی کونسل کی قرارداد آخرکار 21 اپریل 1948ء کو منظور کرلی گئی تھی اور 5 پانچ رکنی کمیشن برائے انڈیا اور پاکستان (UNCIP) قائم کیا گیا تھا۔ (UNCIP) اور کمیشن کے لیے کہا گیا تھا کہ وہ فوراً برصغیر پاک وہند کی طرف کوچ کرے اور ہندوستان پاکستان کے درمیان سہولت کاری کرے جس طرح سیکیورٹی کونسل نے ہدایات اور شفارشات دی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ پاکستان اپنی ساری کوشش قبائلیوں اور دوسرے پاکستانی شہریوں کو جموں کشمیر سے نکالنے میں لگائے۔

۲۔ جب جنگ بندی کا اعلان ہو جائے گا تو ہندوستان اپنی فوجوں کو ریاست سے نکالے گا اور تعداد کم کرکے اس سطح تک لائے گا جو سول حکومت کی مدد کے لیے ضروری ہوگی تاکہ امن وامان قائم رکھ سکے۔

۳۔ امن وامان کے مقصد کے لیے اقوام متحدہ کا کمیشن پاکستانی فوجیوں کی خدمات بھی حاصل کرسکتا ہے لیکن اس کے لیے ہندوستان کی رضا مندی ضروری ہوگی۔ پاکستان نے کمیشن کے آخری نقطے میں فوراً ترمیم کرنے کی تجویز پیش کی اور کہا کہ

اقوام متحدہ کے ایڈمنسٹریٹر (Administrator) کو یہ صوابدیدی اختیار دیا جائے کہ ہندوستان یا پاکستان کی رضامندی کی شرط ختم کردی جائے۔ پاکستان کی اس تجویز کو 7 سات ووٹوں سے شکست ہوئی اور اس تجویز کے حق میں کوئی بھی ووٹ نہ ڈالا گیا جبکہ چار ملکوں نے ووٹ کا استعمال ہی نہ کیا۔ سیکیورٹی کونسل کے ان چار ممبر ممالک میں ارجنٹائن، شام، سویت یونین اور یوکرائن نے ووٹ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ 21 اپریل 1948ء کی قرارداد کو ہندوستان اور پاکستان دونوں نے قبول نہیں کیا تھا جبکہ کمیشن کے ممبران سے ملنے اور بات چیت کرنے پر دونوں ملکوں نے رضامندی ظاہر کی تھی۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کا وفد جولائی 1948ء کو انڈیا پاکستان کے دورے پر آیا۔

کراچی میں اقوام متحدہ کے کمیشن کے اراکین کو اچانک ایک دھماکہ خیز خبر دی گئی اور یہ خبر اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے سربراہ سر ظفر اللہ خان نے دی تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان کی تین بریگیڈ فوج ریاست جموں کشمیر کی سرزمین پر مئی 1948ء سے لڑ رہی ہیں۔ یہ اطلاع کراچی میں جوسف کاربل کو دی گئی تھی جو اس وقت اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا پاکستان کی صدارت کر رہا تھا۔ یہ کچھ وقت سے سب کو معلوم تھا کہ پاکستانی فوج ریاست جموں کشمیر میں ہونے والی لڑائی میں اور کاروائی میں حصہ لے رہی تھی لیکن اقوام متحدہ کے کمیشن کے اراکین اپنی کاروائی صلح کار کی حیثیت سے اسی صورت میں جاری رکھ سکتے تھے جب دونوں فریقین انہیں ریاست جموں کشمیر میں داخل ہونے کی اجازت دیں گے۔ جبکہ کراچی میں (UNCIP) کمیشن کے اراکین کو اچانک شک، غصے اور فرسٹریشن کا سامنا کرنا پڑا اور دہلی میں انہوں نے کنفیوژن، افراتفری کی حالت پائی تھی۔ دہلی میں جوسف کاربل کو متضاد خیالات جان کر مزید حیرت ہوئی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وزیراعظم نہرو نے کمیشن کو یہ بھی بتایا کہ ہندوستان اس چیز پر زور نہیں دے گا کہ ان کی فوج ان علاقوں پر آگے بڑھ کر قبضہ کرے گی جو پاکستانی فوج خالی کرے گی۔ ہندوستان کے وزیراعظم نے ریاست میں رائے شماری ہونے پر بھی شک ظاہر کیا تھا اور اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ اگر ریاست جموں کشمیر

کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو انڈیا اس کی مخالفت نہیں کرے گا۔
اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا اور پاکستان (UNCIP) نے اپنی سفارشات کو 13 اگست 1948ء کی قرارداد کی صورت میں حتمی شکل دی تھی۔ کمیشن (UNCIP) نے اپنی سفارشات کو دونوں کے لیے مندرجہ ذیل طریقے سے الگ الگ بیان کیا تھا۔

ا۔ دونوں ملک سفارشات کو قبول کرنے کے بعد چار دنوں میں جنگ بندی کا اعلان کریں۔

۲۔ پاکستانی فوج کا ریاست سے انخلاء کیا جائے کیونکہ پاکستانی فوج کی ریاست میں موجودگی مادی حقیقت کو بدل دیتی ہے۔ کیونکہ پاکستان نے سیکیورٹی کونسل میں اس معاملے کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی فوج کی ریاست میں موجودگی سے انکار کیا تھا۔ پاکستانی فوج کے انخلاء کا مطالبہ اس لیے نہیں کیا جا رہا تھا کہ پاکستان نے جارحیت کا ارتکاب کیا تھا بلکہ اس لیے کہ انہوں نے ریاست میں اپنی موجودگی کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔

۳۔ جو علاقے پاکستان خالی کرے گا ان کا انتظام مقامی ریاستی اتھارٹی اقوام متحدہ کے کمیشن کی زیر نگرانی چلائے گی۔

۴۔ ہندوستانی فوج کے ایک بڑے حصے کا ریاست سے انخلاء اس وقت شروع کیا جائے گا جب کمیشن ہندوستان کو اطلاع کریگا کہ پاکستانی شہری اور پاکستانی فوجی ریاست سے انخلاء کر چکے ہیں۔

۵۔ حتمی حل کے لیے شرائط قبول ہونے تک ہندوستان ان حدود تک محدود رہے گا جو حدود جنگ بندی کے وقت موجود تھیں۔ جبکہ گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کے علاقوں کا کنٹرول ہندوستان کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستان نے اس مسئلہ پر وضاحت مانگی تھی اور کمیشن (UNCIP) نے جواب دیا تھا کہ ہندوستان کا موقف نوٹ کر لیا گیا ہے لیکن اس کا حتمی فیصلہ کمیشن پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا حل نکالے لیکن ہندوستان نے بھی اس مسئلے کا مزید پیچھا نہیں کیا تھا۔

۶۔ آخر میں دونوں حکومتیں (انڈیا، پاکستان) اس سمجھوتے کو تسلیم کریں گی کہ ریاست

جموں کشمیر کے مستقبل کا حل ریاستی عوام کی مرضی سے کیا جائے گا۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا اور پاکستان (UNCIP) نے ان سفارشات میں ایک طرف تو دونوں ملکوں کو اپنی اپنی فوجیں ریاست سے نکالنے کی تجویز پیش کی اور دوسری طرف کسی حد تک ہندوستان کی قانونی حیثیت اور اقتدار کو ریاست میں تسلیم بھی کیا ہے۔اس میں جو تجویز شق نمبر 4 کے تحت پیش کی وہ ایک طرف دونوں فوجوں کے انخلاء کو برابر کرتی ہے تو دوسری طرف پاکستان کو اپنی ساری فوج نکالنے کا مطالبہ کرتی ہے اور ہندوستان کو فوج کا ایک بڑا حصہ نکالنے کی تجویز دیتی ہے جو کسی حد تک اس مسئلہ میں کنفیوژن بھی پیدا کرتی ہے۔جس طرح یہ بھی واضع نہیں کیا گیا کہ لوکل اتھارٹی کے طور پر آزاد کشمیر گورنمنٹ کی حیثیت کیا ہوگی۔گلگت بلتستان میں تو اس وقت کوئی معقول لوکل اتھارٹی موجود ہی نہیں تھی اور جو اتھارٹی بنائی گئی اس کی سربراہی تو ایک پاکستان شہری کے کنٹرول میں تھی جبکہ دوسری طرف ریاست کے ان علاقوں سے پاکستانی شہریوں کو نکالنے کا واضع طور پر کہا گیا تھا۔تاہم یہ تجاویز جہاں ہندوستان کے عدم اطمینان کا باعث بنی وہاں ہی یہ پاکستان کی شکست کا بھی باعث بنی تھیں۔پاکستان 1948ء کے شروع میں ہی یہ اطمینان اور امید کر بیٹھا تھا کہ اقوام متحدہ ریاست میں اس کی فوجوں کی موجودگی ضرور تسلیم کرے گی اور شیخ عبداللہ کو نکال دے گی۔اب جبکہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا اور پاکستان (UNCIP) نے تجویز کیا تھا کہ پاکستان اپنی فوج ریاست سے نکالے۔لیاقت علی خان نے یہ حالت دیکھی تو اس نے برطانیہ سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور اہم کارڈ کھیلتے ہوئے برطانیہ کو دفاعی معاہدے کی پیشکش کی تھی۔اس مقصد کے لیے پاکستان نے اپنے ڈپٹی کمانڈر انچیف جنرل والٹر کاتھران (Walter Cawthorm) کو برطانیہ میں خفیہ مشن کے لیے بھیجا تھا جو ستمبر 1948ء کو لندن گیا تھا۔پاکستانی فوج کا ڈپٹی کمانڈر انچیف آسٹریلیا کا پیدائشی باشندہ تھا۔برطانیہ کی طرف سیکرٹری کامن ویلتھ (Common Wealth) نول بیکر (Noel Baker) نے پاکستانی فوج کے ڈپٹی کمانڈر انچیف سے ملاقات کی۔دوران گفتگو پاکستانی فوج کے ڈپٹی کمانڈر نے نول بیکر (Noel Baker) کو بتایا کہ وہ پاکستان کی طرف سے برطانیہ کے

ساتھ مشترکہ دفاعی معاہدے کی غرض سے آیا تھا اور یہ دفاعی معاہدہ جتنا جلدی ممکن ہو سکے اتنا ہی اچھا ہوگا کیونکہ پاکستان اس وقت کمیونزم کے ایک بڑے خطرے سے دو چار ہے۔ اس نے مزید کہا کہ پاکستان سوویت یونین کی طرف سے کسی بھی جارحیت کی صورت میں مشترکہ دفاع میں اپنا بھرپور حصہ ڈالے گا۔ اس کے بعد پاکستانی فوج کا ڈپٹی کمانڈر برطانیہ کے وزیراعظم اٹیلی (Attlee) سے بھی ملا۔ برطانوی وزیراعظم نے اپنی فوجوں کے سربراہوں سے مشورہ کرنے کے بعد کامن ویلتھ (Common Wealth) آفس کو بتایا کہ وہ پاکستانی فوج کے ڈپٹی کمانڈر کو زبانی بتائیں کہ پاکستان کی طرف سے پیش کی جانے والی تجویز خوش آئند ہے اور برطانیہ اس تجویز کو خوش آمدید کہتا ہے لیکن برطانیہ نے پاکستان کی طرف سے اس دفاعی معاہدے کی پیشکش کو فوراً قبول نہیں کیا تھا جبکہ اس پیشکش کے بعد برطانیہ نے پاکستان کو فوجی اسلحہ سپلائی کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس بات سے بھی اتفاق کر لیا تھا کہ برطانیہ سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان غیر مشروط جنگ بندی کے لیے ہندوستان پر دباؤ ڈالے گا تا کہ ہندوستان کو جموں کشمیر میں مزید آگے بڑھنے سے روکا جائے۔

برطانیہ نے پاکستانی فوج کا ریاست سے انخلاء کے بارے میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا، پاکستان (UNCIP) کی تجویز سے ہٹ کر الگ راستے پر کام کرنے پر بھی رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ وہ ہندوستان پر جنگ بندی کے لیے براہِ راست دباؤ ڈالے گا۔ لیکن برطانیہ نے امریکہ کے بغیر پاکستان کے ساتھ فوجی معاہدہ کرنے سے گریز کیا تھا۔ اس سے پہلے 27 جنوری 1948ء میں امریکہ کی ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر ممکنہ پالیسی کا ذکر بیلجیئم کے دہلی میں تعینات سفیر نے نہرو سے کیا تھا جس میں اس نے نہرو سے کہا تھا کہ ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر امریکہ کی اپروچ اس کی گلوبل پالیسی کے اثر میں زیادہ ہوگی جو اس وقت امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان کشمکش جاری ہے نہ کہ اس مسئلے کی نیچر اور میرٹ پر اس کے حل کی بنیاد پر امریکہ فیصلہ کرے گا۔ اگر پاکستان نے امریکہ کی اس گلوبل سرد جنگ کی پالیسی میں امریکہ سے تعاون کیا تو امریکہ بھی کشمیر کے مسئلے پر پاکستان سے دوستانہ رویہ رکھے گا اور اس تنازعہ کے حل میں امریکہ

بھی ایسی ہی دوستانہ کوشش کرے گا۔ جبکہ ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا کہ امریکہ نے 1948ء کے اوائل میں پاکستان کو مغربی بلاک کے ساتھ باندھنے کا کوئی ارادہ ظاہر کیا ہو۔ بیلجیئم کے سفیر کی ان باتوں سے نہرو کافی متاثر ہوا اور دوسرے دن 28 جنوری 1948ء کو نہرو نے امریکہ کے سینئر وارڈن آسٹن پر غصہ نکالتے ہوئے کہا کہ ہندوستان بین الاقوامی تعلقات پر کافی تیزی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

فروری 1948ء میں بائیں بازو کے میگزین کے ایک ایڈیٹر کنگیز لے مارٹن (Kingsley Martin) نے دہلی کے دورے کے دوران ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا جو بیلجیئم کے سفیر نے بیان کیے تھے۔ امریکہ کے نظریات گلوبل حکمت عملی اور معاملات میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ وہ کیمونسٹ مخالف تھا جبکہ ہندوستان دونوں کے درمیان تھا۔ قدرتی طور پر امریکہ کا یہ خیال تھا کہ پاکستان کو ریاست جموں کشمیر کے مسئلے میں پسند کی شنوائی ملنی چاہیے۔ برطانوی حکومت کے کئی اہلکار پاکستان کو مشرقی وسطی کے حوالے سے بھی بہت اہم خیال کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ برطانوی کابینہ کے فارن سیکرٹری ارنسٹ بوین (Ernest Bevin) نے لیاقت علی کو 1948ء کے آخری دنوں میں کہا تھا کہ وہ عرب ملکوں سے رابطے میں رہے۔ برطانیہ کی حکمت عملی یہ بھی تھی کہ ایک طرف پاکستان کو برصغیر میں کمیونزم کے خلاف یا سوویت یونین کے اثر ورسوخ کے خلاف استعمال کیا جائے تو دوسری طرف مڈل ایسٹ میں کمیونزم کے خلاف فوجی حکمت عملی کے مطابق استعمال کیا جائے جو بعد میں بغداد پیکٹ کی صورت میں فوجی معاہدے میں شامل کر کے پاکستان کو سیٹو اور سینٹو کا بھی حصہ بنایا گیا تھا۔ یہ ساری حکمت عملی ابتداء میں برطانیہ کی ہی تیار کی ہوئی تھی۔ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ لے جانے سے ہندوستان کو ابتداء میں احساس ہو گیا تھا کہ امریکہ، برطانیہ اور ان کے مغربی اتحادی ممالک اس کے خلاف ہیں۔ امریکہ ایک وقت میں ہندوستان پر الزام لگانے میں سیکیورٹی کونسل میں اتنا دور نکل گیا کہ اس نے ہندوستان کو حیدرآباد دکن کی ریاست میں بھی اپنی فوجی طاقت کے استعمال کو ناجائز قرار دیا تھا۔ ہندوستان امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کے

ہندوستان مخالف رویے پر ناخوش تھا۔ ہندوستان نے امریکہ اور اس کے اتحادی ملکوں پر الزام لگایا کہ وہ سیکیورٹی کونسل میں ناجائز طور پر پاکستان کی حمایت کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہندوستان میں ان کے خلاف شدید ناراضگی پیدا ہوگئی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی ریاست جموں کشمیر کے مسئلے میں دلچسپی اس لیے بہت زیادہ تھی کہ ریاست کی سرحدیں سوویت یونین سے ملتی تھیں اور امریکہ ریاست کے شمالی علاقوں میں اپنے فوجی اڈے قائم کر پائے گا۔ اگر ریاست کا کنٹرول ہندوستان کے پاس رہتا ہے تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔

یہ زمانہ سوویت یونین میں سٹالن کا دور حکومت تھا اور سٹالن نے ریاست کے مسئلے پر غیر جانبدارانہ رویہ رکھا اور سیکیورٹی کونسل میں بھی مسئلہ جموں کشمیر کی کاروائی میں سوویت یونین کی شروع میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سٹالن ریاست کو ملٹری سٹریٹجی کے لیے اہم علاقہ تصور کرتا تھا اور انڈین برصغیر میں کمیونزم کے داخلے کے لیے راستہ بھی ریاست جموں کشمیر کو سمجھتا تھا۔ جب بیلجیئم کی پیش کی گئی ڈرافٹ کی قرارداد پر بحث کا وقت آیا تو سوویت یونین کے نمائندے نے سیکیورٹی کونسل میں معمولی سی تقریر کی اور سیکیورٹی کونسل پر زور دیا کہ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر جلد از جلد قرارداد منظور کر کے اس مسئلہ کی اصلیت کو ڈیل کیا جائے جب ڈرافٹ کی گئی قرارداد ووٹ کے لیے پیش کی گئی تو سوویت یونین یوکرائن نے ووٹ استعمال کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ جب 22 جنوری 1948ء میں ریاست کے سوال کو ہندوستان اور پاکستان کے سوال سے بدل دیا گیا تو ہندوستانی نمائندے گوپالا سوامی آئینگر نے اس تبدیلی پر شدید احتجاج کیا تھا۔ اس تبدیلی پر سوویت یونین کے نمائندے نے کونسل کے صدر کے اس حق کو چیلنج کیا اور سیکرٹریٹ کو بھی کہا کہ ایجنڈے پر موجود کسی آئٹم کو سیکیورٹی کونسل کے فیصلے کی ضرورت کے بغیر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب اس پر ووٹ دینے کا وقت آیا تو سوویت یونین کے نمائندے نے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی۔ ریاست جموں کشمیر کا سوال 6 ماہ سے زیادہ سیکیورٹی کونسل کی کاروائی پر چھایا رہا۔ اس پورے عرصے میں سوویت یونین کا نمائندہ ایک بار بھی ریاست کے تنازعہ پر نہیں بولا اور اس کا رویہ بحث کے دوران ہمیشہ عدم دلچسپی والے تماشائی کی طرح ہی رہا تھا۔ اس زمانے میں سٹالن کا موڈ کافی

جارحانہ تھا کیونکہ وہ بہت زیادہ اپنے آپ کو طاقت ور خیال کرنے لگا تھا اور اپنی طاقت اور حثیت سے آگاہ تھا۔ سٹالن اپنی طاقت قائم کرنے کے لیے ریاست جموں کشمیر میں بھی سوویت طرز کے نظام کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سٹالن کو اپنے زیر نگین ایک علاقہ چاہیے تھا۔ سٹالن ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان کے انقلاب کے لیے اسی طرح استعمال کرنا چاہتا تھا جس طرح ماسکو نے شمالی چین میں ینین (Yenan) کو چینی قومی تحریک کے لیے استعمال کیا تھا۔

ہندوستانی برصغیر سٹالن کے لیے وہی کشش رکھتا تھا جو زار روس کے لیے اس جگہ کی جغرافیائی اہمیت تھی۔ ہندوستان کی دنیا میں سوویت کمیونزم کے لیے بہت اہمیت تھی۔ 1924ء میں سٹالن کا خیال تھا کہ ہندوستان دنیا میں دوسرا ملک ہوگا جو سوویت انقلاب کے راستے پر چلتے ہوئے برصغیر ہند میں انقلاب کی مثال کو دلچسپی سے واقعات کے تسلسل میں جاری رکھے گا۔ لیکن ٹھیک 16 سال بعد اسی سٹالن نے 1940ء میں نازی جرمنی کی تجویز پر ہندوستان کا بٹوارہ قبول کر لیا تھا۔ ہٹلر اور سٹالن کے درمیان ہندوستان کے بٹوارے پر سمجھوتہ ہونے کے باوجود اس پر عمل درآمد نہیں ہوا تھا بلکہ ہٹلر نے اپنے ایک نہایت ہی خفیہ حکم کے تحت جرمن فوجوں کو تیار رہنے اور ایک تیز فوجی مہم میں روس کو مثل ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ 1940ء میں سوویت یونین نے ریاست کو انگریز سے آزاد کرانے کو جائز قرار دیا تھا اور اس ریاست کی آزادی کی حمایت کرتے ہوئے 1947ء میں ہندوستان کا جو نقشہ سوویت یونین نے شائع کیا تھا اس میں ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان سے الگ ملک دکھایا گیا تھا۔ ریاست جموں کشمیر کی سرحدیں سوویت یونین کے کنٹرول والے سنگیانگ اور سنٹرل ایشیاء کی سوویت ریپبلکس کے ساتھ ملتی ہیں اور یہ سوویت یونین کی پہنچ میں بڑی آسانی سے آسکتی تھیں کیونکہ یہ کسی بھی بڑے حملے سے دفاع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس لیے سٹالن کا خیال تھا کہ وہ ہندوستان کے خلاف سخت جارحانہ پالیسی اختیار کرے گا تا کہ نئی دہلی کا اثر ورسوخ ریاست میں کمزور کیا جائے اور ہندوستانی کمیونسٹوں کی حوصلہ افزائی کرے گا کہ وہ سوویت نظام کو ریاست میں عملی جامہ پہنائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی کمیونسٹ 1946ء سے ہی ریاست

میں متحرک ہو چکے تھے اور نیشنل کانفرنس میں داخل ہو چکے تھے وہ مزور یونینز سمیت آزاد اور خود مختار ریاست جموں کشمیر کی حمایت کرتے تھے۔ اس تناظر میں سوویت یونین نے ہندوستان پر زبانی حملے شروع کرر کھے تھے۔ ہندوستان کی کشمیر پالیسی کے حوالے سے سوویت یونین کے تبصرہ نگار ایک کے بعد دوسرا ہندوستان کو سامراج کا طفیلی قرار دیتے تھے اور الزام لگاتے تھے کہ دہلی کی سرکار نے جان بوجھ کر سوویت مخالف پالیسی اختیار کرر کھی تھی۔ سٹالن نے ہندوستانی حکومت کو ریاست میں معاشی اور سیاسی صورتحال کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔

سوویت یونین نے انڈین نیشنل کانگریس کی لیڈرشپ کو رجعت پسند قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ سارے متحد ہو کر ریاست جموں کشمیر کے عوام کی آزادی کی جدوجہد کی مخالفت کرر ہے ہیں جس کی قیادت نیشنل کانفرنس کرر ہی تھی اور شیخ عبداللہ حکومت کی زمینی اصلاحات کو روکنا چاہتے تھے۔ سوویت تبصرہ نگاروں نے ہندوستانی فوج کو ریاست میں قابض فوج قرار دیتے ہوئے اس کی شدید مذمت کی اور کہا کہ اس قابض فوجی حکومت کیوجہ سے ریاستی عوام کی معاشی حالت درگوں ہو چکی تھی۔ یہ ہندوستان کی رجعت پسند قوتوں کے مفادات میں ہے کہ ریاست جموں وکشمیر ہندوستانی فوج کے قبضے میں رہے۔ ہندوستان کو قابض اور جارح قرار دیتے ہوئے سٹالن کو یہ یقین تھا کہ ریاست جموں کشمیر کے عوام اس کا انتظار کرر ہے تھے کہ وہ انہیں آ کر آزاد کرائے اور سوویت یونین کے تبصرہ نگاروں کو یہ معلوم ہوا تھا کہ ریاستی عوام میں سوویت یونین کے لیے بہت ہمدردی کے جذبات پائے جاتے تھے اور نیشنل کانفرنس کا سرخ جھنڈا تو سوویت یونین میں بہت سی امیدیں پیدا کر چکا تھا جو ماسکو میں ریاست کے مستقبل کے حوالے سے پیدا ہوئیں تھیں۔ سوویت یونین والوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سرینگر کے بڑے چوک کا نام بھی ریڈ سکوائر ہے جس کی ماسکو کے ساتھ کئی طرح سے مشابہت تھی۔

سوویت یونین کے لیڈرز یہ امید اور توقع رکھتے تھے کہ ریاست جموں کشمیر سوویت یونین کی مثال کو اپنا راستہ بنائے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سوویت یونین کی طرف سے ہندوستان کی کشمیر پالیسی پر شدید حملہ اس لیے کیا گیا تھا کہ سوویت یونین والے ریاست میں کمیونسٹوں کے اثر ورسوخ کو مضبوط کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ ہندوستانی

ریاست کی پوزیشن کو ریاست میں کمزور کیا جائے اور ہندوستانی کمیونسٹوں کی پوزیشن کو مضبوط کیا جائے تاکہ وہ ریاست پر اپنا کنٹرول حاصل کرسکیں۔ ہندوستانی فوج کی موجودگی کیمونسٹوں کی پوزیشن کو اس اہم حکمت عملی کی جگہ واضع چیلنج تھا۔ ایسی صورتحال میں شیخ عبداللہ کی حکومت کو مجبور کیا جاسکتا تھا کہ وہ ہندوستان کی رجعت پسند قوتوں کے مفادات کے لیے کام کرے اور ہندوستانی رجعت پسند شیخ عبداللہ کی حکومت پر اپنا کنٹرول حاصل کرسکتے ہیں حالانکہ یہ حکومت جمہوری حکومت تھی۔ اب ریاست کے عوام کو دو طرح کے دُشمنوں کا سامنا تھا ایک طرف وہ قوتیں ہیں جو ریاست میں مداخلت کرچکی ہیں اور ریاست کے علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کرچکی ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کی رجعت پسند اور بنیاد پرست قوتیں ہیں۔ یہ سوویت یونین کی ریاست جموں کشمیر اور ہندوستان اور پاکستان کے بارے میں ابتدائی پالیسی تھی۔ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سوویت یونین کے لیے ریاست کی اہمیت کتنی زیادہ اہم تھی اور دوسری طرف برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے سوویت یونین کی اس خطے میں مداخلت روکنا کتنا اہم مشن تھا۔

سوویت یونین ایک طرف کمیونسٹوں کو کشمیر کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے اپنی مہم تیز کرچکا تھا تو دوسری طرف اندرون ریاست شیخ عبداللہ حکومت کی زمینی اصلاحات کے پروگرام کی مکمل حمایت کرچکا تھا اور شیخ کی عوامی حکومت قائم کرنے کی تجویز کی بھی حمایت کرچکا تھا۔ سوویت یونین کی واضع پالیسی یہ تھی کہ نیشنل کانفرنس ریاستی عوام کی خواہشات کی نمائندگی کرتی تھی۔ سوویت یونین نے یہ واضع پالیسی اختیار کرلی تھی ریاست کشمیر ایک الگ قوم کی نمائندگی کرتی تھی اور ریاست کی قومی تحریک کا مقصد آزادی اور حق خود ارادیت کا حصول تھا۔ سوویت یونین نے واضع کیا تھا کہ وہ ریاست کو ایک آزاد ملک کے طور پر ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ سوویت یونین نے کیمونسٹوں کی نیشنل کانفرنس سے تعاون کی پالیسی کی حمایت کی تھی اور انہیں پورا یقین تھا کہ ریاست کیمونسٹوں کی مدد سے ایک پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں آگرے گی۔ ہندوستانی کیمونسٹوں نے ماسکو کی اس نصیحت کو بڑی تابعداری سے جاری رکھا اور کہا کہ حکمران طبقے کی جس حصے کی نمائندگی نہرو کررہا تھا وہ سرمایہ دار طبقہ اور زمیندار طبقہ ہے۔ یہ طبقہ ریاست جموں

کشمیر کی دولت سے مالا مال علاقوں کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر ان کا استحصال کرنا چاہتا تھا۔ کیمونسٹوں نے ہندوستانی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ریاست کی جبراً فوجی تقسیم ختم کرے اور ریاستی عوام کو آزادانہ اور متحد ہو کر اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دے۔

ہندوستانی کمیونسٹوں نے ریاست جموں کشمیر کی مکمل آزادی کی تحریک کی مکمل حمایت کا اعلان بھی کیا تھا۔ ہندوستان کے کیمونسٹ اس وقت یہ خیال کرتے تھے کہ ریاست جموں کشمیر، سوویت یونین اور چین کے دروازے پر ہے اور پورے ہندوستان کے کیمونسٹ انقلاب کے لیے دروازہ بن جائے گا۔ جوسف کاربل (Josef Karbal) جو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان پاکستان (UNCIP) کی صدارت بھی کر چکا تھا نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ کیمونسٹ ریاست جموں کشمیر کو ایک نیم آزاد ملک بنانا چاہتے تھے تاکہ اس کو پورے ہندوستان کے انقلاب کے لیے ایک موقع بنا کر کام کیا جائے۔ بہر حال سٹالن کی یہ مہم بری طرح ناکام ہوئی اور کوئی ایسا نتیجہ پیدا نہ کر سکی جو ماسکو کو فائدہ دیتی۔ ریاست کے لوگ ہندوستانی ریاست کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور کیمونسٹوں کو عوامی حکومت قائم کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ شیخ عبداللہ نے جموں کشمیر کو الگ ملک بنانے کے خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ سوویت یونین کی ریاست کے بارے میں نہ صرف پالیسی بری طرح ناکام ہوئی بلکہ امریکہ پاکستان کو اس بات پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ ریاست کے شمالی علاقوں میں امریکہ کو فوجی اڈے قائم کرنے کی اجازت دے گا۔ سٹالن کے ریاست جموں کشمیر میں اپنے قدم جمانے کے خواب تو پورے نہ ہوئے الٹا سوویت یونین کے لیے خطرات کا ایک نیا دور اس خطے میں شروع ہو گیا تھا۔ اب سوویت یونین نے نیا پینترا بدلہ اور برطانیہ اور امریکہ پر الزامات لگاتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں نے کئی منصوبے بنائے تھے کہ ریاست جموں کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ضم کیا جائے۔ اس سے وہ اپنے جنگی اڈے گلگت میں سوویت یونین کے خلاف قائم کر سکیں اور تفصیل سے تصاویر بھی شائع کیں جن میں برطانیہ اور امریکہ کی کشمیر پر پاکستانی حملے کی حمایت دکھائی گئی تھی۔

سوویت یونین نے کھلم کھلا یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ ریاست میں جنگ امریکہ،

برطانیہ اور ان کے اتحادیوں کے منصوبے کا حصہ تھا جس میں شمالی اور مغربی ریاستی حصوں کو امریکہ اور برطانیہ کے فوجی اڈوں میں بدلنا تھا اور سوویت یونین کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ سوویت یونین نے یہ بھی کہا کہ برطانوی ایجنٹوں نے ریاست پر 1947ء کے حملے کو مدد فراہم کی اور پاکستان کو جنگ میں حصہ لینے کے لیے پوری حوصلہ افزائی کی تھی۔گلگت سکاؤٹس کا انگریز کمانڈر مقامی عناصر سے مل کر اس علاقے کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے مکمل تعاون کر رہا تھا۔2 نومبر 1947ء میں پاکستانی فوج نے انگریز کی مدد سے ہنزہ، نگر، چترال اور دیر کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کیا تھا۔سوویت یونین نے شمال مغربی سرحدی صوبے کے انگریز گورنر پر الزام لگایا تھا کہ اس نے قبائلی پٹھانوں کو ریاست جموں کشمیر پر قبضہ کرنے اور لوٹ مار کرنے پر اکسایا تھا اور پاکستانی حکومت نے ان قبائلیوں کو ہر طرح کی سہولت مہیا کی تھی۔ ریاست کے اندر پہنچانے کے لیے بسیں اور ٹرک مہیا کیے تھے اور یہ انگریز ریاست کے شمالی اور مغربی علاقوں پر پاکستان کا قبضہ کروا کر یہاں فوجی اڈے قائم کرنا چاہتا تھا اور برطانوی خفیہ ایجنٹوں نے ہی پٹھانوں کو لوٹ مار کی لالچ دے کر ریاست میں بھیجا تھا۔ یہ الزامات اس وقت کی سوویت حکومت نے ہندوستان کی برطانوی حکومت پر لگائے تھے اور امریکی ارادوں کو آشکار کیا تھا جب اپریل 1948ء میں پاکستان نے سوویت یونین سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور دونوں کے درمیان سفیروں کے تبادلہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو ماسکو نے فوراً بدلے میں نئے سرے سے تعلقات قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پاکستان کی اس تجویز نے سٹالن کو حوصلہ دیا تھا کہ پاکستان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے سے سٹالن میں امید پیدا ہوئی تھی کہ وہ امریکہ کو ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقوں میں فوجی اڈے قائم کرنے سے روک دے گا۔

دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہونے پر سوویت یونین اور پاکستان میں خوشی کا اظہار کیا گیا تھا۔ پاکستان کو یقین تھا کہ اس نے سٹالن کا دل جیت لیا تھا اور ہندوستان کے خلاف اس کی نا ختم ہونے والی محاذ آرائی میں طاقتور اور عقل مند استاد کو بھی ساتھ ملا لیا تھا۔سٹالن کو بھی یہ لگا تھا کہ اس نے امریکہ کو پاکستان کو اپنے کیمپ میں لانے سے روک

دیا تھا سٹالن نے پاکستان سے ہمدردی جتاتے ہوئے پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ماسکو کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔لیکن ماسکو اور پاکستان کے درمیان گرم جوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ جب مئی 1948ء میں ماسکو نے اسرائیل کو یہودی ریاست تسلیم کر لیا تھا تو ہزاروں پاکستانیوں نے سوویت یونین کے خلاف مظاہرے کیے تھے۔اس کے بدلے میں ماسکو نے انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس کی مذمت کی تھی جو اسی سال کراچی میں منعقد کی گئی تھی پاکستان اب بظاہر امریکن امداد ملنے کی وجہ سے تیزی سے امریکہ کی طرف مائل ہونا شروع ہو گیا تھا اور 1949ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان امریکہ کے دورے پر چلا گیا تھا جس پر سٹالن کو بہت حیرانگی ہوئی تھی۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کا امریکی دورہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی ثابت ہوا تھا۔ پاکستان کو امریکہ سے قریبی تعلقات قائم کرنے میں اس وقت خوشی محسوس ہوئی جب پہلی امریکی امداد کراچی پہنچی تھی۔

اب امریکہ کی ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر اقوام متحدہ میں پالیسی پاکستان کے حق میں ہوگئی جبکہ سوویت یونین کی پالیسی غیر جانبدارانہ تھی۔ پاکستان اور امریکہ کے نئے تعلقات نے سٹالن کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا اور ماسکو کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ان خبروں کے سامنے آنے سے کہ گلگت میں ایئر فیلڈ قائم کرنے کے لیے پاکستان سے امریکہ مذاکرات کر رہا تھا پر سوویت یونین کا رویہ سخت ہو گیا تھا لیکن ماسکو ابھی پاکستان کی مذمت کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔سوویت پریس میں امریکہ کے خلاف تبصرے ہو رہے تھے اور اس منصوبے کی شدید مذمت کی جارہی تھی کہ امریکہ سوویت سرحدوں کے قریب اپنے فوجی اڈے قائم کر رہا تھا۔امریکہ پر سوویت تبصرہ نگار یہ رپورٹیں دے رہے تھے کہ اس نے پاکستان کو پیسے اور اسلحہ کی پر کشش پیشکش کی تھی تا کہ پاکستان امریکہ کو ہوائی اڈہ (Airport) گلگت میں قائم کرنے کی اجازت دے۔امریکی پاکستانی حکومت کو لالچ دے کر امریکہ کے اس طرح کے جارحانہ منصوبے قبول کرنے کی طرف مائل کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔اب سوویت پالیسی یہ تھی کہ وہ امریکہ کی جنوبی ایشیاء میں جارحانہ فوجی پالیسی پر شدید تنقید کرتے تھے اس حکمت عملی کی بھی مذمت کرتے تھے کہ امریکہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ پر تضادات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور کشمیر کو امریکہ اپنے فوجی اڈوں کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔

اس مقصد کے لیے امریکہ نے پاکستان کو زبردستی اپنی جارحانہ پالیسی کے ساتھ جوڑا ہوا تھا ریاست جموں کشمیر کی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے امریکہ واقعی ریاست کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے سوویت یونین بھی امریکہ کو ریاست میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنے سے ہر حالت میں روکنا چاہتا تھا اب ریاست کا مسئلہ اقوام متحدہ میں بھی بڑی طاقتوں کے درمیان کشمکش کا ذریعہ بننے جا رہا تھا کسی حد تک پہلے سے ہی برطانیہ اور امریکہ نے اقوام متحدہ سے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اب سوویت یونین کے لیے بھی اقوام متحدہ میں غیر جانبدار رہنا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ امریکہ ریاست کے مسئلے میں سوویت یونین کے خلاف ریاست میں فوجی اڈے قائم کرنے کے لیے ملوث ہوا تھا اور اڈے ریاست میں سوویت یونین کے خلاف قائم ہونے جا رہے تھے۔ ریاست کے ان علاقوں میں جو سوویت یونین کی سرحدوں کے قریب تھے اس لیے اب ریاست کا مسئلہ نہ صرف اقوام متحدہ بلکہ جنوبی ایشیاء میں بھی دو بڑے متحارب دنیا کے گروپوں کے درمیان قربان گاہ بننے والا تھا جو پہلے سے ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کے پاؤں تلے کچلا جا چکا تھا۔ امریکہ کی پوری کوشش تھی کہ ریاست جموں کشمیر کے کچھ حصوں پر اس کا کنٹرول قائم ہو جائے اور امریکہ بار بار اپنے ہوائی جہازوں کو ریاست کے اوپر سے بغیر کسی روک ٹوک کے گزار رہا تھا تا کہ وہ شمالی علاقوں میں فوجی اڈوں کے لیے زمین ہموار کر سکے۔ ماسکو کی اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں غیر جانبدارانہ رویے نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے اقوام متحدہ میں اپنی مرضی اور اپنے اثر ورسوخ میں لیے گئے نمائندے لینے کی راہ ہموار کی تھی۔ سوویت یونین امریکہ کی پالیسی جو کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ میں اپنائی گئی تھی اپنی ویٹو کی طاقت سے اسے شکست دے کر امریکہ کو سیکیورٹی کونسل میں من مانی کرنے سے روک سکتا تھا۔ لیکن سٹالن کا ابتدائی رویہ کشمیر کے بارے میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ سٹالن امریکہ کی جنوبی ایشیاء کی پالیسی کو سمجھنے میں ناکامی اور نا اہلیت کا شکار ہوا تھا۔ ایک بار پھر

اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل نے کشمیر کے مسئلے پر 1951ء میں بحث شروع کی تو سوویت نمائندے نے اس وقت بھی چند الفاظ ہی ادا کیے کیونکہ سوویت یونین صرف امریکہ کو دیکھ رہا تھا کہ وہ ریاست کے شمالی علاقوں میں سوویت یونین کے خلاف کیا فوجی حکمت عملی ترتیب دے رہا تھا اور پاکستان کب امریکہ کو ریاست کے شمالی علاقوں میں فوجی اڈے بنانے کی اجازت دیتا ہے سوویت یونین شاید صرف امریکہ کی کشمیر پالیسی کو فوکس کرنے کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور نہ ریاست کے مسئلے سے اسے کوئی غرض تھی یہ پالیسی سوویت یونین کی 1 195ء کے آخر تک برقرار رہی تھی۔

نومبر 1951ء میں سیکیورٹی کونسل ایک بار پھر ریاست جموں کشمیر کے تنازعے پر بحث کرنے کے لیے اکٹھی ہوئی جس میں ڈاکٹر فرینک گراہم (Dr. Frank Graham) کی پیش کی گئی رپورٹ پر بحث ہوئی تھی۔ اس اجلاس میں امریکہ اور برطانیہ نے ایک مشترکہ قرارداد پیش کی تھی کہ جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی ریاست کا حتمی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی اور یہ کام اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ایک غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعہ کیا جائے گا۔ اب یہ خبریں آنا شروع ہوگئی تھیں کہ اس پر ہندوستانی نمائندے نے قرارداد پر تنقید کی تھی لیکن سوویت نمائندے نے اس بحث میں حصہ لینے سے گریز کیا تھا اور ووٹ میں بھی حصہ نہیں لیا تھا۔ امریکہ نے آخر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گلگت میں ہوائی فیلڈ ((Airfield)) بنانے کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ بھی ہو چکا تھا جس کے تحت گلگت میں ایئر فیلڈ (Airfield) کی تعمیر جلد شروع ہوگی۔ پاکستانی وزیر اعظم نے یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان مقررہ وقت کے اندر امریکہ کے لیے ایئر فیلڈ کی تعمیر کر دے گا اور امریکہ نے پاکستان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کشمیر کے مسئلہ پر اس کی پوری حمایت کرے گا۔ امریکہ کے 50 جنگی ماہرین گلگت میں پہنچ گئے تھے۔ یہ اطلاع بھی سوویت یونین کی طرف سے دی گئی تھی۔ اب سوویت یونین کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی سالمیت کو امریکہ سے خطرات لاحق ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆

ساتواں باب

سوویت یونین اور مسئلہ جموں کشمیر

اب سوویت یونین کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ امریکہ کو ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقوں میں اس کے خلاف فوجی اڈے قائم کرنے سے روکے۔ اب سوویت یونین کے لیے امریکی فضائی حملہ پہلی بار ایک حقیقت بن چکا تھا۔ جب سے اکتوبر 1947ء سے ریاست جموں کشمیر کا بحران شروع ہوا تھا اور اب سوویت یونین کے لیے ریاست کے مسئلے پر اقوام متحدہ میں غیر متحرک کردار ادا کرنا ممکن نہیں رہا تھا لیکن ماسکو کے لیے اب بھی ہندوستان کی حمایت کرنا مشکل تھا کیونکہ سٹالن دہلی کو اب بھی امریکہ اور برطانیہ کا تابعدار سمجھتا تھا ایسی صورتحال میں سیکیورٹی کونسل کا ایک اور اجلاس دسمبر 1951ء میں ایک بار پھر ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر فرینک گراہم کی ریاست جموں کشمیر پر دوسری رپورٹ پر بحث ہونے والی تھی اس اجلاس میں سوویت یونین نے ریاست کے مسئلہ پر اپنا پرانا کردار ختم کر دیا تھا اور اس اجلاس میں سوویت نمائندے جیکب ملک (Jocob) نے امریکہ اور برطانیہ پر شدید حملہ کرتے ہوئے دونوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ بار بار ریاست جموں کشمیر کے اندرونی معاملات میں اپنے گھناؤنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مداخلت کرتے ہیں جیکب ملک نے الزام لگایا تھا کہ ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ پر اقوام متحدہ میں ساری قرار دیں اور صلح کاری کی تمام کوششیں امریکہ اور برطانیہ کی مرضی اور کنٹرول میں کی گئی جو ان کے مفادات کی نمائندگی کرتی تھیں اور

یہی وجہ ہے کہ دونوں ملکوں نے ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کو جان بوجھ کر ابتداء سے حل نہیں ہونے دیا تھا کیوں کہ ان دونوں ملکوں کی قبضہ گیری کی پالیسی تھی جو ان کی گلوبل پالیسی اور حِکمت عملی کا حصہ تھا جو سوویت یونین کے خلاف جنگ کا حصہ تھا۔ سوویت نمائندے جیکب ملک نے ڈاکٹر فرینک گراہم کو امریکہ کا ایجنٹ قرار دیا اور اسے اقوام متحدہ کا نمائندہ ہونے کی بجائے امریکہ کا نمائندہ کہا جائے تو اچھا ہوگا۔ جیکب ملک نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ اب تک ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ امریکہ برطانیہ کی طرف سے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے جتنے بھی منصوبے پیش کیے گئے ہیں وہ سارے ناکام کیوں ہوئے تھے؟ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ یہ سارے منصوبے سامراج کے مفادات کے مطابق بنائے گئے تھے ان میں ریاست کے مسئلے کے حقیقی حل کے لیے ابھی تک کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ سوویت یونین نے ابھی تک اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں پاکستان کے حملے کی مذمت نہیں کی تھی لیکن جیکب ملک کی سیکیورٹی کونسل میں ہونے والی تقریر سے سوویت رویے میں کشمیر ایشو پر تبدیلی کے واضع اشارے موجود تھے۔

1952ء سے 1953ء تک یعنی 1952ء کے سال سے لے کر سٹالن کی وفات تک جو مارچ 1953ء میں ہوئی تھی سوویت یونین نے کشمیر کے بارے میں اپنی پالیسی میں بہت اہم تبدیلیاں لائیں تھیں۔ 1952ء کے آخر میں سٹالن نے انڈیا کے بارے میں سوویت پالیسی میں تبدیلی لانا شروع کردی تھی۔ کیونکہ اب بین الاقوامی سطح پر اہم تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ بے شمار سامراج دُشمن آزادی کی تحریکیں بھی ابھریں تھیں۔ اب ان تبدیلیوں کی روشنی میں سرد جنگ کے تقاضوں کے مطابق ہی سٹالن نئی پالیسی بنانے کی کوشش کررہا تھا گو کہ سرد جنگ کا آغاز 1947ء سے ہوگیا تھا لیکن اس دوران تیسری دنیا کے تنازعات میں امریکی بلاک اور سوویت بلاک کی کشمکش بڑھتی جارہی تھی۔ دونوں بلاک تیسری دنیا میں اپنے اپنے پراکسی ملکوں کی حمایت اور مخالفت میں محاذ آرائی کرتے نظر آتے تھے۔ اس لیے سٹالن اور اس کے مشیروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ انڈیا کے بارے میں ماسکو کو اب نئی پالیسی تیار کرنا ہوگی۔ اکتوبر 1952ء میں کیمونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی 19 ویں

کانگریس منعقد کی گئی تھی جس میں بین الاقوامی صورتحال پر رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ماسکو ان ملکوں کی غیر جانبدارانہ حیثیت کو تسلیم کرے گا جو امریکہ کے اثر ورسوخ سے اپنے آپ کو الگ کرلیں گے اور آزادانہ پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے اور انڈیا کا خصوصاً اس رپورٹ میں ذکر کیا گیا تھا۔سوویت تبصرہ نگار امریکہ اور برطانیہ پر الزام لگاتے تھے کہ ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ ان دونوں سامراجی ملکوں کی پر مرضی سے پیدا ہوا ہے اور اس تنازعے کی بنیاد پر دونوں سامراجی ملک ہندوستان پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ اپنی غیر وابستہ(Non-Align) خارجہ پالیسی کو ختم کردے۔18 فروری 1953ء کو سٹالن نے ہندوستانی سفیر مسٹر مینین کو اپنے ملک میں خوش آمدید کہا تھا اور ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی تعریف کی تھی۔

سوویت یونین نے فروری 1953ء میں ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کے حوالے سے اپنی نئی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے ریاست کی جغرافیائی اہمیت اور اس سے جڑی ہوئی سوویت یونین کی سالمیت پر زور دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کے لیے ریاست جموں کشمیر جغرافیائی لحاظ سے ہی اہمیت کی حامل نہیں تھی بلکہ ان کے فوجی مفادات کے لیے بھی اہم جگہ تھی اور ان سامراجی گدھوں کے لیے ریاست کے(نیچرل) قدرتی وسائل بھی پرکشش ہیں اس لیے سامراجی ملکوں نے سازشوں کے لیے ریاست کا تنازعہ کھڑا کر کے اسے گھیر رکھا تھا۔ان سامراجی سازشوں کے نتیجے میں ریاست جموں کشمیر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک خونی جنگ کا میدان بن چکا تھا۔پاکستان کی طرف سے مشہور برطانوی ایجنٹ قُلی خان کے مسلح گروہ ریاست میں خفیہ طریقے سے 4 ستمبر 1947ء سے گھسے ہوئے تھے اور ہندوستان نے اس کے بعد اپنے فوجی ریاست میں داخل کیے تھے اور اس وقت سے ریاست میں خون خرابہ ہو رہا تھا اور ریاست کے امن پسند لوگ انتہائی پریشانی اور مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔21 اپریل 1948ء میں سیکیورٹی کونسل نے ریاست کے مسئلے پر ایک کمیشن تشکیل تھا لیکن اس کمیشن کی کوئی بھی سرگرمی اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے نہیں نظر آئی اور کمیشن امریکہ کا ایک آلہ کار بن چکا تھا ریاست میں داخل ہونے کے لیے امریکہ کی مدد کر رہا تھا۔اقوام متحدہ کے آبزرورز(Observers) کے ساتھ 26 امریکی فوج کے آفیسرز ہیں۔اقوام متحدہ کے

صلح کار (Mediator) کے لیے ایک پوسٹ پیدا کی گئی تھی جو کشمیر میں کمیشن کی جگہ لے سکے گا۔ آسٹریلین آون ڈکسن (Owen Dixon) امریکہ کے حکم بڑی تابعداری سے بجالایا تھا اور اس نام نہاد اقوام متحدہ کے سہولت کار (صلح کار) نے یہ مانگ کی تھی کہ ریاست کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ یہ سوویت یونین نے اپنی نئی پالیسی واضع کرنے کے لیے ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر اقوام متحدہ میں کیا ہوتا رہا ہے اور امریکہ اور برطانیہ نے اب تک اس مسئلے کی آڑ میں کیا کھیل ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کھیلے تھے اور مستقبل میں ان کے اس جنوبی ایشیائی خطے میں کیا ارادے ہیں اس پر تبصرے کیے گئے تھے۔ دراصل یہ سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر نئی کشمکش کا آغاز تھا۔

اب سوویت یونین نہ صرف ریاست جموں کشمیر کے سوال پر اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں کھل کر اپنا نقطہء نظر پیش کر رہا تھا بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی کشمیر پالیسی پر شدید تنقید کرنے لگا تھا۔ اب سوویت یونین غیر محسوس طریقے سے ریاست جموں کشمیر کے ہندوستان سے 1947ء میں ہونے والے الحاق کو بھی منظور کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جب 5 مارچ 1953ء کو سٹالن فوت ہوا تو سوویت یونین کی کشمیر پالیسی ہندوستان کے حق میں بدل گئی تھی اسی دوران سوویت یونین نے امریکہ کے خلاف ہندوستان میں شدید پروپیگینڈہ مہم کا آغاز کیا تھا تاکہ وہ ہندوستان میں امریکن دُشمن ماحول پیدا کر سکے۔ اس وقت ہندوستان میں عوام کی رائے پہلے سے ہی امریکہ مخالف بن چکی تھی جس کی وجہ امریکہ کی کشمیر پر پاکستان کی حمایت تھی۔ سوویت یونین کے پریس میں یہاں تک لکھا گیا تھا کہ امریکہ پاکستانی شہریوں کے ذریعہ کشمیر میں جاسوسی کر رہا تھا تاکہ وہ ریاست میں اندرونی انتشار پیدا کرے اور اس خلفشار سے فائدہ اٹھائے۔ سٹالن کی موت کے بعد جب مالنکوف (Malenkov) کے زمانے میں ہندوستان میں امریکن مخالف لہر اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی ہندوستانی پریس بھی امریکہ پر الزام لگا رہا تھا کہ وہ پاکستان کی حمایت کر رہا تھا اور ہندوستانی سیاستدان بھی امریکہ کی پاکستان کو اسلحہ سپلائی کرنے کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے اور اس کی اس طرح کی پالیسی کو جنوبی ایشیاء

میں امریکی مفادات کو پروموٹ کرنے اور تحفظ دینے کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ ہندوستان کا یہ رویہ سٹالن کی موت کے بعد کے سوویت لیڈروں کے لیے فائدہ مند تھا اور سوویت یونین ہندوستان کی اس بظاہر امریکہ مخالف پالیسی سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

سوویت یونین کی پہلے جنوبی اشیاء سمیت ریاست جموں کشمیر کے مسئلے میں عدم دلچسپی اور اب سٹالن کی موت کے بعد فوراً پالیسی شفٹ کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کو سوویت ماہرین اس خطے میں حقیقی صورتحال کا درست تجزیہ کرنے میں ناکام رہے تھے یا ان کی دلچسپی امریکی مفادات کی مخالفت کرنا ہی تھا اور سوویت یونین کی ریاستی پالیسیاں امریکہ کے مفادات کو ہر خطے میں ناکام بنانے کی پالیسی پر زور دینا ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوویت یونین کے پالیسی سازوں کو شاید یہ شک تھا کہ برطانیہ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد جن قوتوں کو برصغیر کے تقسیم شدہ حصوں میں سیاسی طاقت ٹرانسفر کر کے جا رہا تھا کہ وہ برطانوی سامراج کے مفادات کا تحفظ کرنے والی سیاسی قوتیں ہی ہیں اور ان کے ساتھ سوویت یونین کسی قسم کا تعاون کرنے کے حق میں نہیں تھا جبکہ دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابتداء میں سوویت یونین نے اپنی بھرپور کوشش کی تھی کہ وہ کسی طرح پاکستان کے ساتھ خطے میں سٹریٹیجک پارٹنرشپ کی بنیاد پر تعلقات قائم کرے اور سوویت لیڈروں کو اس بات کا بالکل ہی کوئی علم نہیں تھا کہ مسلم لیگ کی لیڈرشپ کا جھکاؤ زیادہ برطانیہ اور امریکہ کے حق میں تھا اور کانگریس درمیان والی پالیسی پر چل رہی تھی جس نے بعد میں دہلی کا اقتدار سنبھالنے کے بعد نام نہاد غیر جانبدار اور غیر وابستہ خارجہ پالیسی بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ دراصل نہرو کا دونوں سپر طاقتوں کی کشمکش سے دور رہنا اور کسی حد تک دونوں سے مفادات حاصل کرنے کی حِکمت تھی لیکن نہرو سمیت ہندوستانی لیڈروں کو بین الاقوامی سیاست کا درست تجزیہ اور درست اندازہ نہیں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ نہرو ریاست جموں کشمیر کے تنازعے کو ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر اور دباؤ میں اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں لے گیا تھا اور اقوام متحدہ میں جانے کے بعد نہرو سمیت ہندوستانی لیڈروں کو احساس ہوا کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک طرف بڑی طاقتوں کے مفادات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے تو دوسری طرف ہر ملک اپنے مفاد کے بغیر کسی بھی

دوسرے ملک کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا اور ملکوں کے مفادات میں صرف کچھ لو اور دو کے تحت ہی حمایت ملتی ہے اصولوں کی کوئی قدر و قیمت بین الاقوامی تعلقات میں کہیں بھی موجود نہیں تھی۔ اسی طرح سوویت یونین سٹالن کے دور تک تو ریاست جموں کشمیر کو ایک آزاد ملک کی طرح سمجھتا تھا اور اس کو سارے برصغیر کے سوشلسٹ انقلاب کا نقطہ آغاز گردانتا تھا لیکن جب امریکہ کی ریاست میں بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھی اور پاکستان کی امریکہ نواز پالیسی اور جھکاؤ دیکھا تو فوراً ہندوستانی پالیسی کی حمایت شروع کر دی اور ریاست جموں کشمیر کے عوام کے مفادات، حقوق اور آزادی سب کچھ بھول کر یک طرفہ موقف اختیار کر لیا تھا یہی حال امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کا بھی تھا امریکہ اور برطانیہ ریاست کے مسئلے کو خطے میں اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھا چکے تھے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اس تنازعہ کو ہوا دینے اور اقوام متحدہ کے ذریعہ اسے لمبا کرنے میں مصروف تھے چونکہ دونوں سامراجی ملک ریاست کے مسئلے کو اپنی فوجی حکمت عملی کا حصہ بنا چکے تھے اور ریاست کو تقسیم کر کے اس کے شمالی علاقوں کو سوویت یونین کے خلاف استعمال کرنے کا پورا منصوبہ بنا چکے تھے اور اسی حکمت عملی کے تحت ریاست کو متنازعہ بنانے میں برطانوی حکومت نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اب صورت یہ بن چکی تھی کہ سوویت یونین کو شک تھا کہ امریکہ صرف وادی کشمیر کو ہی آزاد ملک بنا کر باقی ریاست کے علاقوں کو اپنے براہِ راست فوجی کنٹرول میں لانا چاہتا تھا اور اقوام متحدہ کے پردے میں امریکہ اپنی فوج ریاست میں بھیجنا چاہتا تھا۔ یہ سارا پروپیگنڈہ بڑے پیمانے پر پریس میں بھی رپورٹ ہو رہا تھا چونکہ اس پروپیگنڈے کے مطابق ابھی عملی حقیقت گراؤنڈ پر موجود نہیں تھی صرف قیاس آرائیں ہو رہی تھیں۔ جہاں بڑی طاقتیں بار بار ریاست کے تنازعہ پر قلابازیاں کھا رہی تھیں اور پوزیشن بدل رہی تھیں وہاں ریاست جموں کشمیر کے لیڈرز بھی اپنی قلابازیوں میں کسی سے پیچھے نہیں تھے اور ان لیڈروں کی حالت بھی قابل دید تھی آیئے ان کے کردار کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مئی 1953ء میں ایڈلائی سٹیونسن (Adali Stevenson) نے سرینگر کا دورہ کیا تھا یہ امریکہ کی ڈیموکرٹیک پارٹی کا صدارتی الیکشن ہارا ہوا امیدوار تھا اور بعد میں اقوام

متحدہ میں امریکہ کے وفد کا سربراہ بھی رہا تھا۔ س نے سرینگر کے دورے کے دوران ریاست کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ سے ملاقات کی تھی اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ وادی کشمیر کو ایک آزاد ملک کی حیثیت دے دی جائے سوویت پریس نے یہاں تک رپورٹ کیا تھا کہ (Stevenson) سٹیونسن نے آزاد خودمختار کشمیر کی وادی کو امریکی ڈالر کی مدد دینے کا بھی اشارہ دیا تھا۔ سٹیونسن کے سرینگر کے دورے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں نیشنل کانفرنس کے ماضی کے پروگرام کو مسترد کرتے ہوئے اس کی جگہ متبادل آزاد اور خودمختار وادی کشمیر کے پروگرام کی حمایت کی تھی۔ شیخ عبداللہ نے 1952ء میں ہونے والے معاہدہ دہلی کی بھی مذمت کی تھی جو اس نے خود کیا تھا اور کہا تھا کہ ان پانچ سالوں میں کشمیر نے شخصی راج کا خاتمہ کیا تھا اور اس موجودہ وقت میں عوام ہی طاقت کے مالک ہیں شیخ عبداللہ نے یہ بھی کہا کہ ریاست کے عوام کو اپنے مستقبل کا آزادانہ فیصلہ بغیر کسی خوف کے کرنے کا موقع دیا جائے۔ شیخ صاحب نے یہ بھی کہا کہ اسے خوشی ہے کہ پاکستان نے بھی مجبور ہو کر یہ فیصلہ تسلیم کر لیا تھا۔ اور میری یہ خواہش تھی کہ پاکستان نے یہ فیصلہ 1947ء میں ہی قبول کر لیا ہوتا اور اسی رویہ کا اظہار کیا ہوتا۔ شیخ عبداللہ کی یہ سوچ جو ہندوستان مخالف تھی ماضی کی سوچ کے بالکل متضاد تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شیخ عبداللہ ہی تھا جس نے ریاست کا ہندوستان سے الحاق کرنے کی سب سے زیادہ حمایت کی تھی اور اس کے حق میں مہم چلائی تھی۔ یہ شیخ عبداللہ ہی تھا جس نے خود ہی ہندوستان کے ساتھ 1952ء میں معاہدہ دہلی کیا تھا اور شیخ عبداللہ ہی تھا جس کی چند سال پہلے یہ رائے تھی کہ کشمیر کا مستقبل ہندوستان سے ہی وابستہ تھا۔ یہ شیخ عبداللہ ہی تھا جس نے 1949ء میں نہرو کو بتایا تھا کہ وہ چاہتا ہے کہ نہرو یقین کرے کہ کشمیر اس کا ہی تھا۔ (نہرو کا) دنیا کی کوئی طاقت کشمیر اور ہندوستان کو جدا نہیں کر سکتی تھی۔ شیخ عبداللہ نے 3 نومبر 1951ء میں آئین ساز اسمبلی میں اپنی تقریر میں آزاد اور خودمختار کشمیر کے تصور کو سرے سے مسترد کر دیا تھا۔

دو سال سے کم عرصے میں شیخ عبداللہ نے آزاد اور خودمختار کشمیر کی مہم شروع کر دی تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاستی کابینہ اور نیشنل کانفرنس میں اختلاف پیدا ہو گئے۔ ہندوستانی

حکومت موقع کی تلاش میں تھی اور شیخ عبداللہ کے خلاف پورے ہندوستان میں پروپیگنڈہ مہم شروع کر کے عوامی رائے عامہ کو اس کے خلاف کیا گیا تھا دوسرا شیخ عبداللہ کی آزاد وادئ کشمیر کی تجویز کو حکومتی سطح پر امریکی سازش قرار دیا جا چکا تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ جب 1947ء سے پہلے مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کو ہندوستان اور پاکستان سے الگ رکھنے کی کوشش کی تھی تو کشمیر وادی سے شیخ عبداللہ ہی وہ واحد لیڈر تھا جس نے ریاست کو آزاد اور خودمختار رکھنے کی سخت مخالفت کرتے ہوئے مہاراجہ کو ہندوستان سے الحاق کرنے کا مشورہ دیا تھا جبکہ بٹوارے سے پہلے ریاست کو آزاد رکھنے کا خیال زیادہ بہتر تھا چونکہ اس وقت یہ تجویز ساری ریاست کی وحدت کے ساتھ پیش کی گئی تھی جبکہ شیخ عبداللہ اس ریاست کے ایک صوبے کشمیر کو آزاد ملک بنانے کی تجویز دے رہا تھا جو ریاست کے رقبے کے 15% کے قریب اور 44% فی صد آبادی والا حصہ تھا۔ ظاہر ہے ایسا چھوٹا علاقہ باقی ریاست سے الگ کر کے ایک ملک بنانے کی تجویز دینے کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ یہ کسی بڑی طاقت کی مدد سے ہی قائم رہ سکتا تھا۔ جبکہ ریاست کا 1947ء میں آزاد ملک رہنا آسان تھا جسے اس وقت شیخ عبداللہ نے ایک پوری منظم مہم چلا کر ناکام کر دیا تھا اور ریاست کے آزاد رہنے کے خلاف مہم میں نہرو اور کانگریس پارٹی نے شیخ عبداللہ کی بھرپور حمایت کی تھی۔ 9 اگست 1953ء کو شیخ عبداللہ کو وزیراعظم کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تھا اور گلمرگ کے پہاڑی تفریح مقام سے گرفتار کیا گیا تھا۔

شیخ عبداللہ کی جگہ بخشی غلام محمد کو ریاست کا نیا وزیراعظم بنایا گیا تھا۔ بخشی غلام محمد نے شیخ عبداللہ کی گرفتاری اور وزیراعظم کے عہدے سے ہٹائے جانے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ شیخ کو اس لئے برطرف کیا گیا تھا چونکہ وہ ایک غیر ملکی سامراجی طاقت کے تعاون سے آزاد اور خودمختار کشمیر کی ریاست قائم کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح کی کئی رپورٹیں سامنے آرہی تھیں جن میں یہ کہا گیا تھا کہ شیخ عبداللہ امریکی سازشوں کا شکار ہو کر ہندوستان کے ساتھ تعلقات خراب کر کے ایک آزاد اور خودمختار کشمیر قائم کرنا چاہتا تھا خودمختار کشمیر کے قیام کو امریکہ کے ساتھ اس لیے جوڑا جا رہا تھا کہ ہندوستان میں سوویت یونین کے پروپیگنڈہ مہم سے

اور ہندوستان کے اپنے اس دکھ اور غصے کی وجہ سے کہ امریکہ پاکستان کی حمایت اور امداد کر رہا تھا ہندوستانی عوام میں شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی اس لیے شیخ عبداللہ کے آزادی اور خودمختاری کے منصوبے کو امریکہ سے جوڑ کر شیخ کے خلاف ہندوستانی عوام کی ہمدری کو ختم کرنا آسان تھا۔ ریاست کی نئی حکومت نے تمام امریکیوں کو ریاست سے نکل جانے کا حکم دیا اور اقوام متحدہ کے آبزروز کو حکم دیا کہ وہ صرف اپنی سرگرمیاں اپنے متعلقہ کام تک محدود رکھیں ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے باز رہیں۔ ریاست جموں کشمیر کے وزیراعظم بخشی غلام محمد نے آزاد ریاست کو ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے لیے خطرناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک نیا کوریا (Korea) بنانے کی کوشش لگتی ہے۔

یہ اس وقت کی اپنی ریاستی لیڈرشپ کی اپنی ریاست کے بارے میں خیالات تھے۔ ایسے لوگوں کو کسی دُشمن کی ضرورت ہی نہیں ہوتی یہ اپنے زہر سے ہی اپنے لوگوں کی آزادی کی تڑپ کو مار دیتے ہیں۔ ریاستی لیڈرشپ نے یہ کام 1947ء سے پہلے اور اس کے بعد بہت بڑے احسن طریقے سے نبھایا تھا۔ دوسری طرف سوویت یونین کی قلابازی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے شیخ عبداللہ کو وزیراعظم کے عہدے سے ہٹائے جانے کے ہندوستانی اقدام کو سراہا تھا اور شیخ عبداللہ کی گرفتاری کو کشمیر کے خلاف ایک عظیم خطرے کو ہٹانے کے برابر قرار دیا جو پانچ سال پہلے ریاست پر پاکستانی حملے سے بھی بڑا خطرہ تھا۔ سوویت تجزیہ نگاروں نے شیخ عبداللہ کو غیر ملکی ایجنٹوں کے ہاتھوں میں ایک خطرناک ہتھیار قرار دیا تھا۔ سوویت یونین نے کہا تھا ریاست کا سابق وزیراعظم امریکہ سے مل کر ریاست جموں کشمیر کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا ان میں سے ریاست کا ایک حصہ ہندوستان اور دوسرا پاکستان کو ملنا تھا اور تیسرا حصہ کشمیر وادی کو امریکہ کے تحفظ میں ایک آزاد ملک بنانا تھا۔ شیخ عبداللہ کی عہدے سے برطرفی اور گرفتاری نے غیر ملکی ایجنٹوں کے منصوبے کو ریاست میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا۔ سیاسی موقع پرستی کا یہ عالم تھا کہ جونہی سوویت یونین کی آواز میں تبدیلی آئی ادھر ہندوستانی کمیونسٹ بھی اسی ریاستی آواز اور مفادات کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا نے فوراً شیخ عبداللہ پر الزام لگایا تھا کہ وہ ایک غیر ملکی طاقت سے مل کر خودمختار

کشمیر بنانے کی سازش کررہا تھا۔یہی ہندوستانی کمیونسٹ چند سال پہلے اسی سوویت یونین کے کہنے پر خود ریاست کو ایک آزاد اور خود مختار ملک بنانے کی مہم چلا رہے تھے۔سوویت یونین نے شیخ عبداللہ کی پارٹی کے سرخ جھنڈے کی وجہ سے بعد میں زمینی اصلاحات کرنے پر ترقی پسند قرار دیا تھا اور انہی کمیونسٹوں کو نیشنل کانفرنس سے تعاون کرنے کا حکم دیا تھا۔

کیا ہندوستانی کمیونسٹوں کو سوویت یونین کی ہاں میں ہاں ملانا اور ریاست کو آزاد ملک بنانا پہلے غیر ملکی سازش نظر نہیں آئی تھی؟اگر یہیں کام شیخ عبداللہ کرے تو غیر ملکی سازش کس طرح ہوگئی تھی؟ہندوستانی کمیونسٹوں کا حال یہ تھا کہ جب سٹالن نے یالٹا(Yalta) کانفرنس میں ہندوستان کے بٹوارے کو جرمن کی تجویز پر قبول کیا تھا تو ہندوستانی کمیونسٹوں نے اسے فوراً مسلم اقلیت کا حق خوداراد یت قرار دیا تھا اپنے ملک کا بٹوارہ کرانے کی حمایت کرنا اور پھر مذہبی فرقہ واریت کے نام پر رجعت پسندانہ برطانوی حکومت کے اقدامات کا ساتھ دینا کونسا مزدور طبقے کے مفادات کی جنگ تھی یہ کسی غیر ملکی طاقت کی کھلم کھلا ایجنٹی اور مزدور دُشمنی کے ساتھ ساتھ ملک دُشمنی بھی تھی لیکن ایسے اقدامات کو کیمونسٹ اور سوویت یونین کے حکمران بار بار نظر یہ ضرورت قرار دے کر جائز بنا لیتے تھے جہاں سوویت یونین کا حکمران ٹولہ ساری دنیا کی کیمونسٹ پارٹیوں کو اپنے ریاستی مفادات کے لیے اپنی آواز پر ناچنے پر مجبور کرتا تھا وہاں ان کمیونسٹوں کے مفاد پرست گروہوں کی ساری سیاست بھی موقع پرستی کی زندہ مثال تھی۔ سوویت یونین کے حکمران طبقے نے اپنے ملک کی عوام پر ایک جابرانہ نظام اور سخت گیر آمریت مسلط کر کے بولنے اور تنقید کرنے کی آزادی تک چھین رکھی تھی اور مزدور طبقے کو چند سہولتوں کے بدلے ریاستی بیوروکریسی اور کیمونسٹ اہلکاروں کے حکم کا غلام بنا رکھا تھا۔ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ریاست جموں کشمیر کے عوام سے کوئی ہمدردی کا جذبہ رکھیں گے محض خام خیالی کے سوا کچھ نہیں تھا۔یہی حال ہندوستانی کیمونسٹوں کا تھا۔کیمونسٹ لیڈرز اپنے ملک کے محنت کش عوام کے حقوق اور اپنے ملک سے وفاداری کی بجائے سوویت یونین کے حکمران ٹولے کے مفادات کا دم بھرتے تھے جونہی سوویت یونین کے ریاستی مفادات بدل جاتے تھے یہ کیمونسٹ بھی ان کے ریاستی مفادات کے مطابق اپنی سوچ فوراً بدل لیتے تھے ایسے سیاسی گروہ جن کی اپنی کوئی

آزادانہ سوچ اور پالیسی نہ ہو وہ کسی مظلوم قوم اور قومیت کی حمایت کیسے کر سکتے تھے۔ ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی کے لیڈروں کا رویہ ایسا تھا کہ جیسے وہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے سوویت یونین سے تعلقات قائم کیے ہوئے تھے یا سوویت یونین کے مفادات سے جڑے ہوئے تھے یہی پالیسی ہندوستانی کیمونسٹ جموں کشمیر کے حوالے سے بھی بار بار دوہرا رہے تھے۔ دوسری طرف امریکی سامراج اور اس کے مغربی اتحادی بھی ریاست جموں کشمیر کے عوام کے حقوق اور مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے حالانکہ ریاست کے وہ علاقے جو پاکستان کے زیر کنٹرول تھے وہ بنیادی حقوق سے بھی محروم تھے لیکن امریکی اور اس کے سرمایہ دارانہ نظام کے حامی سامراجی ملکوں کو ریاست کی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے اپنے فوجی اڈے قائم کرنے میں دلچسپی تھی جس کے لئے امریکہ سے پاکستان فائدے اٹھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن اس ساری کشمکش میں ریاستی عوام کی آزادی اور ان کے بنیادی حقوق کا ذکر کہیں بھی موجود نہ تھا۔ سوویت یونین اور امریکہ اپنے درمیان ہونے والی سیاسی، معاشی اور فوجی مفادات کی جنگ میں ریاست جموں کشمیر کے ساتھ سارے جنوبی ایشیاء کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھا رہے تھے۔

ریاستی عوام جو ان دو بڑی طاقتوں کی وجہ سے ان کے ہندوستانی اور پاکستانی اتحادیوں کی وجہ سے سب سے زیادہ عذاب کی زندگی جھیلنے پر مجبور تھے اور ریاست کے عوام اپنی لیڈرشپ کی بے وفائیوں اور موقع پرستیوں کی الگ سزا بھگت رہے تھے۔ بہر حال سوویت یونین پاکستان پر الزام لگا رہا تھا کہ وہ امریکہ سے خفیہ فوجی معاہدے کے لیے گفتگو کر رہا ہے کہ جبکہ پاکستان ایسے کسی بھی معاہدے اور بات چیت سے انکار کر رہا تھا۔ سوویت یونین نے پاکستان کو سنجیدہ نتائج کی دھمکی دی تھی کیونکہ امریکہ اور پاکستان کا فوجی اتحاد سوویت یونین اور پاکستان کے پڑوسی ملکوں کے لیے فوراً خطرہ تھا جس میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ سوویت یونین نے کہا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان فوجی اتحاد کے لیے ہونے والی بات چیت ایشیا میں پاکستان کے کئی پڑوسیوں میں بہت تشویش پیدا کر رہی تھی۔

جبکہ سوویت یونین نے امریکی فوج کے کچھ اہلکاروں پر الزام لگایا تھا کہ انھوں نے

کشمیر میں اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹرز اور آبزرورز (Observers) کو اپنی خفیہ سرگرمیوں کا ہتھیار بنالیا تھا اور اس کے کام کو سبوتاژ کرلیا تھا۔سوویت یونین نے امریکہ پر کشمیر میں سازش کرنے کا الزام لگاتے ہوئے ہندوستان پر زور دیا تھا کہ وہ تمام امریکیوں اور اقوام متحدہ کے آبزرورز (Observsers) کو کشمیر سے نکال باہر کرے۔اسی حوالے سے 24 فروری 1954ء میں نہرو نے ہندوستان کی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ کا پاکستان کو مسلح کرنے کا فیصلہ یہ ثابت کرتا ہے کہ امریکی فوجی جو اقوام متحدہ کے ملٹری آبزورز کی ٹیم کا کشمیر میں حصہ ہیں اب انہیں غیر جانبدار تصور نہیں کیا جائے گا اور سوویت یونین نے فوراً ہندوستان کی حمایت کی تھی۔سوویت یونین نے یہ الزام بھی لگایا تھا کہ نہ صرف امریکی شہری جو اقوام متحدہ کی جنگ بندی کو سپروائز کرنے والی ٹیم کا حصہ تھے سبوتاژ کرنے والی سرگرمیوں میں مصروف تھے بلکہ امریکی مشینری بھی کشمیر میں تباہی پھیلانے اور جاسوسی کی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ستمبر 1954ء میں جب پاکستان سیٹو (SEATO) ساؤتھ ایسٹ ایشیاء ٹریٹی آرگنائزیشن کا حصہ بنا تھا تو سوویت یونین نے پاکستان کی اس جارحیت پسند بلاک کی ممبرشپ لینے پر مذمت کی تھی۔گو کہ سوویت یونین کی ریاست جموں کشمیر پر تشویش نے اس وقت نیا موڑ لیا تھا جب 1950ء کے وسط میں چین اور سوویٹ یونین کا آپس میں تعاون ختم ہوا تھا۔ریاست جموں کشمیر کے شمال مغربی علاقوں کو سوویت یونین کی سیکیورٹی کے لیے بہت اہم خیال کیا گیا تھا۔1954ء کے ابتداء میں چین نے مشرقی لدّاخ کے علاقے اقصائے چن پر اپنی بالادستی قائم کرنا شروع کردی تھی اور چین نے فوجی مقاصد کے لیے ایک سڑک اقصائے چن کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تعمیر کرائی تھی جو سنکیانگ کو مغربی تبّت سے ملاتی تھی۔اس سڑک کی تعمیر 1954ء میں شروع ہوئی تھی اور 1957ء میں مکمل کی گئی تھی۔چین نے اقصائے چن پر زبردستی قبضے کی ابتدائی کوشش خفیہ انداز میں شروع کی تھی جس کا خاص مقصد سوویت یونین کے خلاف اپنا دفاع قائم کرنا تھا۔ستمبر 1954ء میں خروشیف نے بیجنگ کا دورہ کیا تھا اور اس نے ماؤزے تنگ کو ایک مکمل قوم پرست پایا تھا جو اپنی نئی حاصل کی گئی پوزیشن کو چین کی سرحدوں کو وسعت دینے کے لیے استعمال کرنے پر یقین رکھتا تھا۔

چین نے اقصائے چن پر قبضہ کرنے کے لیے ماسکو سے مدد طلب کی تھی اور بدلے میں سوویت یونین سے تعاون بحال کر کے اس کی قیمت چکانے کی حامی بھری تھی۔خروشیف نے خطرے کو بھانپتے ہوئے چین کے انڈیا کے علاقے پر دعوے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اسی وقت چین نے اپنے ملک کا ایک نقشہ شائع کیا تھا جس میں 42 ہزار مربع کلومیٹر لدّاخ کے علاقے کو اپنا قرار دیا تھا۔چین کی فوج نے اسی زمانے میں ہندوستان کی شمالی سرحدی علاقوں کو اپنے ملک میں شامل کرنا شروع کر دیا تھا۔سوویت یونین چین کی اس حرکت پر بہت تشویش میں مبتلا ہوا کہ وہ ہندوستان کے شمالی سرحدی علاقوں پر چین کے قبضے کو اپنے ملک کے لیے چین کے اس عمل کو اس کی سیکیورٹی کے لیے نقصان دہ خیال کرتا تھا۔سوویت یونین کو یہ خطرہ بھی پیدا ہوا تھا کہ چین کہیں سنٹرل اشیاء میں پامیر کے علاقوں پر اپنا دعویٰ نہ شروع کر دے۔سوویت یونین کو ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کی وجہ سے اپنی سیکیورٹی کو بہت زیادہ خطرات لاحق ہو چکے تھے کیونکہ ریاست کے شمالی حصے جہاں ہندوستان، پاکستان چین اور افغانستان کی سرحدیں ریاست جموں کشمیر سے ملتی تھیں، وہاں سے سوویت یونین کا جنوبی سرحدی علاقہ صرف 40 میل دور تھا۔دوسری طرف ہندوستان کے وزیراعظم نے بھی امریکہ کی پاکستان کو اسلحہ سپلائی کو ریاست کے تنازعہ سے جوڑ دیا تھا جو سوویت یونین کے لیے مزید تشویش کا باعث بن گیا تھا۔سوویت یونین نے ہندوستان کی مکمل حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔سوویت یونین کے ہفت روزہ اخبار نیو ٹائم میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں لکھا گیا تھا کہ سوویت یونین ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان کا حصہ سمجھتا ہے اور ہندوستان کی کشمیر پالیسی کی مکمل حمایت کرتا تھا۔اس کے بعد خروشیف اور نکولائی بلگانین (Nikoli-Buganin) نے ہندوستان کے دورے کے دوران سرینگر کا بھی دورہ کیا تھا اور ہندوستان کی کشمیر پالیسی کی کھلے عام حمایت کی تھی۔خروشیف نے سرینگر میں اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ریاست کا سوال ریاستی عوام نے حل کر دیا تھا اور یہ ریاست بھی ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح ایک ہندوستانی ریاست تھی۔خروشیف نے ہندوستان کے بٹوارے کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ مذہبی اختلاف کے بجائے برطانیہ کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کا حصہ تھا اور اس

تقسیم کو سامراج کی سازش قرار دیا تھا۔ جبکہ چند سال پہلے ہی سوویت یونین کے لیڈر جوزف سٹالن نے ہندوستان کا بٹوارہ بڑی خوشی سے قبول کیا تھا اور اس وقت سوویت یونین کو اس بٹوارے میں کوئی سامراجی سازش نظر نہیں آئی تھی جواب چند سالوں بعد نظر آ رہی تھی۔

دراصل سوویت یونین اور امریکی سامراج اس خطے میں اپنی اپنی ریاستوں کے مفادات کے لیے ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر ان کی پالیسیوں میں نہ کوئی تسلسل تھا نہ ریاست کے قومی سوال پر ان کا موقف صاف تھا۔ آئے روز سوویت یونین اپنی ریاستی پالیسی اس مسئلے پر بدل رہا تھا۔ اب سوویت یونین کے لیڈروں کا خیال تھا کہ ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کے مسئلے سے سوویت یونین کے فوجی مفادات کا گہرا تعلق بن چکا تھا۔ اس لیے خروشیف نے ریاست کی سرزمین کو امریکہ کے ہاتھوں استعمال ہونے کے بجائے یہ بہتر سمجھا کی ریاست ان کے دوست ملک ہندوستان کے ہاتھوں ہیں ہی رہے کیونکہ ریاست ہندوستان کے ہاتھوں میں رہ کر سوویت یونین کے مفادات کو بہتر طریقے سے پورا کر سکتی تھی۔ بجائے اس ریاست کو پاکستان میں شامل کرنے اب سوویت لیڈرز اسے ہندوستان کے ساتھ رکھ کر اپنے مفادات پورے کرنا چاہتے تھے۔ پاکستان نے نہ صرف سوویت لیڈروں کے بیانات کی مذمت کی بلکہ ان کے سرینگر کے دورے پر شدید تنقید کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی قراردادوں کا بھی حوالہ دیا اور سوویت لیڈروں کے رویے کو افسوسناک قرار دیا تھا۔

سوویت یونین کے رویے میں اچانک تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ پاکستان کا پہلے ساؤتھ ایسٹ ایشین ٹریٹی آرگنائزیشن (SEATO) کا حصہ بننا ہی سوویت پالیسی میں بڑی تبدیلی کا باعث بنا تھا اور اب پاکستان نے بغداد پیکٹ بھی جائن کر لیا تھا۔ بغداد پیکٹ جس کا نام 1959ء میں بدل کر سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن (CENTO) رکھا گیا تھا۔ بغداد پیکٹ 1955ء میں برطانیہ، ترکی، عراق، ایران اور پاکستان کے درمیان ایک دفاعی گروپ بنایا گیا تھا۔ اس گروپ کا اصل مقصد علاقائی دفاع کو مضبوط کرنا اور سوویت یونین کو مشرق وسطیٰ میں داخل ہونے سے روکنا تھا۔ اب امریکہ اور اس کے اتحادی مغربی ممالک سرد جنگ کو کشمیر

میں متعارف کرا چکے تھے۔انہوں نے پاکستان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ سوویت یونین کی ہندوستان کی حمایت کے خلاف پروپیگنڈہ کرے کہ اس خطے میں کمیونسٹوں کی مداخلت بڑھ گئی تھی۔8 مارچ 1956ء میں سیٹو(SEATO) کونسل نے ایک پریس بیان جاری کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ اقوام متحدہ میں براہِ راست بات چیت سے حل نکالا جائے۔ایک بار پھر اپریل 1956ء میں بغداد پیکٹ کونسل نے بھی ریاست کے مسئلے کا فوری حل نکالنے پر زور دیا تھا۔ہندوستانی وزیراعظم نے سیٹو کونسل اور بغداد پیکٹ کونسل کا کشمیر کے تنازعہ پر بیان دینے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے خدشات اس تنظیم کے بارے میں درست ثابت ہو رہے ہیں۔مزید کہا کہ سیٹو کونسل کے مقاصد کا ریاست کے تنازعے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور یہ فوجی اتحاد ایک ملک کی پشت پناہی کر رہا تھا۔اس کے نتیجے میں جب فروری 1957ء میں ریاست کا مسئلہ سیکیورٹی کونسل میں بحث کے لیے لایا گیا تھا تو سوویت یونین کا رویہ اقوام متحدہ کی قرارداد کے مکمل خلاف تھا اور ہندوستان کی پوزیشن کے مکمل حمایت میں تھا۔ 14 فروری 1957ء کو امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا اور کیوبا نے ایک قرارداد کا ڈرافٹ سیکیورٹی کونسل میں پیش کیا تھا جسے انڈیا نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ فوجوں کا انخلاء اقوام متحدہ کی زیرنگرانی غیر جانبدارانہ رائے شماری اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان پاکستان کی قرارداد کے مطابق حاصل نہیں کیا جاسکا اور اس قرارداد میں اقوام متحدہ کی عارضی فوج کو فوجی انخلا کے لیے استعمال کرنے کی تجویز دی گئی تھی۔ 19 فروری 1957ء میں سوویت نمائندے نے اپنی حکومت کی پالیسی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی حکومت کے نزدیک ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ اس ریاست کی عوام نے پہلے سے حل کر دیا تھا اور ریاست کے لوگ اپنے آپ کو ہندوستان کا حصہ سمجھتے تھے اور سیکیورٹی کونسل ان حقائق کو نظرانداز نہیں کر سکتی۔سوویت یونین کے نمائندے سوبلوف نے بھی کہا کہ ضروری تبدیلیاں کشمیر میں ہو چکی ہیں جب سے مسئلہ 1948ء میں سیکیورٹی کونسل میں لایا گیا تھا۔ان تبدیلیوں کو نظرانداز کرنا اس وقت خودکشی کے برابر ہوگا۔سوویت نمائندے نے ریاست میں رائے شماری کرانے کی

بھی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کرنے سے لوکل تنازعات کو ہوا ملے گی اور اس مسئلے کی وجہ سے اس خطے میں صورتِ حال مزید پیچیدہ ہو جائے گی۔ سوویت نمائندے نے اقوام متحدہ کی عارضی فوج کشمیر بھیجنے کی بھی مخالفت کی تھی۔

سوویت یونین کے نمائیندے نے ایک بار پھر یہ بات دہرائی کہ ریاست کا تنازعہ مغربی طاقتوں نے پیدا کیا تھا۔ ان طاقتوں نے جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے اور اس خطے میں مداخلت کے لیے مسئلہ پیدا کیا تھا۔ 16 نومبر 1957ء میں ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ ایک بار پھر سکیورٹی کونسل میں بحث کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ سوویت نمائندے سوبولوف نے ان پانچ طاقتوں کی ڈرافٹ کی گئی قرارداد پر شدید تنقید کی جس میں دوبارہ یہ لکھا گیا تھا کہ ریاست سے فوجوں کا انخلا کرانا اہم مقصد تھا اور اقوام متحدہ کے نمائندے گراہم (Graham) کو کہا گیا تھا کہ وہ اپنی کوشش دوبارہ شروع کرے تا کہ ہندوستان پاکستان کے درمیان مسئلے کے حل کے لیے سمجھوتہ ہو سکے۔ سوویت نمائندے نے اس قرارداد کو سکیورٹی کونسل میں ویٹو کرنے کی دھمکی دی تھی۔ 28 نومبر 1957ء کو سویڈن کے نمائندے نے ایک ترمیم شدہ ڈرافٹ کی قرارداد پیش کی تھی تا کہ مختلف ممبران نے سکیورٹی کونسل میں جو مختلف آراء پیش کی تھیں ان کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہو گئی تھیں اس پر دونوں گروپوں کے درمیان صلح کا ماحول پیدا کیا جائے۔ 22 اکتوبر 1957ء میں ڈرافٹ کی گئی قرارداد کو پیش کرنے والوں نے کہا کہ وہ قرارداد میں ترمیم کو خوش آمدید کہیں گے تا کہ ڈرافٹ نے جو پہلے سے مشکلات پیدا کر رکھی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ قرارداد ترامیم کے ساتھ پاس کی گئی تھی لیکن سوویت یونین نے ووٹ میں حصہ نہیں لیا تھا۔

سوویت یونین نے یہ بھی کہا تھا کی مغربی ملکوں نے جتنی بھی قراردادیں سکیورٹی کونسل میں متعارف کرائی تھیں ان کی اکثریت پاکستان کی پوزیشن کو سامنے رکھ کر پیش کی گئی تھیں۔ ترمیم شدہ قرارداد نے جہاں انڈیا کو مایوس کیا وہاں پاکستان نے بھی اسے اپنی بے عزتی قرار دیا تھا۔ پاکستانی وزیراعظم فیروز خان نون نے مغربی ملکوں کو دھمکی دی تھی کی پاکستان مغربی اتحادیوں کا کیمپ چھوڑ کر سوویت کمیونسٹ بلاک میں شامل ہو سکتا ہے اور پاکستان کو یہ توقع تھی

کہ کشمیر کے تنازعے پر کمیونسٹ دنیا ان کی اقوام متحدہ میں حمایت کرے گی۔ انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ پاکستانی عوام اور حکومت کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوگا کہ وہ کمیونسٹ بلاک میں شامل ہوں۔ اگر مغربی ملکوں نے ریاست کے تنازعہ پر پاکستان کی حمایت نہ کی تو آج کے دُشمن سے بھی ہاتھ ملانے سے گریز نہیں کریں گے کیونکہ پاکستان کے لیے اس کے سوا کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔ پاکستان نے غصے اور جھلاہٹ میں سوویت یونین کو کشمیر کے معاملے پر اپنی حمایت میں لانے کے لیے چین کی خدمات حاصل کیں۔ پاکستان نے چین میں اپنا ایک سرکاری وفد بھیجا جس نے وزیر اعظم چیون لائی سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ وہ سوویت یونین پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے اور انہیں ریاست جموں کشمیر پر اپنا رویہ بدلنے پر زور دیں۔ لیکن سوویت یونین نے پاکستان کی طرف سے چین کی بھیجی گئی تجاویز پر غور کرنے سے ہی انکار کر دیا اور ہندوستان کی کشمیر کے مسئلے پر حمایت ترک کرنے سیصاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد پاکستان نے سوویت یونین سے براہِ راست بات کی اور پاکستان کو ایک امن پسند ملک قبول کرنے کی درخواست کی تو سوویت یونین کے پاکستان میں سفارتی نمائندے کابڑہ (Kapitza) نے پاکستانی حکومت کو بتایا کہ پاکستان کی سوویت مخالف فوجی بلاک میں ممبر شپ اور اس کی سرزمین پر غیر ملکی فوجی اڈوں کی موجودگی ہی پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان اچھے تعلقات میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ اگر پاکستان اور سوویت یونین کے تعلقات میں اس وقت مشکلات میں ہیں تو اس کے لیے سوویت یونین کو الزام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

مارچ 1959ء میں ایک سوویت وفد پھر کشمیر کے دورے پر بھی یہ دکھانے کے لئے آیا تھا کہ سوویت یونین کشمیر کی ریاست کو ہندوستان کا حصہ تصور کرتا تھا۔ اس ریاست کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو چکا تھا۔ اس سوویت وفد نے ایک بار پھر مغربی سامراجی ملکوں پر الزام لگایا تھا کہ انھوں نے جارحیت پسندی پر مبنی سوویت مخالف فوجی معاہدے کر رکھے ہیں اور ان معاہدوں کا حصہ پاکستان کو بھی بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے سیٹو (SEATO) اور بغداد پیکٹ جیسے معاہدوں کو سوویت مخالف اور امن پسند ایشین ممالک کے خلاف قرار دیتے ہوئے

کہا کہ یہ معاہدے ہندوستان دُشمن بھی ہیں۔ اپریل 1959ء میں صدرِ ریاست کرن سنگھ نے سوویت یونین کا دورہ کیا تھا۔ کرن سنگھ کا والہانہ استقبال کرنے والوں میں سوویت وزیراعظم خروشیف سمیت تمام بڑے لیڈر موجود تھے۔ کرن سنگھ کو دیئے گئے سرکاری استقبالیہ میں سوویت وزیراعظم خروشیف نے ایک بار پھر ریاست جموں وکشمیر کے مسئلے پر ہندوستانی پالیسی کی مکمل حمایت کی تھی۔ کرن سنگھ نے سوویت لیڈروں کا ہندوستان کی حمایت کرنے پر شکریہ ادا کیا تھا اور کہا تھا کہ سوویت یونین کی کشمیر پر ہندوستان کی حمایت کرنے کی پالیسی کو ساری دنیا جانتی ہے۔

21 فروری 1962ء کو سکیورٹی کونسل کا اجلاس ہوا اور اس اجلاس میں سکیورٹی کونسل کے صدر نے ہندوستانی اور پاکستانی نمائندوں کی سکیورٹی کونسل میں دیئے گئے بیانات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ دونوں ملکوں کی طرف سے پُرامن حل کی یقین دہانیوں کی روشنی میں سکیورٹی کونسل کے ممبران یہ محسوس کرتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر کے مسئلہ پر مزید بات چیت ملتوی کردی جائے۔ سوویت نمائندے نے بھی سکیورٹی کونسل کے صدر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس مسئلے پر فوراً سکیورٹی کونسل کا اجلاس بلانا نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے بعد 27 اپریل 1962ء میں سکیورٹی کونسل نے ریاست کے مسئلے پر بحث کرنے کے لئے ایک اور اجلاس بلایا تھا اس میں سوویت یونین کے نمائندے نے ہندوستان کی اہلیت سے ہٹ کر پھر کشمیر کے مسئلے پر حمایت کی تھی اور وہی بیانات دہرائے جو اس سے پہلے بار بار سوویت نمائندے سکیورٹی کونسل میں دوہرا چکے تھے۔ سوویت نمائندے کا یہ کہنا کہ ریاست جموں کشمیر کے عوام اس مسئلے کو حل کر چکے تھے اور یہ ریاست اب ہندوستان کا حصہ ہے اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ سوویت یونین کی دنیا کے مسائل اور مظلوم قوموں کے حق خودارادیت کے بارے میں کتنی بوگس سوچ تھی اور کس طرح مغربی سامراجی ملکوں کی مخالفت کے بہانے سوویت حکمران ٹولہ کس طرح اپنے ریاستی مفادات کی خاطر دوسرے ممالک کو نہ صرف آلہ کار بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا بلکہ امریکی سامراج کی طرح مسائل کو حل کرنے کی بجائے انہیں الجھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

سوویت یونین کا یہ موقف کہ ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ ہی حل ہو چکا ہے انتہائی بد یانتی پر مبنی غیر حقیقت پسندانہ سوچ کی عکاسی کرتا تھا اور یہ موقف ہندوستان کا بھی نہیں تھا۔ اب ہندوستان کو سوویت یونین کی طرف سے حمایت ملنے کی وجہ سے ریاست کے مسائل حل کرنے میں اس کی دلچسپی کم ہوتی جارہی تھی۔ اندرونِ ریاست شیخ عبداللہ جیسی بڑی کشمیری لیڈر شپ کو جیل میں ڈال کر اپنے حمایتی ٹولے کی مدد سے کشمیری عوام پر زبردستی اپنا تسلط قائم کر چکا تھا۔ شیخ عبداللہ جس نے دن رات ایک کر کے ریاست کو ہندوستان کا حصہ بنانے کی کوشش کی تھی، آج منظر سے غائب کر دیا گیا تھا اور ریاست پر ایک طرف ہندوستان تو دوسری طرف پاکستان اپنی پوزیشن کافی مضبوط کر چکا تھا، جن ریاستی لیڈروں نے 1947ء سے پہلے ریاست میں ہندوستان اور پاکستان سے الحاق کی مہم چلائی تھی وہ عبرت کا نشان بن جانے کے باوجود کچھ بھی سیکھنے اور سمجھنے سے قاصر تھے لیکن ریاستی عوام دونوں طرف محکومیت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ریاست کے ٹکڑے کرانے کے باوجود ریاستی لیڈروں کو دونوں طرف نہ کوئی شرمندگی تھی نہ کوئی پچھتاوا تھا۔

ایک طرف ہندوستان اور پاکستان کے حکمران ریاست پر اقوام متحدہ میں تماشا لگانے کے بعد بڑی طاقتوں کے آلہ کار بن کر ساری دنیا کو شرمندہ کر رہے تھے تو دوسری طرف اندرونِ ملک ایک دوسرے کے خلاف دُشمنی کا ڈھونگ کر رہے تھے۔ ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں بڑی طاقتوں کا کھیل بنا کر اس کا حصہ بننے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں ملکوں کے حکمران دراصل سامراج کی ملی بھگت سے اپنے عوام اور جنوبی ایشیاء کے خطے میں مسائل کو مزید الجھا چکے تھے ایسے حالات میں بڑی طاقتوں کو آپس میں خطوں پر کشمکش تو ان کے مفادات کا تقاضا تھا لیکن ہندوستان اور پاکستان کے حکمرانوں کی نااہلی، عوام دُشمنی اور خطے میں بڑی طاقتوں کی آلہ کاری کا کیا جواز تھا؟ اس خطے کو امریکی سامراج اور سوویت یونین کے مفادات کی بھینٹ چڑھانے سے اس خطے کی ترقی کو روک دیا گیا تھا۔

☆☆☆☆

آٹھواں باب

اقوام متحدہ میں ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ مزید الجھاؤ کا شکار

ریاست جموں وکشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے جا کر الجھانے میں ہندوستان اور پاکستان کا ہی ہاتھ تھا۔ شروع میں سیکیورٹی کونسل کے ممبران کی اس مسئلے سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی کیونکہ پہلے اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ یکطرفہ تھا۔ یعنی ہندوستان کی پاکستان کے خلاف شکایت تھی لیکن پاکستان نے ہندوستان کے خلاف بھی شکایت درج کروا کر اس مسئلہ کو دوطرفہ رضا کارانہ بنا دیا تھا۔ کیونکہ اقوام متحدہ نے باب نمبر 6(Chapter-6) کے تحت شکایت درج کی تھی جس کی اہمیت بعد میں دوطرفہ نوعیت کی بنا دی گئی۔ پاکستان نے ریاست جموں وکشمیر کے مسئلے کے ساتھ ہندوستان سے کچھ مزید مسائل بھی حل طلب قرار دیئے تھے اور اس طرح مسئلہ تو دوطرفہ ہوا لیکن اب ریاست کا سوال بھی ہندوستان اور پاکستان کا سوال بن گیا تھا۔ اس لیے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے بنائے گئے کمیشن کا نام بھی بدل کر کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان (UNCIP) رکھا گیا تھا۔ شروع میں سیکیورٹی کونسل کے ممبران نے نہ ہندوستان کی حمایت کی تھی نہ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اب دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا جب سے ریاست کا مسئلہ ہندوستان سیکیورٹی کونسل میں لایا تھا۔ اب پاکستانی

نمائندے نے سیکیورٹی کونسل میں پہلی بار چین کو مسئلے کا حصہ بناتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان نے چین کو اس کے حق میں سرحدوں کا تعین کرنے کی پیشکش کی تھی اور بدلے میں ریاست جموں وکشمیر کے تنازعہ پر اس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

30 اپریل 1962ء میں ہندوستان کے وزیراعظم نہرو نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کشمیر میں ہر طرح کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا وہ جارحیت پاکستان کے بھیجے گئے قبائلیوں کی ہو یا کسی اور طرف سے ہو۔نہرو نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ پاکستان کئی مہینوں سے قبائلیوں کو کشمیر پر ایک بار پھر حملہ کرنے کی تربیت دے رہا تھا۔نہرو نے پاکستان کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان نے اگر قبائلیوں کا کشمیر پر حملہ کرایا تو اس کا مطلب مکمل جنگ ہوگی۔دوسری طرف آزاد کشمیر جو علاقہ پاکستان کے کنٹرول میں تھا کے صدر خورشید حسن اور مسلم کانفرنس کے لیڈر چوہدری غلام عباس نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ دس ہزار رضا کار آزاد کشمیر میں جمع ہو چکے ہیں اور حکم کے انتظار میں تھے کہ لائن آف کنٹرول عبور کرتے ہوئے ہندوستان کی طرف لڑنے کے لیے جائیں گے یہ بھی پاکستان کی ہی ایک چال تھی تا کہ اقوامِ متحدہ میں یہ تاثر دیا جائے کہ کشمیر میں تشویشناک صورتحال تھی اور اس کی وجہ سے پورے خطے کے امن کو خطرہ لاحق تھا تا کہ اس مسئلے کی اہمیت بنائی جائے لیکن بار بار ایسی حرکتوں کی وجہ سے پاکستان کو بڑی کامیابی تو حاصل نہ ہوئی لیکن آئندہ سیکیورٹی کونسل کا اجلاس بلایا گیا تھا۔21 جون 1962ء میں سیکیورٹی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں امریکی نمائندے نے سیکیورٹی کونسل میں ہونے والی بحث کا خلاصہ پیش کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس مسئلے پر سیکیورٹی کونسل کے ممبران کی اکثریت کے درمیان مندرجہ ذیل نکات پر اتفاق پایا جاتا ہے۔

۱۔ اس بات پر اطمینان ہے کہ دونوں ملک اس تنازعہ کو حل کرنے کے لیے جنگ کا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔

۲۔ اس بات پر سمجھوتہ کہ اقوام متحدہ کے کمیشن اور سیکیورٹی کونسل کی قراردادیں ابھی تک قابلِ اطلاق ہیں۔

۳۔ اس بات پر سمجھوتہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان بات چیت کریں گے۔

۴۔ چند ممبران کے درمیان سمجھوتہ تھا کہ دونوں فریق اپنے آپ کو غیر جانبدار تیسرے فریق کی بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

۵۔ اس مسئلے پر سیکیورٹی کونسل کی ذمہ داری سے آگاہ ہونا اس پر سوویت یونین کے نمائندے موروزف (Morozov) نے کہا تھا کہ امریکی وفد نے نامکمل، غلط اور ناکام کوشش کی ہے اس بحث کا خلاصہ نکالنے کے لیے اور اس کا جو نتیجہ نکالا گیا تھا، ان کے لیے وہ قبول نہیں تھا۔ سوویت نمائندے نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ سیکیورٹی کونسل کے چند ممبران ہی کشمیر پر بحث کو جعلی طریقے سے لمبا کرنا چاہتے تھے۔ باقی سیکیورٹی کونسل کو صرف یہ نوٹ کرنا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان نے یہ بیان کیا کہ وہ کشمیر کے علاقے میں اپنی فوجوں کو استعمال نہیں کریں گے۔ اس بحث کے دوران آئرلینڈ کے نمائندے نے ایک قرارداد سیکیورٹی کونسل میں پیش کی تھی۔ اس قرارداد میں ریاست جموں کشمیر میں استصواب رائے کرانے کی تجویز پیش کی تھی لیکن سوویت نمائندے نے اس قرارداد کی بھی مخالفت کی تھی۔ جب یہ آئرش نمائندے کی یہ قرارداد 3 جون 1962ء کو ووٹنگ کے لیے پیش کی گئی تھی تو سوویت نمائندے نے اس قرارداد کو ویٹو کر دیا تھا اور قرارداد سیکیورٹی کونسل میں قبول نہیں ہوئی تھی۔ سوویت نمائندے نے ایک بار پھر کہا تھا کہ ریاست میں رائے شماری کی تجویز مُردہ اور پرانی ہو چکی تھی اور ریاست کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو چکا تھا۔ چونکہ رائے شماری کا سوال پاکستان کی فوج کے ریاست سے انخلاء سے جڑا ہوا تھا، پاکستان نے وہ شرط پوری نہیں کی تھی۔ سوویت یونین نے ریاست کے مسئلہ پر پہلے دو قراردادیں ویٹو کی تھیں۔ نہرو نے سوویت یونین کا شکریہ ادا کیا جو اس نے آئرش قرارداد کو ویٹو کیا تھا لیکن برطانیہ اور امریکہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ دونوں ملک ہندوستان پر غیر ضروری دباؤ ڈالتے ہیں جو پاکستان کی حمایت کے لیے ہوتا ہے۔ اکتوبر 1962ء میں چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا اور امریکہ اور برطانیہ نے ہندوستان کی فوجی مدد کی تھی اور اس وقت چین نے ہندوستان کی جنگ کو ایک سنہری موقع سمجھتے ہوئے ریاست کے مسئلے کو پاکستان کی حمایت میں حل کرانے کی کوشش کی تھی دونوں ملکوں نے ہندوستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ ریاست کے مسئلے پر پاکستان سے بات چیت کرے لیکن نہرو نے

اس وقت ریاست کا مسئلہ کھڑا کرنے پر رضامندی ظاہر نہ کی۔

البتہ پاکستان سے دوطرفہ بات چیت کرنے اور ریاست کے مسئلہ پر بحث کرنے پر آئندہ کے لئے رضامندی ظاہر کی تھی۔ نہرو کے اس بیان پر کہ وہ ریاست کے مسئلے پر پاکستان سے بات چیت کرے گا۔ ماسکو نے اس پر حیرت اور کنفیوژن کا اظہار کیا تھا۔ جونہی سوویت یونین نے نہرو کے بیان پر ردعمل ظاہر کیا تھا فوراً کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی طرف سے کہا گیا کہ ریاست جموں وکشمیر کے مسئلے پر پاکستان سے بات چیت کرنے پر راضی ہونے سے ہندوستان کی عزت اور اس کی سالمیت کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا کیونکہ یہ بیرونی دباؤ کے تحت تجویز قبول کی گئی تھی۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی سنٹرل کمیٹی نے کہا کہ ریاست کے مسئلے پر برطانیہ اور امریکہ کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا اور انہوں نے ہندوستانی حکومت سے کہا کہ کسی بھی ایسی تجویز پر توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی جس میں ریاست جموں کشمیر کی حیثیت کو بدلنے کی بات کی گئی ہو۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی اپنی سرے سے کوئی سوچ ہی نہیں تھی وہ ہر اس بات کی حمایت کرنے لگتے تھے جو سوویت یونین کی حکومت کا موقف ہوتا تھا چاہے وہ کتنا ہی غلط اور رجعت پسندانہ کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بات چیت ہوئی جس طرح توقع کی گئی تھی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کیونکہ پاکستان نے چین کے ساتھ سرحدوں کے تعین پر معاہدے کا اعلان ہندوستان سے بات چیت شروع ہونے سے چند گھنٹے پہلے کر دیا تھا۔ اس غیر واضع سمجھوتے کا اعلان پاکستان نے ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے کیا تھا تا کہ وہ ہندوستان سے ریاست کے مسئلہ پر فائدہ حاصل کر سکے۔ نیو یارک ٹائمز نے بھی اس اعلان کو ہندوستان کو جان بوجھ کر غصہ دلانے کے لیے کیا گیا عمل قرار دیا تھا۔ چین اور ہندوستان کی سرحدی جنگ کے بعد امریکن اور برطانوی فوجی مشن (Military Mission) کا دہلی میں جانے کا تسلسل شروع ہو گیا تھا جس کا سوویت یونین پر بڑا سخت اثر ہوا تھا۔

سوویت یونین کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ چین کے دباؤ کی وجہ سے جو شمالی سرحد کی طرف سے تھا ہندوستان کہیں اپنی غیر جانبدار خارجہ پالیسی کو ختم کر کے مغربی ملکوں کے بلاک

میں شامل نہ ہو جائے۔ سوویت یونین نے کہا تھا کہ امریکن اور برطانوی مشن ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی تنازعہ پر امن کروانے کے لیے نہیں آئے بلکہ اس خطے میں تلخیوں اور تنازعات کو مزید بڑھانے کے لیے آتے تھے۔ سوویت یونین نے کہا کہ امریکن اور برطانیہ ہندوستان اور پاکستان کو یہ مشورہ دے چکے ہیں کہ دونوں ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ پر تلخی اور دُشمنی کا رویہ ختم کریں اور انہوں نے کہا کہ مغربی طاقتیں ہندوستان کو زبردستی دباؤ ڈال کر سیٹو (SEATO) کا حصہ بنانے کی کوشش کر رہی تھیں اور بلیک میل کی پالیسی استعمال کر رہی تھیں۔ کشمیر پر حمایت سے محروم ہونے کی دھمکی دے رہے تھے۔ سوویت یونین نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ چینی حملے کے دوران امریکہ نے ہندوستان کو جو اسلحہ دینے کا فیصلہ کیا تھا وہ امریکہ کی سفارتی گیم کا حصہ تھا جو ایک طرف تو کشمیر کے سوال پر اور دوسری طرف چین پاکستان سرحدی سمجھوتے پر عدم اطمینان کا اظہار بھی تھا۔ اسی دوران مغربی ملکوں کی پریس میں ایسی رپورٹس بھی سامنے آئیں تھیں کہ سوویت یونین ممکن ہے ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ پر اپنے رویئے میں تبدیلی لائے۔ لیکن ماسکو نے فوری مغربی پریس کی رپورٹوں کی تردید کی تھی اور ہندوستان کو یقین دلایا تھا کہ اس کی کشمیر پالیسی تبدیل نہیں ہوئی اور سوویت یونین کشمیر کو ہندوستان کا حصہ تصور کرتا تھا۔ اقوام متحدہ میں بھی ہندوستانی نمائندے وجے لکشمی پنڈٹ کو سوویت وزیر خارجہ گرومیکو (GROMYKO) نے بتایا تھا کہ کشمیر پر سوویت یونین کا موقف نہیں بدلا تھا۔ ماسکو میں وزیر اعظم خروشیف نے کہا تھا کہ اگر ہندوستان کو کشمیر میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا سوویت یونین اس پر ہندوستان کی مدد کے لیے تیار تھا۔ سوویت یونین نے نہرو کے اس فیصلے کی بھی حمایت کی تھی جس میں اس نے ریاست جموں کشمیر کا سپیشل درجہ ختم کر کے اسے ہندوستانی یونین میں ضم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ دوسری طرف ایوب خان نے 1963ء میں ماسکو سے مدد کی اپیل کی تا کہ پاکستان ایک بار پھر ریاست کا مسئلہ سیکیورٹی کونسل میں لا سکے لیکن ماسکو نے پاکستان کی اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ اس نے پاکستان کو ایک بار پھر مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے تنازعات ہندوستان سے پر امن طریقے سے حل کرے۔ اس طرح سوویت یونین نے اپنی پالیسی کو اسی طرح جاری رکھنے کا اعادہ کیا تھا لیکن امریکہ نے

ان حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب سے چین پاکستان کا سرحدی معاملات پر سمجھوتہ ہوا تھا کشمیر میں صورتحال کی نوعیت بدل چکی تھی۔ اب پاکستان کو یہ محسوس ہو گیا تھا چین کا ہندوستان پر حملہ اور پاکستان اور چین کا سرحد پر سمجھوتہ کی وجہ سے امریکہ کی کشمیر پر اور پاکستان کی حمایت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لیے اب پاکستان نے کچھ ایسے اقدامات کیے تھے جس سے سوویت یونین سے اس کے تعلقات نارمل ہو جائیں۔ تاہم پاکستان کے ان اقدامات کے باوجود ماسکو کے کشمیر کے مسئلے پر جو رویہ پہلے سے تھا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

اپریل 1964ء میں سوویت کونسل جنرل نے کلکتہ سے یہ بیان جاری کیا تھا کہ سوویت حکومت ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان کا حصہ تصور کرتی ہے اور ہندوستان کی علاقائی سالمیت کی ہمیشہ حمایت کرے گی۔ جولائی 1964ء میں ہندوستان کے وزیر تعلیم نے سوویت یونین کا دورہ کیا تو سوویت وزیر خارجہ گرومیکو (GROMYKO) نے ایک بار پھر یقین دہانی کرائی کہ سوویت یونین کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کی حمایت جاری رکھے گا۔ اکتوبر 1964ء کے شروع میں پاکستان کی قومی اسمبلی کے ایک وفد نے سوویت وزیر اعظم خروشیف سے ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں سوویت وزیر اعظم نے پاکستانی وفد کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان اپنے مسائل پر امن طریقے سے حل کریں اور ہندوستان سے دوستانہ تعلقات قائم کریں کیونکہ وہ ایک عظیم ملک تھا یہ تو سوویت یونین کا رویہ تھا جو اپنی ریاستی پالیسی کی بنیاد ہی امریکہ اور مغربی ملکوں کی مخالفت پر قائم رکھے ہوئے تھا، جبکہ چین کی پالیسی ریاست کے بارے میں محتاط اور بکھری ہوئی تھی۔ ہندوستان اور چین کی دوستی کے وقت میں بھی چین نے کشمیر پر ہندوستان کی حمایت نہیں کی تھی۔ چین نے کبھی بھی سرے عام ریاست کے بارے میں کوئی بیان نہیں دیا تھا لیکن ذاتی ملاقاتوں میں چین ہندوستان کو یقین دہانی کراتا رہا تھا کہ وہ کشمیر کے مسئلہ پر ہندوستان کی پوزیشن کو قبول کرتا ہے۔ چینی کلچرل میشن نے 1951ء میں پہلے سے طے شدہ کشمیر کا دورہ ملتوی کر دیا تھا اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی تھی۔

1954ء میں ماؤزے تنگ نے اقصائے چن پر قبضہ کرنے کے لیے سوویت

یونین سے مدد مانگی تھی۔ دسمبر 1954ء میں چین نے ایک نقشہ شائع کیا تھا جس میں لدّاخ کا بہت بڑا علاقہ چین کا حصہ دکھایا تھا۔ 1955ء میں چین نے ہندوستان کی کشمیر کے مسئلہ میں بلاوجہ حمایت کرنے پر روس سے ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ 16 مارچ 1956ء میں چیون لائی نے ایک ہندوستانی وفد کو بتایا تھا کہ جو اس وقت بیجنگ میں تھا۔ چین کو یقین ہے کہ ریاست جموں کشمیر کے عوام اپنی ریاست کے مستقبل کے حوالے سے اپنا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس یقین دہانی کے 6 ماہ بعد چیون لائی نے پاکستانی وزیر اعظم حسین شہید سہروردی سے بات چیت کرتے کہا تھا کہ چین ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کو بہت اہم ایشو سمجھتا تھا اور اس تنازعہ میں چین غیر جانبدار تھا۔ چیون لائی کے اس بیان نے پاکستان کے لیڈروں کی حوصلہ افزائی کی تھی اور وہ بیجنگ کو مستقبل میں ہندوستان کے خلاف اپنا ممکنہ اتحادی سمجھتے تھے جو پاکستان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ 9 دسمبر 1956ء میں چیون لائی نے ایک بار پھر اس بات کو دوہرایا تھا کہ چین ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر غیر جانبدار تھا اور چین ریاست کے ایشو کو اہم مسئلہ سمجھتا ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی بہت اہم مسئلہ ہے۔° لیکن چین نے پاکستان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ریاست کا تنازعہ ہندوستان سے براہِ راست حل کرے جو بیرونی مداخلت کے بغیر ہو۔ 5 فروری 1957ء میں چیون لائی نے سری لنکا کے وزیر اعظم بندرا نائیکے کے ساتھ ایک بار پھر مشترکہ بیان میں کہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان ریاست کے مسئلہ کا پرامن حل تلاش کریں۔

11 اپریل 1957ء میں صرف دو ماہ بعد پولینڈ کے وزیر اعظم سے ایک پیغام میں چیون لائی نے پھر کہا تھا کہ ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ ہندوستان اور پاکستان پرامن بات چیت سے حل کریں اور بیرونی قوتوں کو اس مسئلہ کو اس خطے میں کشیدگی پیدا کرنے کے لیے استعمال نہیں کرنے دینا چاہیے۔ چیون لائی نے کہا تھا کہ بیرونی قوتوں سے اس کی مراد سوویت یونین بھی ان میں شامل تھا اور کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ماسکو اس سے دور رہے۔ اس کے بعد 2 جون 1957ء میں ماؤزے تنگ نے عوامی سطح پر اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ چین ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر غیر جانبدار تھا اور سوویت یونین اور دوسرے کیمونسٹ

ملکوں سے اپیل کی تھی کہ وہ بھی سخت غیر جانبداری کی پالیسی اس مسئلہ کے حوالے سے اختیار کریں۔ پاکستان کے اس وقت کے وزیر خارجہ فیروز خان نون نے ماؤ کے اس بیان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر سوویت یونین بھی چین کی طرح کی پالیسی اور رویہ اس مسئلے میں اختیار کرے اور بھارت کی ویٹو کے زریعہ مدد نہ کرے تو یہ مسئلہ فوراً حل ہوسکتا ہے۔

ہندوستان نے ماؤ کے ان بیانات کو نظر انداز کیا تھا اور چیون لائی کے بیانات کو بھارت کا کشمیر پر حق تسلیم کرنے کے مترادف قرار دیا تھا۔لیکن جلد ہی ہندوستان کو احساس ہوگیا تھا کہ وہ چین کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھا۔ کیونکہ 1958ء کے موسم بہار میں بھارتی حکومت کو علم ہوا کہ چین نے ایک فوجی سڑک خفیہ طریقے سے تعمیر کرلی تھی جو اقصائے چن سے گزرتی ہوئی چینی صوبے سنگیانگ کو مغربی تبّت سے ملاتی تھی۔ جب ہندوستانی فوج نے اپنی پٹرول کرنے والی فوجی پارٹی اس علاقے کو چیک کرنے کے لیے بھیجی تو چینی سرحدی گارڈز نے انہیں گرفتار کرکے ایک ماہ تک اپنی قید میں رکھا تھا۔ جب ہندوستان نے اس پر چین سے احتجاج کیا تو چیون لائی نے کہا تھا کہ سنکیانگ تبّت ہائی وے مکمل طور پر چین کے اپنے علاقوں سے گزرتی تھی لیکن ہندوستان نے چین کے اس دعوے کو مسترد کردیا تھا۔سوویت یونین نے بھی چین کے اس دعوے کو مسترد کردیا تھا کہ یہ ہائی وے چینی علاقوں سے گزرتی تھی۔

چین اس ہائی وے کے ذریعہ سنٹرل ایشین ریاستوں میں اپنا اثر رسوخ بڑھانے کی کوشش کررہا تھا اور یہ صورتحال سوویت یونین کے لیے تشویش پیدا کررہی تھی۔ بہرحال چین کی حکومت نے اقصائے چن کے علاقوں کو ہندوستان کی مرضی کے بغیر ہی استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ 1958ء میں چین نے ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر اپنا دعویٰ کرنا شروع کردیا تھا اور مغربی سیکٹر میں چین نے 33 ہزار مربع میل علاقہ پر اپنی مانگ کی تھی۔اب چین کی پالیسی کشمیر کے حوالے سے بھی بدلنا شروع ہوگئی تھی۔ اب چین نے کشمیر کا ایشو بھی ہندوستان کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور پاکستان سے تعاون کرکے ہندوستان کے خلاف دوسرا محاذ بھی کھول دیا تھا۔اپریل 1959ء میں کیمونسٹ پارٹی آف چین کی سنٹرل کمیٹی کے کئی خفیہ اجلاس کئے گئے ان خفیہ اجلاسوں میں ہندوستان کے بارے میں چین کی

پالیسی کا نئے سرے سے جائزہ لیا گیا تھا اور یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ریاست جموں کشمیر کے بارے میں اب نئی پالیسی بنائی جائے گی تا کہ ہندوستانی لیڈرشپ کو سبق سکھایا جائے۔اس کے بعد مئی 1959ء میں دہلی میں موجود ایک چینی وفد نے ہندوستان کو وارننگ دیتے ہوئے کہا تھا کہ بیجنگ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ریاست کے تنازعہ کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے گا اور پاکستان سے مل کر ہندوستان کے خلاف دوسرا محاذ کھولے گا۔ اس ورانگ کے 3 ماہ بعد چیون لائی نے ایک خط میں 12 ہزار مربع میل لدّاخ کا علاقہ اپنا قرار دیا تھا۔ ہندوستانی علاقے کو اپنا قرار دینے کے ایک ماہ بعد چینی لدّاخ میں بہت زیادہ اندر تک آ گئے تھے۔ 1959ء کے موسم سرما میں چین کے سرحدی محافظوں اور ہندوستانی فوج کی ایک گشتی پارٹی کے درمیان شدید جھڑپ ہوئی تھی۔ 21اکتوبر 1959ء میں دہلی کو یہ حیرت انگریز خبر ملی تھی کہ ہندوستانی فوج کی ایک گشتی پارٹی پر اچانک چینی فوج نے حملہ کر کے 9 فوجی مار دیئے تھے اور 10 کو پکڑ لیا تھا۔ یہ مسلح تصادم سوویت یونین کے لیے بھی بہت اہم تھا کیونکہ چین اقصائے چن میں اپنی فوجی پوزیشن کو مضبوط کرنے سے سنٹرل اشیاء میں نفسیائی برتری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے سوویت یونین ایسی صورت میں اپنے آپ کو بہت ہی مشکل حالت میں محسوس کر رہا تھا۔

31اکتوبر 1959ء میں سپریم سوویت میں خارجہ پالیسی پر اپنا بیان جاری کرتے ہوئے سوویت وزیراعظم خروشیف نے لدّاخ کے واقعہ پر شدید دکھ کا اظہار کیا تھا اور دونوں ملکوں سے اپیل کی تھی کہ وہ دوستانہ ماحول میں ایک دوسرے سے بات چیت کریں۔سوویت یونین کے اس بیان پر چین نے بہت زیادہ ناراضگی کا اظہار کیا تھا اس لیے خروشیف نے جلد ہی دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی تنازعہ میں سوویت یونین کے غیر جانبدار ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔تاہم کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا اس بار تقسیم نظر آئی تھی کیونکہ کئی کیمونسٹ لیڈروں اور صوبائی تنظیم کے یونٹوں نے چین کے لدّاخ میں فوج پر حملے کی شدید مذمت کی تھی۔ پارٹی کے مرکزی بیان میں بھی اس عمل کو رد کیا گیا تھا لیکن چین پر کوئی الزام نہیں لگایا گیا تھا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں ڈانگے (Dange) جو کیمونسٹ پارٹی انڈیا کا لیڈر تھا نے چین کی شدید مذمت

کی تھی جبکہ 24 اکتوبر 1959ء میں مغربی بنگال کے کیمونسٹ اخبار نے چینی کیمونسٹ پارٹی کی طرف سے چھاپی گئی رپورٹ کو اپنے اخبار میں دوبارہ چھاپا اور جیوتی باسو جو کیمونسٹ پارٹی انڈیا کی طرف سے مغربی بنگال کے بعد میں وزیر اعلیٰ بھی رہے تھے ان کا بیان چین کے لدّاخ پر موقف کی حمایت میں چھپا تھا۔ اس طرح چین نے ہندوستان کی حوصلہ شکنی اور پاکستان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ 23 اکتوبر 1959ء میں پاکستان کے صدر ایوب خان نے اعلان کیا تھا کہ اس کی حکومت جلد ہی چین سے سرحد کے تعین پر بات چیت تجویز کرے گی۔ چین کو پاکستان کی طرف سے اس طرح کی شروعات پر جلد جواب کی توقع نہیں تھی لیکن پاکستان کی طرف سے چین کے ساتھ سرحد کے معاملات پر سمجھوتہ کرنے کی شروعات نے چین میں بڑی امیدیں پیدا کر دیں تھیں۔ جب ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی تنازعہ پر بات چیت شروع ہوئی تو چین نے پاکستان کے زیر انتظام ریاست کے وہ علاقے جو قراقرم کے مغرب کی طرف تھے ان پر بات کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان پر بات چیت ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کو حل ہونے تک انتظار کرنا ہوگا۔ تاہم چین نے پاکستان سے دوستی کرنے اور اسے ہندوستان کے خلاف اتحادی بنانے میں بہت محتاط تیاری کی تھی اور ریاست جموں کشمیر میں اس کے ذریعہ ہندوستان کے خلاف پراکسی جنگ شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

15 جنوری 1961ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ منظور قادر نے پشاور میں طالب علموں کے ایک گروپ سے بات چیت میں کہا تھا کہ چین پاکستان کی درخواست پر اصولی طور پر راضی ہو گیا تھا کہ اس کا پاکستان سے سرحد کا تعین ہو جائے۔ اس بیان کے 5 دنوں بعد پاکستان کے صدر ایوب خان نے کہا تھا کہ چین اور پاکستان کے درمیان غیر متعین شدہ سرحد موجود تھی اور پاکستان نے چین سے درخواست کی تھی کہ اسے متعین کر دیں اور اشارے ہیں کہ چین بھی ایسا کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے بعد ہندوستان نے پاکستان کو ایک پیغام بھیجا تھا کہ ساری ریاست جموں کشمیر نے 1947ء میں ہندوستان سے الحاق کیا تھا اور پاکستان کے کسی حصے سے چین کی کوئی سرحد نہیں ملتی۔ دہلی نے پاکستان کے چین کے ساتھ ریاست جموں

کشمیر کے علاقوں پر بات چیت کرنے کے حق کو مسترد کر دیا تھا۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سیکرٹریٹ سے ایک بیان میں ڈاکٹر زیڈ اے احمد نے کہا کہ ریاست کے وہ علاقے جو پاکستان کے زیر انتظام ہیں وہ بھارت کا حصہ ہیں اور پاکستان ان علاقوں پر ان کے ساتھ لگنے والے علاقوں کا کسی دوسروں ملک کے ساتھ سرحد کا تعین کرنے اور بات چیت کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ تاہم ایوب خان نے ہندوستان کے احتجاج کو مسترد کر دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ پاکستان چین کے ساتھ اپنے ملک کا ان علاقوں میں سرحد کا تعین کرنے کا پورا حق رکھتا تھا۔ یہ بھی کہا کہ چین سے سرحد کا تعین کرنے کے لیے بات چیت کا حق بھی رکھتا تھا۔

پاکستان نے 16 مارچ 1961ء میں چین کو ایک پیغام بھیجا تھا کہ وہ چین اور پاکستان کی سرحد کے تعین کے لیے بات چیت کا خواہشمند تھا۔ دوسری طرف 16 جولائی 1961ء میں چیون لائی نے ہندوستانی وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل کو بتایا تھا کہ پاکستان نے چین سے سرحد کے تعین پر بات کرنے کی تجویز دی تھی لیکن چین کی حکومت نے ان سے اس لئے بات چیت نہیں کی تھی کہ چین ہندوستان کی قبولیت کے بغیر پاکستان سے مستقبل میں کوئی بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بیان کے دو ماہ بعد چین کی حکومت ان پاکستانی تجاویز کا جائزہ لے رہی تھی اور بہت جلد پاکستان کو اس بارے میں مطلع کرنے والی تھی۔

دسمبر 1961ء کے شروع میں ایک چینی وفد ایوب خان سے ملا تھا تاکہ سرحد کے تعین پر بات چیت کی جائے۔ اچانک چین نے سرکاری سطح پر ریاست جموں کشمیر کا ہندوستان سے الحاق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ہندوستان سے ریاست کے ان علاقوں پر بات چیت سے انکار کر دیا تھا جو قراقرم کے مغرب کی طرف واقع تھے۔ چین کے اس مخالفانہ رویے نے کشمیر پر ہندوستان کی تشویش میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے دہلی نے کچھ فوری اقدامات کیے تاکہ اقصائے چن میں اپنی فوجی پوزیشن کو مضبوط کر سکے۔ ہندوستان نے سرینگر سے لیہہ تک ایک سپلائی روڈ مکمل کی تھی اور لدّاخ میں اپنی فوجی چوکیاں قائم کرنی شروع کر دیں اور ایک بہت اہم فوجی چوکی قراقرم پاس کے قریب تعمیر کی تھی جو ہندوستان کی طرف سے آنے والے راستے میں سنگیانگ سے دوسری طرف سنٹرل اشیاء سے ملتی تھی۔ 1961ء کے آخر تک

ہندوستان چین سے کچھ علاقے واپس لے چکا تھا اور اپنی فوجی چوکیوں میں بھی اضافہ کر چکا تھا۔ آہستہ آہستہ ہندوستان نے چین کے لیے لدّاخ میں مزید آگے بڑھنا ناممکن بنا دیا تھا۔ تاوقتیکہ کہ دونوں میں کوئی بڑی جنگ ہو جائے ہندوستان کی ان فوجی چوکیوں کی تعمیر پر چین نے احتجاج کیا تھا لیکن ہندوستان نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ نومبر 1961 میں چین نے ہندوستان کو دھمکی دی تھی کہ بھارت یہ غلط اور خطرناک حکمت عملی ترک کرے اور اگر ہندوستان نے یہ فوجی آپریشن بند نہ کیا تو چین کو بھی یہ حق ہوگا کہ وہ اپنی فوج ہمالیہ کی بلند چوٹیوں سے لے کر اس کے وسیع جنوبی حصوں تک بھیجے۔

1962ء کے موسم بہار تک ہندوستان نے کئی فوجی آپریشن اقصائے چن میں جاری رکھے جن کی وجہ سے فوجی صورتِ حال میں شدید تبدیلی آ گئی تھی۔ 1962ء کے وسط تک ہندوستان اپنی 43 فوجی چوکیاں مزید بنا چکا تھا اور یہ ساری ان علاقوں میں بنائی گئی تھیں جن پر چین کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کا علاقہ تھا۔ اب چین کی پریشانی بڑھ گئی تھی اور ہندوستانی فوجی پوزیشن مضبوط ہونے سے وہ کسی بھی وقت چینی فوج کی سپلائی لائن کاٹ سکتے تھے اور چینی فوج کو ہراساں کر سکتے تھے۔ اب چین کی تشویش لدّاخ میں بڑھ گئی تو وہ پاکستان کے ساتھ سرحدی سمجھوتہ کرنے پر متوجہ ہوا۔ 12 فروری 1962ء میں چین نے پاکستان کو ایک پیغام بھیجا تھا جس میں بارڈر سمجھوتہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی گئی تھی چین کے اس پیغام کو پاکستان نے بارڈر سمجھوتے کے لئے اگلا قدم قرار دیا تھا۔

3 مئی 1962ء میں چین اور پاکستان نے اعلان کیا تھا کہ دونوں ملک ایک عارضی باڈر کی حد بندی لائن بنانے کے لیے بات چیت پر راضی ہو چکے تھے خاص کر کے ان علاقوں کی حد بندی کے لیے جو چینی سنگیانگ سے ملتے تھے اور مکمل طور پر پاکستان کے کنٹرول میں تھے۔ یہ بارڈر سمجھوتہ اس وقت ختم ہو جائے گا جب ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حل ہو جائے گا۔ اس وقت اس علاقے پر حتمی اتھارٹی قائم ہونے سے چین سے وہی اتھارٹی حتمی حل کے لیے بات چیت کرے گی۔ ہندوستان نے اس بات چیت پر دونوں ملکوں سے شدید احتجاج کیا تھا اور پاکستان کے اس حق پر سوال اٹھایا تھا کہ وہ قراقرم

کے مغربی علاقوں پر کسی دوسرے ملک سے باڈر سمجھوتہ کر سکتا تھا کیونکہ ہندوستان ان علاقوں پر پاکستان کا قبضہ غیر قانونی سمجھتا تھا۔ ہندوستان نے کہا تھا کہ پاکستان کسی ایسے علاقے پر چین یا کسی اور ملک سے کس طرح بات چیت کر سکتا تھا جو علاقے اس کے اپنے ہیں ہی نہیں۔ ہندوستان نے چین پر بھی الزام لگایا تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے اختلافات کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ انہوں نے چینی وزیر اعظم کے سابق بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ چین پہلے ہی یہ بات قبول کر چکا تھا کہ ریاست جموں کشمیر کے عوام ہندوستان سے الحاق کر کے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ چین نے ہندوستان کے اس موقف کو مسترد کر دیا تھا اور کہا تھا چین نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا کہ ریاست جموں کشمیر ہندوستان کا حصہ بن چکی تھی۔ یہ چین کے بارے میں ہندوستانی سفارتکاروں کے لیے اپنے اندازے تھے۔ تاہم چین اور پاکستان نے سرحد کی حد بندی کے لیے اپنی بات چیت جاری رکھی ہوئی تھی۔

جولائی 1962ء میں چین اور پاکستان نے آپس میں نقشوں کا تبادلہ بھی کیا تھا اور آپس میں باڈر سمجھوتے کے طریقہ کار پر بھی بات چیت کی تھی۔ لیکن اصل بات چیت 13 اکتوبر 1962ء میں شروع ہوئی تھی جو چین کے ہندوستان پر حملے سے پر ایک ہفتہ پہلے کا وقت تھا۔ 26 دسمبر 1962ء میں چین کی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ ان کا پاکستان کے ساتھ مشترکہ سرحد پر ایک مکمل باڈر سمجھوتہ ہو گیا تھا اور باڈر کی یہ ترتیب (Arrangement) سنگیا نگ اور ہنزہ کے ساتھ ملحقہ علاقوں پر ہوئی تھی جو علاقہ گلگت ایجنسی کا آخری حصہ تھا۔ دو دنوں کے بعد چین اور پاکستان نے اپنے اعلان میں یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ جتنا جلدی ممکن ہو سکے دونوں ملک باڈر سمجھوتے پر دستخط کرنا چاہتے تھے۔ چین نے ایک بار پھر کہا تھا کہ یہ باڈر سمجھوتہ عارضی ہو گا اور اس کی جگہ اس وقت کوئی دوسرا معاہدہ لے لے گا جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ حل ہو جائے گا۔ آخر 2 مارچ 1963ء میں چین اور پاکستان نے سرحد کی حد بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیئے تھے۔ ہندوستان نے دونوں ملکوں کو سنگین نتائج کی دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سرحدی سمجھوتہ غیر قانونی تھا۔

ہندوستان نے چین کے اس عمل کو دھوکہ دہی قرار دیا تھا اور ریاست جموں کشمیر کے مسئلے پر چین کی دھوکہ دہی کی شدید مذمت کی تھی۔ ہندوستان نے کہا تھا کہ چین اور پاکستان کی کوئی مشترکہ سرحد نہیں تھی اور ساری ریاست جموں کشمیر ہندوستان کا حصہ تھا۔ ہندوستان نے اس سرحدی معاہدے کو چین کے حق میں اور اس کے لیے فوجی فائدے کا سمجھوتہ قرار دیا تھا۔ سوویت یونین جو ریاست جموں کشمیر کے مسئلے میں ہندوستان کا حمایتی تھا چین اور پاکستان کے اس سرحدی معاہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس بات کو دوہرایا تھا کہ ریاست جموں وکشمیر ہندوستانی یونین کا حصہ تھا۔ امریکہ نے بھی چین اور پاکستان کے درمیان سرحدی معاہدے پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ چین گلگت اور اس کے گردونواح کے علاقوں کو اپنے کنٹرول اور اثر میں رکھنا چاہتا تھا۔ یہ معاہدہ چین کو گلگت میں امریکہ کے تعمیر کیے گئے (Airfield) ائیر فیلڈ کے قریب لے آیا تھا۔ گلگت ائیر فیلڈ سے چینی ایئر کرافٹ (Aircraft) بڑی آسانی سے سنٹرل اشیاء کی صنعتی ریاستوں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ اس لئے گلگت اور اس کے گردونواح کے علاقوں کا کنٹرول حاصل کرنا ہی چین کی کشمیر پالیسی کا مرکز بن گیا تھا۔

چین میں اس سرحدی معاہدے کو ایک عظیم فتح قرار دے کر خوب جشن منایا گیا تھا۔ چینی وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ اس سرحدی معاہدے میں ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کو خاص توجہ دی گئی تھی اور کشمیر کس کا حصہ ہے یہ ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا تھا اور چین کی حکومت کو امید تھی کہ ریاست کا مسئلہ پرامن طریقے سے حل کیا جائے گا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو سے ایک ملاقات میں ماؤزے تنگ نے کہا تھا کہ پاکستان نے ہندوستان سے کشمیر لینے کا موقع اکتوبر 1962ء میں ضائع کر دیا تھا جب چینی فوج ہندوستان کو ایک طرف دھکیل چکی تھی لیکن پاکستان امریکہ کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ اس سرحدی معاہدے کے بعد پاکستان نے کشمیر میں ایک نئی جنگ شروع کرنے کے لیے چین کی مدد پر انحصار کرنا شروع کر دیا تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار بھٹو نے پاکستان کی قومی اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان اور چین ہندوستان کے خلاف آپس میں فوجی مدد پر رضامند ہو چکے

تھے۔ایک ہفتے کے بعد پاکستانی وزیر خارجہ نے قومی اسمبلی میں پھر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہندوستان نے پاکستان کے خلاف کوئی جارحیت کی تو چین بھی اس میں پاکستان کی طرف سے ملوث ہوگا۔

بھٹو کی طرف سے اس اعلان کے بعد پاکستانی پریس نے ایک خبر نشر کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان چین کے فوجی ماہرین سے مدد حاصل کرے گا جو پاکستانیوں کو کشمیر آزاد کرانے کے لیے گوریلا جنگ کی تربیت دیں گے۔چین نے فوراً پاکستان کو یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر وہ ہندوستان سے کشمیر چھین لینا چاہتا تھا تو چین اس کی بھرپور مدد کرے گا۔ پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ایک چینی وفد نے ریڈیو پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ چین پاکستانی عوام کی مدد کرے گا اگر پاکستانی کشمیر کو ہندوستانی قبضے سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ چینی وزیر اعظم چیون لائی نے بیجنگ کے دور پر آئے ہوئے ایک پاکستانی وفد کو بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر کشمیر پر نئی جنگ شروع ہوئی تو چین کی حکومت پاکستان کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

1964ء کے شروع میں چینی وزیر اعظم چیون لائی اور وزیر خارجہ چن لی (Chen Yi) پاکستان کے دورے پر آئے تھے اورانہوں نے بار بار یہ دعوی کیا تھا کہ چین کشمیر کی آزادی کے لیے پاکستان کی مدد کرے گا۔چینی وزیر اعظم کے اس دورے کے بعد چین کے فوجی ماہرین کا ایک گروپ جو گوریلا جنگ کا ماہر تھا پاکستان پہنچا تھا تا کہ وہ پاکستانیوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دے سکے۔حکومت پاکستان نے چینی فوجی ماہرین کی مدد سے گوریلا جنگ کے کئی تربیتی مراکز قائم کیے تھے تا کہ ریاست جموں وکشمیر پر ایک نئی جنگ کا آغاز کیا جائے۔ پاکستان اور چین کے سرحدی معائدے اور دوستی میں سویت یونین میں نئی تشویش پیدا کردی تھی حالانکہ سوویت یونین میں خروشیف کی جگہ برزنیف نے قیادت سنبھال لی تھی ۔ سوویت یونین کے اس نئے لیڈر برزنیف نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کشمیر پر خروشیف کی پالیسی کو تبدیل کردے گا۔ برزنیف نے سوچا تھا کہ سوویت یونین کے مفادات کو برصغیر ہندوستان میں آگے بڑھانے کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستان اور پاکستان ایک متبادل طاقت کے طور

پر آزاد پالیسی اختیار کریں جو چین اور امریکہ دونوں کے اثر سے آزاد ہو۔ برزنیف کا خیال تھا کہ کشمیر کا تنازعہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان عدم استحکام اور تناؤ کا باعث بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے امریکہ اور چین کی اس خطے میں مداخلت بڑھ گئی تھی۔

یہ مداخلت سوویت یونین کے مقاصد کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ماسکو ہندوستان کے کشمیر میں مفادات اور اپنی دوستی متاثر کیے بغیر پاکستان سے اپنے تعلقات بڑھانا چاہتا تھا۔ اگر پاکستان ماسکو سے اپنے تعلقات قائم کرنے میں راضی ہو جائے تو یہ ہندوستان پاکستان کے تعلقات بہتر بنانے میں مددگار ہوسکتا تھا۔ اس طرح سوویت یونین دونوں ملکوں سے اپنا اتحاد بنانے کے خواب کی تعبیر دیکھ رہا تھا۔ سوویت یونین یہ سہہ فریقی اتحاد بنا کر امریکہ اور چین کی برصغیر میں مداخلت کے خلاف ہر طرح کا تحفظ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سوویت یونین کے لیے ریاست جموں وکشمیر کے گلگت کے علاقے جو پاکستان کے قبضے میں تھے، بہت اہم تھے۔ چین پاکستان سرحدی معاہدہ جو 1963ء میں کیا گیا تھا کی وجہ سے چین نے منٹا کا (Mintaka) پاس کے جنوبی علاقوں کا کنٹرول حاصل کرلیا تھا جس کی وجہ سے گلگت میں اس کی حیثیت مضبوط ہوگئی تھی۔ ماسکو کو شک تھا کہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں سرد مہری آچکی تھی۔ پاکستان میں امریکہ مخالف جذبات بہت بڑھ گئے تھے اور ماسکو کو یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان اب آزاد معاشی اور خارجہ پالیسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سوویت یونین کو یہ بھی یقین تھا کہ اگر پاکستان کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ ماسکو کے ساتھ قریبی سیاسی اور معاشی تعلقات قائم کرے تو ماسکو بڑی آسانی سے پاکستان سے امریکہ کا اثر ورسوخ ختم کروادے گا اور ساتھ ہی پاکستان کو چین کے قریب جانے سے بھی روک دے گا۔ ماسکو نے اپنی نئی پالیسی کی ابتداء کشمیر کو ہتھیار بناتے ہوئے اپنی خارجہ پالیسی کے مقاصد کو آگے بڑھاتے ہوئے پاکستان کے صدر ایوب خان کو ماسکو آنے کی دعوت دی۔

سوویت یونین کی یہ کوشش بڑی مثبت اور برصغیر کی دونوں ملکوں کی خوشحالی کے لیے بھی اہم تھی لیکن ماسکو اس تاریخی حقیقت کو نظرانداز کر کے یہ قدم اٹھا رہا تھا کہ پاکستان نے

اپنے جنم دن سے ہی ہندوستان کے خلاف نہ ختم ہونے والی محاذ آرائی کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور پاکستان سیٹو(SEATO) اور سینٹو(CENTO) میں کیمونزم سے زیادہ ہندوستان کے خلاف مغربی ملکوں سے جدید اسلحہ لینے کے لیے شامل ہوا تھا۔سوویت یونین یہ بات سمجھنے میں ناکام ہوا تھا کہ چین پاکستان تعلقات کس تیزی سے آگے بڑھ چکے تھے اور ماسکو کے ان اقدامات کا چینی لیڈرشپ کیا ردعمل کرے گی۔ چین کے وزیر خارجہ نے 1964ء کی ابتداء میں کہا تھا کہ ان کے تعلقات پاکستان کے ساتھ اس وقت بھی دوستانہ رہیں گے جب پاکستان کشمیر اور چین تائیوان لے لے گا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہونے کے بعد بھی پاکستان چین سے اپنی دوستی ختم نہیں کرے گا۔ کچھ عرصے بعد ماسکو نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ چین نے 1965ء میں ماسکو کی پالیسی ناکام بنا دی تھی جس میں ماسکو نے پاکستان کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی تھی کیونکہ چین نے پاکستان کو بہت زیادہ فوجی اور معاشی مدد کے ساتھ کشمیر پر بھی پاکستان کی پالیسی کی حمایت کی پیشکش کی تھی۔ ایک سوویت سکالر نے چین کی طرف سے 1965ء میں پاکستان کو دی گئی معاشی اور فوجی امداد کے بارے میں کہا تھا کہ یہ کوئی حادثاتی مدد نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے بیجنگ کی یہ پالیسی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے تنازعہ کو مزید گہرا کیا جائے ۔ یہ پالیسی آنے والے سالوں کے لیے بھی تھی جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات سرد مہری کا شکار تھے۔

1969-70ء میں چین نے پاکستان کی فوجی امداد میں مزید اضافہ کر دیا تھا کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی بحران مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا اور چین اس بحران کو مسلح تنازعہ میں بدلنا چاہتا تھا۔ 3 اپریل 1965 میں ایوب خان اپنے پہلے سرکاری دورے پر ماسکو پہنچا تھا۔ ایوب خان اس دورے کے دوران کئی سوویت لیڈروں سے ملا اور کئی دوستانہ بیانات بھی دونوں طرف سے جاری کیے گئے تھے۔ ایوب خان نے برزنیف اور وزیر اعظم کوسیجن (Kosygin) اور دوسرے کئی لیڈروں سے ملاقات میں پاکستان سوویت تعلقات کے علاوہ ویتنام اور کشمیر کے مسئلے پر بھی بات چیت کی تھی۔ سوویت لیڈروں نے پاکستانی صدر

کی آزاد خارجہ پالیسی کی بڑی تعریف کی تھی۔ سوویت وزیر اعظم کوسیجن (Kosygin) نے کہا تھا کہ اسے گہرا یقین تھا کہ ایوب خان کا دورہ سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان اچھے پڑوسیوں جیسے تعلقات قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ماسکو کو اس بات کا علم تھا کہ سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان تعلقات دہلی میں تشویش کی لہر پیدا کر چکے ہوں گے۔ ہندوستان کو بھی یقین تھا کہ پاکستان سوویت یونین سے تعلقات صرف اس منصوبے کی وجہ سے قائم کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ سوویت یونین کو کشمیر پر ہندوستان کی حمایت سے باز رکھ سکے۔ سوویت یونین نے ہندوستان سے اپنے تعلقات اور کشمیر پر اپنی پالیسی واضع کرتے ہوئے ایک بار پھر کہا تھا کہ اس دورے سے نہ سوویت یونین کے ہندوستان سے دوستانہ تعلقات پر کوئی فرق پڑے گا نہ ماسکو کی کشمیر پر ہندوستان کی حمایت میں کوئی تبدیلی آئے گی۔ سویت یونین نے پاکستانی میڈیا کی اس خبر کی تردید کی تھی کہ ماسکو شیخ عبداللہ کو اپنے ہاں دعوت دے گا تا کہ وہ کشمیر پالیسی بیان کرے۔ ماسکو کے اس دورے کے بعد ایوب خان نے چین کی مدد سے کشمیر پر نئی جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ ایوب خان نے اس نئی جنگ میں سب سے زیادہ چین کی مدد پر انحصار کیا تھا۔ ہنزہ میں چین کی موجودگی کی وجہ سے پاکستانی لیڈروں کو یقین تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی اس نئی جنگ میں چین بھی شامل ہو جائے گا۔ ماسکو جانے سے ایک ماہ پہلے ایوب خان نے بیجنگ کا دورہ کیا تھا اور چین کے وزیر خارجہ چن لی (Chen-Yi) نے ایوب خان کو یقین دلایا تھا کہ چین کشمیر کی آزادی کے لیے پاکستان کی بھرپور فوجی مدد کرے گا۔

اپریل 1965ء میں پاکستان نے جموں کشمیر میں فوجی مداخلت سے تناؤ میں اضافہ کر دیا تھا۔ پاکستانی فوج کے ریگولر یونٹس نے کئی جگہوں پر ہندوستانی فوجی پوزیشنوں پر حملے کیے تھے۔ پاکستانی فوج نے ایک منصوبہ بندی کے تحت کوچھ (Kutch) کے علاقے میں ہندوستان کی فوج پر حملہ کیا تھا۔ اس بنیاد پر پاکستانی حکام نے کشمیر پر بڑے حملے کی تیاری کر رکھی تھی۔ پاکستانی فوجی کمانڈروں کا خیال تھا ہندوستان کے خلاف کشمیر میں جنگ پاکستان کے لیے آسانی سے فتح کا باعث بنے گی۔ چین نے کشمیر پر پاکستانی حملے کی حمایت کرتے

ہوئے ہندوستان کو دھمکی دی تھی کہ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں بھی مسلح تنازعات اُٹھ کھڑے ہوں گے۔چین نے پاکستان کوبھی مشورہ دیا تھا کہ وہ کشمیر کا مسئلہ اس بار ہمیشہ کے لئےحل کر دے۔ پاکستانی لیڈروں کو یہ بھی یقین تھا کہ سوویت یونین کشمیر پر نئ جنگ میں ہندوستان کی اس طرح مدد نہیں کرے گا جس طرح اس نے پہلے کیا تھا۔

سوویت یونین نے براہِ راست پاکستان کی حوصلہ افزائی کے لئے ایسا تاثرنہیں دیا تھا کہ وہ ریاست جموں وکشمیر پر اپنی پالیسی بدل چکا تھالیکن پاکستانی آمر ایوب خان کویقین تھا کہ ماسکو ریاست پر اپنی پالیسی بدل چکا تھا۔ایوب خان نے یکم مئی 1965ء میں بڑے اعتماد سے اعلان کیا تھا کہ وہ ماسکواس لئے گیا تھا تاکہ اس بات کا اندازہ لگاسکے کہ کیا سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان جموں کشمیر پر کوئی راستہ نکل سکتا تھا؟ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ماسکونئ جنگ کی صورت میں ہندوستان کے ساتھ نہیں کھڑا ہوگا جس طرح پہلے کھڑا ہوا کرتا تھا۔ پاکستانی حکومت کی مزید حوصلہ افزائی اس وقت ہوئی تھی جب سوویت یونین نے جموں کشمیر اورکوچھ(Kutch) پر پاکستانی حملے کے خلاف پبلک(Public) میں کوئی پوزیشن لینے سے انکارکردیا تھا۔ یہ مئی 1965ء میں ہندوستانی وزیراعظم لال بہادرشاستری کے دورۂ ماسکو کے دوران ہوا تھا۔شاستری نے سوویت وزیراعظم کوسیجنکے ساتھ مسئلہ جموں وکشمیر پر بات چیت کی تھی لیکن وہ مشترکہ پیغام میں جموں وکشمیر کا ذکر کرانے میں ناکام ہوگیا تھا جبکہ دورے کے آخر میں سوویت وزیراعظم نے شاستری کویقین دلایا تھا کہ سوویت یونین ہندوستان کا اب بھی پُراعتماد اور وفادار دوست تھا۔سوویت یونین نے پاکستان کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے لئے ہندوستان کی قربانی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ماسکو نے ہندوستان کوخوش کرنے کے لیے 90 کروڑ کی امداد کی بھی پیشکش کی تھی اور مزید فوجی امداد کا وعدہ بھی کیا تھا جبکہ دوسری طرف چین نے لگاتار پاکستان کی حوصلہ افزائی شروع کررکھی تھی کہ پاکستان ریاست جموں کشمیر پر نئ جنگ کا آغاز کرے۔

☆☆☆☆

نواں باب

چین کا جموں کشمیر پر نیا موقف

جون 1965ء میں چین کے وزیراعظم چیون لائی نے افریقہ سے آتے ہوئے پاکستان کا دورہ کیا تھا اور پاکستان کو جموں کشمیر کا مسئلہ اپنی مرضی کے مطابق حل کرنے کے لیے فوجی امداد کی پیشکش کی تھی۔ صرف جون اور جولائی 1965ء میں 5 پاکستانی اور 6 چینی وفود نے ایک دوسرے کے ملک کا دورہ کیا تھا جس میں فوجی اہلکار بھی شامل تھے تاکہ جموں کشمیر پر ہونے والی نئی جنگ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں۔ پاکستان نے چین کی مدد سے اس جنگ کی تیاری کئی ماہ سے جاری رکھی ہوئی تھی آخر پاکستان نے چین کی مدد سے جموں کشمیر میں داخل ہونے کے لیے اپنے گوریلے تیار کر لئے تھے۔ تب پاکستان نے 5 اگست 1965ء میں اپنے ہزاروں گوریلوں اور فوجیوں کو جموں کشمیر میں داخل کر دیا تھا اس میں سویلین تربیت یافتہ مجاہدین جنہیں گوریلا جنگ کی ٹریننگ دی گئی تھی جموں کشمیر میں داخل کیے گئے تھے اور یہ توقع کی گئی تھی کہ وہ جموں کشمیر میں گڑبڑ اور بغاوت کرانے کے بعد پاکستان کی حمایت یافتہ حکومت قائم کریں گے۔ ہندوستان نے الزام لگایا تھا کہ اس جنگ میں چینی طرز کی گوریلا جنگ کا طریقہ کار اپنایا گیا تھا اور ہندوستان کے وزیراعظم شاستری نے کہا تھا کہ چینی فوجی آفیسرز آزاد کشمیر میں موجود تھے اور پاکستانی جنگجوؤں کو ہندوستانی فوج کے خلاف لڑنے کی ہدایت دے رہے تھے۔ ہندوستان نے پاکستان کی اس جنگ کو جنوبی ویتنام کی طرز کی جنگی مداخلت قرار دیا

تھا۔ پاکستانی تربیت یافتہ گوریلا جنگجوؤں کو ویتنام کے گوریلوں کے مشابہ قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان ہندوستان کی سرحدوں پر ایک اور ویتنام طرز کی جدوجہد کو متعارف کر رہا تھا۔ ہندوستانی تبصرہ نگاروں نے یہاں تک کہا تھا کہ پاکستان کی کوشش یہ تھی کہ وہ اپنی حمایت یافتہ حکومت کشمیر میں قائم کرنا چاہتا تھا اور موجودہ منصوبہ یہ تھا کہ پاکستان کشمیر کو ویتنام بنانا چاہتا تھا اور وہی کردار ادا کرنا چاہتا تھا جو جنوبی ویتنام کی ہنوئی (Hanoi) حکومت ادا کر رہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ یاد رکھنا بھی مفید ہوگا کہ جنوبی ویتنام میں لڑنے والے گوریلا جنگجو اور کشمیر میں لڑنے والے گوریلا تربیت یافتہ مجاہدین کا غالب امکان ہے کہ ایک ہی آقا (چین) تھا۔ پاکستان کی طرف سے گوریلا مجاہدین کی مداخلت سوویت یونین کے لیڈروں کو اس بات پر مطمئن نہ کر سکی تھی کہ یہ پاکستان کی طرف سے شروع کیے گئے نئے حملوں کی شروعات تھیں۔ ہندوستان کی طرف سے سوویت یونین کو یہ سمجھانا کامیاب نہیں رہا تھا کہ پاکستان کی طرف سے مسلح جتھوں کو ریاست جموں کشمیر میں داخل کرنا مسلح جارحیت کے زمرے میں آتا تھا اور پاکستان نے کشمیر میں جارحیت کی تھی لیکن ہندوستان ماسکو کو قائل کرنے میں بری طرح ناکام ہوا تھا کہ وہ پاکستان کے اس جارحانہ عمل کی مذمت کرے۔

تاہم 7 اگست 1965ء میں سوویت صدر میکایان (Mikoyan) نے آصف علی کی بیوی کو یقین دلایا تھا کہ سوویت یونین ہندوستان کے بارے میں اپنی پالیسی پر قائم رہے گا اور چار دنوں کے بعد سوویت یونین کے دفتر خارجہ نے ماسکو میں تعینات ہندوستانی سفارتکار کو بھی یقین دلایا تھا کہ سوویت یونین جہاں تک کشمیر ایشو کا تعلق تھا اس بارے میں ہرگز غیر جانبدار نہیں تھا بلکہ ہندوستان کا حمایتی تھا۔ سوویت دفتر خارجہ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان نے جنگ بندی لائن کو عبور کر کے ہندوستانی علاقوں پر حملہ کیا تھا اور امید کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان جلد ہی پر امن راستے پر آجائے گا۔ لیکن سوویت یونین کے رویے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ کشمیر کے معاملے میں کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کر رہے تھے اس لیے سوویت یونین پاکستان کے مسلح جتھوں کی طرف سے کشمیر میں داخل ہونے پر کوئی مخالفانہ ردعمل دینے سے گریز کر رہا تھا۔ سوویت اخبار پراودا (Pravda) نے پاکستانی

جتھوں کی کشمیر میں داخل ہونے پر رپورٹس شائع کی تھیں لیکن ان میں ہندوستان اور پاکستان دونوں کے نقطہء نظر کو پیش کیا گیا تھا جو تاس (Tass) نیوز ایجنسی نے سرکولیٹ کی تھیں تاہم پراودا نے ہندوستانی حکومت اور کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی طرف سے پیش کئے گئے وہ حوالے جو پاکستانی مداخلت کے بارے دیئے گئے تھے اپنی رپورٹ سے غائب کردیئے تھے اور کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا (C-P-I) کی نیشنل کونسل کی وہ قرارداد بھی شائع نہیں کی تھی جو پاکستانی جارحیت کے بارے میں پاس کی گئی تھی۔ پریس ٹریسٹ آف انڈیا (PTI) نے لکھا تھا کہ سوویت یونین پاکستان پر سرے عام پبلک میں الزام تراشی سے اس لئے گریز کررہا تھا کہ وہ پاکستان سے اپنے تعلقات بڑھانا چاہتا تھا اور اسے چین کے اثر سے دور رکھنا چاہتا تھا لیکن ماسکو نے پاکستان پر اپنا دباؤ سفارتی ذرائع کے ذریعہ جاری رکھا اور کشمیر میں طاقت کے استعمال سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

21 اگست 1965ء میں پاکستان میں سوویت چارج ڈی آفیئرز (Charge-D-Affairs) زینوویچ (Zinoviev) نے ایوب خان کو سوویت وزیراعظم کوسیجن کا ایک ایمرجنسی پیغام پہنچایا تھا جس میں زور دیا گیا تھا کہ کشمیر میں مسلح تصادم فوراً روکا جائے۔ اس کے بعد سوویت وزیراعظم نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ماسکو کشمیر پر اپنی پالیسی پر قائم تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی پوری کوشش جاری رکھے گا کہ ہندوستان اور پاکستان کے تمام مسائل کو پرامن طریقے سے حل کیا جائے لیکن سوویت یونین نے پاکستان کو بھی ایسا کوئی اشارہ نہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کے بارے میں اپنی پالیسی بدلے گا اور پاکستان کو جنوبی ایشیاء میں توجہ کا مرکز بنائے گا۔ پاکستان کو خوش کرنے کی کئی کوششوں کے باوجود سوویت یونین نے ہمیشہ ہندوستان کو ہی ترجیح دی تھی۔ 24 اگست 1965ء میں سوویت اخبار پراودا (Pravda) نے لکھا تھا کہ ریاست جموں کشمیر ہندوستان کا ہی حصہ تھا لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ خون خرابہ روکنے کے لیے کوئی فوری راستہ نکالا جائے اور اس تنازعہ کو ختم کیا جائے۔ اخبار نے لکھا تھا کہ سوویت یونین نے ہندوستان کے ساتھ پکی روائیتی دوستی قائم رکھی تھی اور یہ دوستی ہر سال مضبوط ہوتی جارہی تھی۔

سوویت یونین نے ہندوستان کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان سے تعلقات بڑھانے کی پالیسی کو ہندوستان کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا اور سوویت یونین کی طرف سے پاکستان کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی سخت کوششوں سے ہماری دونوں ریاستوں کے درمیان اچھے پڑوسیوں کی طرح تعلقات بن جانے سے کسی تیسرے ملک کی دوستی سے کوئی تضاد پیدا نہیں ہوگا بلکہ سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان مضبوط ہوتے ہوئے تعلقات کو جنوبی ایشیاء میں قیام امن کی پالیسی کا حصہ اور مقصد سمجھا جائے۔ہم سوویت یونین اور پاکستان کے تعلقات ایسے ہی دیکھنا چاہتے ہیں جس طرح سوویت یونین اور ہندوستان کی روائیتی دوستی تھی اور اسے ایشیاء میں صورتحال کو مضبوط اور توازن قائم رکھنے والا عنصر سمجھا جائے جو ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو نارمل بنانے میں اپنا حصہ ڈالے گا۔ جب واقعات تیزی سے رونما ہونے شروع ہوئے تو سوویت یونین کو تنازعہ جموں کشمیر کے حوالے سے مزید تشویش ہوئی تھی۔سنٹرل ایشیاء جغرافیائی لحاظ سے ان علاقوں سے قریب تھا جہاں چین، پاکستان، ہندوستان اور افغانستان آپس میں ملتے تھے۔یہ سوویت یونین کے قریب کے سرحدی علاقے تھے اس لئے سوویت لیڈروں نے جلد ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس تنازعہ کو ختم کر دیا جائے اور اسی وقت وہ جنگ کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مقاصد بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ مقاصد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سوویت یونین کی رہنمائی میں دوستانہ تعلقات قائم کرانا اور برصغیر سے امریکہ اور چین کا اثر ختم کرانا شامل تھا۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فوجی تصادم کشمیر جیسے نازک علاقے میں سوویت یونین کے لیے بہت بڑا مسئلہ تھا جس طرح چین نے پاکستان کی نئے سرے سے حمایت کی تھی کہ وہ اپنی جنگ کو آخر تک لڑے۔جس دن پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا تھا اس دن چین کے وزیر خارجہ نے پاکستان پہنچ کر پاکستان کو بیجنگ کی طرف سے مکمل حمایت کا یقین دلایا تھا اور کشمیریوں سے بھی ان کی جدوجہد میں ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ ہندوستان کی جنگ بندی لائن کی خلاف ورزی پر مذمت کی تھی۔چینی وزیر خارجہ نے ہندوستانی ریاست کے کردار کو کشمیر میں ظالمانہ اور عوام کو کچلنے والا قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسی وجہ سے کشمیر میں آزادی

کی جدوجہد شروع ہوئی تھی اور کہا تھا کہ ریاست کا مسئلہ ریاستی عوام کی مرضی اور خواہش کے مطابق حل ہونا چاہیے جیسا کہ انڈیا اور پاکستان نے ان سے وعدہ کیا تھا۔چین نے ہندوستان کو متعصب اور توسیع پسند ملک قرار دیتے ہوئے کہا تھا۔امریکہ اور سوویت یونین نے ہندوستان کو بے تحاشا پیسہ اور بے پناہ اسلحہ دیا تھا تاکہ وہ پاکستان کے خلاف جنگ جاری رکھ سکے۔چین نے ہندوستان پر الزام لگایا تھا کہ وہ کشمیر میں رائے شماری کے وعدے سے پیچھے ہٹ رہا تھا اور کشمیری عوام پر ظلم وستم کر رہا تھا۔ان کے بنیادی حقوق سمیت حق خودارادیت سے انکاری تھا اور کشمیری عوام ہندوستان کے اس ظالمانہ راج کو مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے ۔وہ بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان کی یہ بغاوت جائز اور سمجھ آنے والی تھی۔ جب 6 ستمبر 1965ء میں ہندوستان نے لاہور پر بڑا حملہ کر دیا تھا اور دوسرا محاذ سیالکوٹ پر حملہ کرتے ہوئے 7 ستمبر کو کھول دیا تھا۔اس پر چین کی حکومت نے سرکاری بیان جاری کرتے ہوئے ہندوستان کے اس اقدام کو ننگی جارحیت قرار دیتے ہوئے ہندوستان پر الزام لگایا تھا کہ اس نے لوکل تنازعہ کو بڑی اور عام جنگ میں بدل دیا تھا۔

چین نے ہندوستان کے اس جارحانہ عمل کو نہ صرف بچگانہ قرار دیا تھا بلکہ اسے تمام بین الاقوامی تعلقات کی رہنمائی کرنے والے اصولوں کی بھی سنگین خلاف ورزی قرار دیا تھا اور ایشیا کے اس حصے میں امن کے لیے شدید خطرہ قرار دیا تھا۔چینی حکومت نے ہندوستان کے اس جارحانہ عمل کو جرم قرار دیتے ہوئے اس کی شدید مذمت کی تھی۔چین نے کہا تھا کہ پاکستان اس جارحیت کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا اور چین اس کی مکمل حمایت کرتا ہے اور چین نے ہندوستانی حکومت سے کہا تھا کہ وہ اس جارحیت کے نتائج بھگتنے کے لیے اس جرم کی ذمہ داری قبول کرے۔دوسرے دن چین کی حکومت نے ہندوستان کو ایک لکھا ہوا پیغام بھیجا تھا جس میں چین نے ہندوستان کے ساتھ اپنے سرحدی تنازعہ کو ہندوستان اور پاکستان کے کشمیر پر تنازعے سے جوڑ دیا تھا۔دوسری طرف سوویت لیڈروں میں اس وقت تشویش کی شدید لہر پیدا ہوگئی جب چین نے پاکستان کی حمایت تھی۔

سوویت لیڈروں نے برصغیر میں جلدی امن قائم کرنے کے لیے ہندوستان اور

پاکستان پر شدید دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ وہ فوراً فوجی تصادم ختم کر دیں۔4 ستمبر 1965ء میں سوویت وزیر اعظم کوسیجن (Kosygin) نے ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور پاکستانی صدر ایوب خان کو ایک خط لکھ کر اپیل کی تھی کہ دونوں ملک فوراً جنگ بندی کا اعلان کریں اور اپنی اپنی فوجوں کو 1949ء کی جنگ بندی لائن کے پیچھے لے جائیں۔ دونوں ملک اپنے تنازعات کو پُرامن طریقے سے حل کریں اور سوویت یونین نے اس کے لیے اپنی مدد کی بھی پیشکش کی تھی۔ 7 ستمبر 1965ء میں تاس (Tass) نیوز ایجنسی کے ذریعہ سوویت حکومت نے کہا تھا کہ اسے اپنی سرحدوں کے قریب اس کشمیر تنازعہ پر شدید تشویش تھی اور کشمیر میں مسلح فوجی تصادم بیرونی قوتوں کو فائدہ پہنچا رہا تھا جو ہندوستان پاکستان کو متحد کرنے کے بجائے الجھائے رکھنا چاہتی تھیں۔ ماضی میں بھی ان قوتوں نے ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کو استعمال کیا تھا اور دونوں ملکوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم نہیں ہونے دیئے تھے۔ دوسرے کئی سوویت لیڈروں نے بھی دونوں ملکوں سے جنگ بندی کی اپیل کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس مسلح تصادم کا کوئی تیسری قوت فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ دراصل یہ سارا الزام سوویت لیڈرز چین پر لگا رہے تھے۔ امریکہ اور برطانیہ نے بھی ہندوستان اور پاکستان کے اس فوجی تصادم پر شدید تشویش کا اظہار کیا تھا اور اسے روکنے اور ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چین واحد ملک تھا جو اس جنگ کو جاری رکھنے کے حق میں تھا اور کھل کر اس جنگ میں پاکستان کی حمایت کر رہا تھا۔9 ستمبر 1965ء میں شمالی کوریا کے بیجنگ سفارتخانے میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے چینی وزیر اعظم چیون لائی نے پاکستان پر ہندوستان کے فوجی حملے کی شدید مذمت کرتے ہوئے پاکستان کی حمایت کا اعادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان صرف ہندوستانی فوجی جارحیت کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا۔

چیون لائی نے ہندوستان کو اس جارحیت کے نتائج کی سنگین دھمکیاں بھی دیں تھیں۔ چیون لائی نے سوویت یونین اور امریکہ کی بھی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ دونوں انتہائی نامناسب کردار ادا کر رہے تھے اور غلط اور درست کے فرق کو کنفیوز کر رہے تھے۔ حملے جارحیت اور حملہ مخالف جارحیت میں فرق کرنے سے قاصر تھے۔ چیون لائی نے

سوویت یونین کے اس رویے پر بھی شدید حملہ کیا تھا کہ وہ کشمیر کو ہندوستان کا اندرونی حصہ کہتے تھے۔ چین نے ہندوستان کے اس الزام کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا تھا کہ پاکستان نے مسلح افراد کے ذریعہ ہندوستان کی طرف حملہ کیا تھا بلکہ چین نے ہندوستان پر الزام لگایا تھا کہ اس نے پاکستان پر غیر اعلانیہ جنگ مسلط کر رکھی تھی۔ چین نے کہا تھا ہندوستان کے خلاف ریاست جموں کشمیر میں مسلح بغاوت ہندوستانی ریاست کی ظالمانہ کاروائیوں کے خلاف ردعمل کا نتیجہ تھا۔ چین نے لال بہادر شاستری کے اس بیان پر کہا تھا کہ یہ ایک بدمعاش گینگ کی دلیل تھی کہ لاہور پر حملہ ہندوستان نے اپنے دفاع میں کیا تھا۔ ہندوستان نے یہ سب کچھ امریکی سامراج اور سوویت ترمیم پسندوں سے سیکھا تھا۔ اسی دوران چین نے انڈونیشن کمیونسٹوں سے دنیا کے لیے یہ اعلان کروادیا تھا کہ چین ممکن ہے پاکستان کی طرف سے اس جنگ کا حصہ بن جائے۔ 8 ستمبر 1965ء میں انڈونیشین کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین آدیٹ (Aidit) نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ چین نے پاکستان کو دوسال کے لیے مغربی اتحادوں سے دور رہنے کی صلاح دی تھی۔ انڈونیشین کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین نے یہ بھی کہا تھا کہ چین کی مسلح افواج ہندوستانی فوج کیخلاف کشمیر میں داخل ہو کر اچانک بڑی حیران کن شکست سے دوچار کرسکتی تھی یا سرحدی علاقوں میں اسے پاکستان کی طرف حملہ کرنے سے روک سکتی تھی۔ یوتھانٹ (U-Thant) جو اس وقت اقوام متحدہ کا سیکرٹری جنرل تھا اور 9 ستمبر 1965ء میں پاکستان آیا تھا لیکن یہ دورہ اس وقت ذاتی امن مشن کے لیے تھا۔ اس پر چین نے پاکستان کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان اقوام متحدہ سے کسی قسم کے انصاف کی توقع نہ رکھے کیونکہ کشمیر کے مسئلہ پر اقوام متحدہ کی شہرت بالکل اچھی نہیں تھی کیونکہ اقوام متحدہ نے 18 سال تک ہندوستان کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ غیر قانونی عمل کرے۔ اقوام متحدہ نے اسے ایسا کرنے سے روکنے کے لیے ایک انگلی بھی نہیں اٹھائی تھی۔

اقوام متحدہ نے اپنے آپ کو بار بار امریکہ کے ہاتھ ہتھیار ہی ثابت کیا تھا۔ اقوام متحدہ امریکہ کے اتحادیوں کے لیے بھی آلہ کار بنا ہوا تھا۔ اقوام متحدہ نے بار بار امریکی سامراج کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہوئے غلط کو درست اور کالے کو سفید قرار دیا تھا اور ہمیشہ

جارحیت پسند کے مفادات کا ہی تحفظ کیا تھا۔آج اقوام متحدہ ایک بار پھر کشمیر کے معاملے پر حملہ آور اور جارحیت کا ساتھ دے رہی تھی اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ میں یہ ہندوستانی جارحیت کے لیے ایک پناہ گاہ بن چکی تھی۔جیسا کہ ابھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ جاری تھی اور اس کے مزید پھیلنے کے خطرات بڑھ گئے تھے کیونکہ چین اس جنگ میں پاکستان کی کھل کر حمایت اور مدد کررہا تھا، ایسے حالات کو دیکھتے ہوئے سوویت یونین نے ایک بار پھر بیان دیا تھا۔ یہ بیان چین کے خطرے کی طرف توجہ دیتے ہوئے دیا تھا اور ان قوتوں کی مذمت کی تھی جو ہندوستان اور پاکستان کے بگڑے ہوئے تعلقات کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔دونوں ملکوں کو مزید فوجی تصادم کی طرف دھکیل رہے تھے۔سوویت یونین نے کہا تھا کہ کسی بھی ملک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جنگ کے شعلوں میں مزید تیل ڈال کر انہیں بھڑکائے۔سوویت یونین نے ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر امن کی فتح کو لازمی قرار دیا تھا۔

ماسکو کی دراصل یہ کوشش تھی کہ وہ چین کو پاکستان پر مزید اپنا کنٹرول حاصل کرنے سے روکے اس لئے سوویت لیڈرشپ ذہانت سے کشمیر میں ہونے والے مسلح تصادم کو استعمال کررہی تھی۔ وہ پاکستان سے اپیل کررہے تھے کہ پرامن حل کی طرف آئے اور زور دے رہے تھے کہ کشمیر کے مسئلے کا پرامن حل نکالا جائے۔ساتھ ہی پاکستان سے قریبی تعلقات بھی قائم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ دوسری طرف ماسکو اس بات کو بھی یقینی بنا رہا تھا کہ پاکستان اور سوویت یونین کے دوستانہ تعلقات پر ہندوستان کوئی مخالفانہ ردعمل ظاہر نہ کرے اس لئے وہ بار بار ہندوستان سے اپنے دوستانہ تعلقات کا بھی ذکر کررہے تھے۔سوویت یونین نے یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا دونوں کے عوام کے مفاد میں تھا۔ لیکن سوویت یونین نے بار بار اس وقت اس بات کو دوہرایا تھا کہ وہ کشمیر کی ریاست کو ہندوستان کا حصہ تصور کرتے تھے۔سوویت نمائندوں نے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں 28,18,4 ستمبر اور 5 نومبر 1965ء میں اپنی تقریروں میں ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان کا حصہ قرار دیا تھا۔ایوب خان نے چین کی امداد پر ان کی بہت تعریفیں کی تھیں اور

اپنے نمائندے بیجنگ بھیجے تھے تا کہ وہ چین کو ہندوستان کے خلاف دوسرا محاذ کھولنے پر راضی کر سکیں اور ہندوستانی فوجوں کی توجہ پاکستان پر حملوں سے ہٹائی جائے۔ایوب خان نے سیٹو (SEATO)اور سینٹو(SENTO) کے اتحاد کو بھی پاکستان کے دفاع کے لیے مدد کی درخواست کی تھی لیکن کامیابی نہ ہوئی تھی اور صرف سفارتی مدد ملی تھی۔ پاکستان کو انڈونیشیا اور 5 پانچ عرب ملکوں نے فوجی مدد دی تھی۔

ہندوستان کو اس بار سوویت یونین سے بھی مدد نہ ملی تھی بلکہ سوویت یونین نے زبانی دوستی کا دم بھرنے کے باوجود ہندوستان سے فاصلہ بنائے رکھا۔چین نے امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ سوویت یونین پر بھی الزام لگایا تھا وہ ہندوستان کو پیسہ اور اسلحہ دے رہے تھے جبکہ مغربی ملکوں نے ہندوستان پر معاشی پابندیاں بھی لگائی تھیں۔ البتہ سوویت یونین نے ان پابندیوں کی حمایت نہیں کی تھی بلکہ وہ انڈیا کو معاشی مدد اور اسلحہ پہنچا تا رہا تھا۔سوویت یونین سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ وہ اپنی فوجی حیثیت کو ہندوستان میں مضبوط کر رہا تھا۔ اگر چین پاکستان کی مدد کے لیے آیا تو سوویت یونین سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ وہ ہندوستان کے دفاع کے لیے اور مدد کے لیے آئے گا۔سوویت یونین نے پاکستان کے اس دعوے کو مسترد کر دیا تھا کہ کشمیر چونکہ مسلم اکثریتی ریاست تھی اس لئے یہ پاکستان میں شامل ہونا تھی جبکہ سوویت یونین نے کہا تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ریاست جموں کشمیر کو بھی تقسیم کر دیا تھا اور دونوں ملکوں کے درمیان تنازعہ بنانے میں برطانیہ کا کردار کلیدی تھا کس طرح ہندوستان اور پاکستان بچوں کی طرح آپس میں لڑ رہے تھے اور اپنا چھوٹا سا مسئلہ بھی حکمران حل کرنے کی اہلیت سے محروم تھے یا بڑی طاقتوں کی ایماء پر ایسا کر رہے تھے۔ بہر حال ہندوستان نے لاہور اور سیالکوٹ پر اپنے بڑے فوجی حملے جاری رکھے ہوئے تھے کہ 15 ستمبر 1965ء میں ایوب خان نے اچانک امریکی حکومت سے رابطہ کر کے کہا کہ وہ امن کے لیے کوشش کریں۔ ایوب خان چاہتا تھا کہ جنگ بندی پاکستان کی شرائط پر ہو اور امریکہ کی حمایت سے ہو لیکن امریکہ نے خود صلح کرانے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے لیے اقوام متحدہ کو ہی مناسب جگہ قرار دیا تھا۔ دوسری طرف سیالکوٹ کے محاذ پر ٹینکوں سے شدید لڑائی ہو رہی تھی اور ہندوستان اس

بار پاکستان کو زیادہ سے زیادہ سزا دینا چاہتا تھا اور پاکستان کو فوجی ساز وسامان کی قلت ہونے والی تھی اگر یہ جنگ مزید کچھ وقت کے لیے جاری رہتی تو پاکستان مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ 17 ستمبر کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے یہ تجویز دی تھی کہ اس وقت پاکستان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس جنگ سے باعزت طریقے سے باہر کس طرح نکلے۔ ایوب خان نے سوویت وزیراعظم کو بھی خط لکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ سوویت یونین اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کا طاقتور ترین ممبر ہونے کے ناطے اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے سیکیورٹی کونسل میں کوئی بامعنی قرارداد پیش کرے جس میں ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کا کوئی باعزت حل نکل سکے۔

اسی دوران چین نے ہندوستان کے خلاف دھمکیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تھا اور 16 ستمبر 1965ء میں چین نے انڈیا کو ایک دھمکی آمیز پیغام بھیجا تھا جو بعد میں چین کی طرف سے ایک الٹیمیٹم (Ultimatum) کے طور پر مشہور ہو گیا تھا کیونکہ اس پیغام میں چین نے انڈیا پاکستان تنازعے کا ذکر کر کے دھمکی دی تھی۔ چین نے ہندوستان کو اپنے پڑوسی ملکوں کے لیے ایک متعصب اور توسیع پسند ملک قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ ہندوستان اپنی عجیب دلیل کو مانتا تھا کہ جو علاقے اس نے اپنے قبضے میں لے رکھے تھے ان کو اپنے علاقے کہتا تھا اور ان علاقوں کو بھی اپنا کہتا تھا جو اس نے اپنے قبضے میں ابھی نہیں لیے تھے۔ چین نے کہا تھا کہ اس کا تنازعہ میں شمولیت نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ چین ہندوستان کو کشمیری عوام کے حق خودارادیت سے محروم کرنے کی اجازت دے گا اور اسے کشمیر ایشو کے بہانے پاکستان کے خلاف جارحیت کرنے دے گا۔ چین نے کہا تھا کہ وہ کشمیریوں اور پاکستان کی حمایت کبھی ختم نہیں کرے گا چاہے ہندوستان کی مدد کرنے والے کتنے ہی کیوں نہ ہوں، جیسا کہ امریکہ، جدید ترمیم پسند اور امریکہ کے کنٹرول میں اقوام متحدہ وغیرہ۔ ہندوستان نے چین کی پاکستان کی حمایت کرنے پر، جنگ کے شعلے بھڑکانے اور دھمکی دینے پر اور ہندوستان کے خلاف دوسرا محاذ کھولنے پر شدید احتجاج کیا تھا۔ لیکن چین نے پروپیگنڈہ کرنے کے سوا پاکستان کی کوئی عملی مدد نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ امریکہ کی مداخلت تھی جس نے بیجنگ کو براہِ راست ہندوستانی

سرحدوں پر فوجی ایکشن لینے سے روکا تھا۔ 14 ستمبر 1965ء میں پولینڈ میں تعینات امریکی سفارتکار نے چین کے ایک وفد کو دھمکی دی تھی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے تنازعہ سے دور رہے ورنہ امریکہ اور اقوام متحدہ کے دوسرے ممبرز چین کے خلاف فوجی کاروائی کریں گے۔

چین کو مجبور کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی جنگ میں شامل ہوا تو امریکی ایئر فورس (Airforce) چین کو نشانہ بنائے گی۔ امریکی ایئر فورس نہ صرف ہندوستان سے چین کو نشانہ بنائے گی بلکہ جنوب مشرقی ایشیا سے بھی ایسا کر سکتی تھی۔ سوویت یونین جو پہلے ہی سے چین کے پروپیگنڈے کے خلاف احتجاج کر رہا تھا اس نے بھی چین کے خلاف امریکی دھمکی کی حمایت کی تھی۔ ریڈیو پر یہ خبر آگ کی طرح پھیلی تھی کہ امریکی حکومت نے چین کو جو دھمکی آمیز پیغام دیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے خلاف چینی فوج کی طرف سے بڑا ایکشن فوراً چین کے خلاف بڑے امریکی حملے کا سبب بن سکتا تھا امریکی فوج اور ایئر فورس چین کا بڑا نقصان کر سکتی تھی۔ تاہم چین کی ہندوستان کو دی گئی دھمکی کو سوویت یونین نے پسند نہیں کیا تھا کیونکہ یہ دھمکی ماسکو کو کشمیر کے تنازعہ سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی پالیسی ترک کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ سوویت یونین ہندوستان کے مسئلے پر چین سے کھلے عام محاذ آرائی کی پالیسی نہیں چاہتا تھا لیکن وہ خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ جب ہندوستان کو چین اور پاکستان نے تنازعہ میں الجھایا ہوا تھا چین کی ہندوستان کے خلاف دھمکی کو محسوس کرتے ہوئے سوویت یونین نے اس وقت عارضی طور پر امریکہ سے ہاتھ ملا لیا تھا تاکہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں جاری جنگ کو پرامن طریقے سے حل کرنے میں مدد حاصل کر سکے۔ سوویت یونین کو چین کی خطے میں بڑھتی ہوئی طاقت اور اثر ورسوخ پر اب زیادہ تشویش ہو چکی تھی اور چین جس طرح پاکستان پر اپنا اثر قائم کر چکا تھا اس پر سوویت یونین کو برصغیر میں اپنا اثر کم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چونکہ سوویت یونین پورے برصغیر پاک وہند کو اپنے اثر اور کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی دوستی ہو۔ اب پاکستان ایک طرف امریکہ کے اثر میں تھا اور آہستہ آہستہ چین کے اثر میں جا رہا تھا۔ سوویت یونین نے انڈیا پر اپنا کنٹرول کافی مضبوط کیا

ہوا تھا کچھ ہندوستانی یہ بھی کہتے ہیں کہ سوویت یونین نے ہندوستان کو چینی حملے کی صورت میں مدد کے لیے آنے کا وعدہ کیا تھا سوویت یونین نے دونوں ملکوں پر اقوام متحدہ کے ذریعہ بھی جنگ بندی کے لیے دباؤ ڈلوایا تھا اور اپنی پرانی جنگ بندی لائن پر واپس آنے کا مشورہ دیا تھا۔ 17 ستمبر 1965ء میں سوویت وزیر اعظم نے شاستری اور ایوب خان کو ایک خط لکھا تھا جس میں دونوں کے لیے ایک جیسا پیغام تھا۔ اس پیغام میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کو سوویت یونین کی طرف سے تاشقند میں ملاقات کے لیے آنے کی پیشکش کی گئی تھی تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان امن بحال کرنے کے لیے کوئی سمجھوتہ کیا جائے تاہم دوسری طرف چین نے ہندوستان کو سخت نتائج کی دھمکیوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ چین کا یہ دعوی تھا کہ سوویت یونین اور امریکہ دونوں پاکستان کی حمایت کی بجائے ہندوستان کی حمایت کر رہے تھے۔ چین کا کہنا تھا کہ کئی سالوں سے امریکی سامراج اور سوویت ترمیم پسند ہندوستانی رجعت پسندوں کی پاکستان کے خلاف حمایت کر رہے تھے اور دونوں ملک ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے تاکہ ہندوستانی رجعت پسندوں کو پیسہ اور اسلحہ دے کر انہیں مضبوط کر سکیں۔ سوویت یونین اور امریکہ کی وجہ سے ہندوستانی رجعت پسندوں کو حوصلہ مل گیا تھا کہ وہ اپنے پڑوسی ملکوں کے خلاف ننگی جارحیت کریں۔ امریکی سامراج اور سوویت یونین کے ترمیم پسندوں نے ہندوستانی رجعت پسندوں کو اپنی آنکھوں کا تارا بنا رکھا تھا اور پاکستان کے خلاف جنگ میں ہندوستان کی مدد کی تھی۔ چین نے سوویت یونین کی ان کوششوں پر شدید تنقید کی تھی جو اس نے ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ختم کروانے کے لیے دونوں کے درمیان امن قائم کرنے کے لیے کی تھیں۔ چین نے یہ بھی کہا تھا کہ سوویت یونین نے اس سے پہلے دسمبر 1955ء میں ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان کا حصہ قرار دیا تھا اور دوسری طرف سوویت یونین نے ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ پر بین الاقوامی سمجھوتے کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہندوستان کی مدد کی تھی اور کشمیر کو زبردستی ہندوستان کا حصہ بنانے میں مدد کی تھی۔ جب ہندوستانی رجعت پسند پاکستان پر حملہ کر رہے تھے تو اس وقت ہندوستان کو انتہائی مزاحمت کا سامنا ہوا اور واپس بھاگنا شروع ہوئے تو سوویت یونین ایک پیشکش لے کر آ گیا کہ اب یہ تنازعہ ختم کرو۔ سوویت یونین

کے لیڈروں کے ارادے یہ تھے کہ وہ اس پیشکش کے نام پر ہندوستانی جارحیت کی مدد کرنا چاہتے تھے تا کہ پاکستان کو مجبور کیا جائے کہ وہ کشمیر پر ہندوستان کے غیر قانونی قبضے کو قانونی تسلیم کرے۔سوویت یونین کے ترمیم پسند لیڈرز غیر جانبداری کا ڈھونگ رچاتے تھے لیکن دراصل ہندوستانی رجعت پسندوں کی حمایت کرتے تھے۔ 22 ستمبر 1965ء میں سوویت یونین اس وقت پھر سرگرم ہو گیا تھا جب اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں ایک قرارداد لائی گئی تھی۔سوویت وزیر اعظم نے ایک بار پھر شاستری اور ایوب خان سے رابطے شروع کیے اور تاشقند میں ملاقات کر کے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تمام تنازعات کو زیر بحث لانے کی پیشکش کی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان نے اس تجویز پر رضامندی ظاہر کی تھی۔سوویت یونین کی تجویز کردہ تاشقند ملاقات کی حمایت امریکہ نے بھی کی تھی کیونکہ امریکہ بھی برصغیر میں امن قائم کرنے کا حامی تھا۔سوویت یونین تاشقند ملاقات کے لیے اپنی خدمات کی پیشکش کر کے اپنی بین الاقوامی شہرت کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

پاکستان نے چار ملکوں پر مشتمل ایک کمیشن بنانے کی تجویز دی تھی جو فرانس، امریکہ ،سوویت یونین اور برطانیہ پر مشتمل کمیشن ہوگا جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تمام مسئلوں کا حل نکالے۔سوویت یونین نے پاکستان کی اس تجویز کو قبول نہ کیا اور ہندوستان نے امریکہ اور سوویت یونین کی طرف سے پہل کرنے کی تجویز دی تھی جبکہ ماسکو نے اس تجویز پر بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔اکتوبر 1965ء میں چین ایک بار پھر سکیم اور لدّاخ میں ہندوستان کے خلاف سرگرم ہو گیا تھا تا کہ ہندوستان پر اپنا دباؤ ڈال کر رکھے۔ ہندوستان نے چین کی سکیم میں سرحد پار مداخلت اور لدّاخ میں ہونے والے واقعات پر شدید احتجاج کیا تھا۔ آہستہ آہستہ چین کی طرف سے ہندوستانی سرحدوں پر حملوں میں سختی آ گئی تھی۔ایک بار پھر چین نے 9 دسمبر 1965ء میں لدّاخ میں اپنی ایک چھوٹی فورس سے ہندوستانی فوجی چوکی پر حملہ کیا تھا۔چین کا ہندوستانی سرحد پر حملوں کا مقصد تاشقند ملاقات کو سبوتاژ کرنا تھا اور برصغیر کو جنگ کی حالت میں رکھنا تھا اور پاکستان کو بھی میدان جنگ میں مضبوط رکھنا چاہتا تھا تا کہ وہ رعایت کے بدلے امن قائم کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔چین تاشقند کانفرنس سے پہلے ہی

ہندوستان کو کئی پیغامات بھیج چکا تھا تاکہ وہ ہندوستان کی حیثیت کو کمزور کر سکے۔ دوسری طرف چین نے پاکستان کی حوصلہ افزائی جاری رکھی اور اکتوبر 1965ء کے وسط میں چین کے فوجی اسلحہ کی پہلی کھیپ پاکستان بھیجی گئی تھی تاکہ پاکستان ہندوستان کے خلاف جنگ جاری رکھ سکے۔ اسی ماہ چین نے پاکستان کو 67 کروڑ امریکی ڈالر کا کریڈٹ دیا تھا اور فوجی ساز و سامان دینے اور جنگی جہاز دینے پر بھی رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس کے باوجود چین نہ تو پاکستان کو اقوام متحدہ کی تجویز کردہ جنگ بندی سے روک سکا نہ ہی سوویت یونین کی تجویز کردہ تاشقند کانفرنس سے باز رکھ سکا۔ دوسری طرف سوویت یونین نے کشمیر ایشو پر ہندوستان کے ساتھ کھڑا رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اکتوبر 1965ء میں سوویت یونین نے ہندوستان کو زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل دیئے تھے اور چار سب میرین (Submarine) دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ نومبر 1965ء میں جب ہندوستان کے وزیر خزانہ کرشنا (Krishna) مورتی نے سوویت یونین کا دورہ کیا تھا تو ماسکو نے 90 کروڑ روبل کی امداد چار اور پانچ سال کے منصوبے کے تحت دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اقوام متحدہ میں سوویت یونین کے وزیر خارجہ گورومیکو (Gromyko) نے امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ کو بتایا تھا کہ سوویت یونین ہندوستان کو ایشیاء میں اپنا سب سے بڑا اتحادی تصور کرتا تھا اسی لیے پاکستان کے خلاف کشمیر پر اس کی حمایت کی تھی لیکن سوویت یونین انڈو پاک جنگ کا خاتمہ چاہتا تھا کیونکہ اس جنگ نے ہندوستان پر چینی دباؤ کو دعوت دی تھی۔ نومبر 1965ء میں پاکستان سوویت یونین کی تجویز کردہ تاشقند کانفرنس میں ہندوستان سے ملاقات کر کے آپس میں تنازعات پر بات چیت کر چکا تھا۔ اب سوویت یونین کے لیے یہ موقع بن گیا تھا کہ وہ پاکستان کا اعتماد حاصل کرے اور امریکہ کا اثر پاکستان سے کم کرے۔ سوویت اخبار پراودا (Pravda) نے لکھا تھا کہ اب پاکستان میں یہ سوچ پروان چڑھ چکی تھی کہ ہندوستان سے تعلقات نارمل کرنے سے ملک کے موجود مشکل حالات پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ اس وقت تک پاکستانی معیشت کو امریکی اور برطانوی کی اجارہ داری عملاً کنٹرول کر رہی تھیں اور ملک میں کوئی بڑی صنعت کا وجود ہی نہیں تھا۔ پاکستان کی اس معاشی پسماندگی کی

بنیادی وجہ اس کی مغربی فوجی اتحادوں سیٹو(SEATO)اور سنٹو(SENTO) کی ممبر شپ تھی یہ معاشی صورتحال مغربی اتحادیوں کو چھوڑنے سے ہی بہتر ہو سکتی تھی۔سوویت یونین نے کہا کہ وہ پاکستان کی ترقی کے لیے معاشی اور ٹیکنیکل مدد دینے کے لیے تیار تھا۔تاشقند کانفرنس سوویت یونین نے جان بوجھ کر ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں رکھی تھی۔تاشقند وہی جگہ تھی جہاں دو کشمیری وفد بھیجے گئے تھے جو 1865ء اور 1869ء میں گئے تھے تاکہ زارِ روس سے مدد حاصل کر کے ریاست جموں کشمیر سے انگریزوں کے دباؤ کے خلاف مزاحمت کی جائے لیکن یہ کوشش ڈوگرہ حکمرانوں کی ناکام ہوگئی تھی۔ 4 جنوری 1966ء میں تاشقند میں ہندوستان اور پاکستان کے سربراہوں کو بلایا گیا تھا۔ جونہی تاشقند کانفرنس کی تاریخ قریب آنا شروع ہوئی سوویت یونین نے ہندوستان اور پاکستان کی توجہ ان کے اندرونی حالات پر مرکوز کرنا شروع کردی تھی۔ دونوں ملکوں کو موجودہ جاری جنگ کے نقصانات کی طرف توجہ دلائی اور کہا تھا کہ اگر دونوں ملک امن سے رہیں گے تو ان کو کیا فوائد ہوں گے۔ سوویت یونین نے دونوں ملکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ تاشقند کانفرنس میں بیٹھ کر ریاست جموں کشمیر جیسے پرانے اور خطرناک مسئلے کو حل کریں اور سوویت یونین اس مسئلے کو حل کرنے میں ان کی مدد کرے گا۔سوویت یونین کی حکومت نے یہ ماننے سے انکار کردیا تھا کہ ماسکو ریاست کے مسئلے پر یکطرفہ جھکاؤ ہندوستان کی طرف رکھتا تھا اور اس طرح کی سوچ کو ماسکو نے حقیقت سے دور قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ ماسکو کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دیرپا امن قائم کرے۔

تاشقند سربراہان ملاقات سے پہلے ماسکو کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسا ہی غیر جانبدارانہ رویہ ظاہر کرے تاکہ وہ مسئلہ کشمیر پر تاشقند ملاقات سے پہلے ہی دونوں ملکوں کے سامنے اپنی حیثیت کو واضع کرے۔ حالانکہ سوویت یونین کھلم کھلا کشمیر پر ہندوستان کی نا صرف حمایت کرتا رہا تھا بلکہ سیکیورٹی کونسل میں کشمیر پر کئی قراردیں بھی ویٹو کر چکا تھا لیکن ماسکو واقعی برصغیر میں قیام امن کے لیے اور کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مخلص کوشش کر رہا تھا کیونکہ اب سوویت یونین ہندوستان ، پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان اتحاد قائم

کر کے ہی اس خطے میں اپنے مفادات کو آگے بڑھا سکتا تھا۔ اس لیے اس سہ فریقی اتحاد قائم کرنے کی امید میں سوویت یونین کے لیڈرز خوش تھے ہندوستان اور پاکستان نے ان کی دعوت قبول کر کے ان کے مقاصد کو حقیقت کے قریب کر دیا تھا۔ سوویت لیڈرز یہ بھی سمجھتے تھے کہ تاشقیند کانفرنس کے کامیاب نتائج حاصل کرنے کے لیے کئی مشکلات حائل تھیں۔

ہندوستان نے واضع کر دیا تھا کہ کشمیر پر کوئی بحث نہیں ہوگی کیونکہ وہ ہندوستان کا حصہ تھا جبکہ پاکستان اس مسئلے کو زندہ رکھنا چاہتا تھا جبکہ سوویت لیڈروں نے دونوں ملکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بڑے مسائل کو اس کانفرنس میں بحث کا حصہ بنانے سے گریز کریں اور اس ملاقات کو دوطرفہ بحثوں کا آغاز تصور کریں۔ 4 جنوری 1966ء میں تاشقند کانفرنس کا آغاز سوویت وزیراعظم کوسیجن نے اس شک وشبے کے ساتھ کیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کیا پرامن سمجھوتہ ممکن ہوگا؟ اس کانفرنس کا آغاز کرتے ہوئے وزیراعظم کوسیجننے تمام وفود کو تاشقند میں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا تھا کہ ازبکستان کے عوام کے ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ پرانے تجارتی اور ثقافتی تعلقات رہے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نارمل تعلقات کی بحالی سوویت یونین کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے لیے مفید ثابت ہوں گے اور یہ ثقافتی تعاون بڑھانے، معاشی مفادات کو وسعت دینے قومی آزادی کو مضبوط کرنے اور عوامی فلاح وبہبود کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے یہ تعلقات اہم کردار ادا کریں گے۔ سوویت وزیراعظم کوسیجننے مزید بات کو آگے بڑھاتے ہوئے دونوں ملکوں کے لیڈروں کو یاد دلایا تھا کہ سوویت یونین ان دونوں کا پڑوسی کا تھا اس لیے نہ صرف ان دونوں ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن قائم کرنے کا بھی خواہاں تھا۔ کوسیجننے کہا تھا کہ اسے یقین تھا کہ آپ لوگ بھی اسی مقصد کو حاصل کرنے کی سخت خواہش لے کر یہاں اس کانفرنس میں شریک ہوئے ہیں۔

جس دن ہندوستانی اور پاکستانی لیڈروں کی تاشقند میں ملاقات ہوئی تھی سوویت لیڈروں نے ان کی قابلیت اور دانش مندی کی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ تاشقند کانفرنس میں ملاقاتیں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ کا حل تلاش کرنے کے لیے حقیقی قدم تھا۔

سوویت یونین نے اس بات پر بھی تشویش کا اظہار کیا تھا کہ کس طرح مغرب کے جارحیت پسند حصے تاشقند کانفرنس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کررہے تھے اور ہندوستان پاکستان اور سوویت یونین کی دوستی کو ناکام بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ چین کی لیڈرشپ کا ذکر کرتے ہوئے سوویت لیڈروں نے کہا تھا کہ کس طرح وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے میں دلچسپی لے رہے تھے اور ہندوستانی علاقوں پر حملوں کی دھمکیاں بھی دے رہے تھے۔ سوویت یونین کی وارننگ کے باوجود کہ دونوں ملک بڑے مدعے اس کانفرنس میں بحث کرنے سے اجتناب کریں لیکن ایوب خان نے پھر بھی جلدی میں کشمیر کا مسئلہ اٹھایا اور کانفرنس دو دنوں تک رُک گئی اور سوویت وزیر اعظم کوسیجنکو مجبوراً دونوں ملکوں کے لیڈروں کے درمیان صلح کروانا پڑی۔ اس نے آٹھ گھنٹے ایوب خان اور وزیر اعظم لال بہادر شاستری سے بات کی تھی۔ 7 جنوری 1966ء کو ہندوستانی اور پاکستان لیڈروں کے درمیان بات چیت دوبارہ بحال ہوئی۔ دو دِنوں کے بعد 9 جنوری 1966ء کو کانفرنس ایک بار پھر اس ایشو پر رک گئی کہ کشمیر کے مسئلے کو مشترکہ اعلامیہ میں شامل کیا جائے۔ اس مایوسی کے ماحول میں سوویت وزیراعظم کوسچنا یک بار پھر بچاؤ کے لیے درمیان میں آئے۔ کوسیجنے 14 گھنٹے شاستری اور ایوب خان سے الگ الگ بات چیت کی تھی۔ کوسیجنے اس کانفرنس کا میزبان ہونے کے باوجود منفرد کردار ادا کیا تھا۔ سوویت وزیر اعظم اس بات پر قائم تھا کہ وہ اس کانفرنس کو مکمل ناکام ہونے سے ہر حال میں روکے گا۔ آخر کار 10 جنوری 1966ء میں دونوں کے درمیان ایک سمجھوتہ طے پا گیا جو اعلان تاشقند کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ یہ سمجھوتہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سوویت یونین کی دوستانہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان ٹائمز نے اس سمجھوتے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں پر سوویت یونین کا اس سمجھوتے کے لیے شدید دباؤ ڈالا گیا تھا۔

اس کانفرنس میں ایوب خان اور شاستری نے بھی یہی کوشش کی تھی کہ میزبان ملک کو بے عزتی سے بچانے کے لیے راستہ نکالا جائے کیونکہ اس کانفرنس کی ناکامی سے ماسکو کی بین الاقوامی حیثیت کا کچھ باتوں سے کافی نقصان ہونا تھا۔ بہر حال تاشقند میں ہندوستان اور

پاکستان طاقت کا استعمال نہ کرنے پر راضی ہو گئے اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق اس پر عمل کریں گے اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے کی حوصلہ شکنی کریں گے۔ لیکن دونوں ملکوں کے درمیان تنازعات کو حل کرنے کے لیے کوئی نظام یا طریقہ کار نہیں بنایا گیا تھا اعلامیہ میں کہا گیا تھا کہ دونوں ملک اعلیٰ سطح پر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور ایسے معاملات پر بات چیت کرتے رہیں گے جو دونوں کے مسائل سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ ایوب خان اور شاستری نے اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق اچھے پڑوسیوں جیسے تعلقات قائم رکھنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ دونوں ملکوں نے اس بات کا اعادہ کیا تھا کہ وہ اپنے تنازعات پرامن طریقے سے اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق حل کریں گے۔ دونوں ملکوں کے لیڈروں نے اس بات پر بھی اتفاق ظاہر کیا تھا کہ برصغیر میں امن قائم کرنے سے اس خطے کے عوام کے مفادات وابستہ ہیں اور کشیدگی سے اس خطے میں کسی کا بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ تاشقند اعلامیہ بنیادی طور پر دونوں ملکوں کو اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ وہ سیکیورٹی کونسل کی قرارداد کو لاگو کرتے ہوئے اپنی اپنی فوجوں کو 3 اگست 1965ء والی پوزیشن پر واپس لائیں چونکہ سیکیورٹی کونسل کی قرارداد میں دونوں ملکوں کو یہی کرنے کی ہدایت دی گئی تھی اس لڑائی اور موجودہ تنازعہ کو ختم کرنے کے لیے شاستری نے حاجی پیر اور ٹٹوال کی پوزیشن چھوڑنے پر آمادگی ظاہر کی تھی ہندوستانی وزیر خارجہ سوارن سنگھ نے اعلان کیا تھا کہ اگر پاکستان نے ایک بار پھر مداخلت کار بھیجے تو یہ اس معاہدے کی خلاف ورزی تصور کی جائے گی اور ہندوستان ان کے خلاف ایسی صورت میں سخت ترین اقدام کرنے کا حق رکھتا تھا۔ ایوب خان نے بھی اپنے منصوبے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے جنگ کے ذریعہ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے سے گریز کرنے پر اتفاق کیا تھا۔ سوویت یونین والے تاشقند معاہدے کے نتائج سے بہت مطمئن تھے کیونکہ یہ معاہدہ ان کے لیے ڈرامائی فوائد لایا تھا سوویت وزیر اعظم کوسیجن اپنے نگران ہاتھوں میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کروانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کوسیجن نے کہا تھا کہ اعلان تاشقند نے ایشیاء کے نہایت اہم علاقے میں امن کے لیے حقیقی بنیادیں فراہم کر دیں تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ اگر

ہندوستان اور پاکستان برصغیر کے دفاع کے لیے چین کے خلاف متحد ہو جائیں تو سوویت یونین کے اپنے جنوبی حصے کی دفاعی پوزیشن بہت مضبوط ہو جائے گی۔ دراصل سوویت یونین کا خیال تھا کہ کشمیر کا مسئلہ اس وقت کے حالات میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتا تھا ایک طرف چین کو روکنے کے لیے اور دوسری طرف امریکہ کو جنوبی ایشیاء میں فوجی اڈے قائم کرنے سے بھی روکا جا سکتا تھا۔

تاشقند معاہدے پر جموں کشمیر کے وزیراعظم جی ایم صادق نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا اور اس معاہدے کا خیر مقدم کرتے ہوئے سوویت وزیراعظم کوسیجنکی کوششوں اور کردار کو سراہا تھا اور کہا تھا کہ کشمیری عوام سوویت وزیراعظم کے اس کردار اور کوششوں کو بہت احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دل کی گہرائیوں سے کوسیجن کا شکریہ کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس معاہدے سے برصغیر میں امن کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ البتہ چین نے اس معاہدے کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سوویت یونین کا منصوبہ تھا اور سوویت یونین اپنے آپ کو ایشین طاقت بنانا چاہتا تھا۔ چین نے معاہدہ تاشقند کو کشمیری عوام کے مفادات کے خلاف قرار دیتے ہوئے سوویت یونین اور امریکہ پر الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے پاکستان پر شدید دباؤ ڈال کر یہ معاہدہ کرنے پر مجبور کیا تھا تاکہ وہ ہندوستان سے امن قائم کرے۔ تاشقند معاہدے کو ختم کرانے کے لیے چین نے پاکستان کو اسلحہ سپلائی کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ جنگ کا پیدا کردہ خلا کے ماحول کو پر کر سکے۔ مارچ 1966ء میں پاکستان کی فوج نے چین کے بنائے I-59 درمیانہ درجے کے ٹینک مِگ (MIG)19 فوجی پریڈ میں نمائش کے لیے پیش کیے تھے صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ چین اور پاکستان کے تعلقات ایک نئے دور میں داخل ہو چکے تھے۔

ایوب خان نے دھمکی آمیز انداز میں کہا تھا کہ اگر ہندوستان ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کسی شرط پر راضی نہ ہوا تو یہ اسلحہ اکٹھا کرنا جاری رہے گا۔ روزنامہ ڈان کے ایڈیٹوریل میں لکھا گیا تھا کہ پاکستان کو چاہیے کہ جتنا جلد ہو سکے تاشقند معاہدے کے بعد پیدا ہونے والی خوشی کا جو کچھ بقایا بچا ہوا ہے اس سے بھی نجات حاصل کرے اور حقیقت

پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو نئی جنگ کے لیے تیار کرے۔ 1966ء کے مارچ کے آخر میں چین کی نیشنل پیپلز کانگریس (NPC) کے چیئرمین لیو (LIU) پاکستان کے دورے پر آئے تاکہ پاکستان کو معاہدہ تاشقند ختم کرنے پر قائل کرسکیں اور اس کے بدلے چین کا تحفظ قبول کرے۔ اس نے ایوب خان کو یقین دلایا تھا کہ چین پاکستان کا لافانی دوست تھا اور بیجنگ ہندوستان کے خلاف پاکستان کو تحفظ دے گا اور اس کی آزادی اور خودمختاری کو قائم ودائم رکھے گا۔ اس نے ایوب خان کی اس بات پر تعریف کی تھی کہ اس نے سوویت یونین کی طرف سے کیا گیا چین کے خلاف پروپیگنڈہ قبول نہ کرکے اچھا کیا تھا اور سوویت ترمیم پسندوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے چیئرمین لیو (LIU) نے کہا تھا وہ عقل سے عاری پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ چین برصغیر کے لیے خطرہ تھا اور کہا کہ سوویت یونین چین کے گرد تنگ گھیرا بنانا چاہتا تھا اس نے کہا تھا کہ چین ہندوستانی جارحیت کے خلاف پاکستان کی مدد کرتا رہے گا۔

چین کے وزیر خارجہ چن لی (Chen Yi) نے اس دورے کے دوران سوویت یونین پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا سوویت یونین والے ہندوستان کے ریاست جموں کشمیر پر جبری قبضے کی حمایت کرتے ہیں اور اپنے اوپر غیر جانبداری کا لبادہ ڈال کر صلاح کار بھی بنے ہوئے ہیں۔ چینی وزیر خارجہ نے کہا تھا کشمیری عوام ایک لمبے عرصے سے ظلم اور جبر کا شکار ہیں اور حق خودارادیت سے محروم ہیں اور چین کی حکومت اور عوام ان کی آزادی اور حقوق کے لیے جدوجہد میں پوری طرح حمایت کرتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ ہم اپنا یہ موقف کبھی نہیں بدلیں گے چاہے دوسرے ہمارے اوپر جس طرح کے الزام لگائیں اور ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کریں۔ چیئرمین لیو (LIU) کے دورے کے آخر میں مشترکہ بیان جاری کیا گیا تھا جس میں چین کی طرف سے پاکستان کی ہندوستان کے خلاف حمایت کو دوہرایا گیا تھا کشمیر کے مسئلے کو کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل کرنے کی حمایت کی گئی تھی۔ چین اور پاکستان کے بڑھتے ہوئے تعلقات اور ایک دوسرے کے قریب آنے سے ماسکو میں تشویش بڑھ گئی تھی۔ سوویت یونین نے دیکھا کہ ان کی کوششیں پاکستان کو چین سے دور کرنے کے لیے فیل ہوگئی

تھیں۔تب سوویت یونین نے برصغیر میں امن کی کوششیں ترک کردیں تھی چین کا پاکستان پر کنٹرول حاوی ہو جانے کے خوف سے سوویت یونین نے تاشقند معاہدے کی خلاف ورزی کے لیے قدم اٹھاتے ہوئے برصغیر میں اسلحہ کی دوڑ شروع کردی تھی۔

سوویت یونین کو ہندوستان اور پاکستان دونوں پر اپنا فوجی اثر قائم کرنے میں دلچسپی تھی اس لیے وہ پاکستان کو چین سے دور رکھنے کے لیے اسلحہ سپلائی کرنا چاہتے تھے۔جون 1966ء میں پاکستان کا ایک اعلیٰ سطح کا فوجی مشن ماسکو گیا تھا تاکہ وہ سوویت اسلحہ کو پاکستان لانے کے لیے کوئی ممکنہ راستہ تلاش کرے۔اس اقدام پر ہندوستان میں تشویش پیدا ہوئی اور انہوں نے ماسکو پر دباؤ ڈالا اور ماسکو کو دھمکی دی تھی کہ سوویت اسلحہ کی پاکستان کو سپلائی سوویت انڈیا تعلقات کو کمزور کرے گی۔سوویت یونین نے ہندوستان کا اتحادی ہونے کے ناطے دہلی کو یقین دلایا تھا کہ ان کا پاکستان کو اسلحہ سپلائی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور ماسکو نے اندرا گاندھی کو جولائی 1966ء میں سوویت یونین کے دورے کی دعوت دی تھی۔اندرا گاندھی نے جولائی 1966ء میں سوویت یونین کا دورہ کیا تو انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ نہ تو سوویت یونین نے ریاست جموں کشمیر پر اپنا موقف بدلا ہے اور نہ ہی پاکستان کو اسلحہ سپلائی کیا تھا سوویت یونین نے اندرا گاندھی سے یہ بھی کہا تھا کہ اسلحہ کی سپلائی کے لیے پاکستان سے کوئی معاہدہ نہیں کیا گیا تھا۔انہوں نے کہا تھا کہ یہ ضرور تھا کہ سوویت یونین پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ ہندوستان کے تعلقات میں تبدیلی لائے گا۔

سوویت یونین کی طرف سے ہندوستان کو بار بار یقین دلانے کے باوجود کہ وہ پاکستان کو اسلحہ سپلائی نہیں کریں گے۔مارچ 1968ء میں سوویت نیوی کے سینئر آفیسرز کا ایک وفد ان کے وائس ایڈمیرل سیمرنوف (Samirnov) کی قیادت میں پاکستان پہنچا تاکہ دونوں ملکوں کی بحریہ کے درمیان تعاون کے ممکنہ راستے تلاش کرسکیں۔اپریل 1968ء میں سوویت وزیراعظم کوسیجن پاکستان کے دورے پر آیا تاکہ وہ پاکستان سے تعلقات قائم کرنے کی کوششوں کو مزید آگے بڑھائے۔گو کہ سوویت وزیراعظم کے اس دورے کے دوران

پاکستان سے اسلحہ سپلائی کا معاہدہ نہ ہوسکا۔ 6 جون 1968ء میں ایک پاکستانی فوجی مشن ماسکو پہنچا جس کی قیادت جنرل یحییٰ (Yahya) خان کررہا تھا۔ یہ پہلا فوجی مشن سوویت پاکستان اسلحہ معاہدے پر بات چیت کے لیے ماسکو آیا تھا۔ ان کے ماسکو پہنچنے کے دوسرے دن ہی یہ اعلان کیا گیا تھا کہ سوویت یونین پاکستان کو اسلحہ دینے پر راضی ہوگیا تھا۔ اس کے فوراً بعد سوویت یونین نے پاکستان کو ٹینک، آرٹلری، آرمورڈ پرسنل کیریئر پاکستان بھیجنا شروع کردیئے تھے۔ اس بار ماسکو نے ہندوستان کے احتجاج کی کوئی پروانہ کی کیونکہ سوویت یونین برصغیر میں مزید جنگی کھیل کھیل کر اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سوویت وزیراعظم کوسیجنے ایک بار پھر ہندوستان کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ سوویت یونین کا ارادہ برصغیر ہند میں فوجی توازن بدلنا نہیں تھا لیکن نئی دہلی نے اس بار سوویت یونین کی یقین دہانی کو قبول نہیں کیا تھا۔ ہندوستان کے وزیر دفاع نے ماسکو کو وارننگ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان ریاست جموں کے مسئلے پر حمایت دینے والے کسی بھی ملک کا کوئی احسان مند نہیں تھا اس نے ہندوستانی پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ ہندوستان ساری بین الاقوامی دنیا کو یہ بتادینا چاہتا ہے کہ وہ ایک حد تک ہی کشمیر کے مسئلے پر دباؤ برداشت کرسکتے ہیں۔

ہندوستان کا بڑا صاف اور دوٹوک موقف ہے کہ اسے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہے کہ کون اس کی حمایت کررہا تھا اور کون اس کی مخالفت کررہا تھا کیونکہ ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے کہ وہ کسی بڑے سے بڑے دباؤ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ وزیر دفاع نے پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان اور سوویت یونین کے اسلحہ سپلائی کے معاہدے کو بہت افسوس ناک قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان سوویت اسلحہ ملنے سے ہندوستان کے بارے میں اپنا موقف مزید سخت کرے گا۔ وزیر دفاع نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان مکمل طور پر سوویت اسلحہ کا محتاج نہیں تھا اور سوویت یونین کو وارننگ دی کہ وہ ہندوستان کو اتنا آسان نہ لے۔ ہندوستانی وزیر دفاع کا بیان ایک مضبوط وارننگ دی گئی تھی اور پیغام دیا گیا تھا۔ سوویت یونین اور ہندوستان کی دوستی یک طرفہ نہیں تھی اور نہ ہندوستان کے لیے فرانس، برطانیہ اور دیگر ملکوں سے اسلحہ حاصل کرنا کوئی مسئلہ تھا۔ ہندوستان سوویت یونین سے دوطرفہ دوستی چاہتا تھا۔

سوویت یونین کو ہندوستان کے ردعمل سے کافی بڑا دھچکا لگا تھا کہ انہوں نے پاکستان کو اسلحہ سپلائی کرنے کا معاہدہ کیوں کیا تھا۔ ماسکو نے ہندوستان کو پھر یقین دلایا تھا کہ وہ کشمیر کے سوال پر ہندوستان کے ساتھ کھڑا ہے جس طرح وہ پہلے کھڑا تھا۔ تاہم چین نے پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ کسی بھی طرح کے دوطرفہ تنازعات پر بات چیت کرنے سے انکار کر دے جن دوطرفہ معاملات کی بنیاد تاشقند معاہدہ مہیا کرتا تھا اور پاکستان سے کہا تھا کہ وہ کشمیر پر نئی جنگ کی تیاری کرے۔ چین کے نیشنل وائس وزیر دفاع وانگ وینگ (Zheng Wang) نے پاکستان کو ہندوستان کے خلاف نئی جنگ میں اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا تھا اور پاکستان کو مزید اسلحہ دینے کی پیشکش کی تھی جو پاکستان کے دفاع کو مزید بڑھا دے گا۔ چین نے پاکستان سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ سوویت یونین کی فوجی اور معاشی امداد کو مسترد کرے کیونکہ ماسکو ہندوستان کی حمایت کرتا تھا اور سوویت یونین کی طرف سے دی گئی فوجی اور معاشی امداد جو ہندوستان کو دی جاتی تھی وہ پاکستانی مفادات کے خلاف تھی۔

دوسری طرف سوویت یونین نے چین پر الزام لگایا تھا کہ وہ بادشاہت تشکیل دے رہے ہیں اور ہندوستان، پاکستان اور افغانستان کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہونے میں ہر طرح کی رکاوٹ ڈال رہے ہیں اور عملاً ایسے اقدامات کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں جنوبی ایشیاء میں ان کی بالادستی قائم ہو جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے چین پاکستان میں تباہ کن اور خطرناک کام کر رہا تھا۔ یہ تو سوویت یونین کے چین کے بارے میں سرکاری خیالات تھے۔ دوسری طرف سوویت یونین نے پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ چین کے ساتھ اپنی دوستی ختم کرے اور سوویت یونین کا اتحادی بن کر ایک خوشحال قوم کی تعمیر کرے۔ لیکن پاکستان نے سوویت یونین کی اس پیشکش کو فوراً مسترد کر دیا تھا اور چین کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا کہ چین اس کا سب سے وفادار دوست تھا۔ پاکستانی وزیر خارجہ ارشد حسین نے چین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ہندوستان کے خلاف نئی جنگ میں بیجنگ کی طرف سے امداد کی یقین دہانی اور کشمیر کے سوال پر حمایت اور مسلسل حمایت پر چین کی دوستی پر فخر محسوس کرتے تھے۔ پاکستان نے سوویت یونین کی تجویز کردہ جنوبی ایشیاء کی علاقائی ٹریڈ اور ٹرانزٹ معاہدے کو مسترد کر دیا

تھا اور ایشیاء کا متحدہ سیکیورٹی نظام کو بھی مسترد کر دیا تھا کیونکہ چین ان کے نزدیک کسی بھی ملک اور قوام کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں پاکستان نے ائیر مارشل نور خان کو بیجنگ یہ پیغام دینے کے لیے بھیجا تھا کہ انہوں نے سوویت یونین کی تجاویز کو مسترد کر دیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ پاکستان چین کا دوست ہے اور ہمیشہ دوست رہے گا۔ پاکستان کی طرف سے سوویت تجاویز کو مسترد کرنے پر چین کے وزیراعظم چیون لائی نے کہا تھا یہ فطری تھا کہ پاکستانی عوام نے سوویت تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔

کیونکہ یہ تجاویز نہ صرف چین کے خلاف سوویت یونین کی تیار کردہ سکیم تھی بلکہ یہ پاکستان کے بھی خلاف تھیں۔ نومبر 1970ء میں جب یحییٰ خان (Yahya) نے چین کا دورہ کیا تھا تو چیون لائی نے ایک بار پھر اس بات کو دوہرایا تھا کہ بیجنگ کشمیر کے مسئلہ کو پاکستان کی خواہش کے مطابق حل کرنے میں پوری مدد کرے گا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ چین کا انٹرنیشنل فرض بنتا تھا کہ وہ پاکستان کی خواہش کے مطابق ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ حل کرنے میں مدد دے۔ اس وقت تک سوویت یونین کو محسوس ہو چکا تھا کہ ان کا پاکستان کے ساتھ رومانس بے ثمر ثابت ہو چکا تھا اور ان کی اسلحہ کی سپلائی بھی پاکستان کو سوویت یونین کا ہمدرد بنانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی پاکستان کی طرف سے سوویت یونین کی جنوبی ایشیاء کی متحدہ سیکیورٹی اور ٹریڈ اینڈ ٹرانزٹ ٹریٹی کی تجویز کو مسترد کرنے سے سوویت یونین بہت ناراض ہوا۔ اس کے نتیجہ میں سوویت یونین نے اچانک پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی بند کر دی تھی ماسکو نے پاکستان کے بارے میں اپنی پالیسی بدل دی تھی۔ اب سوویت یونین پاکستان کی طرف سے ناکامی کے بعد واپس ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا اور ہندوستان کو مزید معاشی اور فوجی مدد دینے کی پیشکش کی تھی تا کہ پاکستان کو اسلحہ سپلائی کی وجہ سے جو ناراضگی پیدا ہوئی تھی اسے دور کیا جا سکے ہندوستان نے سوویت یونین کی بدلی ہوئی پالیسی کو خوش آمدید کہا اور اس کے ساتھ ہی سوویت یونین نے ہندوستان پر زور دیا تھا کہ وہ سوویت یونین کے ساتھ امن دوستی اور تعاون کا نیا معاہدہ کرے اس کے بدلے سوویت یونین ہندوستان کا بیرونی جارحیت کی صورت میں دفاع کرے گا۔

9 اگست 1971ء میں سوویت یونین اور ہندوستان نے ایک نئے معاہدے پر دستخط کیے تھے اور یہ معاہدہ امن دوستی اور تعاون کے بارے میں تھا جو 20 سالوں تک قانونی اور سیاسی بنیادوں پر ہندوستان اور سوویت یونین کے درمیان تعاون کا معاہدہ ہوگا۔ یہ معاہدہ دونوں ملکوں کو بیرونی جارحیت کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا پابند بناتا تھا۔ اس معاہدے میں لکھا گیا تھا کہ اگر معاہدے کا ایک فریق بیرونی حملے کا خطرہ محسوس کرے تو دونوں فریق فوراً ایک دوسرے سے مشورہ کریں گے اور مناسب اقدامات کریں گے تاکہ ان کے ملک میں امن اور سیکیورٹی کو یقینی بنایا جائے۔ اس معاہدے میں یہ یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ اگر پاکستان چین کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کرتا ہے اور کشمیر میں نقصان پہنچاتا ہے تو سوویت یونین کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ہندوستان سے مشورہ کرکے اسے ضروری مدد پہنچائے تاکہ ہندوستان جارحیت کی مزاحمت کر سکے اور ہندوستان کی سیکیورٹی کو یقینی بنایا جا سکے۔ لیکن اس معاہدے میں فوجی مدد کا ذکر نہیں کیا گیا تھا اگر بیرونی حملہ ہوتا ہے تو مناسب اقدام کا ذکر موجود تھا۔ لیکن سوویت وزیر خارجہ گورمیکو (Gromyko) نے اس معاہدے میں مناسب اقدام کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ معاہدہ ہندوستان کو سوویت یونین کی فوجی امداد مہیا کرتا ہے اگر ہندوستان کے خلاف کوئی جارحیت ہو جائے تو سوویت یونین اس معاہدے کے مطابق ہندوستان کو اس کے مخالف پڑوسی ملک کے خلاف فوجی مدد مہیا کرے گا اور اس معاہدے میں اس کی گرانٹی (Gurantee) دی گئی تھی۔ دوسری طرف سوویت یونین نے ایک بار پھر چینی لیڈروں پر الزام لگایا تھا کہ وہ پاکستانی فوجی جرنیلوں کی کشمیر میں نئی جنگ شروع کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ سوویت اخبار نے لکھا تھا کہ چینی لیڈروں نے پاکستانی جرنیلوں کے ساتھ ہمیشہ وعدے کیے تھے کہ وہ کشمیر کے سوال پر ان کی مدد کریں گے۔

1969ء میں ائر مارشل نور خان کے ساتھ چینی لیڈروں نے اس پر بات چیت کی تھی کہ وہ کشمیر پر کوئی بھی قدم اٹھائیں گے تو چین مدد کرے گا۔ ایسا ہی ایک بیان گوموجو (Gomojo) نے 1970ء میں پاکستان کے دورے کے دوران دیا تھا یہ دورہ فروری 1970ء میں کیا گیا تھا۔ پاکستان کے ایک سابق صدر جنرل یحییٰ خان کے دورہ بیجنگ کے

دوران جونومبر 1970ء میں کیا گیا تھا چین نے ایسی ہی یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ کشمیر پر اس کی مدد کرے گا۔چین کے لیڈر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اختلافات کوکم کرنے کی بجائے وہ مداخلت کرتے تھے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات نارمل نہ ہونے پائیں اور پاکستان کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ وہ کشمیر پرنئی جنگ کا آغاز کرے اور وہ اس جنگ کوصاف طور پر اپنے حق میں استعمال کرنے کی سیاسی حکمت عملی سے کام لیتے تھے۔سوویت یونین نے چین اور امریکہ کے مشترکہ جاری کیے گئے بیان جو صدر نیکسن (Nixon) کے چین کے دورے کے دوران جاری کیا گیا تھا شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا کہ دونوں ملک برصغیر میں ماحول کوکشیدہ اور غیر یقینی حالت میں رکھنا چاہیے تھے۔امریکی صدر نیکسن اور چینی وزیر اعظم چیون لائی نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں اپنی اپنی طرف کے لائن آف کنٹرول کی جانب سے فوجیں کشمیر سے نکالیں۔چین نے ایک بار پھر اپنی حمایت کا پاکستانی حکومت کو یقین دلایا تھا اور ریاست جموں کشمیر کے عوام کی حق خودارادیت کی جدوجہد میں ان کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا تھا۔ سوویت اخبار پراودا(Pravda) نے لکھا تھا کہ چیون لائی اور صدر نیکسن کا مشترکہ بیان ایک بدتمیزانہ مداخلت کے سوا کچھ نہیں ہے جو ہندوستان کے اندرونی معاملات میں کی گئی تھی اور یہ مشترکہ بیان اس بات کو یقین میں بدل دیتا ہے کہ چین برصغیر میں تعلقات کو نارمل ہونے کے خلاف تھا اور چین پاکستان میں ہندوستان کے خلاف بدلے کے رجحانات کو بڑھکانے کی کوشش کررہا تھا۔

سوویت یونین نے چین اور امریکہ دونوں سے کہا تھا کہ وہ برصغیر پاک وہند میں مداخلت سے باز رہیں۔سوویت یونین کی اس وقت ایک ہی کوشش تھی کہ کسی طریقے سے چین کو پاکستان پر اپنا اثرورسوخ قائم کرنے سے ہرممکن طریقے سے روکے کیونکہ سوویت یونین کے لیے چین صرف برصغیر پاک وہند میں مسائل نہیں کھڑے کررہا تھا بلکہ سوویت یونین کو سب سے بڑا خطرہ چین سے سنٹرل ایشین ریاستوں میں بھی پیدا ہو چکا تھا چین پاکستان کے ذریعہ ریاست جموں کشمیر کے جس حصے میں اپنا اثر پیدا کرنے میں لگا ہوا تھا دراصل وہ

ریاست کے علاقے سنٹرل ایشیاء سے زمینی طور پر اپنے باڈر کے ذریعہ ملے ہوئے تھے۔ اس طرح سوویت یونین جغرافیائی طور پر ریاست جموں کشمیر کے مسئلے سے اپنے آپ کو جڑا ہوا محسوس کرتا تھا اور اس لیے وہ ریاست جموں کشمیر کے مستقبل سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ سوویت یونین کو امریکہ سے یہ خطرہ تھا کہ وہ ریاست جموں کشمیر کے شمالی حصے خاص کر گلگت بلتستان میں فوجی اڈے قائم کر کے سنٹرل ایشیائی ریاستوں میں مداخلت کر سکتا تھا۔ سوویت یونین کے لیے اب ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ میں دلچسپی کی وجہ صرف یہی نہیں تھی بلکہ وہ سنٹرل ایشیاء کے ساتھ اسی علاقے سے تجارتی راہداری تعمیر کرتے ہوئے اس پرانے تجارتی راستے کو کھول کر پورے برصغیر پاکستان اور ہندوستان سے تجارت کر سکتا تھا اور اس راستے سے وہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک تک اپنا اثر رسوخ بنا سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ سوویت یونین کی دلچسپی ابتداء میں ہندستان سے زیادہ پاکستان کے ساتھ تھی اور سوویت یونین نے پاکستان کو اپنا دوست بنانے کی بھرپور کوششیں کی تھیں جو امریکہ کے پاکستان میں اثرات سے بارآور ثابت نہ ہوئیں۔ سویت یونین چین کی ریاست جموں کشمیر کے شمای علاقوں میں موجودگی کو اپنی سیکیورٹی کے لیے بھی خطرہ محسوس کرتا تھا۔ پاکستان کے ساتھ چین کا سرحدی معاہدہ جو 1963ء میں ہوا تھا اس کی وجہ سے گلگت میں ہنزہ کے جو علاقے چین نے حاصل کیے تھے اس کی وجہ سے چین سوویت یونین کے لیے ایک بڑا دباؤ بنانے کی پوزیشن میں آچکا تھا۔

دراصل ریاست جموں کشمیر کا یہ شمالی علاقہ خاص کر کے جو علاقے پاکستان کے کنٹرول میں آگئے تھے۔ سوویت یونین، چین اور امریکہ تینوں کے لیے نہایت ہی اہمیت کے علاقے تھے اور ان علاقوں کے بارے میں ہی کہا گیا تھا کہ یہاں دنیا کی تین بڑی بادشاہتیں آپس میں ملتی ہیں لیکن اس وقت یہاں اسی خطے میں تین دنیا کی بڑی طاقتوں کی آپس میں شدید کشمکش چل رہی تھی۔ سوویت یونین نے چین اور امریکہ پر شدید تنقید کر کے کسی حد تک ہندوستان کو ایک بار پھر یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی مکمل حمایت کرے گا۔ یہ اس اعتماد کا بھی اظہار تھا کہ اب سوویت یونین ہندوستان کے رویے سے مطمئن تھا جو ہندوستان کا سوویت یونین کے بارے میں تھا۔ سوویت یونین ہندوستان سے امید رکھتا تھا کہ وہ مزید دوستی اور

تعاون کو مضبوط کریں گے اور چین کے خلاف رکاوٹ بنانے میں مدد دے گا۔ 2 جولائی 1972ء میں ہندوستان اور پاکستان نے شملہ معاہدہ کیا تھا۔ سوویت یونین نے شملہ معاہدے کو خوش آئند قرار دیا تھا کیونکہ یہ ایشیاء میں امن سے رہنے اور کشیدگی کو کم کرنے کے لیے ایک اہم بنیاد مہیا کرتا تھا۔ یہ معاہدہ ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ حل کرنے کے لیے دوطرفہ مذاکرات پر زور دیتا تھا اور کسی بھی بیرونی مداخلت کے بغیر مخلصانہ طریقے سے تعلقات کو نارمل کرنے پر زور دیتا تھا اور برصغیر میں امن کی بحال کے لیے بھی یہ معاہدہ اہم بنیاد تھا۔ شملہ معاہدے کو ہر اس فریق نے قبول کیا تھا جن کے دل میں اس خطے میں امن اور پائیدار حالات کے لیے درد تھا۔ شملہ معاہدہ دونوں فریقوں کو اپنے مسائل پرامن طریقے سے حل کرنے اور پاکستان کو کشمیر میں فوجی حل سے پرہیز کرنے پر راضی کر چکا تھا۔ اس معاہدے کے تحت پاکستان برصغیر میں طاقت کے توازن کے بدل جانے کو محسوس کر چکا تھا اور وعدہ کر چکا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ یہ اپنے اختلافات کو پرامن طریقے سے دوطرفہ مذاکرات کے ذریعہ حل کرے گا اور کشمیر میں طاقت کے استعمال سے پرہیز کرے گا اور دسمبر 1971ء والی سیز فائز لائن کی خلاف وزری نہیں کرے گا۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کی حیثیت کو کشمیر میں چیلنج نہیں کرے گا اور نہ بیرونی مدد سے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرے گا۔

ہندوستان کے وزیر خارجہ سوارن سنگھ نے کہا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان سیز فائز لائن کی جونئی حد بندی کی گئی تھی دونوں فریق اس کا احترام کریں گے۔ اور یہ نئی سیز فائز لائن جسے لائن آف کنٹرول کا نام دیا گیا تھا اس کو یکطرفہ طور پر تبدیل نہیں کیا جائے گا اور دونوں فریق اس لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کے لیے طاقت کا استعمال نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہندوستانی حکومت کے ایک ترجمان نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ شملہ معاہدے کی روشنی میں ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کا حل دوطرفہ مذاکرات کے زریعہ بغیر طاقت کے استعمال اور کسی بیرونی مداخلت کے نکال دیا جائے گا۔ شملہ معاہدہ کو جموں کشمیر کے ہندوستانی کنٹرول والے علاقوں کی حکومت نے خوش آئند قرار دیا تھا اور پاکستان کی طرف سے زبردستی ریاست کا

ہندوستانی علاقہ لینے کی پالیسی کا خاتمہ تصور کیا گیا تھا ریاست جموں کشمیر کے ہندوستانی کنٹرول والے علاقوں کے وزیراعظم میر قاسم نے کہا تھا کہ یہ معاہدہ ایک تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ شملہ معاہدہ نہ صرف دونوں ملکوں کی عوام کی خواہشات کا امین تھا بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان امن اور خوشحالی کا بھی ضامن ہوگا۔ نیشنل کانفرنس کے لیڈر اور سابق ریاستی وزیراعظم شیخ عبداللہ نے کہا تھا کہ شملہ معاہدہ اچھی شروعات ہے لیکن ہمیں بھی بہت دور تک سفر کرنا ہے۔ چین نے بھی شملہ معاہدے کی حمایت کی تھی۔ چیون لائی نے کہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان نے باہمی مشورے سے ایک نامکمل یا جانبدارانہ طرز کا معاہدہ کیا ہے۔ دراصل ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت پاکستانی صدر تھا نے اس پوزیشن کو اچھی طرح استعمال کرتے ہوئے شملہ معاہدہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ بھٹو نے کہا تھا کہ سوویت یونین کو دوطرفہ مذاکرات سے دور رکھنا ہی چین کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنا تھا اور اس لیے چین نے اس معاہدے کی حمایت کی تھی۔ تاہم بڑی طاقتیں آسانی سے دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے باز نہیں آئیں گی۔ سوویت یونین نے چین کے تضادات کو سامنے لاتے ہوئے اسے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ایک طرف چینی وزیراعظم چیون لائی شملہ معاہدے کی حمایت کر رہا تھا اور دوسری طرف پاکستان کو ہندوستان کے خلاف جارحانہ قدم اٹھانے پر اکسا رہا تھا۔ چین پر سامنے سے حملہ کرتے ہوئے ایک سوویت سکالر نے کہا تھا کہ چین برطانیہ کی سامراجی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے جنوبی ایشیاء میں تنازعات کو ہوا دیتا ہے اور سازشوں خفیہ منصوبوں کے ذریعہ مخالفانہ رویوں کو بڑھاوا دیتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ چین نے برصغیر میں صورتحال کو بگاڑنے میں اہم رول ادا کیا تھا جس میں پاکستانی لیڈروں کو اسلحہ دینا اور حوصلہ افزائی کرنا کہ وہ کشمیر پر حملہ کریں بھی شامل تھا۔ حالانکہ ریاست جموں کشمیر کی آبادی کی 1947ء میں یہ خواہش تھی کہ وہ ہندوستان کا حصہ بنیں۔

1965ء کی جنگ میں پاکستان کو حوصلہ چین نے دیا تھا اور بڑا اہم رول چین کا تھا۔ بیجنگ نے پاکستان کو حمایت کا یقین دلایا تھا اور ہندوستان کو دھمکی دی تھی جب ہندوستان نے چین کی دھمکی کو ماننے سے انکار کیا تھا تو چین کو پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔

سوویت یونین کی طرف سے چین کے بارے میں یہ سارے خیالات درست تھے لیکن سوویت یونین کا اپنا رویہ برصغیر کے بارے میں بہت زیادہ منفی تھا اور جو کچھ سوویت یونین، چین اور پاکستان کے لیے کہہ رہا تھا یہی کچھ وہ ہندوستان کے ساتھ کر رہا تھا اور ہندوستان سوویت اسلحہ کا سب سے بڑا خریدار تھا جنگی ساز وسامان بنا کر دوسرے ملکوں کو اسلحہ کی منڈی کے طور پر استعمال کرنا اور امن اور مزدور کے حقوق کی باتیں کرنا سوویت یونین کی اپنی تضادات سے بھری ہوئی پالیسی کا حصہ تھا۔ جو کام چین کے لیے جائز نہیں وہی کام سوویت یونین کے لیے کس طرح جائز ہوسکتا تھا چین پاکستان کو اسلحہ سپلائی کرے تو سوویت یونین کو اعتراض تھا لیکن اگر سوویت یونین انڈیا اور پاکستان دونوں کو اسلحہ سپلائی کرے تو وہ جائز کس طرح ہوسکتا تھا پھر یہ کونسی سوشلسٹ پالیسی تھی جس میں غریب ملکوں کے محنت کشوں کا خون چوس کر ظالم حکمران طبقات سوویت یونین کو اسلحہ کی قسطیں ادا کرتے تھے اور سوویت یونین نے ہندوستان جیسے غریب ملک کو اسلحہ کی منڈی بنا رکھا تھا اور پاکستان کو بھی اسلحہ کی منڈی بنانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا جس میں ناکامی ہوئی پھر سوویت یونین کا ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ پر انتہائی رجعت پسندانہ کردار رہا تھا کئی بار ریاست جموں کشمیر کے قومی سوال پر درست موقف اور ترقی پسندانہ کردار ادا کرنے کی بجائے بار بار ویٹو کا استعمال کرنا سوویت یونین کی اپنی رجعت پسندی کی قلعی کھول دیتا ہے۔ ایک طرف امریکی سامراج نے خطے میں اسلحہ کی دوڑ لگوا رکھی تھی تو دوسری طرف سوویت یونین کا کردار بھی جنوبی ایشیاء میں اسلحہ کے سوداگر کا تھا۔ چین نے پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی اس وقت شروع کی جب چین نے پاکستان کے ساتھ سرحدی معاہدہ کیا تھا اور اس معاہدے کے بعد امریکہ اور سوویت یونین دونوں اپنے مفادات کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے اور پاکستان کا جھکاؤ چین کی طرف ہو گیا تھا جبکہ سوویت یونین کا رجعت پسندانہ کردار جموں کشمیر کا تنازعہ حل ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا حالانکہ پاکستان نے امریکہ سے مایوس ہو کر سوویت یونین کی طرف رجوع کیا تھا لیکن سوویت یونین کا رویہ منافقانہ ہی رہا اگر وہ چاہتا تو انڈیا اور پاکستان کے درمیان شروع میں ہی کشمیر کا تنازعہ حل کروا سکتا تھا لیکن سوویت یونین نے سٹالن کی موت کے بعد ریاست جموں

کشمیر کے سوال پر امریکی سامراج کے جنوبی ایشیائی خطے میں اور خاص کر ریاست کے مسئلے میں دلچسپی کی وجہ سے مخالفانہ رویہ اختیار کیا تھا۔

سوویت یونین کی پالیسی اس خطے میں کشمیر کے تنازعہ کو بڑھانے اور مزید پیچیدہ بنانے کا سبب بنی تھی۔ چین کے رویے کی شکایت سوویت یونین کو تب ہوتی اگر اس کی اپنی پالیسی درست ہوتی۔ کشمیر کے حوالے سے چین کی پالیسی یہی تھی کہ پاکستان اس پر زبردستی قبضہ کرے جبکہ پاکستان امریکہ کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کشمیر کا مسئلہ حل کروائے گا جبکہ امریکہ کا اس خطے میں اپنا ڈیزائن تھا۔ چین ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کے حوالے سے یہ تصور رکھتا تھا کہ یہ مسئلہ امریکہ اور سوویت یونین اقوام متحدہ میں کبھی حل نہیں ہونے دیں گے اور اسی لیے بیجنگ کو یقین تھا کہ پاکستان بازور طاقت حاصل کرے اور چین نے کھل کر پاکستان کی حمایت بھی کی تھی اور فوجی اسلحہ بھی دیا تھا۔ 1974ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے چین کا دورہ کیا تھا تو ڈینگ زیاؤ پنگ (Deng Xiaoping) نے ایک بار پھر اس بات کی یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ پاکستان کی مرضی سے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے میں اس کی پوری مدد کرے گا۔ سوویت یونین نے فوری چین کے اس بیان کی مذمت کرتے ہوئے اس کو بڑھکاؤ اعلان قرار دیا تھا۔ جب 1979ء میں افغانستان میں سوویت یونین کی حامی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی نے کابل کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر خود قبضہ کر لیا تھا اور اس کے خلاف امریکہ سمیت دیگر ملکوں نے دائیں بازو کی مذہبی جماعتوں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔

جس کے نتیجے میں افغان حکومت کے خلاف مذہبی اور سیاسی گروپوں کی طرف سے مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا افغان حکومت نے انقلاب کے خطرے میں گر جانے سے سوویت حکومت سے فوجی مدد طلب کی۔ 1979ء کے موسم بہار میں جب سوویت فوجوں نے کابل کی سڑکوں پر مارچ کیا تھا تو اس وقت چین کو محسوس ہوا کہ اس کی سیکیورٹی تو برصغیر میں پائیدار حالات سے جڑی ہوئی تھی۔ چین نے محسوس کیا تھا کہ شملہ معاہدہ جو ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ کے حل کرنے کے لیے لاگو کیا جائے تو اس کی اب مزید مخالفت کرنے کی ضرورت نہیں تھی چین صرف برصغیر میں سوویت یونین کے کردار کو محدود کرنا چاہتا تھا۔ یہ تب ممکن ہو سکتا تھا جب

بیجنگ اپنی ہندوستان مخالفت سے کنارہ کشی کرے۔ اب چین نے پاکستان پر زور دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ ریاست جموں کشمیر کے سوال کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق حل کرنے کی کوشش جاری رکھے جو شملہ معاہدے کے مطابق حل ہو۔ چین کو اب یقین ہو گیا تھا کہ شملہ معاہدے کی رو سے پاکستان ریاست جموں کشمیر کے اس حصے پر کنٹرول کرے گا جو چین کے سنکیانگ (Singkiag) کے علاقوں سے ملتا تھا اور ریاست جموں کشمیر کا موجود لائن آف کنٹرول کے مطابق حل چین کی حکمت عملی اور فوجی فائدے پر اثر انداز نہیں ہوگا جو فوائد چین نے پاکستانی کنٹرول والے ریاست کے علاقوں میں حاصل کر لیے تھے۔ یہ فوائد سوویت یونین پر چین کی اس خطے میں برتری ظاہر کرتے تھے۔ لیکن سوویت یونین جو جغرافیائی لحاظ سے ریاست جموں کشمیر کے ساتھ جڑا ہوا تھا سنٹرل ایشین ریاستوں کی وجہ سے وہ ریاست جموں کشمیر کے مستقبل سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ سوویت مخالف چین کی ریاست جموں کشمیر کے پاکستانی کنٹرول والے علاقے میں موجودگی سوویت یونین کے سیکیورٹی مفادات کے لیے براہِ راست خطرہ بن چکی تھی۔ پاکستان کے ساتھ 1963ء کے سرحدی معاہدے میں چین ہنزہ کے ساتھ منٹا کا پاس (Mintaka) کے جنوبی حصے حاصل کر چکا تھا۔ دوسری طرف سوویت یونین واہ خان کوریڈور (Corridor) میں اپنی فوجی پوزیشن مضبوط کر چکا تھا۔ واہ خان سے سوویت یونین آسانی سے گلگت پر مضبوط دباؤ ڈال سکتا تھا۔ اگر گلگت کا علاقہ پاکستان نے چین کے حوالے کر دیا تو سوویت مخالفانہ سرگرمیوں کے خلاف یہ بات یقینی تھی کہ سوویت یونین گلگت کی طرف بڑھے گا۔

سوویت یونین ساری ریاست جموں کشمیر کو متحد کر کے ہندوستان کے کنٹرول میں کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا سوویت یونین کے لیے صرف گلگت کو ہندوستان کے کنٹرول میں کرنے سے بھی پامیر اور سنٹرل ایشین ریاستوں کے لیے چین کا خطرہ ختم کر سکتا تھا۔ ماسکو اس بات کو یقینی بنانا چاہتا تھا کہ پاکستان کو دوبارہ کشمیر پر حملہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے تاکہ وہ طاقت سے اور جارحیت کر کے ریاست کے علاقے اپنے کنٹرول میں نہ لے سکے۔ سیکیورٹی کی وجوہات کی بنا پر سوویت یونین کشمیر کو ہندوستان کا حصہ ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ سیاسی اور فوجی

مقاصد سوویت یونین کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ ہندوستان کی حمایت کرے۔ یہی حال چین اور امریکہ کا بھی تھا۔ ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ ان ملکوں نے جنوبی ایشیاء میں اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا اور ہندوستان اور پاکستان ان بڑی طاقتوں کے خطے میں پراکسی کا کردار ادا کرتے رہے ہیں اور ان کے فیصلے یہی بڑی طاقتیں کرتیں رہی ہیں یا ان سے اپنی مرضی کے فیصلے کرواتے رہے ہیں اور ان سے پالیسیاں بڑی طاقتیں اپنی مرضی کی بنواتی رہی ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہونے کی بڑی وجہ جنوبی ایشیاء میں ان بڑی طاقتوں کا مفاداتی ٹکراؤ تھا۔ یہ بڑی طاقتیں اس مسئلے کو حل کرنے سے زیادہ اس مسئلے کو اس خطے میں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی رہی ہیں۔ ایک طرف امریکہ اور برطانیہ کی کوششیں ہیں جو ریاست جموں کشمیر کے سوال کو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی رائے شماری کرانے کی کوشش بار بار کرتے ہیں لیکن دوسری طرف سوویت یونین اور ہندوستان ہیں جو بار بار امریکہ اور برطانیہ پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ کشمیر کے مسئلے کی آڑ میں اس ریاست کے شمالی علاقوں میں جو سنٹرل ایشین ریاستوں سے ملتے ہیں میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنے کے لیے ساری کوشش کر رہے ہیں تا کہ سوویت یونین پر اس کے سرحدی علاقوں میں فوجی اڈے تعمیر کر کے اس پر دباؤ بڑھایا جائے سوویت یونین بار بار اقوام متحدہ کے سیکیورٹی کونسل میں بنائے گئے کمیشن کے اراکین پر بھی الزامات لگاتا تھا۔ وہ اس ریاست میں اقوام متحدہ کے کمیشن کے پردے میں امریکی اہلکاروں کو بھیجا جاتا تھا اور سوویت یونین نے اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو جو ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کے لیے پیش کی گئیں قبول کرنے سے انکار کیا تھا اور کئی قراردادوں کو ویٹو کیا تھا اس سارے عمل سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں حل کرنے کی بجائے الجھانے کے لیے لے جایا گیا تھا۔

☆☆☆☆

دسواں باب

اقوام متحدہ کی قراردادیں اور مسئلہ جموں کشمیر

ہندوستانی حکومت نے یکم جنوری 1948ء میں اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل سے تحریری درخواست کی تھی کہ وہ جموں کشمیر کے تنازعہ میں مداخلت کرے۔جموں کشمیر کا مسئلہ 6 جنوری 1948ء کو اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں بحث کے لیے لایا گیا تھا۔سیکیورٹی کونسل نے اس تنازعہ پر 20 جنوری 1948ء تک 5 پانچ اجلاس اور کئی بحثیں کیں۔اقوام متحدہ نے اس مسئلہ کے حل کے لیے سکیورٹی کونسل کا کمیشن بنایا اور دو نمائندے برصغیر بھیجے گئے ان سب لوگوں نے اپنی تمام کوششیں اس تنازعہ کو پرامن طور پر حل کرنے کے لیے وقف کیں لیکن یہ تنازعہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔جموں کشمیر کی ریاست پر تنازعہ دونوں ملکوں کے درمیان آج بھی اس قدر الجھا ہوا ہے کہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کے امکان کو خارج نہیں کیا جاسکتا اور یہ تنازعہ اس وقت پورے جنوبی ایشیائی خطے کے لیے نیوکلیر فلش پوائنٹ بنا ہوا ہے اس مسئلہ پر 1947ء سے ہی امریکہ،سوویت یونین (سابقہ) برطانیہ اور چین کی مداخلت جاری ہے اگر ہم اس زمانے کا جائزہ لیں تو آج ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ کئی زیادہ الجھا دیا گیا ہے ہندوستان اور پاکستان کے حکمران طبقات کی نااہلی کا یہ عالم ہے کہ یہ اس تنازعہ پر بڑی طاقتوں کی پراکسی کا کردار ادا کرتے ہوئے اس خطے کو نفرت کی آگ میں جھونک چکے ہیں جب سے جموں کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی میں گیا ہے بڑی طاقتوں کی

اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں اور جنوری ایشیائی خطے میں ان کی آپس میں ہونے والی کشمکش کی وجہ سے ہی ریاست کا مسئلہ حل نہیں ہو پایا۔ اب ہم جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ اقوام متحدہ میں جموں کشمیر کے مسئلے پر پیش ہونے والی قراردادوں کی نوعیت کیا تھی اور ان پر عمل نہ ہونے کی کیا وجوہات تھیں؟ امریکہ اور اس کے اتحادی سمجھتے تھے کہ جموں کشمیر جنوبی ایشیاء میں کیمونسٹ سرگرمیوں کا مرکز بن جائے گا کیونکہ سوویت یونین کی خفیہ سرگرمیاں خطرناک حد تک اس طرف اشارہ کرتیں تھیں اور پورے خطے میں ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ نے بڑی طاقتوں کو ملوث کر دیا تھا دوسری طرف اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان نے پاکستان کے خلاف جو شکایت کی تھی اس میں بھی ہندوستان کی حکومت نے واضع طور پر اس تنازعہ کی وجہ سے عالمی امن کو لاحق خطرات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

یکم جنوری 1948ء میں ہندوستان کی حکومت نے سیکیورٹی کونسل کے صدر کو خط میں لکھا تھا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 35 ,34 کے مطابق کوئی بھی ممبر ملک اگر ایسی صورتحال پیدا کر دے جس صورتحال کے جاری رہنے سے بین الاقوامی امن اور سیکیورٹی کو خطرات لاحق ہو جائیں تو اس پر سیکیورٹی کونسل کو توجہ دینی چاہیے اور ایسی ہی صورتحال جموں کشمیر کے تنازعہ کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پیدا ہو چکی ہے اور اس کے لیے ہندوستان کو مدد چاہیے کیونکہ حملہ آور پاکستانی شہریوں اور قبائلیوں پر مشتمل ہیں یہ حملہ آور پاکستان کی سرزمین سے آپریشن کر رہے ہیں اور یہ آپریشن جموں کشمیر کی ریاست میں کر رہے ہیں جو ہندوستان سے الحاق کر چکی ہے اور ہندوستان کا حصہ بن چکی تھی۔ یہ تو ہندوستان کی حکومت کا اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے صدر کے نام تحریری متن دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے جب سیکیورٹی کونسل نے شکایت کو بحث کے لیے منظور کر لیا تو 6 جنوری 1948ء کو پہلی درخواست پاکستان کی طرف سے آئی تھی۔ اس وقت سیکیورٹی کونسل میں نمائندگی کرنے والی ریاستوں میں ارجنٹینا، بیلجیئم، کینیڈا، چین، کولمبیا، فرانس، شام، یوکرائن، سوویت یونین، برطانیہ اور امریکہ شامل تھیں۔ پاکستان کی درخواست میں دو ہفتے کا وقت دینے پر زور دیا گیا تھا تا کہ وہ اس کیس کی تیاری کر سکے۔ صرف شام کے نمائندے فارس الخوری نے پاکستان کی

درخواست کی مکمل حمایت کی تھی دوسرے ممبرانسیکیورٹی کونسل یا تو اس درخواست سے لاتعلق رہے یا ایک ہفتے سے زیادہ اس مسئلے میں دیر کرنے کی مخالفت کررہے تھے۔ اس کے بعد سیکیورٹی کونسل میں اجلاس کے دوران بھیسیکیورٹی کونسل کے ممبران ایسا رویہ سامنے لائے تھے جو بڑی طاقتوں کی مخالفت کے حساب سے کوئی زیادہ پیچیدہ رویہ نہیں تھا۔ جب سیکیورٹی کونسل ہندوستانی شکایت پر غور وخوض کرنے لگی تو اسے معلوم ہوا کہ یہ کیس تو بین الاقوامی قانونی عمل اور بڑی حد تک سختی سے اس کی تھیوری سے جڑا ہوا تھا۔ ہندوستان نے جموں کشمیر کے تنازعے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ اس تنازعہ کی موجودگی سے بین الاقوامی امن اور سیکیورٹی کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا تھا اور یہ تنازعہ پاکستان نے جموں کشمیر پر حملہ کرنے والوں کی مدد کرکے پیدا کیا تھا۔ اس حملہ کے نتیجہ میں جو صورتحال پیدا ہوئی تھی اس نے مندرجہ ذیل نتائج پیدا کیے ہیں۔

ا۔ یہ حملہ آور پاکستان نے اپنے علاقوں سے گزرنے دیئے تھے۔

۲۔ ان حملہ آوروں کو آپریشن کے لیے پاکستان کی سرزمین استعمال کرنے دی گئی تھی۔

۳۔ ان حملہ آوروں میں پاکستان کے اپنے شہری بھی شامل تھے۔

۴۔ جموں کشمیر کے حملہ آوروں نے ساری فوجی مدد پاکستان سے حاصل کی تھی جس میں فوجی ساز وسامان، ٹرانسپورٹیشن اور پٹرول کی سپلائی بھی شامل تھی۔

۵۔ پاکستانی فوجی آفیسرز ان حملہ آوروں کی تربیت کررہے تھے اور ان کی رہنمائی اور مدد کررہے تھے۔

پاکستان نے سیکیورٹی کونسل میں ان نقاط پر بات چیت کرنے سے انکار کردیا تھا۔ پاکستان کا رویہ غیر جانبدارانہ نہیں تھا اور ہندوستان یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان اس کے علاقوں پر جارحیت کا مرتکب ہوا تھا اور بین الاقوامی قانون ہندوستان کو یہ حق دیتا ہے کہ اس کی فوج پاکستان میں داخل ہوکر حملہ آوروں سے نمٹے۔ تاہم اس طرح کے عمل سے پاکستان کے ساتھ کھلا کھلم جنگ کا خطرہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان نے اقوام متحدہ سے رجوع کیا تھا۔ حکومت پاکستان نے اس کا پہلے تحریری جواب دیا تھا جو ہندوستان نے اس کے خلاف سیکیورٹی کونسل

میں شکایت درج کروائی تھی اور پھر سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان کے خلاف جوابی شکایات درج کروائی گئی تھیں۔ پاکستان نے سیکیورٹی کونسل میں تین تفصیلی کاغذات جمع کروائے تھے۔ پہلے کاغذات کے حصے میں ہندوستانی شکایت کا جواب دیا گیا تھا جس میں پاکستان نے قبائلیوں کی مدد سے انکار کر دیا تھا اور کسی قسم کی جارحیت میں حصہ لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ تاہم حکومت پاکستان نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ کچھ قبائلی آزادانہ طور پر کچھ پاکستانی رضا کارانہ طور پر آزاد کشمیر کی حکومت کی مدد کر رہے تھے کیونکہ وہ اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے۔ دوسرے تحریری کاغذات کے حصے میں حکومت پاکستان نے کئی جوابی شکایات ہندوستان کے خلاف کھڑی کی تھیں۔

پاکستان نے ہندوستان پر مسلم آبادی کا قتلِ عام کرنے کا الزام لگایا تھا جس میں شاہی ریاستوں کے ذمہ دار اہلکاروں اور ہندوستان کی اپنی حکومت بھی بٹوارے کے دوران اس قتلِ عام میں ملوث تھی۔ پاکستان نے ہندوستان پر جوناگڑھ کی ریاست پر بزور طاقت قبضہ کرنے کا بھی الزام لگایا تھا۔ جوناگڑھ کی ریاست کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی لیکن حکمران مسلمان تھا جس نے ریاست کا الحاق پاکستان سے کر دیا تھا ہندوستان نے سیکیورٹی فورسز بھیج کر جوناگڑھ پر پہلے قبضہ کیا اور پھر رائے شماری کروا کر اس کو ہندوستان میں شامل کر لیا تھا۔ جوناگڑھ پر ہندوستانی ریاست کی طرف سے حملہ پاکستان کے خلاف جارحیت تصور کیا جاتا تھا کیونکہ ریاست کے نواب نے جو الحاق کا فیصلہ کیا تھا وہ قانونی طور پر درست تھا۔ اس لیے پاکستان کو بھی یہ قانونی حق تھا کہ وہ ہندوستانی حملہ کو بزور طاقت روک دے۔ پاکستان نے اپنے کاغذات میں ہندوستان پر جوابی الزامات سے وار کرتے ہوئے اسے واپس بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس سے جموں کشمیر کے مسئلے کی اصلیت بھی ظاہر ہوگئی اور ہندوستان سے ریاست کے الحاق کی اہمیت سے بھی انکار ہو گیا تھا۔ پاکستان نے ہندوستانی فوجوں کا ریاست جموں کشمیر میں بھیجا جانے پر شدید احتجاج کیا تھا کہ حکومت پاکستان سے مشورہ کیے بغیر اور کسی نوٹس کے بغیر فوج جموں کشمیر میں کیوں بھیجی گئی تھی کیونکہ ریاست کا پاکستان کے ساتھ معاہدہ قائمہ (Standstill) موجود تھا۔ پاکستان نے اس تحریر کے ذریعہ ہندوستان کی طرف سے

کیا گیا رائے شماری کے وعدہ پر شدید تحفظات کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ رائے شماری ہونی چاہیے لیکن ہندوستانی فوج کی موجودگی میں یہ ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور اگر جموں کشمیر کے عوام کے لیے اچھے حالات پیدا نہ کیے گئے جس میں وہ اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر سکیں اور ان کو معقول حالات کی گارنٹی نہ دی گئی تو رائے شماری کا مقصد ہی فوت ہو جاتا تھا۔

پاکستان نے سیکیورٹی کونسل میں دی گئی تحریر میں ہندوستان کے خلاف احتجاج کیا تھا کہ بٹوارے سے متعلق کیے گئے کئی معاہدوں پر عمل کرنے میں ہندوستان ناکام ہو گیا تھا جس میں فوجی سٹوروں کی (گوداموں) کی تقسیم، پیسہ کیش کی تقسیم اور کئی دوسرے معاملات بھی شامل تھے۔ پاکستان نے اپنی شکایات کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے سیکیورٹی کونسل سے درخواست کی تھی کہ وہ ہندوستان کو مندرجہ ذیل چیزوں سے روکے۔

۱۔ ہندوستانی حکومت کو بتائے کہ وہ پاکستان کے خلاف جارحیت سے باز رہے اور تمام معاہدے جو پاکستان سے کیے ہیں ان کی پاسداری کرے۔

۲۔ سیکیورٹی کونسل ایک کمیشن بنائے جو ہندوستان پر لگائے گئے تمام الزامات کی چھان بین کرے اور جموں کشمیر میں تمام مخالفانہ سرگرمیوں کو روکنے کا بندوبست کرے۔ تمام بیرونی قوتوں کو جموں کشمیر سے نکالنے کا بندوبست کرے چاہئے وہ ہندوستانی یا پاکستانی ہوں۔ جموں کشمیر سے آئے ہوئے مہاجرین کو واپس کرنے اور ان کی آبادکاری کے لیے مددگار کا کردار ادا کرے جموں کشمیر میں غیر جانبدار انتظامیہ تشکیل دینے اور آخر میں ایک غیر جانبدار رائے شماری کروانے میں مدد کرے۔

۳۔ تیسری تحریر میں پاکستان نے بٹوارے کی وجہ سے ہندوستان کے مخالفانہ رویے کی شکایت کی تھی اور جموں کشمیر پر حکومت پاکستان نے واضع کہا تھا کہ وہ ریاست کا ہندوستان سے الحاق کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ دونوں ملکوں نے ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ سیکیورٹی کونسل میں پیش کیا تھا۔ دونوں ملکوں کو اس تنازعہ کی نیچر اور بنیاد پر شدید اختلاف تھا بلکہ اس کے حل کرنے پر جو مختلف نقطہءنظر تھا وہ بھی سامنے آ گیا تھا۔ ہندوستان کے لیے اس تنازعہ کی وجہ قبائلی حملہ بنا تھا اور پاکستان

نے اس حملے میں حصہ لیا تھا۔ ہندوستان نے ان دو وجوہات تک ہی سیکیورٹی کونسل میں اپنے کیس کا دفاع محدود رکھا تھا۔تاہم پاکستان کے لیے جموں کشمیر میں مخالفانہ سرگرمیاں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کی ساری تصویر کا صرف ایک حصہ تھا اور پاکستانی نقطہ نظر یہ تھا کہ تمام مسائل مل کر دونوں ملکوں کو تقسیم کررہے تھے ہندوستانی وفد نے اپنی شکایت سیکیورٹی کونسل میں پاکستان سے پہلے پیش کی تھی اور اس کے بعد وزیر خارجہ پاکستان سر ظفر اللہ خان نے اپنی حکومت کا موقف پیش کیا تھا جو اقوام متحدہ کی تاریخ میں اس وقت تک سب سے لمبی تقریر تھی جو ظفر اللہ نے 5 پانچ گھنٹے تک جاری رکھی تھی۔ پاکستانی وزیر خارجہ نے صرف ہندوستانی وفد سے ایک بات پر ہی اتفاق کیا تھا کہ جموں کشمیر میں حالات سنگین ہو چکے تھے اور فوراً توجہ کے متقاضی تھے۔ سر ظفر اللہ خان نے اپنی تقریر کے آخر میں واضح طور پر یہ کہا تھا کہ ریاست جموں کشمیر میں جو لوگ بھی ہندوستان اور پاکستان کی طرف سے داخل ہوئے تھے وہ فوراً ریاست سے نکل جائیں جس میں ہندوستانی فوج بھی شامل تھی اور پاکستانی وزیر خارجہ نے یہ تجویز بھی دی تھی کہ جس طرح کے ذرائع بھی استعمال کیے جائیں حالات کو بہتر کرنے کے لیے وہ پاکستان کو قبول ہوں گے۔ اس میں اگر مشترکہ انتظامیہ قائم کی جائے جو دونوں ملکوں کے گورنر جنرل کے کنٹرول میں قائم ہو یا دونوں ملکوں کا مشترکہ قبضہ اس طرح قبول کیا جائے کہ مسلم اکثریتی علاقوں میں پاکستانی مسلم فوجی تعینات کیے جائیں اور ہندو اکثریتی علاقوں میں ہندوستانی فوج تعینات کی جائے جموں کشمیر پر دونوں کا مشترکہ قبضہ قبول کیا جائے اور کامن ویلتھ کی افواج بھی ان کے ساتھ ساتھ تعینات ہوں جو اقوام متحدہ کے ذریعہ ہوں یا کسی اور طریقے سے لیکن جموں کشمیر کو بالکل صاف کر دینا چاہیے تا کہ جنگ بند ہو جائے۔ ریاست کی نارمل انتظامیہ بحال کی جائے اور اس پر کسی طرف سے بھی کوئی دباؤ نہیں ہونا چاہیے کہ مسلم کانفرنس کا طاقت پر قبضہ ہوگا یا نیشنل کانفرنس کو اس انتظامیہ کا کنٹرول

دیا جائے۔عوام پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے اور عوام کو فیصلہ کرنے کی دعوت دی جائے اور جو بھی عوام فیصلہ کرے گی اس کا خیر مقدم کیا جائے۔سیکیورٹی کونسل نے ایک قرارداد پاس کی جس میں اس کیس کی ہنگامی حالت کو تسلیم کیا گیا تھا اور دونوں سے کہا گیا تھا کہ وہ صورتحال کو بہتر بنانے کی کوشش کریں اور ایسی کوئی حرکت نہ کریں جس سے حالات بگڑیں۔

قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کو سیکیورٹی کونسل کے صدر کی مدد سے ایک ساتھ لایا جائے تا کہ ابھی سے کوئی مشترکہ گراؤنڈ تلاش کیا جائے جس کے ڈھانچے پر ہی کوئی حل نکالا جائے۔ بات چیت کا سلسلہ غیر رسمی طریقے سے شروع ہوا جس کا مطلب اقوام متحدہ کے چیپٹر (Chapter)6 کی روح کے مطابق ہی تھا جس میں تنازعہ کے دونوں فریقوں کے درمیان براہِ راست کوششوں سے مسئلہ کا حل نکالا جانا تھا گویا اقوام متحدہ دونوں فریقوں کے درمیان ان کی مرضی اور دوطرفہ مذاکرات سے ہی ان کے تنازعات کا حل تلاش کرے گی یا حل تلاش کرنے میں مدد دے گی۔اس بات چیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سمجھوتہ فریقین میں طے پا گیا اور 20 جنوری 1948ء کو ہی سیکیورٹی کونسل کے صدر نے دونوں فریقوں کی ایماء پر ایک تجویز پیش کی جو سیکیورٹی کونسل کی قرارداد میں شامل تھی جس میں سیکیورٹی کونسل کی طرف سے تین رکنی کمیشن بنانے پر اتفاق کیا گیا تھا اور کمیشن کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ اس کے اراکین جلد سے جلد صورتحال کا جائزہ لگانے کے لیے گراؤنڈ پر پہنچیں تا کہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کی طرف سے پیش کی گئی شکایات کے بارے حقائق تلاش کریں اور سیکیورٹی کونسل کی طرف سے سہولت کار ہونے کا اثر ورسوخ استعمال کر کے مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کریں۔ یہ بڑی معقول قرارداد تھی جس میں نا قبائلیوں کو اور نہ ہی ہندوستانی فوج کو نکالنے کا ذکر کیا گیا تھا اور نہ ہی رائے شماری کا ذکر تھا جو بعد میں کسی مرحلے پر کروایا جانا تھا۔ اس قرارداد کو دونوں فریقوں نے قبول کیا تھا اور یہ قرارداد 9 نو ووٹوں سے منظور کی گئی تھی جبکہ سوویت یونین اور یوکرائن نے ووٹ میں حصہ نہیں لیا تھا۔اس کے باوجود کہ سیکیورٹی کونسل نے جو کمیشن تشکیل دیا تھا وہ جنگ روکنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا لیکن وہ پھر بھی تاخیر سے برصغیر کی

طرف بھیجا گیا تھا موسم بہار میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بڑے پیمانے پر فوجی تصادم جاری تھا کمیشن کی موجودگی سے اس جنگ پر اثرات پڑ سکتے تھے۔ اگر جنگ مکمل طور پر بند نہ بھی ہوتی پھر بھی کمیشن کا فائدہ ضرور ہوتا۔ لیکن اقوام متحدہ کے کمیشن میں اس کی نہ کوئی وضاحت دی گئی تھی اور نہ ہی اس بارے میں عملاً کچھ کہا گیا تھا اور نتیجہ بھی یہ نکلا کہ دونوں ملکوں کے درمیان ناگزیر طور پر تلخ تنازعہ پھر پیدا ہو گیا۔

دونوں ملکوں کے نمائندے اقوام متحدہ کے اجلاس میں واپس آتے ہی ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کرنے لگے تھے اور بار بار انہی الزامات کو دوہرا رہے تھے کہ بٹوارے کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کیا کچھ ہوا اور جموں کشمیر میں کیا ہوا تھا ہندوستان سے الحاق سے پہلے اور بعد میں اور کس طرح ریاست کے لوگوں پر ظلم وستم جاری تھا۔ دونوں ملکوں کے نمائندے ایک دوسرے پر لگائے گئے الزامات کو ثابت کرنے کے لیے بین الاقوامی پریس کے حوالے دے رہے تھے۔ 20 جنوری 1948ء کی اقوام متحدہ کی معقول اور مصالحت پسندانہ قرارداد دونوں فریقوں کی زہر آلودہ بڑی بڑی تقریروں کے نیچے دفن ہو گئی تھی۔ آخر ہندوستان نے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں ایک تجویز دی جس میں یہ نرمی کا اشارہ دیا گیا تھا کہ مستقبل میں مشروط طور پر رائے شماری کروائی جا سکتی تھی۔ ہندوستانی وفد نے مندرجہ ذیل تجاویز سیکیورٹی کونسل میں پیش کیں۔

ا۔ جموں کشمیر میں جنگ فوراً بند ہونی چاہیے اور قبائلیوں اور پاکستانیوں کو ریاست سے نکالا جائے۔

۲۔ امن بحال ہونے کی صورت میں مہاجرین کو واپس آنے دیا جائے گا اور امن وامان کو بحال رکھا جائے گا اور جموں کشمیر کی سالمیت کا یقین دلایا جائے۔ ہندوستان نے واضح کیا تھا کہ وہ ریاست کے دفاع کا ذمہ دار تھا لیکن وہ اپنی سیکیورٹی فورسز کو اتنا کم کر دے گا جو بیرونی جارحیت اور اندرونی امن کے لیے ریاست میں ضروری ہوں۔

۳۔ شیخ عبداللہ ریاست کا وزیر اعظم رہے گا۔

۴۔ اقوام متحدہ کا کمیشن ہندوستان کا دورہ کرے اور جنگ بندی کی نگرانی کرے اور صلح کاری کرنے سے پہلے فوجی آپریشن کو ختم کرے اور نگرانی کرے۔ ہندوستانی وفد نے رائے شماری کے لیے یہ تجاویز دیں تھیں۔

۱۔ ریاست جموں کشمیر کی قومی اسمبلی منتخب شدہ ہو(ظاہری طور پر شیخ عبداللہ کی قیادت میں)۔

۲۔ اس کے بعد ایک قومی حکومت بنائی جائے۔

۳۔ ریاست کی یہ قومی حکومت اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ریاست میں رائے شماری کرانے کا بندوبست کرے۔

۴۔ جموں کشمیر کی یہ نیشنل اسمبلی نیا آئین تشکیل دے۔

پاکستانی حکومت کی طرف سے جو درخواست دی گئی تھی وہ ہندوستانی تجاویز کے بالکل برعکس یا الٹ دی گئی تھی۔ پاکستان نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ مندرجہ ذیل چیزوں کا ریاست میں بندوبست کرے۔

۱۔ ریاست جموں کشمیر میں ایک غیر جانبدار عارضی انتظامیہ تشکیل دی جائے۔

۲۔ جموں کشمیر سے تمام فوجوں کو نکالا جائے۔

۳۔ مہاجرین کی واپسی کا بندوبست کیا جائے۔

۴۔ ریاست میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کروائی جائے۔

دونوں کی تجاویز میں بہت بڑا فرق تھا اور اسی فرق کی بنیاد پر ہی مزید اقدامات کو دیکھا جا سکتا تھا لیکن ایک بات پر دونوں ملک شروع سے راضی تھے کہ جموں کشمیر کے مستقبل کا حل رائے شماری کے ذریعہ ہی ہونا تھا۔ دونوں میں جس بات پر تقسیم تھی وہ یہ تھا کہ ہندوستان کی خواہش تھی کہ پہلے جنگ بندی ہو اور اس کے بعد باقی کام ہوں جبکہ پاکستان زور دے رہا تھا کہ پہلے رائے شماری کے لیے سمجھوتہ ہو جائے کیونکہ لوگ لڑنا تب بند کریں جب انہیں یقین ہو جائے کہ غیر جانبدارانہ اور آزادانہ رائے شماری کروائی جائے گی۔ سیکیورٹی کونسل میں ریاست

کے مسئلے پر غور وخوض کے پہلے مرحلہ پر ہی پاکستان کی طرف سے اس خوف کا اظہار کیا گیا تھا کہ اگر لڑائی بند ہوگئی اور فوجی صورتحال مستحکم ہوگئی تو ایک حقیقی سیاسی استحکام بحال ہو جائے گا اور اس کا مطلب ریاست کا بٹوارہ ہو جائے گا اور ہندوستان کے پاس جموں کشمیر کے بہت اہم حصے آجائیں جس میں وادی کشمیر بھی شامل ہوگا۔ اس پر سیکیورٹی کونسل میں بڑی لمبی بحث ہوئی اور 9 نو سیکیورٹی کونسل کے ممبران نے پاکستانی پوزیشن یا موقف کی حمایت کی تھی سوویت یونین اور یوکرائن نے نہ بحث میں حصہ لیا نہ ہی ووٹنگ میں حصہ لیا تھا۔ اب ہندوستانی وفد نے کہا کہ یہ پاکستان کی ذمہ داری تھی کہ وہ قبائلیوں کو جموں کشمیر میں داخل ہونے سے روکے اگر قبائلی پرامن طریقے سے نہیں رکے تو پاکستان کو چاہیے کہ وہ ان کے خلاف اعلان جنگ کرے۔ یہاں ہندوستانی حکومتی اہلکاروں اور سیاستدانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ بالکل یہی تجویز یکم نومبر 1947ء میں پاکستان کے گورنر جنرل محمد علی جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو دی تھی جب دونوں ملکوں کے گورنر جنرل لاہور میں ملے تھے یہ جموں کشمیر کے تنازعہ کے شروع کے دنوں کی بات تھی لیکن اس وقت ہندوستانی حکومت نے یہ تجویز ماننے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ اس تجویز میں ہندوستانی فوجوں کے انخلاء کی بات بھی کی گئی تھی جبکہ جناح صاحب نے یہاں تک تجویز دی تھی کہ اگر قبائلی اور آزاد کشمیر فوج لڑائی بند نہیں کرتے تو ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں مل کر ان کے خلاف کاروائی کریں گے۔

سیکیورٹی کونسل کے اگلے اجلاس میں ہندوستانی اور پاکستانی وفود کی شدید لڑائی جاری رہی اور ہندوستانی وفد نے کہا کہ سیکیورٹی کونسل ان کی طرف سے تجویز کیا گیا حل کے خلاف رجحان رکھتی ہے۔ ہندوستانی وفد نے کہا کہ نہ ہندوستان نہ پاکستان اور نہ ہی سیکیورٹی کونسل کو قانونی حق ہے کہ وہ جموں کشمیر کی حکومت تشکیل دیں اور وفد نے یہاں تک کہا کہ سیکیورٹی کونسل کو ریاست میں رائے شماری کروانے کا بھی حق نہیں ہے بلکہ رائے شماری اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ہونا چاہیے لیکن اصل رائے شماری اور اس کا بندوبست تو جموں کشمیر کی حکومت اور عوام کو کرنا چاہیے اور یہ ان کا ہی حق تھا۔ جب پاکستانی وفد نے سیکیورٹی کونسل میں بات کی تو اس نے ایک بار پھر اپنی پرانی تجویز دوہرائی اور کہا رائے شماری ریاست میں ایک غیر

جانبدار انتظامیہ اور حکومت کی موجودگی میں ہونی چاہیے لیکن ریاست کی سرزمین پر کسی کی بھی فوج موجود نہیں ہونی چاہیے۔ اس بار پھر سیکیورٹی کونسل کے ممبران نے پاکستانی موقف کی حمایت کی تھی اور ممبران نے اس بات کو بہت اہمیت دی تھی کہ رائے شماری اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہونی چاہیے اور غیر جانبدار حکومت کی موجودگی ضروری ہے سیکیورٹی کونسل کے ممبران نے ہندوستان کی اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ غیر جانبدار انتظامیہ اور رائے شماری کا اصلی کام تو جموں کشمیر کی حکومت کا اندرونی معاملہ تھا۔ ہندوستانی وفد کی باتوں میں بے پناہ تضاد تھا اور سیکیورٹی کونسل کے ممبران نے ہندوستان کے وفد کو یاددلایا تھا کہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے ہونے کے بعد ہندوستان ریاست کے اقتدار اعلیٰ کو استعمال کر رہا تھا اور ہندوستان نے خود وعدہ کیا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ریاست جموں کشمیر میں رائے شماری کرائے گا۔ سیکیورٹی کونسل میں کئی ہفتوں تک جموں کشمیر کے مسئلہ پر بحث جاری رہی اور کئی تجاویز بھی پیش کیں گئی تھیں۔ کینیڈین، بلجیئم اور کولمبیا کے وفود نے ڈرافٹ کر کے قرارداد پیش کی لیکن وہ بھی قریب قریب پاکستانی موقف ہی کو قبول کر رہے تھے۔ صرف چین کے وفد نے ہندوستانی موقف کی تائید کی تھی۔ اس اجلاس میں کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ نے بھی سیکیورٹی کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ریاست کی عوام جب تک اس کے ساتھ ہے وہ ریاستی انتظامیہ کے سربراہ کے طور پر وہی رہے گا اور دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اسے ہٹا سکے۔ شیخ عبداللہ نے اس بات پر شدید تنقید کی تھی کہ اس کی حکومت کو ہٹا کر غیر جانبدار حکومت کی موجودگی میں ریاست میں رائے شماری کروائی جائے شیخ عبداللہ اس وقت تک عوامی ووٹوں کے ذریعہ نہیں بلکہ مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے سول انتظامیہ کا سربراہ بنایا گیا تھا اور اس وقت تک اس کا یہ دعویٰ درست نہیں تھا کہ عوام اس کے ساتھ تھی شیخ عبداللہ صوبہ کشمیر کا واقعی پاپولر عوامی لیڈر تھا لیکن ساری ریاست میں اس کی عوامی ساکھ اتنی پاپولر نہیں تھی۔

شیخ عبداللہ نے جموں کشمیر میں غیر جانبدار حکومت کی تشکیل کی تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا تا کہ ریاستی عوام کو فری اور غیر جانبدارانہ انتظامیہ کی موجودگی میں رائے شماری میں حصہ لینے کا حق دیا جائے۔ دراصل شیخ عبداللہ رائے شماری کروانے کے حق میں ہی

نہیں تھا اس وقت تک اس کا ہندوستان کے ساتھ ابتدائے عشق تھا اور وہ ریاستی اقتدار کا مزہ چکھ چکا تھا اور اپنی پوزیشن سے ہٹنے پر راضی نہ تھا کیونکہ ساری ریاست میں صورت بدل چکی تھی بہر حال چند دنوں کے بعد 8 فروری 1948ء کو ہندوستانی وفد نے سیکیورٹی کونسل کو اجلاس معطل کرنے کی درخواست دی تھی کیونکہ ہندوستانی حکومت نے اپنے وفد کو فوراً دہلی واپس بلایا تھا تا کہ مزید مشورہ کیا جائے۔ دراصل ہندوستانی حکومت کو محسوس ہوا کہ اس وفد نے سیکیورٹی کونسل میں کیس درست طرح پیش نہیں کیا تھا جس طرح پاکستانی وزیر خارجہ نے پیش کیا تھا۔ سیکیورٹی کونسل کے زیادہ وفود نے اجلاس کو معطل کرنے کی ہندوستانی درخواست پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انہیں یاددہانی کروائی تھی کہ جموں کشمیر کی سنگین صورتحال کسی فیصلے میں تاخیر کی اجازت نہیں دیتی تھی چینی وفد نے ایک بار پھر ہندوستانی موقف کی تائید کرتے ہوئے اجلاس کو معطل کرنے کی قرارداد پیش کی تھی۔ تاہم سیکیورٹی کونسل نے پاکستان کی جوناگڑھ کی ریاست پر کی گئی شکایت پر بحث شروع کی۔ اس ریاست کے تنازعہ کی بنیاد پر دونوں ملک اپنی اپنی پوزیشن جموں کشمیر پر مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ جوناگڑھ کی ریاست ہندو اکثریت تھی اور اس کا حکمران مسلمان تھا ریاست کے حکمران نے اپنی قانونی حیثیت استعمال کرتے ہوئے پاکستان سے الحاق کرلیا تھا جو پاکستان نے قبول بھی کرلیا تھا اب ریاست جوناگڑھ نہ آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے الحاق کرنے کی مجاز تھی اور نہ ہی جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ صرف حکمران مسلمان تھا جس کو قانون آزادی ہند میں اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ریاست کا الحاق کرے لیکن اگر وہ بنیادی شرائط پوری ہو رہی ہوں تو تب حکمران ایسا کرسکتا تھا جوناگڑھ کی ریاست میں حکمران کے اس غلط فیصلے کے خلاف بغاوت ہوگئی تھی اور ہندوستان نے سیکیورٹی فورسسز بھیج کر جوناگڑھ پر قبضہ کرلیا تھا اور بعد میں رائے شماری کروا کر ریاست کو ہندوستان میں ضم کر دیا تھا اب دوسری طرف ریاست جموں کشمیر میں بھی حکمران ہندو تھا اور عوام کی اکثریت مسلمان تھی حکمران نے ہندوستان اور پاکستان دونوں سے الحاق کرنے سے انکار کر دیا تھا جبکہ پاکستان نے ریاست پر حملہ کر دیا تھا جس طرح ہندوستان نے جوناگڑھ پر حملہ کیا تھا حکمران نے بھارت سے الحاق کر دیا تھا لیکن عوام کی

اکثریت نے اس الحاق کو جائز نہ قرار دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست متنازعہ ہوگئی تھی اور کیس اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان لے گیا تھا۔ لیکن پاکستان نے صرف جموں کشمیر کے تنازعہ کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور ہندوستان کے خلاف جوابی شکایات درج کرواتے ہوئے اس میں دیگر تنازعات بھی شامل کروا دیئے تھے۔ اب سیکیورٹی کونسل نے ہندوستانی وفد کی درخواست پر جموں کشمیر کا مسئلہ زیر بحث لانے کے بعد بحث معطل کر دی تھی اور سیکیورٹی کونسل نے پاکستان کی طرف سے کی گئی جونا گڑھ ریاست سے متعلق شکایت پر بحث شروع کر دی تھی۔

جونا گڑھ کی ریاست کے حکمران کے قانونی فیصلے پر پاکستان نے ہندوستان کے رویے پر کہا تھا کہ ہندوستان جونا گڑھ کے حکمران کے قانونی الحاق کو ماننے سے انکاری ہے جو الحاق حکمران نے اپنی ریاست کا پاکستان سے کیا تھا جبکہ ریاست جموں کشمیر کے مہاراجہ کے ہندوستان سے الحاق پر ہندوستان زور دے رہا تھا جبکہ ہندوستان نے اسی طرح پاکستان کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جونا گڑھ کے نواب محبت خان کا الحاق تو جائز سمجھتا تھا اور جموں کشمیر کے مہاراجہ کا الحاق اور ہندوستان کی قانونی حیثیت کو مسترد کرتا ہے۔ ہندوستان کا موقف تھا کہ اگر جونا گڑھ کے حکمران کا فیصلہ قانونی طور پر درست تھا تو یہی فیصلہ جموں کشمیر کے حکمران کا قانونی لحاظ سے درست کیوں نہیں تھا؟ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو دونوں ملکوں کا موقف تضادات سے بھرا ہوا تھا اگر پاکستان کو دیکھا جائے جونا گڑھ کے حکمران کی طرف سے الحاق قبول کر کے اس نے ہندوستانی موقف کی جموں کشمیر میں تائید کر دی تھی اور ہندوستان نے جموں کشمیر کے حکمران کا الحاق مشروط قبول کر کے اب اس سے انکاری ہو گیا تھا اگر جونا گڑھ کے حکمران کا پاکستان سے الحاق نا جائز تھا تو جموں کشمیر کے حکمران کا الحاق ہندوستان سے کس طرح جائز تھا۔ اگر ہندوستان اقوام متحدہ میں خود گیا تھا تو اب اسے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی دی گئی تجاویز کیوں قبول نہیں ہیں جبکہ اقوام متحدہ نے اپنی زیر نگرانی رائے شماری کی جو تجویز دی تھی یہ پہلے سے قانون آزادی ہند میں طے کیا گیا تھا کہ اگر کوئی ریاست متنازعہ ہوگئی تو اس کا فیصلہ ریفرنڈم سے کیا جائے گا۔ اگر ہندوستان نے

جوناگڑھ میں ریفرنڈم کروا لیا تھا تو جموں کشمیر میں ریفرنڈم کروانے سے کیوں انکاری ہو گیا تھا؟ 8 مارچ 1948ء کو ہندوستانی وفد دہلی سے واپس آ گیا تھا اور اقوام متحدہ میں جموں کشمیر کے تنازعہ پر پھر بحث شروع ہوئی تھی۔ اس اجلاس کے دوران سیکیورٹی کونسل کی صدارت چینی وفد کے پاس تھی۔ سیکیورٹی کونسل کے صدر نے دونوں فریقوں سے غیر رسمی سی بات چیت کی تھی اور اس کے بعد اس نے ایک ڈرافٹ قرارداد سیکیورٹی کونسل میں جمع کروائی تھی اس قرارداد میں ہندوستانی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جموں کشمیر میں دوبارہ انتظامیہ تشکیل دے اور اقوام متحدہ کے کمیشن کو ایک معقول، سادہ اور غیر واضع صلح کار کی ذمہ داری تفویض کرے جو طے شدہ ذمہ داری کے دائرے میں آتا ہو۔

حالیہ دنوں میں ہندوستانی حکومت کی اقوام متحدہ میں جس پالیسی پر زیادہ فوکس رہا تھا اور خاص کر 1950ء سے اس کا مقصد چین کے قوم پرست وفد کو سیکیورٹی کونسل کی سیٹ سے محروم کرنا تھا۔ چینی وفد کا سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان کی طرف دوستانہ رویہ جو جموں کشمیر کے مسئلے کے حوالے سے ظاہر ہوا تھا قابل رحم تھا۔ ہندوستانی وفد چین کی جموں کشمیر کے حوالے سے سیکیورٹی کونسل میں تجویز قبول کرنے کے لیے تیار تھا لیکن پاکستانی وفد نے چینی تجویز کی مخالفت کی تھی اور سیکیورٹی کونسل کے دیگر ممبران نے بھی پاکستان کی حمایت کی تھی۔ پاکستانی وفد کے سربراہ سر ظفر اللہ خان کو شیخ عبداللہ کی ریاستی انتظامیہ کو سیکیورٹی کونسل میں جانبدار ثابت کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ شیخ عبداللہ نے چند دن پہلے ہی سیکیورٹی کونسل میں بڑے جذباتی انداز میں یہ بیان دیا تھا کہ ہم موت کو گلے لگانا پسند کریں گے لیکن پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے۔ ایسی ریاستی انتظامیہ کی موجودگی میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری ممکن ہی نہیں تھی یہ سیکیورٹی کونسل کے ممبران کی اکثریت کی سوچ تھی جو بنیادی طور پر پاکستانی موقف بھی یہی تھا۔ شیخ عبداللہ کا غیر سنجیدہ رویہ اور ہندوستانی لیڈرشپ کے ساتھ خاص کر کے نہرو کے ساتھ اس کا جذباتی تعلق جموں کشمیر کے عوام کو اس مسئلے کی پیچیدگیوں میں مزید الجھانے کا باعث بن گیا تھا شیخ عبداللہ نہ تو درست طریقہ سے جموں کشمیر کے عوام کی نمائندگی کر سکے اور نہ ہی ہندوستان کو ہی کوئی فائدہ پہنچا سکے اور ہندوستان اور پاکستان ریاست کے

مسئلے کو حل کرنے کی بجائے بڑی طاقتوں کے مفادات کے لیے مزید الجھانے میں لگے رہے ہیں۔

شیخ عبداللہ سمیت ریاست کا کوئی بھی سیاسی لیڈر درست موقف پر کھڑا ہونے کی بجائے پاکستان اور ہندوستان کے موقف کی جنگ لڑتے رہے اور ہندوستان اور پاکستان جنوبی ایشیاء میں سرد جنگ کا حصہ بن کر اس پورے خطے میں نفرت اور جہالت کو بڑھانے کا باعث بنے۔ بدقسمتی سے اپنے عوام اور اپنے ملکوں کے مفادات کو نہ ریاستی لیڈر شپ نے اہمیت دی اور نہ ہی ہندوستان اور پاکستان کے حکمرانوں نے اس کو اہمیت دی اور جنوبی ایشیاء کا خطہ سامراجی سازشوں میں الجھتا گیا اور آج پون صدی (75) سال گزرنے کے باوجود اس خطے کے یہ سارے مسائل آج بھی حل طلب ہیں۔ بہرحال سیکیورٹی کونسل نے کئی ماہ گزرنے جانے کے باوجود اپنی کوشش جموں کشمیر کے تنازعہ کو پرامن طریقے سے حل کرنے کے لیے جاری رکھی۔ اس بار چھ (6) ملکوں کے وفود نے مل کر ایک ڈرافٹ کی گئی قرارداد پیش کی تھی ان وفود میں برطانیہ اور امریکہ بھی شامل تھے۔ یہ قرارداد کئی تجاویز کا مجموعہ تھا۔ ہندوستانی وفد نے سیکیورٹی کونسل کے ممبران کی یہ قرارداد بھی شدید تنقید کا نشانہ بنائی تھی اور اس پر ہندوستانی نمائندے کا یہ اعتراض تھا کہ اس قرار داد میں پاکستانی جارحیت کی مذمت نہیں کی گئی تھی۔ ہندوستانی وفد نے جموں کشمیر میں مشترکہ سیاسی جماعتوں کی اتحادی حکومت قائم کرنے کی بھی شدید مخالفت کی تھی کیونکہ بقول ان کے اس اتحادی حکومت میں ریاست کے دُشمن اور حملہ آوروں کے حمایتی بھی شامل کرنے کی تجویز دی گئی تھی جو ہندوستان کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ ریاست کا دُشمن کون تھا یہ شیخ عبداللہ نے واضع کر دیا تھا اور اس نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ ریاستی کابینہ کو چننے کا ایک ہی معیار ہوگا اور وہ معیار یہ ہوگا کہ کابینہ کے ممبر نیشنل کانفرنس اور ہندوستان کے وفادار ہوں گے۔ ہندوستانی وفد نے سیکیورٹی کونسل میں یہ بھی واضع کیا تھا کہ جب ریاست جموں کشمیر کے سارے حصے ایک انتظامیہ کے کنٹرول میں آجائیں گے تو ہندوستانی فوج کی چوکیاں ریاست کی مغربی سرحدوں کے باہر قائم کی جائیں گی۔ دراصل اس کا واضع مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی فوجوں کو ان علاقوں میں تعینات کیا جائے گا جو آزاد کشمیر

حکومت کے کنٹرول میں آچکے تھے۔ بہرحال ہندوستانی وفد کے اعتراض کے باوجود 21 اپریل 1948ء کو قرارداد (9) نو ووٹوں سے منظور کی گئی تھی جبکہ سوویت یونین اور یوکرائن نے ایک بار پھر اس میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ہندوستانی پریس اور وزیر اعظم نے پھر ایک بار قرارداد کو غیر معقول قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان نہ تو سیکیورٹی کونسل کی اس قرارداد کو قبول کرے گا اور نہ ہی اس پر عمل کرے گا۔

ہندوستانی حکومت نے سیکیورٹی کونسل کی 21 اپریل 1948ء کی قرارداد پر اقوام متحدہ کو ایک احتجاجی خط لکھا تھا جس میں واضع کیا گیا تھا کہ ہندوستان اس قرارداد کو لاگو نہیں کرے گا اور نہ ہی اس پر کوئی تعاون کرے گا۔ ایک ماہ کے بعد ہندوستانی وفد کے نمائندے نے پھر تعاون کا اشارہ دیا تھا۔ سیکیورٹی کونسل نے اپنا کمیشن ایک بار پھر ہندوستان بھیجا تھا اور ہندوستان نے اس سے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ پاکستانی وفد کے نمائندے نے بھی اس قرار داد پر مکمل اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس کی تنقید کا مطلب قرارداد کو مکمل مسترد کرنا بھی نہیں تھا۔ 21 اپریل 1948ء کی قرارداد بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ اس قرارداد نے ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کے حل کے لیے ایک خاکہ بنایا تھا اور اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کا ریاست کے تنازعہ کے حل پر موقف واضع کیا تھا کہ قرارداد ریاست کے مسئلے کے حل کا طریقہ کار تجویز کرتی تھی اور یہ قرارداد اقوام متحدہ کے نمائندوں کے لیے ایک اصولی حوالہ بن چکی تھی جو بھی اقوام متحدہ کے نمائندے ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کے پرامن حل کے لیے کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس قرارداد میں چند اہم چیزیں کی گئی تھیں۔ اس قرارداد میں کمیشن کے ممبروں کی تعداد 5 پانچ کردی گئی تھی اور انہیں ہدایت دی گئی تھی کہ وہ برصغیر کی طرف جائیں اور اپنے آفس قائم کریں اور ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی مرضی سے ان کے درمیان صلح کاری کے فرائض سرانجام دیں۔ اس قرارداد میں حکومت پاکستان کو صلاح دی گئی تھی کہ وہ قبائلیوں اور اپنے شہریوں کو ریاست جموں کشمیر سے نکالے اور ہندوستان کو کہا گیا تھا کہ وہ اپنی فوجوں کی تعداد کو کم سے کم سطح پر لے آئے جو امن وامان قائم کرنے کے لیے ضروری ہوں۔ اس قرارداد میں ریاست جموں کشمیر کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں

پر مشتمل ایک اتحادی کابینہ تشکیل دی جائے اور اس قرارداد میں ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ریفرنڈم کروانے کی یقین دہانی کروائی گئی تھی۔

یہ قرارداد رائے شماری کے لیے ایک منتظم (ایڈمنسٹریٹر) کی تقرری جو مناسب اختیار کے ساتھ کی گئی ہو تجویز کرتی ہے تا کہ یہ منتظم اپنے اختیارات کے مطابق رائے شماری کروا سکے اور مہاجرین کی واپسی کے لیے مناسب اقدامات اٹھا سکے اور سیاسی قیدیوں کو جیلوں سے آزاد کروانے اور سیاسی آزادی کے لیے کوئی مناسب قدم اٹھا سکے۔ کمیشن کو ریاست میں اپنے مبصرین رکھنے کی اجازت بھی دی گئی تھی اور اس کا فرض تھا کہ یہ کمیشن سیکیورٹی کونسل کو رپورٹ پیش کرے کہ آیا ریفرنڈم آزادانہ اور غیر جانبدارانہ تھا۔ اس قرارداد کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ریاست میں جنگ کو روکا جائے اور ایسی حالت پیدا کی جائے کہ ریاستی عوام آزادانہ اپنے مستقبل کے لیے اپنے فیصلے کا اظہار کرسکیں اور اپنی خواہش کے مطابق ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کرسکیں۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے چیپٹر (6) چھ کے تحت سیکیورٹی کونسل تنازعہ میں ملوث فریقوں کی براہِ راست رہنمائی نہیں کرتی بلکہ صرف اپنی سفارشات پیش کرتی ہے یہ فریقین کو اخلاقی طور پر پابند کرتی ہے نہ کہ قانونی طور پر پابند بناتی ہے۔ تاہم جموں کشمیر کے تنازعہ میں بھی سیکیورٹی کونسل کے تشکیل دیئے گئے کمیشن کا کردار بھی صلح کار کا تھا جو اپنی مرضی مسلط کرنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔ یہ کمیشن اپنی سرگرمیوں کو ہندوستانی اور پاکستانی اہلکاروں سے رابطے تک اور ان تک اپنی سفارشات پہنچانے تک محدود رکھے گا۔

اس کے علاوہ سیکیورٹی کونسل نے کسی بھی فریق کی طرف داری کرنے سے گریز کیا تھا تا کہ اس تنازعہ میں اپنی غیر جانبداری برقرار رکھ سکے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی حکومت کے نمائندوں کی بار بار درخواست کے باوجود کہ پاکستانی جارحیت کی جموں کشمیر میں سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں میں مذمت کی جائے لیکن سیکیورٹی کونسل نے ایسا کرنے سے گریز کیا تھا دوسری طرف جموں کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے قانونی پہلو کو بھی سیکیورٹی کونسل نے نہیں چھیڑا تھا۔ سیکیورٹی کونسل نے الحاق کے قانونی پہلو زیر بحث لانے سے گریز کیا تھا حالانکہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 96 کے تحت سیکیورٹی کونسل انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کو

درخواست کرسکتی ہے کہ وہ کسی بھی قانونی سوال اور معاملے میں قانونی رائے دے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ ہندوستان نے اور نہ ہی پاکستان نے الحاق کے سوال پر سیکیورٹی کونسل سے کوئی قانونی حیثیت کے تعین یا الحاق کے بارے میں کوئی غیر یقینی کی طرف اشارہ کیا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں ملکوں کو یقین تھا کہ جموں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق میں کوئی قانونی پہلو سے غلطی موجود نہیں تھی اور الحاق عارضی ہو چکا تھا یا اس الحاق کی حیثیت متنازعہ ہو چکی تھی اس لیے اس الحاق کے کسی قانونی پہلو پر سوال کھڑا کرنا کوئی دانشمندی نہیں تھی جب ریاست دونوں ملکوں کے درمیان متنازعہ ہو چکی تھی تو اس کے الحاق کی حیثیت بھی متنازعہ بن جاتی تھی۔

ریاست جموں کشمیر کی حیثیت متنازعہ بن گئی تھی اس لیے یہ تنازعہ سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان لے گیا تھا چونکہ سیکیورٹی کونسل کی حیثیت ایک سیاسی ادارے کی تھی اس لیے ریاست کا مسئلہ سیاسی نوعیت کا ہی تھا اور اس کا حل بھی سیاسی بنیادوں پر ہی نکالا جانا تھا اس لیے سیکیورٹی کونسل کے ممبران نے محسوس کیا ہوگا کہ ایک مناسب، غیر جانبدارانہ اور کسی حد تک ہلکی سی قرارداد کے ذریعہ ہندوستان اور پاکستان کے سامنے سفارشات پیش کی جائیں تا کہ وہ کچھ خاص اقدامات کریں اور اقوام متحدہ کا سیاسی اور اخلاقی اثر ورسوخ ہی جموں کشمیر کے تنازعہ کے پرامن حل کے لیے کافی ہوگا۔ سیکیورٹی کونسل نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ سفارتکاری اور صلح کاری کے ذریعہ ہی اس تنازعہ کو حل کیا جاسکتا ہے اور قانونی فیصلہ تنازعہ کے ایک فریق کو غلط قرار دے سکتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا تھا کہ وہ فریق اقوام متحدہ کے اس طریقہ کار کے خلاف ہوسکتا تھا۔ سیکیورٹی کونسل کے بارے میں یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا تھا کہ اس نے اقوام متحدہ کے چارٹر کے چیپٹر (Chapter 7) سات کے تحت کیوں عمل نہ کیا جبکہ یہ تنازعہ جنگ کے خطرات سے نمٹنے کے متعلق تھا۔ جبکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے بار بار سیکیورٹی کونسل کے سامنے صورتحال کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر جارحیت پسند ہونے کے سنگین الزامات بھی لگائے تھے۔ دونوں ملکوں نے سیکیورٹی کونسل پر زور دیا تھا کہ اس مسئلہ کا فوری حل نکالا جائے اور اس کی سنگینی پر زور دیا تھا۔ اگر جونا گڑھ اور جموں کشمیر میں ان کے مفادات کا خیال نہ رکھا گیا تو دونوں نے جنگ کرنے کی بھی دھمکی دی

تھی بلکہ جموں کشمیر میں دونوں ملکوں کے درمیان اس وقت بھی جنگ جاری تھی جب سیکیورٹی کونسل اس مسئلہ پر غور وخوض کررہی تھی۔ تاہم اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے چارٹر کے چیپٹر (Chapter 6) چھ کے کلاز Clause یا قانون کے مطابق سیکیورٹی کونسل کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔ اس چیپٹر (Chapter 6) چھ کے تحت سیکیورٹی کونسل فریقین کے درمیان بات چیت کرواسکتی ہے، صلح کاری اور انہیں قریب لاسکتی ہے اور دونوں فریقوں کے اختلافات کوکم کرواسکتی ہے۔ جبکہ چیپٹر (Chapter 7) سات کے تحت سیکیورٹی کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے فیصلے لاگو کرواسکتی ہے اور یہ فیصلے اقوام متحدہ کے تمام ممبران کے لیے ماننے اوران کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل نے جموں کشمیر کے مسئلہ کو چیپٹر (Chapter7) سات کے تحت لانے سے اس لیے گریز کیا تھا کیونکہ اس مسئلے کے دونوں فریقوں نے اس کو چیپٹر (Chapter 6) چھ کے تحت خود رکھوایا تھا اور اسی کے تحت درخواست دی گئی تھی یا شکایت درج کروائی گئی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی تاریخ میں چیپٹر (Chapter 7) سات کو کونسل نے ہمیشہ استعمال کرنے سے گریز کیا تھا کیونکہ سیکیورٹی کونسل کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مسئلوں کو غیر ضروری طور پر سنگین نہ بنائے اور اس چیپٹر (Chapter 7) سات کے تحت سوویت یونین کی طرف سے ویٹو کرنے کا بھی خطرہ زیادہ رہتا تھا لیکن اس وقت سوویت یونین نے نہ تو اس مسئلہ پر بحث میں حصہ لیا تھا نہ ووٹنگ میں حصہ لیا تھا۔

سوویت یونین کے بارے میں یہ مفروضہ درست نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اس چیپٹر (Chapter 7) سات کے تحت قرارداد کو ویٹو کرے گا کیونکہ سٹالن کی موت 1953ء تک سوویت یونین کی پالیسی ہندوستان اور پاکستان دونوں کو ناراض کرنے والی نہیں تھی۔ سوویت یونین نے جب جموں کشمیر کے مسئلہ پر اپنی پالیسی بدلی تھی تو اس نے چیپٹر (Chapter 6) چھ کے تحت پاس ہونے والی کئی قراردادوں کو ویٹو کیا تھا۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ 21 اپریل 1948ء کی قرارداد کو سوویت یونین شاید ویٹو نہ کرتا کیونکہ اس نے قرارداد میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی حد تک سیکیورٹی کونسل کے طریقہ کار پر

تنقید کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے لیکن سیکیورٹی کونسل نے جموں کشمیر کا مسئلہ بڑی حد تک غیر جانبداری سے حل کرنے کی کوشش کی تھی اور سیکیورٹی کونسل کی سفارشات دونوں فریقوں کے لیے مناسب تھیں۔ اس کے باوجود سیکیورٹی کونسل جموں کشمیر کی سنگین صورتحال کو درست طریقہ سے ڈیل نہ کر سکی اور نہ ہی گراؤنڈ کی سنگین صورتِ حال کو درست طریقے سے سمجھ سکی اور یہ سمجھنا بھی ناممکن لگتا ہے کہ سیکیورٹی کونسل نے اپنا کمیشن اتنی تاخیر سے برصغیر کی طرف کیوں بھیجا تھا جبکہ کمیشن تو سیکیورٹی کونسل کی اصلی قرارداد جو 20 جنوری 1948ء کو پاس کی گئی تھی کے تحت ہی تشکیل دے دیا گیا تھا اور دونوں ملکوں ہندوستان اور پاکستان نے اسے قبول کر لیا تھا اس کی موجودگی جنگ کی سنگینی کو کم کر سکتی تھی۔

جب اقوام متحدہ کا کمیشن ہندوستان اور پاکستان کی طرف بھیجا گیا تھا تو اس وقت کمیشن نے سیاسی اور فوجی صورتِ حال کو بالکل مختلف پایا تھا جو سیکیورٹی کونسل نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جب سیکیورٹی کونسل نے اپریل میں ہلکی سے قرارداد اور وہ بھی سفارش کی حد پیش کی تھی۔ گیارہ ہفتے مزید گزر گئے 21 اپریل 1948ء کی قرارداد کے پاس ہونے کے بعد اور پھر کمیشن نے اپنا کام شروع کیا تھا۔ اس وقت تک جموں کشمیر کے حالات مکمل جنگ میں بدل چکے تھے۔ اس جنگ کو ٹالنے میں برطانوی حکومت کی دھمکی نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر پاکستان نے جموں کشمیر میں فوجی حملہ کیا تو انگریز فوجی آفیسروں کو پاکستانی فوج سے نکال دیا جائے گا اور پاکستان کو ائیر فورس استعمال نہ کرنے کی بھی دھمکی دی گئی تھی۔ ہندوستان نے اس بات پر اعتراض کیا تھا کہ اس کی سیکیورٹی کونسل میں چھان بین (Investigation) کیوں کی گئی تھی جو دوسری شکایات پاکستان سیکیورٹی کونسل میں اس کے خلاف لایا تھا ان الزامات میں مسلمانوں کا قتلِ عام، جونا گڑھ کا مسئلہ اور دیگر کئی مسائل کے حوالے سے شکایات شامل تھیں۔ ہندوستان کی حکومت پہلے سے ہی یہ ذہن (Mind) بنا چکی تھی کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی جو بھی سفارشات اس کے حق میں نہیں ہوں گی وہ ہندوستانی حکومت مسترد کر دے گی۔

اب جموں کشمیر کی ہندنواز شیخ عبداللہ کی حکومت نے بھی واضع پیغام دے دیا تھا کہ

وہ ایک غیر جانبدارانہ رائے شماری کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور پاکستان نے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کو دھمکی دی تھی کہ پاکستان میں اس کا سیاہ جھنڈوں سے استقبال کیا جائے گا۔ تاہم 15 جون 1948ء کو سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کا اجلاس جنیوا میں ہوا تھا۔ یہ کمیشن پانچ 5 ممبران پر مشتمل تھا جس میں ارجنٹینا کو پاکستان نے اور چیکوسلاواکیہ کو ہندوستان نے نامزد کیا تھا جبکہ کولیبیا اور بیلجیئم کو سیکیورٹی کونسل نے منتخب کیا تھا اور امریکہ کا نام سیکیورٹی کونسل کے صدر نے شامل کیا تھا۔ کمیشن کا پہلا کام اس کے لیے قوائد وضوابط اور طریقہ کار تیار کرنا تھا اور اس کی شروعات ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے خط وکتابت کے تبادلے سے ہوئی تھی۔ اس کمیشن کے ممبران کی اکثریت پوری طرح مسئلے کی نوعیت سے آگاہ نہیں تھی۔ سوائے امریکن وفد کے سربراہ کے جو امریکی سفارتکار تھا۔ لیکن ہر ممبر اپنے کام کو مکمل کرنے میں دلچسپی پوری طرح سے لے رہا تھا یہ بھی تمام ممبران کی مضبوط سوچ تھی کہ ہندوستان اور برصغیر کے قدیم باشندوں کی سب سے بڑی دولت ان کی آزادی کی اس جنگ کی وجہ سے نفی نہیں ہونی چاہیے اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس کمیشن کا ہر ممبر اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھ رہا تھا کہ جموں کشمیر کے عوام کے لیے امن اور آزادی بحال ہونی چاہیے۔ ان باتوں کا اظہار چیکوسواکیہ کے کمیشن کے ممبر جوزف کاربل نے اپنی کتاب (Danger in Kashmir) کشمیر میں خطرہ ہے کہ نام سے لکھی ہے میں کیا ہے اسی جنیوا میں ہونے والے کمیشن کے اجلاس میں ہی اس کمیشن کا نام بھی چنا گیا تھا چند دونوں کے غور وخوض کے بعد کمیشن کا نام فائنل کیا گیا تھا۔ آخر اس کی ساری تیاری مکمل کرنے کے بعد یہ کمیشن 5 جولائی 1948ء کو کراچی کے لیے روانہ ہو گیا جو اس وقت پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ یہ کمیشن تین دن کراچی میں پاکستان کے گورنر جنرل محمد علی جناح کی رہائش پر ٹھہرایا گیا تھا جبکہ جناح صاحب اپنی بیماری کی وجہ سے بلوچستان میں زیارت میں آرام کے لیے گئے ہوئے تھے اس کمیشن کی ملاقات وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزیر خارجہ ظفر اللہ خان سے ہوئی تھی۔

وزیر خارجہ پاکستان نے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان (UNCIP) کو اسی ملاقات میں بتایا تھا کہ پاکستانی فوج کی تین بریگیڈ جموں کشمیر کی سرزمین

پر مئی 1948ء سے موجود تھیں اس نے کمیشن کو بتایا تھا کہ یہ اقدامات اپنے دفاع میں اٹھائے گئے تھے کیونکہ ہندوستانی فوج نے موسم بہار میں بڑے پیمانے پر حملے شروع کر دیئے تھے اور خطرہ تھا کہ ہندوستانی فوج آزاد کشمیر پر حملے کے بعد پاکستانی علاقوں پر بھی حملہ نہ کر دے۔ اس لئے پاکستان کے لیے ضروری تھا کہ اس دفاعی لائن کو محفوظ بنائے جو آزاد کشمیر فوج نے اور قبائلیوں نے بنا رکھی تھی کمیشن کے ممبران نے اپنی رائے کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا کیونکہ یہ نئی صورتحال سیکیورٹی کونسل کے اندازے کے بالکل برعکس تھی اور حالات کی سنگینی سیکیورٹی کونسل کو بتائی گئی سنگین صورتحال سے کئی گناہ زیادہ خطرناک تھی جب پاکستانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ سے پوچھا گیا کہ کیا حکومت پاکستان نے سیکیورٹی کونسل کو اپنی فوج کے جموں کشمیر کے علاقوں میں موجودگی سے آگاہ کیا تھا تو اس نے نفی میں جواب دیا تھا۔ تین دن کراچی میں ٹھہرنے کے بعد کمیشن دہلی چلا گیا تھا اور ہندوستانی وزیراعظم جواہر لال نہرو سے ملاقات کرتے ہوئے نہرو نے ہندوستان کے تمام مسائل پر بات چیت کی لیکن جموں کشمیر کے مسئلے پر کمیشن کے اراکین سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا یہی حالت پاکستانی وزیراعظم لیاقت علی خان کی تھی اس نے بھی کمیشن کے اراکین سے ملاقات کے دوران جموں کشمیر کے تنازعہ کا کوئی ذکر تک نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کا کمیشن جموں کشمیر میں پیدا شدہ سنگین صورتحال کو دیکھنے اور اس تنازعہ کے حل کے لیے ہی ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کر رہا تھا۔

13 جولائی 1948ء میں ہندوستان کی حکومت کی طرف سے وزارت خارجہ کا جنرل سیکرٹری گرجا شنکر باجپائی اقوام متحدہ کے کمیشن کے سامنے جموں کشمیر کا کیس پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اس نے کمیشن کے اراکین کو بتایا کہ حکومت ہند سیکیورٹی کونسل کے طریقہ کار سے مطمئن نہیں تھی۔ وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل نے واضع کیا تھا کہ جب سے سیکیورٹی کونسل نے قرارداد پاس کی تھی صورتحال اس کے بعد بہت بدل چکی تھی۔ اس نے کہا کہ ہندوستانی فوجیں اس وقت جموں کشمیر کے اگرد گرد تمام محاذوں پر پاکستان کی ریگولر فوجوں سے لڑ رہی تھیں۔ اس نے اس کی کئی شہادتیں (Evidences) ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا اور کہا کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان غیر اعلانیہ جنگ جاری تھی۔ وزارت خارجہ

کے ترجمان نے سیکیورٹی کونسل کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان کو سیکیورٹی کونسل کی طرف سے ہندوستانی شکایت کے مطابق حکم دینا چاہیے تھا کہ وہ پہلے کیا اقدامات کرے لیکن سیکیورٹی کونسل نے ایسا نہیں کیا اس لیے اب ہندوستان کو رائے شماری کروانے کے مسئلے پر بحث کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے دراصل اس کی وضاحت ایک بار پھر ضروری ہے کہ ہندوستان جموں کشمیر کے معاملے میں پاکستان کو قصوروار فریق مانتا تھا اور اس قصور کو وہ جموں کشمیر پر پاکستان کا حملہ سمجھتا تھا اور اس حملے کی شکایت لے کر وہ سیکیورٹی کونسل میں گیا تھا لیکن وہاں پاکستان نے بھی ہندوستان کے خلاف جونا گڑھ، حیدرآباد، مسلمانوں کا ہندوستان کے علاقوں میں قتلِ عام، اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ، مہاجرین کا مسئلہ وغیرہ ملا کر کئی شکایات سیکیورٹی کونسل میں جوابی طور پر درج کروا دی تھیں جس کی وجہ سے جموں کشمیر پر درج کروائی گئی پاکستان کے خلاف ہندوستان کی شکایت دب کر رہ گئی تھی اور سیکیورٹی کونسل نے کسی بھی فریق کی طرفداری نہ کرتے ہوئے کسی بھی فریق کو مجرم قرار دینے سے ابھی تک گریز کیا تھا دوسری اہم بات یہ تھی کہ ہندوستان نے سیکیورٹی کونسل میں پاکستان کے خلاف جو شکایت درج کروائی تھی وہ چیپٹر (6) چھ کے تحت تھی جس کی نوعیت ہی اخلاقی تھی اور سیکیورٹی کونسل اس پر صرف دونوں فریقوں کی مرضی سے سفارشات مرتب کر سکتی تھی اس کے پاس اس سے زیادہ اختیار ہی نہیں تھا۔ اب ہندوستان کے اعتراض سے یہ لگتا تھا کہ ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ حل کرنے سے زیادہ ان کی خواہش تھی کہ سیکیورٹی کونسل پاکستان کو جارح قرار دے اور ریاست کے علاقوں سے نکلنے کا حکم دے۔

اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں اس سے پہلے کی صورتحال دونوں فریقوں کی شکایات کے مطابق بالکل مختلف تھی اور ہندوستان کے پہلے وفد نے خود اقوام متحدہ میں قبائلیوں اور پاکستانی فوج میں فرق کرتے ہوئے پاکستان پر براہِ راست فوجی حملے کا الزام لگانے سے گریز کیا تھا۔ اب اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان نے برصغیر کا پہلا دورہ کیا تھا اس دورے کی ابتداء میں ہی انہیں پاکستانی وزیر خارجہ نے خود مطلع کر دیا تھا کہ پاکستان کی فوج نہ صرف جموں کشمیر کی سرزمین پر موجود تھی بلکہ لڑائی میں بھی حصہ لے رہی تھی۔ اس

صورتحال میں ہندوستانی حکومت کے ترجمان نے اقوام متحدہ کے کمیشن کو واضع طور پر بتا دیا تھا کہ جموں کشمیر میں پاکستانی فوج کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اب ہندوستان کی طرف سے ریاست میں رائے شماری کروانے کا آپشن کھلا نہیں تھا۔ اب سیکیورٹی کونسل کے ممبران نے انفرادی طور پر ہندوستانی وزیر اعظم نہرو، اقوام متحدہ میں ہندوستانی وفد کے سربراہ گوپالا سوامی آہنگر اور گرجا باجپائی سے الگ الگ ملاقاتیں کی تھیں لیکن سب کا رویہ ایک جیسا ہی تھا اور سب کا یہی مطالبہ تھا کہ پاکستان کو جارحیت پسند قرار دیا جائے اور اس کی جارحیت کی مذمت کی جائے اور تب ہندوستان اقوام متحدہ کی قراردادوں کو لاگو کرنے کے لیے راضی ہوگا۔ سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کے اراکین کو معلوم تھا کہ ایسی پالیسی کا مطلب پاکستان کی طرف سے مزید بات چیت کے تمام دروازے فوراً بند کروانے کے مترادف تھا۔ سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کے اراکین ہندوستانی فوج کے کئی اعلیٰ آفیسروں سے بھی کئی بار ملاقاتیں کر چکے تھے اور ان سے فوجی آپریشن کے بارے میں معلومات اور دُشمن سے چھینا گیا مواد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستانی فوج کے آفیسروں نے کمیشن کو بتایا تھا کہ پاکستانی فوج مارچ سے لڑائی میں حصہ لے رہی تھی۔

دراصل اس وقت بھی ہندوستانی، فوج میں 300 انگریز آفیسرز جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور پاکستانی فوج میں 700 انگریز آفیسرز اس وقت حاضر سروس تھے ان میں سے کوئی بھی انگریز آفیسر آپریشن کمانڈ میں نہ ہندوستان کی طرف سے جموں کشمیر میں موجود تھا نہ پاکستان کی طرف سے کوئی انگریز آفیسر موجود تھا۔ تاہم جموں کشمیر میں ہندوستانی اور پاکستان فوجوں کے درمیان لڑائی جاری تھی اور اقوام متحدہ کے کمیشن کو کئی افراد کے خطوط ملے اور کئی تنظیموں کی طرف سے بھی ملے جن میں سویلین آبادی کے خلاف دونوں ملکوں کی فوجوں کے ظلم و بربریت کی داستانیں درج کی گئی تھیں۔ کمیشن کے اراکین نے حکومت ہند سے غیر سرکاری طور پر سرینگر جا کر حالات کا جائزہ لینے کی اجازت مانگی تھی۔ کمیشن کو یقین تھا کہ گراؤنڈ پر جہاں تنازعہ موجود تھا پہنچ کر اس مسئلے کی شدت کا اندازہ لگانا زیادہ آسان ہوگا اور ہوسکتا ہے ان کی موجودگی میں جنگی شدت میں کمی آجائے۔ تاہم شیخ عبداللہ نے کمیشن کو پرائیویٹ ذرائع

سے پیغام بھیجا تھا کہ جموں کشمیر کے مسئلے کا حل سرینگر کی بجائے دہلی اور کراچی میں ہوگا۔کمیشن نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے جنگ بندی کروائی جائے تا کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ ماحول پیدا کیا جائے پھر دوستانہ ماحول میں بات چیت شروع کرنا آسان ہوگا۔کمیشن نے دونوں ملکوں سے درخواست کی تھی کہ وہ ایسے اقدامات فوراً اٹھائیں جوان کے اختیارات میں ہوں اورصورتحال کو بہتر بنانے والے ہوں ایسے بیان سے گریز کریں جوصورتحال کومزید خراب کرنے والے ہوں دونوں حکومتوں نے یقین دہانی کروائی کہ وہ ایسا ہی کریں گےلیکن لڑائی کے دوران اخبارات میں غصہ دلانے والے تبصرے جاری رہے۔نہرونے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ کمیشن جنگ بندی کی بات کرتا ہےلیکن پاکستان یہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ اس کی فوج جموں کشمیر میں موجود تھی۔نہرونے کہا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ بندی کا اطلاق صرف ہندوستان پر ہوگا۔لیکن ہم پہلے اس مطالبہ پر زور دیں گے کہ پاکستان جموں کشمیر سے اپنی فوج نکالے پھر ہم بات چیت کرنے پر راضی ہوں گے۔جب کمیشن کے اراکین نے نہرو سے پوچھا کہ اگر وہ جنگ بندی کروانے میں کامیاب ہوگئےتو اس مسئلے کا ممکنہ حل نہرو کے دماغ میں کیا تھا؟ نہرو نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے پہلے ہی حل کی طرف اشارہ دیا تھااورحکومت ہندوستان نےخودرائے شماری کروانے کے لیےاقوام متحدہ سے درخواست کی تھی اور ہماری خواہش ہے کہ جموں کشمیر کے لوگ خود اپنا فیصلہ کریں یہ ہندوستانی وزیراعظم جواہرلال نہرو کی کمیشن کے ایک رکن جوزف کاربل سے دہلی میں بات چیت کے دوران کہی گئی بات تھی لیکن پنڈٹ نہرو نے یہ بھی کہا تھا کہ ریاست جموں کشمیر میں پچھلے دس ماہ سے جنگ جاری ہےاور ریاست مکمل طور پراس جنگ سےتباہ ہوچکی تھی۔ریاستی انتظامیہ بے اثر ہوچکی تھی اور رائے شماری کی تیاری کے لیےضروری ہوگا کہ پاکستان اپنی فوجیں ریاست سے باہرنکالےگااوراس کے بعد الیکشن ہوں گے،مہاجرین کی واپسی ہوگی اور ان کی آبادکاری ہوگی اورجنگ بندی کےایک سال بعدتک رائےشماری ہوسکتی تھی۔

نہرو نے جوزف کاربل سے کہا تھا کہ جموں کشمیر کا تنازعہ مذہبی نہیں تھا بلکہ ہندوستان کو مذہب کی بنیاد پرتقسیم کرناممکن ہی نہیں تھا ابھی تک ہندوستان میں 35 ملین یا

ساڑھے تین کروڑ مسلمان موجود ہیں اور نہرو نے کہا کہ پاکستان ایک اسلامی فیوڈل ریاست کے طور پر سامنے آئی تھی اس لیے ہندوستان کے ساتھ اس کے اختلافات سامنے آئے تھے اور یہی کچھ جموں کشمیر کی ریاست پر لاگو ہوتا تھا اگر پاکستان نے ریاست پر حملہ نہ کیا ہوتا تو ہندوستان کبھی بھی جموں کشمیر میں اپنی فوج نہ بھیجتا یہ نہرو کے الفاظ تھے۔ نہرو نے انگریز حکومت پر الزام لگایا تھا کہ اگر وہ جناح صاحب کے اس قرون وسطیٰ کے مذہبی نظریئے کا ساتھ نہ دیتے تو جناح صاحب کا یہ بیوقوفانہ نظریہ کہ مذہب کے نام پر الگ ریاست بنائی جائے کبھی کامیاب نہیں ہونا تھا۔ ہندستان کے وزیراعظم اور دیگر اعلیٰ حکومت عہدیداروں سے جموں کشمیر کے ایشو پر بات چیت کے بعد کمیشن کے دو اراکین نے پاکستانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ سے بھی بات چیت کی تھی تا کہ غیر مشروط طور پر جنگ بندی کا موقع تلاش کیا جائے لیکن پاکستانی وزیر خارجہ نے غیر مشروط جنگ بندی کی تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا کہ پاکستان جنگ بندی کی تجویز تب قبول کرے گا اگر ہندوستان بھی اپنی فوجیں ریاست سے نکالے اور اگر ریاست کی مسلم آبادی کو مناسب تحفظ بھی دیا جائے اور آزاد کشمیر حکومت کے خیالات کو بھی اس جنگ بندی کی تجویز میں شامل کیا جائے تو پاکستان اس پر راضی ہوسکتا تھا۔ پاکستانی وزیر خارجہ نے ریاست جموں کشمیر کی تقسیم کو بھی مسترد کر دیا تھا۔ کیونکہ ریاست کا بڑا حصہ ہندوستان کے پاس چلے جانے سے ہندوستانی سرحدوں کو اتنی وسعت مل جائے گی کہ وہ پاکستان کے لیے مستقل خطرہ بن جائے گا۔

چوہدری ظفر اللہ نے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کو تجویز دی تھی کہ وہ زیادہ اختیارات حاصل کرے اور اس پر سختی سے عمل کرائے اور اپنے فیصلہ کو اپنی رہنمائی میں لاگو کرنے کے بجائے سفارشات پیش کرنے کے فیصلہ کی قوت پیدا کرے۔ اب سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کو یقین ہو گیا تھا کہ دونوں ملکوں کی یہ خواہش ہے کہ چند شرائط عائد کیے بغیر جنگ بندی نہ کی جائے اور دونوں کمیشن کو ایسی شرائط پیش کر رہے تھے جو دوسرے کو قبول نہ ہوں۔ جموں کشمیر کے تنازعے کے پیچھے دونوں ملکوں کے درمیان شدید شک وشبہات پائے جاتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان جنگ بندی کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے اور ریاست

کے دونوں طرف عام آدمی کی زندگی تباہ حال ہو چکی تھی۔ دونوں طرف ریاست کے لوگ جنگ کے سب سے بڑے نقصان اٹھا رہے تھے دونوں تقسیم شدہ حصوں میں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ بھی ہندوستان اور پاکستان کی حمایت میں ایک دوسرے سے نفرت کی حد تک دور ہو چکے تھے اور دونوں پارٹیوں کے مقاصد ایک دوسرے سے مخالف سمتوں میں تھے نیشنل کانفرنس نے اپنی قسمت اب مکمل طور پر ہندوستان سے جوڑ دی تھی اور مسلم کانفرنس نے پاکستان سے اپنا مستقبل جوڑ دیا تھا۔

شیخ عبداللہ نے البتہ خفیہ طریقے سے کمیشن تک اپنی خواہش پہنچائی تھی کہ وہ آزاد کشمیر کے لیڈروں سے ملنے پر راضی تھا لیکن کمیشن کے لیے اس سمت کی طرف چلنا مشکل تھا کیونکہ حکومت ہندوستان اقوام متحدہ کے کمیشن پر سازش کرنے کا الزام لگا سکتی تھی کیونکہ ریاست کے دونوں طرف کے لیڈروں کے ملنے سے انہیں کمیشن پر شک ہوسکتا تھا کہ اس کے اراکین نے ایسا ممکن بنایا تھا۔اس کے باوجود کہ پاکستان نے لڑائی بند کرنے اور جنگ بندی کا معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن کمیشن کے اراکین کو یہ محسوس ہوا تھا کہ پاکستان کو ہوسکتا تھا کہ ان کی تجاویز کو قبول کرنے پر راضی کیا جاسکتا تھا۔ ہندوستانی فوج جنگ میں جارحانہ اقدامات کر رہی تھی اور پاکستان کے باڈر کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی ایسے حالات کو دیکھ کر اقوام متحدہ کے کمیشن کے اراکین کو یہ بھی لگ رہا تھا کہ پاکستان شاید اس وقت جنگ بندی قبول کر لے اور ہندوستانی فوج کو مزید آگے بڑھنے سے روکنے کا پاکستان کے پاس یہی بہترین طریقہ تھا۔کمیشن کو علم تھا کہ ابتداء میں ہندوستان نے سیکیورٹی کونسل میں جنگ روکنے پر زور دیا تھا اب جبکہ پاکستانی فوج اس لڑائی کا حصہ بن چکی تھی تو ہندوستان نے اب بالکل ہی مختلف موقف اختیار کیا تھا۔ یاد رہے کہ پہلے پاکستان نے صرف قبائلیوں اور آزاد کشمیر کی فوجوں کی ہی اس جنگ میں شمولیت کو قبول کیا تھا اور ہندوستان کا بھی شروع کے دنوں میں یہی خیال تھا کہ آزاد کشمیر کی فوج اور قبائلی حملہ آور ہی ریاست جموں کشمیر کی سرزمین میں لڑ رہے تھے اب پاکستانی فوج کا اس جنگ کا حصہ بن جانا ہندوستان کے لیے یہ مواقع پیدا کر چکا تھا کہ اس کا بہانہ بنا کر جموں کشمیر میں بین الاقوامی قانون کا سہارا لے کر ریاست کا تنازعہ حل

کرنے سے انکار کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعد میں ایسا ہی کیا گیا تھا۔ جب سکیورٹی کونسل کے ایک ممبر نے نہرو سے دہلی میں پوچھا تھا کہ اگر ہندوستان غیر مشروط طور پر جنگ بندی کی تجویز قبول کرے تو اس بارے میں اس کا کیا خیال تھا یہ سوال دوسری بار کمیشن کے ایک ممبر نے پوچھا تھا تو نہرو نے جواب دیا تھا کہ یہ سوال پوچھ کر آپ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو ایک ہی پلڑے میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کی حیثیت سے آپ کا فرض بنتا ہے کہ پاکستان کو جارحیت پسند اور حملہ آور قرار دے کر اس کی مذمت کریں کیونکہ یہ پاکستان ہے جس نے اپنی فوج ہماری سرزمین پر لا کر رکھی ہوئی تھی۔ کمیشن کو چاہیے کہ وہ انہیں اپنی فوجیں ہماری سرزمین سے نکالنے کو کہیں ورنہ آپ چور اور مالک کو ایک بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور دونوں کو برابر کا سلوک کرنے کا دعویٰ کر رہے تھے۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کی لیڈرشپ کا رویہ تھا جب دونوں کی فوجیں جموں کشمیر کی سرزمین پر پچھلے دس ماہ سے ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار تھیں اصل مسئلہ جموں کشمیر کا تنازعہ حل کرنا نہیں تھا بلکہ اس ریاست کے ٹکڑے کر کے دونوں چھینا چھپٹی میں لگے ہوئے تھے تاکہ ریاست کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر اپنی فوجوں کی طاقت سے قبضہ کر سکیں اور ان حکمرانوں کے پاس ابھی ابھی طاقت آئی تھی لیکن اس طاقت کا نشہ تو ان کو اندھا کر چکا تھا یہی وجہ تھی کہ ریاست کی عوام ان دونوں ملکوں کے حکمرانوں کے لیے کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ سیکیورٹی کونسل کے کمیشن نے واپس کراچی جا کر وہاں کی اصل صورتحال کا جائزہ لینے اور حکومت کے اہلکاروں کے رویے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا جس طرح کمیشن نے دہلی میں وزیراعظم نہرو اور اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے میٹنگ اور بات چیت کے کئی دور چلائے تھے کراچی میں بھی کمیشن کے اراکین نے وزیراعظم لیاقت علی خان، وزیرخارجہ چوہدری ظفر اللہ خان اور وزیرخزانہ غلام محمد سے اور حکومت کے سیکرٹری محمد علی اور دیگر اعلیٰ پاکستانی حکومتی عہدیداروں سے ملاقاتیں کی تھیں لیکن کراچی کی یہ ساری ملاقاتیں بھی دہلی کی ملاقاتوں کی طرح کمیشن کے اراکین کے لیے حوصلہ شکنی کے سوا کچھ نہیں تھیں۔ کراچی میں چند مزید ملاقاتوں اور بات چیت کے بعد اقوام

متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کے اراکین نے بادل نخواستہ فوری جنگ بندی کی کوششوں کو ترک کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حوصلہ شکن شک بھی کمیشن کے ممبران کے دلوں میں پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ کیا وہ کبھی بھی اس قابل ہوں گے کہ ریاست میں غیر جانبدارانہ استصواب کرا سکیں گے؟

سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کے اراکین کو یقین تھا کہ جموں کشمیر کے عوام اس وقت اپنے مستقبل کے لیے آزادانہ رائے کا اظہار اور ریفرنڈم میں آزادی سے ووٹ نہیں دے پائیں گے کیونکہ ان کا ملک جب تک غیر فوجی علاقہ نہیں بن جاتا وہ اس حالت میں دیانت داری سے اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔ اوراس کی کوئی امید بھی نہیں تھی کہ ہندوستان اتنے بڑے پیمانے پر اس ریاست کو غیر فوجی علاقہ بنانے کے لیے راضی ہوگا۔ دوسری طرف کمیشن کے اراکین کو یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ جموں کشمیر کی ریاست بہت بڑے علاقے پر مشتمل تھی جس کے کئی پہاڑی سلسلے وسیع وعریض پھیلے ہوئے ہزاروں گاؤں اور سینکڑوں قصبے تھے جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فیصلے پر موجود تھے ایسے پھیلے ہوئے علاقوں اور وسیع ریاست میں استصواب رائے کروانا عملاً حقیقت کے بالکل برعکس لگ رہا تھا۔ اس طرح کے منصوبے سے مایوس ہو کر یہ خیال بار بار سامنے آنا شروع ہوا تھا کہ کیوں نہ اس ریاست کا دونوں ملکوں کے درمیان بٹوارہ کر دیا جائے سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کے پاس ایسا کوئی منڈیٹ تو موجود نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے اس تنازعے کا کوئی حل تلاش کریں لیکن کمیشن کے اراکین کو یقین تھا کہ ایسا کوئی بھی حل جو ہندوستان اور پاکستان کے لیے قابل قبول ہو اس کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔ جوزف کاربل جو سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کا ایک ممبر تھا اس نے لکھا ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ کیوں نہ ریاست کو دونوں ملکوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے اس کے علاوہ اس وقت کمیشن کے سامنے اس کا کوئی حل موجود نہیں تھا کیونکہ ریاست میں استصواب رائے کا بندوبست کرنے کے لیے سازگار حالات موجود نہیں تھے۔ چوہدری ظفر اللہ نے جواب دیا تھا کہ یہ اقوام متحدہ پر انحصار کرتا تھا کہ وہ ایسے حالات کس طرح پیدا کرتا ہے جو استصواب رائے کے لیے سازگار

ہوں ۔یہی تجویز جب وزیر خزانہ غلام محمد کے سامنے پیش کی گئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ ریاست کی تقسیم کی صورت میں ہندوستان کو مشرقی جموں کے علاقوں کے سوا ریاست کا کوئی اور حصہ نہیں ملے گا کیونکہ باقی ریاست میں آبادی مسلم تھی اور انہیں لازمی طور پر پاکستان کا حصہ بننا چاہیے۔

ہندوستان بھی کسی حد تک ریاست کی تقسیم پر راضی نظر آرہا تھا لیکن دونوں ملکوں کی لیڈرشپ تقسیم کے لیے ایسی شرائط پیش کررہی تھی جو کسی فریق کو قبول نہ ہوں۔اس طرح اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کا کمیشن ایک بار پھر ناکام بنا دیا گیا تھا۔اس کے بعد کمیشن کے اراکین کے پاس کوئی بنیادی تیاری کا کام نہیں رہ گیا تھا جو دونوں ملکوں کے درمیان اس سمجھوتے کی بنیاد بن سکے اور جس پر کمیشن مزید چھان بین کرسکے کیونکہ دہلی اور کراچی میں بیٹھے ہوئے فیصلہ سازوں کی طرف سے ایسے کام کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑرہا تھا۔اقوام متحدہ کے کمیشن نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے اصل کام کی طرف واپس لوٹتا ہے جو کام سیکیورٹی کونسل نے کمیشن کے لیے متعین کررکھا تھا۔اب کمیشن کے اراکین نے فیصلہ کیا تھا وہ ایک قرارداد تیار کرتے ہیں جو دونوں ملکوں کے لیے کسی حد تک قابل قبول ہو اور دونوں کو کسی معاہدے پر راضی کرسکے لیکن کمیشن کو محسوس ہوگیا تھا کہ ہندوستان کو کوئی ایسی قرارداد قبول نہ ہوگی جس میں پاکستانی فوج کی ریاست میں موجودگی کو رد نہ کیا گیا ہو لیکن وہ سوچ رہے تھے پاکستان ایسی قرارداد کو قبول کرے گا جس میں ان کی فوج کی ریاست کی سرزمین پر موجودگی کو کسی بیان کے ذریعہ ہی رد کردیا گیا ہو اسی وجہ سے کمیشن نے اس مرحلہ پر ایک نئی چھان بین شروع کی تھی۔اس سلسلہ میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کے گورنر جو انگریز تھا، نے تین گھنٹے تک قبائلیوں کے جموں کشمیر پر حملے پر پوری بریفنگ دی تھی۔

پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل گریسی نے فوجی صورتحال پر کمیشن کو ایک لمبی تفصیلی کہانی بیان کرتے ہوئے یہ وجہ بتائی کہ حکومت پاکستان نے اس کی (جنرل گریسی) ہی کی سفارش پر فوج جموں کشمیر کی سرزمین پر بھیجی تھی یاد رہے کہ یہی جنرل گریسی اکتوبر 1947ء میں پاکستان کے گورنر جنرل محمد علی جناح کے یہی احکامات ماننے سے انکاری ہوگیا تھا جب جناح صاحب نے اسے فوج جموں کشمیر میں بھیجنے کا حکم دیا تھا جب ہندوستانی فوج قبائلیوں

سے سرینگر بچانے آئی تھی جب مئی 1948ء میں ہندوستانی فوج نے پاکستانی باڈر کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی تو جنرل گریسی نے محسوس کیا تھا کہ اب پاکستان فوج کو خاموش ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے کیونکہ پاکستانی فوج کی خفیہ سروس نے یہ اطلاع دی تھی کہ ہندوستانی فوج نے جموں کشمیر میں آخری حملہ کر کے اس مہم کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہندوستانی فوج نے شمالی مغربی علاقوں اور جنوب مغربی علاقوں پر قبضہ کرنے کا پلان بنایا تھا یہ جموں کشمیر کے علاقے پاکستان کی سرحدوں کے بالکل قریب تھے اور ان علاقوں کی ساری آبادی مسلم تھی۔ اگر ہندوستان کا یہ پلان یا منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو پاکستان کے لیے یہ تباہی کا باعث بن جاتا۔ کیونکہ پاکستانی لیڈر شپ خوف زدہ تھی کہ ہندوستان پاکستان کو اپنی فوج کے گھیرے میں رکھنا چاہتا تھا اور دوسرا خطرہ ہندوستان دریاؤں کے پانی کا رخ موڑ کر پاکستان کو معاشی طور پر تباہ کر سکتا تھا گو ہندوستانی حکومت نے ایسے کسی بھی منصوبے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان کبھی بھی کسی دریا کے پانی کا رخ بدل ہی نہیں سکتا تھا چونکہ یہ عملاً ممکن ہی نہیں تھا لیکن پاکستانی لیڈروں نے بار بار اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستان اپنی فوج پاکستانی بارڈر کے قریب اسی لیے لا رہا تھا تاکہ وہ پاکستان کی آزادی کو ختم کر سکے اور ہندوستان کے اس خطرے سے بچنے کے لیے پاکستانی فوج کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ جموں کشمیر کی ریاست میں داخل ہو کر آگے بڑھتے ہوئی ہندوستانی فوج کو پاکستانی بارڈر سے دور ہی روک دے۔ اقوام متحدہ کے کمیشن نے پاکستانی لیڈروں کی یہ ساری باتیں تفصیل سے سنیں اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ تاہم کمیشن نے پاکستانیوں کے سامنے اس بات کی اچھی طرح وضاحت کی تھی اور سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کسی دوسرے ملک کی سرزمین پر اس کی حکومت کی دعوت کے بغیر اپنی فوج بھیجنا بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی تھی۔ اس عمل نے صورتِ حال کو بگاڑا تھا اور ہندوستان کو یہ حق دیا تھا کہ وہ اس کی شکایت اقوام متحدہ میں کرے اور یہ شکایت کمیشن کی معلومات کی عکاسی کرنی چاہیے اور کمیشن کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی معلومات میں جو گراؤنڈ پر پائی گئی تھیں اس شکایت کے مطابق اس کا اظہار کرے اور پاکستان کے لیے ضروری تھا کہ وہ بھی کمیشن کی طرف سے آنے والی معلومات کے لیے تیار رہے۔

اقوامِ متحدہ کے کمیشن نے ایک قرارداد تیار کی تھی جو 13 اگست 1948ء کو منظور کی گئی تھی۔ یہ قرارداد کمیشن کے سب ممبران نے مشترکہ طور پر منظور کی تھی۔ اقوامِ متحدہ کے کمیشن کی یہ قرارداد تین حصوں میں تقسیم کی گئی تھی۔

1۔ قرارداد کے پہلے حصے میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اس قرارداد کو قبول کرنے کے بعد چار دنوں کے اندر جنگ بندی کرنے پر رضامند ہوں گے۔ اقوامِ متحدہ کا کمیشن فوجی مبصرین کو تعینات کرے گا جو جنگ بندی کی نگرانی کریں گے۔

2۔ اس قرارداد کے دوسرے حصے میں کہا گیا تھا کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں مندرجہ ذیل اصول قبول کریں گی جو امن معاہدے کی بنیاد ہوگا۔

i۔ پاکستان جموں کشمیر سے اپنی فوجیں نکالے گا کیونکہ پاکستانی فوجوں کی جموں کشمیر کی سرزمین پر موجودگی اس مادی صورتِ حال میں تبدیلی کا باعث بن چکی تھیں جو حکومت پاکستان نے سیکیورٹی کونسل کے سامنے پیش کی تھیں۔

ii۔ پاکستانی شہری اور قبائلیوں کو ریاست سے نکالا جائے گا۔

iii۔ ریاست کے جو علاقے پاکستان خالی کرے گا وہ اقوامِ متحدہ کے کمیشن کی زیرِ نگرانی مقامی حکام کی انتظامیہ کے کنٹرول میں دیئے جائیں گے۔

iv۔ ہندوستانی حکومت اپنی فوج کے ایک بڑے حصے کو ریاست سے اس وقت نکالنا شروع کرے گی جب کمیشن ہندوستان کو مطلع کرے گا کہ پاکستان کے شہری، قبائلی اور پاکستانی فوج ریاست سے نکل چکے تھے۔

v۔ جب تک ریاست کا تنازعہ حل نہیں ہوتا اس وقت تک ہندوستان اپنی فوج کا چھوٹا سا حصہ ریاست میں جنگ بندی لائن کے اندر رکھے گا

تا کہ وہ مقامی حکام کی امن امان بحال رکھنے میں مدد کریں۔

3۔ کمیشن کی قرارداد کے تیسرے حصے میں کہا گیا تھا کہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کو دوبارہ اس معاہدے کی یقین دہانی کرانی ہوگی کہ وہ اس بات پر راضی ہیں کہ جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ریاستی عوام کی خواہش کے مطابق ہوگا۔

اب کمیشن کے ممبران کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا تا کہ کمیشن کی تجاویز کو ایک ہی وقت میں دہلی اور کراچی کے سامنے پیش کیا جائے اور کمیشن بھی اپنی خدمات دونوں حکومتوں کے سامنے رکھ سکے اگر دونوں حکومتوں کو کمیشن سے کسی بھی قسم کی تفصیلات درکار ہوں کمیشن کے ممبران حاضر تھے۔ نئی دہلی میں کمیشن کے ممبران کی ملاقات وزیر اعظم نہرو سے کروائی گئی تھی اور نہرو نے کمیشن کے اراکین سے مندرجہ ذیل سوالات کی وضاحت مانگی تھی۔

ا۔ کیا ہندوستانی فوجوں کو ریاست میں اہم جگہوں پر قبضہ کرنے کی اجازت ہوگی؟

۲۔ کیا جنگ بندی کی تجویز قبول کرنے سے پاکستان کی فوجوں کو ریاست میں ایک خاص قانونی حیثیت حاصل نہیں ہو جائے گی؟

۳۔ کیا کمیشن کی اس قرارداد کی لفاظی (wording) سے جموں کشمیر کی حکومت کی قانونی حیثیت میں کوئی بدلاؤ تو نہیں آئے گا؟

۴۔ کیا امن وامان کے جو الفاظ قرارداد میں استعمال کیے گئے ہیں کیا یہ بیرونی جارحیت پر صادق آتے ہیں؟

۵۔ کیا ہندوستانی حکومت ان تجاویز میں کچھ مزید تبدیلی کی تجویز دے سکتی ہے؟ یہ جواہر لال نہرو کے سوالات تھے اور کمیشن نے نہرو کے آخری سوال کا جواب نفی میں دیتے ہوئے تبدیلی کی تجویز قبول نہ کی تھی۔

ہندوستانی وزیر اعظم نے پاکستان کی طرف سے جنگ بندی معاہدے کی خلاف ورزی پر بھی خطرے اور تشویش کا اظہار کیا تھا کمیشن نے یقین دہانی کروائی تھی کہ ایسی صورت میں اقوام متحدہ کا سارا وزن پاکستان کے مخالف پلڑے میں چلا جائے گا۔ ہندوستانی وزیر اعظم کا پاکستان کے بارے میں شک تو دور نہیں ہوا تھا لیکن کمیشن کے اراکین کو لگا کہ وہ کسی حد تک

ان کی بات سے متفق تھے۔ کمیشن جو اقوام متحدہ کی نمائندگی کر رہا تھا اس کی سابق ناکامیوں کی وجہ سے اس کی عزت اور شہرت کو بین الاقوامی تنازعات حل کروانے میں کافی بڑے دھچکے لگ چکے تھے۔ تاہم ایک ہفتے کے بعد حکومت ہندوستان نے 20 اگست 1948ء کو اس قرارداد کو قبول کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ دوسری طرف کراچی میں کمیشن کے دوسرے حصے کے اراکین اور حکومت کے درمیان سفارتی جدوجہد بھی جاری تھی۔ یہ دہلی سے بھی زیادہ سخت مشکل او مخالفانہ جدوجہد تھی جس طرح کمیشن کے اراکین نے اسکا حال بیان کیا ہے پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ نے کمیشن کے اراکین سے سوالات کے دوران سخت مخالفت کا رویہ اور کمیشن پر شک شبہات کا اظہار کرتے ہوئے کمیشن کی غیر جانبداری پر بھی سوالات اٹھائے اور اس کی تجاویز کو غیر مناسب اور نامعقول قرار دیا تھا۔ ظفر اللہ خان نے کمیشن سے تحریری جواب طلبی کی تھی اور کمیشن کے اراکین کو اس کا جواب تحریر کرنے میں کئی دن لگ گئے تھے۔ کمیشن کو 10 دن کراچی میں تحریری اور زبانی اس قرارداد کی تشریح اور تفصیلات بتانے میں لگ گئے تھے۔ چوہدری ظفر اللہ خان نے کمیشن کے چیئرمین سے سینکڑوں سوالات پوچھنے کے بعد اس نے کمیشن پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا لیکن اسے ہندوستان پر شک تھا۔ کمیشن نے صرف اتنا کہا تھا کہ دونوں فریقوں کا ایک دوسرے پر یقین اور اعتماد ہی کسی نتیجہ خیز بات چیت کی بنیاد بن سکتا تھا اور کمیشن کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی کہ وہ اپنا فیصلہ کسی پر لاگو کرے اس کے پاس صرف سہولت کاری کا اختیار ہی تھا۔ ہندوستانی وزیراعظم نے دو ہفتے پہلے کمیشن کی اس قرارداد کو قبول کرلیا تھا اور اب کمیشن پر زور دینے لگا تھا کہ وہ قرارداد کو شائع کریں اور اس کے ساتھ جو باقی تحریری مواد تھا اس کو بھی شائع کیا جائے کیونکہ ہندوستانی پارلیمنٹ کا اجلاس ہونے والا تھا لیکن کمیشن اس وقت تک کچھ نہیں کرسکتا تھا جب تک وہ پاکستان کی طرف سے جواب وصول نہ کرلیں۔ آخر پاکستان کا جواب 6 ستمبر 1948ء کو آیا تھا۔ حکومت پاکستان نے قرارداد کو تو قبول کرلیا تھا لیکن اس نے اس کے ساتھ کئی شکوک وشبہات مفروضے اور اہلیت پر سوال شامل کر دیئے تھے جو اس قرارداد کو مسترد کرنے کے برابر تھے۔ اس کے بعد کئی خطوط کا تبادلہ ہوا تھا لیکن وہ پاکستان کو قرارداد قبول کرنے کے قریب لانے میں محدود کام کرسکتے تھے۔ کئی

اعتراضات میں سے پاکستان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس قرارداد میں آزادانہ استصواب رائے ریاست میں کرانے کی گرانٹی موجود نہیں تھی گو کہ کمیشن پاکستان کی اس پوزیشن سے بالکل متفق تھا لیکن یہ قرارداد صرف پہلے جنگ روکنے کے لیے تیار کی گئی تھی اور بعد میں استصواب رائے کروانے کے لیے تفصیلات طے کرنا اور اس پر بات چیت کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔لیکن پاکستان کو شک تھا کہ جونہی لڑائی بند ہوئی ہندوستان اسی موجودہ لائن کو عارضی بارڈر تسلیم کر کے استصواب رائے سے انکار کر دے گا۔کمیشن شدید مایوسی کا شکار ہوا تھا کیونکہ اس کی ساری کوشش پاکستان کی ہندوستان کے خلاف شک کا شکار ہو چکی تھیں۔ حالانکہ اس وقت بظاہر یہ امید تھی کہ کسی سمجھوتے پر پہنچا جا سکتا تھا لیکن پاکستان نے غیر ضروری مزاحمتی رویہ دکھایا تھا جس کی وجہ سے کمیشن کا کام آگے نہ بڑھ سکا تھا۔کمیشن نے اسی وقت ہندوستان اور پاکستان سے واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا تا کہ وہ سیکیورٹی کونسل میں ایک رپورٹ تیار کر کے پیش کر سکیں۔اس سے پہلے کہ کمیشن برصغیر سے واپس جائے کمیشن کے ایک حصے کو سرینگر بھیج کر حالات کا ایک بار پھر جائزہ لینا ضروری تھا اس لیے کمیشن کا ایک وفد سرینگر پہنچ گیا تھا اس وفد کے اراکین نے سڑکوں پر نکل عام آدمی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی لیکن عام آدمی ڈرا ہوا تھا۔انہوں نے اقوام متحدہ کے کمیشن کے لوگوں سے بات چیت کرنے سے گریز کیا تھا جس ریاست کے عام لوگوں کو اپنے لیڈروں پر بھروسہ نہ ہو وہ کسی دوسرے ملک سے آئے لوگوں پر کیا یقین کرتے۔تاہم کمیشن کے ممبران نے شیخ عبداللہ کی حکومت کے لوگوں سے بات چیت کی تھی۔ابتداء میں شیخ عبداللہ حکومت کے ممبران بات چیت سے گریزاں تھے لیکن بعد میں انہوں نے کھل کر بات چیت کی تھی وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ جموں کشمیر کی قسمت کا فیصلہ ریاست سے باہر بیٹھ کر ہو رہا تھا اور جس میں ان کی شمولیت موجود نہیں تھی۔وہ اس بات پر ناراض تھے کہ کمیشن اس وقت سرینگر آیا تھا جب اس نے اپنی قرارداد پہلے ہی منظور کر لی تھی۔ جموں کشمیر کے حکومتی اراکین کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان کی اپنی سنٹرل حکومت نے کمیشن کی سرینگر آنے پر اس کی حوصلہ شکنی کی تھی۔ بعد میں جب برف پگلی (Melt) تو ریاستی حکومتی اہلکار بلا جھجک بات کرنے لگے تھے۔ایک شام شیخ عبداللہ نے کمیشن کے وفد کو سرینگر کے

شالیمار گارڈن میں استقبالیہ دیا تھا۔ اس استقبالیہ کے بعد شیخ عبداللہ نے کمیشن کے سربراہ سے الگ بات چیت میں تفصیل سے ساری صورتحال سے آگاہ کیا تھا اور شیخ عبداللہ نے مہاراجہ کے خلاف اپنی تحریک پر بھی بات کی تھی یہ جموں کشمیر کا مسلم لیڈر تھا لیکن اس کا یقین ہندوستان پر مکمل تھا۔ شیخ عبداللہ نے کمیشن کے سربراہ سے کہا تھا کہ پاکستان ایک رجعت پسند ملک تھا اس کے ساتھ ریاست کا الحاق کرنا اپنے عوام کے خلاف کام کرنے کے مترادف تھا اور ریاستی عوام کے مفادات کو قربان کرنا تھا۔ شیخ عبداللہ نے وفد کے سربراہ کے سامنے اپنی بے بسی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شیخ عبداللہ نے آزاد کشمیر کے لیڈر غلام عباس چوہدری سے ملنے کی خواہش ضرور کی تھی لیکن اس نے ساری ریاست کی آزادی اور خودمختاری کے بارے میں کہا تھا کہ یہ دیرپا نہیں ہوسکتی تھی۔

شیخ عبداللہ نے کمیشن کے سربراہ جوزف کاربل سے کہا تھا کہ اگر ریاست جموں کشمیر کے طاقتور پڑوسی ریاست کی آزادی اور خودمختاری کی گارنٹی بھی دیں تو پھر بھی اس ریاست کی آزادی ممکن نہیں ہوگی اور یہ آزاد نہیں رہ سکتی تھی۔ شیخ عبداللہ نے کمیشن کے سربراہ سے کہا تھا کہ اس ریاست کا صرف ایک حل تھا اور وہ حل اس ریاست کی تقسیم تھا۔ اگر ریاست جموں کشمیر کو تقسیم کرکے اس کا حل نہ نکالا گیا تو لڑائی جاری رہے گی ہندوستان اور پاکستان ریاست کے جھگڑے کو غیر معینہ مدت تک لمبا کرتے جائیں گے اور ہمارے لوگوں کی مصیبت مزید بڑھتی جائے گی۔ شیخ عبداللہ سے یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ کیا یہ مسئلہ سمجھوتے اور صلح صفائی سے حل نہیں ہوسکتا تو اس نے جواب میں کہا تھا ہندوستان اور پاکستان دونوں اس حل کو قبول نہیں کریں گے۔ کمیشن کے سربراہ نے لکھا ہے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ شیخ عبداللہ اپنے طور پر ریاست کو تقسیم کرنے کی خواہش رکھتا تھا یا وہ نہرو کی پیروی کررہا تھا۔ گو کہ ہندوستانی حکومت نے ریاست کو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کچھ عرصہ پہلے تقسیم کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ لیکن ہندوستانی حکومت ریاست کی حقیقت پسندانہ بنیاد پر تقسیم چاہتی تھی اور شیخ عبداللہ اس تقسیم کے لیے بے چین تھا، وہ اسے آخری حل کے طور پر پیش کررہا تھا۔

پاکستان بھی ریاست جموں کشمیر کی تقسیم پر راضی تھا لیکن وہ وادی کشمیر کے مسلم

اکثریتی علاقے کو ہندوستان کے حوالے کرنے کے لیے بالکل راضی نہیں تھا اور کمیشن کے وفد کو یقین تھا کہ پاکستان ریاست کی تقسیم کے شیخ عبداللہ والے فارمولے کو قبول کرنے سے انکار کرے گا۔ کیونکہ پاکستان کشمیری مسلمانوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ بھی پاکستان میں شامل ہونا چاہتے تھے اور کمیشن کا تجربہ بھی پاکستانی سوچ سے ملتا جلتا تھا۔ کمیشن کے ممبران انفرادی طور پر اور اس کے سیکرٹریٹ کو عام کشمیری انفرادی اور گروپ ممبران، نوجوانوں کی تنظیمیں خفیہ خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ رورو کر آگاہ کررہے تھے کہ وہ اقوام متحدہ کے کمیشن کے اراکین کا کس بے چینی سے انتظار کررہے تھے تاکہ اقوام متحدہ کا کمیشن آئے اور فوراً غلط چیزوں کو بند کرے اور سیاسی دہشت اور کرپشن کو روکے گا اور ریاستی عوام کے لیے یہ ممکن بنائے گا کہ وہ آزادانہ رائے سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔ کمیشن کے اراکین نے بارہ مولا کا دورہ بھی کیا تھا اور جگہ جگہ قبائلی حملے کی وجہ سے تباہی دیکھی تھی گھر اور گاؤں جلے ہوئے نظر آئے تھے اور کمیشن کے ممبران نے بارہ مولا کی تباہی بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور ہزاروں تباہ حال لوگوں کا ہجوم بھی دیکھا تھا جن کے گھر بار قبائلی حملہ آوروں نے جلا ڈالے تھے۔ کمیشن کے اراکین نے چند ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ حکومت نے پولیس کے جبر سے لوگوں کو کمیشن سے آزادانہ بات چیت سے ان لوگوں کو روکا ہوا تھا جو ہندوستان سے الحاق کے حامی نہیں تھے کیونکہ بارہ مولا میں ہی ایک ہجوم میں کمیشن کے ساتھ ایک نوجوان نے کہا تھا کہ یہ حکومت جبر سے ہمیں دبا رہی تھی اور سب لوگوں کو ہندوستان کا حامی ظاہر کرنے کی کوشش کررہی تھی اس نوجوان کو پولیس فوراً پکڑ کر لے گئی تھی۔ یہ واقعات اقوام متحدہ کے کمیشن کے لیے بڑی تشویش کا باعث تھے جبکہ کمیشن کو بتایا گیا تھا کہ ریاست میں لوگوں کو سیاسی آزادی دی گئی تھی۔ جب کمیشن نے اس نوجوان کو کمیشن کے سامنے پیش کرنے کی ڈیمانڈ کی تو پولیس کمشنر نے کسی اور نوجوان کو پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ وہی نوجوان ہے جس کو پولیس اس ہجوم سے باہر لے گئی تھی لیکن وہی دوسرا نوجوان خود ہی بول پڑا کہ وہ کوئی اور بندہ تھا اور دوسرے کو پولیس پکڑ کر جیل میں بند کر چکی تھی۔ کمیشن کے اراکین نے ہندوستانی فوج کے آفیسروں سے بھی سرینگر میں بات چیت کی تھی اور ان میں سے

کوئی بھی جنگ میں دلچسپی لے رہا تھا نہ انہیں کشمیر سے کوئی دلچسپی تھی الٹا وہ سوچ رہے تھے کہ ان کی حکومت جموں کشمیر کو زبردستی کیوں اپنی ریاست کا حصہ بنانا چاہتی تھی کمیشن کی طرف سے جو فوجی پہلو پر تفصیلی رپورٹ بنائی گئی وہ بہت زیادہ حوصلہ شکن تھی۔

آخر 21 ستمبر 1948ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن کے ممبران نے سرینگر سے جنیوا کا سفر کیا تھا تا کہ کمیشن اپنی رپورٹ سیکیورٹی کونسل میں پیش کر سکے سیکیورٹی کونسل کا اجلاس پیرس میں جاری تھا۔ کمیشن کے اراکین نے بڑی مایوسی کی حالت میں سرینگر چھوڑا تھا کیونکہ کمیشن نہ تو لڑائی روکوا سکا تھا اور نہ ہی ریاست جموں کشمیر کے عوام کے لیے کچھ درجہ کا ہی امن بحال کروا سکا تھا اور نہ ان کی مصیبتوں میں کوئی کمی کروا سکا تھا۔ تاہم اقوام متحدہ کے کمیشن نے اپنی امید مکمل طور پر نہیں چھوڑی تھی بلکہ اس نے اپنا کام پیریس میں بھی جاری رکھا تھا۔ پیرس میں ساری دنیا کے لیڈرز اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے لیے جمع تھے کمیشن کو توقع تھی کہ وہ مزید بات چیت کے لیے مددگار ماحول پیدا کریں گے۔ اس وقت تک جو معاملات کمیشن نے طے کیے تھے وہ امید کے لیے کافی تھے۔ اس لیے کمیشن نے اپنے کام سے مکمل ناامیدی کو قریب نہیں آنے دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کمیشن نے ہندوستانی اور پاکستانی نمائندوں سے پیرس میں بھی کئی اجلاس کیے تھے۔ گو کہ پاکستان نے کمیشن کی قرارداد کو ماننے سے انکار کر کے انہیں کافی مایوس کیا تھا لیکن دونوں حکومتوں کا رویہ مجموعی طور پر بھی کافی حوصلہ شکن تھا ان کی کوششوں کے لیے جو کمیشن نے کی تھیں۔ پیرس میں پاکستانی نمائندے نے جموں کشمیر میں فوجی سرگرمیوں میں اضافے کی رپورٹ پیش کر کے کمیشن کو موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ دونوں ملکوں کی اجازت سے کمیشن کی طرف سے ایک فوجی ایڈوائزر (Military Advisor) ہندوستان اور پاکستان کی طرف بھیجا جائے۔ کمیشن نے ایک تجویز ڈرافٹ کی تھی جس کا مقصد تھا کہ 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے ساتھ اس کو جوڑ کر یہ اعلان کیا جائے کہ استصواب رائے کا انتظام اسی اصول کے مطابق کیا جائے گا جو اس قرارداد میں استصواب رائے کا اصول اور طریقہ بیان کیا گیا تھا۔

اس نئی تجویز میں یہی کہا گیا تھا کہ جموں کشمیر کی ریاست کا الحاق کا فیصلہ ہندوستان یا

پاکستان سے ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ کیا جائے گا۔اس تجویز میں رائے شماری کے لیے ایک ایڈمنسٹریٹر جموں کشمیر کی حکومت کے ذریعہ مقرر کیا جانا چاہیے۔ تاکہ ریاست جموں کشمیر جو ایک آزاد ملک ہونے کے ناطے اس کے اندرونی معاملات میں باہر سے مداخلت نہ کی جائے اس لیے استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر کے پاس اپنی طاقت یا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ استصواب رائے کو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ کروانے کی یقین دہانی کرواسکے۔تاہم پنڈت نہرو نے امن معاہدے کو مکمل لاگو کرنے سے پہلے استصواب رائے کے لیے ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنے کی مخالفت کی تھی۔

نہرو کی یہ خواہش بھی تھی کہ اس ایڈمنسٹریٹر کے پاس اختیارات نہ ہوں جو ریاستی انتظامیہ کے معاملات میں مداخلت کا حق دیتے ہوں۔نہرو نے بڑے پیمانے پر آزاد کشمیر فورسز کو ختم کرنے اور ان سے اسلحہ لینے پر بھی زور دیا تھا۔اس نے ریاست جموں کشمیر کی سیکیورٹی اور دفاع کے لیے ہندوستانی فوج کا ایک معقول حصہ استصواب رائے کے دوران ریاست میں رکھنے پر بہت زور دیا تھا۔ان تحفظات،سوالات اور مخالفت کے باوجود دونوں حکومتوں نے آخر اس تجویز کو مان لیا تھا اور پہلے قدم کے طور پر جموں کشمیر میں جنگ بندی کا حکم جاری کر دیا تھا جو یکم جنوری 1949ء کو آدھی رات سے لاگو ہوگا۔جموں کشمیر کے لوگوں کو پچھلے 15 ماہ سے پہلی بار اس قتل وغارت گری سے نجات ملی تھی جو ان کے لیے کسی ڈراؤنے سپنے سے کم نہیں تھا اور پرامن مستقبل کے لیے کچھ امید کی کرن نظر آئی تھی۔ہزاروں گھر تباہ کر دیئے گئے اور ان گنت اس ریاست کے بے گناہ شہری مارے گئے تھے جو بچ گئے تھے وہ نفرت سے بھرے ہوئے تھے۔اس ریاست کے 5 لاکھ 25 ہزار شہری بے گھر ہو کر مہاجر ہوئے تھے۔3 لاکھ 75 ہزار مہاجر ہو کر آزاد کشمیر کے علاقوں میں پہنچے تھے۔2 لاکھ 26 ہزار ہندوستان پہنچے تھے اور شیخ عبداللہ حکومت کے علاقوں میں 45 ہزار ایک جگہ اور 1 لاکھ 81 ہزار دوسری جگہ پہنچے تھے اور ان میں 20 ہزار بیوہ عورتیں بھی تھیں۔یہ بیان کرنا بھی مشکل ہے کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کے اراکین کتنے خوش ہوئے تھے کیونکہ ان کو بار بار جنگ بندی کروانے میں ناکامیاں ہوئیں تھیں اور خوشی ان کی ایک طرف تو اپنی کامیابی کی تھی تو دوسری

طرف ان کو شاید یہ محسوس ہوا تھا کہ جموں کشمیر کے عوام کی مصیبتوں میں کچھ کمی ہوگی جو اس جنگ کا سب سے بڑا نشانہ بن چکے تھے۔ 5 جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن کا اجلاس نیو یارک میں اس کے عارضی ہیڈ کوارٹرز میں ہوا تھا۔ اس اجلاس میں کمیشن نے اپنی رپورٹ کو اکٹھا کیا سیکیورٹی کونسل کو اس کا پہلا حصہ پیش کیا گیا تھا جو اس کمیشن کے مشن (Mission) کا بہترین حصہ تھا۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان نے کل 113 اجلاس کیے تھے جو سیکیورٹی کونسل میں سب ممبران نے مشترکہ طور پر سپورٹ کیے تھے یہ کمیشن کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کا کمیشن 4 فروری 1949ء کو ہندوستان اور پاکستان کی طرف واپس آ رہا تھا تاکہ جنگ بندی کی شرائط کو لاگو کروا سکے اور امن معاہدے کو عمل میں لا سکے اور استصواب رائے کی تیاری کر سکے۔ یہ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کا دوسرا مشن برصغیر بھیجا گیا تھا اور اس کا کام پہلے والے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اس کمیشن نے بڑی محنت شروع کر دی اور دہلی، سرینگر، کراچی اور راولپنڈی میں کمیشن نے اپنے 126 اجلاس کیے تھے کمیشن کے اراکین نے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے نمائندوں سے مذاکرات کیے تھے اور جموں کشمیر کے بار بار دورے کیے تھے اور ایک سب کمیشن (Sub Commission) تشکیل دیا تھا جو خاص مسائل پر توجہ دینے کے لیے تھا۔ اس کمیشن میں نئے ممبران تھے اور کمیشن کے سربراہ کی جگہ اب چیکوسلواکیہ کی کیمونسٹ گورنمنٹ کی طرف سے نیا وفد کمیشن کا حصہ بنایا گیا تھا جس نے کمیشن کے لیے کافی مشکلات پیدا کی تھیں کیونکہ چیک ممبر جو کمیشن کا حصہ بنایا گیا تھا وہ سوویت یونین کی طرف سے امن کی کوششوں کو سبوتاژ کرنا چاہتا تھا جس طرح دوسرے ممبران کو شک تھا۔ کیونکہ چیکوسواکیہ کا ممبر ہر اجلاس کی کاروائی نہ صرف شیخ عبداللہ تک ریگولر پہنچا تا رہا تھا بلکہ دوسرے ممبران کے ساتھ بھی سازشوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں مصروف تھا۔ کمیشن کے پہنچنے سے پہلے ہی ہندوستانی اور پاکستانی فوج کے سربراہان 15 جنوری 1949ء کو ہی ملاقات کر کے اقوام متحدہ کے فوجی ایڈوائزر کی موجودگی میں جنگ بندی کے حکم کا تفصیلی بندوبست کر چکے تھے۔ ہندوستان پہلے ہی اپنی ائیر

فورس کا ایک سکوارڈن ریاست سے نکال چکا تھا اور پاکستان نے بھی فوجوں کا انخلاء شروع کر دیا تھا۔ جنگ بندی لائن پر لوکل سطح کا اتفاق کیا جا چکا تھا اور امن معاہدے کے لیے تجاویز تیار کی جا چکی تھیں اور جنگی قیدیوں کے تبادلے کا معاہدہ بھی ہو چکا تھا۔ جب کمیشن پاکستانی وزیر خارجہ سے ملا تو اس نے کمیشن کے ممبران کو مطلع کیا تھا کہ پاکستانی شہریوں اور قبائلیوں کے انخلاء کا ریاست سے بندوبست ہو چکا تھا جو یہاں ریاست کے شہری نہیں تھے اور لڑنے کی نیت سے ریاست میں داخل ہوئے تھے اور حکومت پاکستان فروری کے وسط تک اس سلسلے میں اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کر دے گی۔ چند دنوں کے بعد ہندوستانی نمائندے نے یہ تجویز دی تھی کہ استصواب رائے کروانے سے پہلے آزاد کشمیر فوج کو بڑے پیمانے پر ختم کر دیا جائے اور ان سے اسلحہ لیا جائے ورنہ استصواب رائے نہیں کروایا جائے گا۔ کس طرح کبھی ہندوستان اور کبھی پاکستان ریاست میں رائے شماری کروانے سے بار بار کتراتے تھے اور کوئی نیا بہانہ بنا کر ریاست کے عوام کو مستقبل کے فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ حالانکہ کمیشن کی تجاویز کو دونوں ملکوں نے امن کی بنیاد کے لیے قبول کیا تھا اور ان تجاویز میں آزاد کشمیر فوج کو ختم کرنے اور اس سے اسلحہ لینے کا کہیں کوئی ذکر موجود نہیں خاص کر کے استصواب رائے کے دوران ایسا کرنے کا تو ذکر نہیں تھا۔ اب ہندوستان نے یہ نیا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا اس نئے عنصر کو تجویز کا حصہ بنا کر دوسری طرف پاکستان نے اس تجویز پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور ہندوستان کی نیت پر ایک بار پھر شک کیا تھا۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے مارچ 1949ء میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی رضامندی اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی سفارش پر ایڈمیرل چسٹر نمیتز (Admiral Chester Nimitiz) کو جموں کشمیر میں استصواب رائے کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا تھا تا کہ وہ استصواب رائے کرانے کی تیاری کرے۔

ایڈمیرل چسٹر نمیتز (Admiral Chester Nimitiz) نے استصوراب رائے کا ایڈمنسٹریٹر بننے کا ٹاسک قبول کر لیا تھا اس نے کئی ماہ تک ہندوستان، پاکستان اور جموں کشمیر کے حوالے سے کئی چیزوں کا مطالعہ کیا تھا جس میں ادب، کلچر، سیاست، تاریخ اور

جغرافیہ، مذہب وغیر شامل تھا۔ استصواب رائے کا ایڈمنسٹریٹر سرینگر کی طرف کوچ کرنے ہی والا تھا بغیر کسی تاخیر کے لیکن اس سے پہلے جموں کشمیر سے فوجوں کا انخلاء ضروری تھا اور یہ کام ہندوستان اور پاکستان نے مکمل نہیں کیا تھا۔ دونوں حکومتوں کو کمیشن نے کہا تھا کہ وہ اپنی فوجوں کے انخلاء کا اپنا منصوبہ پیش کریں لیکن وہ ایسا نہ کر پائے تو کمیشن نے اپنا منصوبہ اور تجاویز داخل کی تھیں جو کمیشن کی اپنی قراردادوں کے مطابق تجاویز دیں گئی تھیں۔ یہ تجاویز نہ ہندوستان اور نہ ہی پاکستان نے قبول کی تھیں کمیشن نے ایک اور تجویز تیار کی اور فوجوں کے انخلاء کے لیے امن معاہدے کے مطابق یہ تجویز دونوں کو قبول کرنے کے لیے بھیجی لیکن دونوں نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد کمیشن نے اپنے نمائندے کراچی اور دہلی میں بھیجے تھے تا کہ وہ پتہ لگا سکیں کہ دونوں ملکوں کی کیا شرائط ہو سکتی تھیں معاہدہ امن قبول کرنے کے لیے تا کہ ان شرائط کے مطابق کام کیا جائے لیکن کمیشن کو اس بار بھی ناکامی ہوئی تھی ہندوستان نے ایک بار پھر آزاد کشمیر کی فوج کو ختم کرنے اور ان سے اسلحہ لینے کی شرط پھر عائد کی تھی۔ پاکستان نے بھی ہندوستانی فوجوں کے کشمیر سے پہلے نکل جانے کے بعد ہی ان تجاویز کو قبول کرنا تھا اس لئے پاکستان بھی انکار ہو گیا تھا۔

اقوام متحدہ کے کمیشن نے بہت سخت کوشش کی تھی کہ کسی طرح سے دونوں ملکوں کے اختلافات کو ختم کیا جائے اور اس کے لیے دونوں ملکوں کے نمائندوں کا مشترکہ اجلاس کی بھی تجویز دی گئی تھی لیکن دونوں نے اس سے بھی انکار کر دیا تھا اور مشترکہ اجلاس کا خیال ترک کر دیا گیا تھا۔ جب صلح کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو کمیشن نے اختلافات کو ختم کروانے کے لیے ثالثی کی تجویز پیش کی تھی جو امن معاہدے کو لاگو کرنے کے لیے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ تجویز امریکی صدر اور برطانوی وزیر اعظم نے بھی پسند کی تھی اور اس کی حمایت کی تھی برطانوی وزیر اعظم نے ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم کو پیغام بھی بھیجے تھے اور دونوں پر زور دیا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی تجویز قبول کریں پاکستان نے ثالثی کی تجویز قبول کر لی تھی لیکن ہندوستان نے انکار کر دیا تھا۔ ہندوستان نے ایک بار پھر اپنی پرانی رٹ دوہرائی تھی کمیشن جموں کشمیر کے تنازعہ میں اس کے اخلاقی پہلو کو نظر انداز کر رہا تھا یہ وزیر اعظم

نہرو کا بیان تھا جو اس نے دوہرایا تھا۔ اقوام متحدہ کے کمیشن نے کئی ماہ اسی مشقت میں گزار دیئے تھے لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔

اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کے قرار دادیں جموں کشمیر کے مسئلے کے آخری حل کے لیے بڑی ٹھوس بنیادیں مہیا کر رہی تھیں لیکن ان قرار دادوں کو لاگو کرنے میں بار بار ناکامی کی وجہ دونوں ملکوں کے درمیان اعتماد کی کمی تھی۔ ہندوستان آزاد کشمیر کی فوج سے اسلحہ لینے اور اسے ختم کرنے کی ضد کر رہا تھا جبکہ پاکستان ہندوستانی فوجوں کے انخلاء کا مطالبہ کر رہا تھا کمیشن کے لیے یہ دونوں کام بہت مشکل تھے۔ ہندوستان جموں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے قانونی پہلو پر زور دیتے ہوئے ریاست کے دفاع کی ذمہ داری اپنے اوپر ڈال رہا تھا۔ اب 1949ء کے موسم گرما میں صورتحال پہلے سے زیادہ مختلف تھی جو سال کے شروع میں تھی۔ آزاد کشمیر فوج پہلے سے زیادہ منظم، مسلح اور بہت بہتر تربیت یافتہ ہو چکی تھی۔ پہلے آزاد کشمیر کی فوج کا ایک چھوٹا سا گوریلا گروپ تھا اور اب ایک بہت اچھے جنگی ساز و سامان کے ساتھ فوج تھی۔ اس کی 32 بٹالین تھیں جو ہندوستان کے لیے پریشانی کا باعث اس لئے تھیں کہ ان سپاہیوں کی اکثریت ہندوستان کی انگریز فوج میں خدمات سرانجام دے کر بہترین سپاہی ہونے کا ثبوت دے چکے تھے۔ ہندوستان کو شک تھا کہ اگر آزاد کشمیر فوج نے ہندوستان کے زیرِ کنٹرول جموں کشمیر کے علاقوں پر حملہ کیا اور پاکستان نے ان کو اسلحہ سپلائی کیا تو ہندوستان کی طرف رہنے والے ریاست کے لوگ اکثریت میں ہونے کے باوجود آزاد کشمیر والوں کی نہ فوجی لحاظ سے اور نہ ہی سیاسی بنیادوں پر مزاحمت کریں گے۔ اگر ہندوستان نے ایک بار جموں کشمیر سے اپنی فوج کا بڑا حصہ نکال دیا تو ان کو واپس ریاست کی اونچی پہاڑیوں پر لانا مشکل ہو جائے گا جو کافی دور فاصلے پر ہیں۔ اسی دوران جب ہندوستانی فوج ریاست کی اونچائی سے اتر جائے گی تو اچانک آزاد کشمیر فوج مقدس جہاد کے نام پر ریاست کے ہندوستانی علاقوں پر حملہ آور ہو سکتی تھی۔ اس لئے فوجوں کے انخلاء کا مسئلہ کافی حقیقت پسندانہ تھا اور کافی پیچیدہ بھی تھا کیونکہ دونوں ملکوں کو خطرہ تھا کہ دوسرا قبضہ کرے گا۔ آپس میں اعتماد کی کمی کی وجہ سے فوجوں کے انخلاء کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا

تھا۔اس لئے ہندوستان اور پاکستان نے کمیشن کی تجاویز ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ہندوستان کو اعتراض تھا کہ اقوام متحدہ کے کمیشن نے اس کی خواہشات کے مطابق ہندوستان کے خدشات دور نہیں کیے تھے۔

پاکستان کی حکومت کو بھی کمیشن کی فوجوں کے انخلاء کے منصوبے پر کئی اعتراضات تھے لیکن آخر میں پاکستان نے ثالث کی تجویز قبول کر لی تھی۔ہندوستانی حکومت کی طرف سے ثالثی کی تجویز قبول کرنے سے انکار پر کمیشن برصغیر سے واپس لوٹ آیا تھا تاکہ کمیشن سیکیورٹی کونسل کو اپنی رپورٹ پیش کرے اور مزید پیش رفت کے لیے اپنی سفارشات سیکیورٹی کونسل کو پیش کرے۔کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بہت درست اور متاثر کُن نتیجہ نکالتے ہوئے لکھا کہ جموں کشمیر کے تنازعہ کی جڑیں بہت گہری،مضبوط،موجودہ سیاستی،معاشی اور مذہبی حالات میں پیوست تھیں جو دونوں ملکوں کے عمل سے ظاہر ہوتا تھا اس لئے ثالث کی مزید کی گئی کوششیں پھر ناکام ہوں گی۔لیکن مجموعی طور پر کمیشن کی یہ رپورٹ ہندوستانی رویے کی ناقد تھی یہ پہلی رپورٹ سے بالکل مختلف تھی جو پاکستانی رویے کی نقاد تھی۔یہ رپورٹ مشترکہ خیالات کی حامل نہیں تھی بلکہ ایک کیمونسٹ ممبر جو چیکوسواکیہ کی طرف سے پورے کمیشن کے کام کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔اس وفد کی تنقید کمیشن کے حوالے سے اتنا جواز مہیا کر چکی تھی کہ کمیشن کو ختم کر کے اس کا کام ایک ثالث کے حوالے کیا جائے جو کمیشن کی ذمہ داریاں پوری کرے۔تاہم مزید اقدامات کے لیے سیاسی مذاکرات دہلی،کراچی،سرینگر،راولپنڈی،جنیوا،پیرس اور نیویارک میں کیے گئے تھے لیکن زیادہ اہم سرگرمیاں جنگ بندی لائن پر کی گئی تھیں۔

اقوام متحدہ کی طرف سے فوجی مبصرین کا ایک گروپ جموں کشمیر بھیجا گیا تھا تاکہ وہ ہندوستانی اور پاکستانی فوجی اہلکاروں کی جنگ بندی لائن کو برقرار رکھنے میں مدد لے سکے۔اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کا پہلا گروپ جنوری 1949ء میں ریاست میں آیا تھا۔تب سے ان فوجی مبصرین کی تعداد 40 اور 60 کے درمیان رہی تھی۔اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کی ٹیم ایک چیف ملٹری مبصر کی قیادت میں جس کا عہدہ بریگیڈیئر یا لیفٹیننٹ جنرل کا ہوتا تھا۔اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری ان کا تقرر کرتا تھا۔فوجی مبصرین کی ٹیم نے اپنے ہیڈ

کوارٹرز راولپنڈی اور سرینگر میں قائم کیے تھے اور اپنے گروپ میں سے دو ممبران کی ٹیم کو جنگ بندی لائن کی اہم فوجی چوکیوں کی طرف بھیجا کرتے تھے۔ٹیم کے ممبران کو ریڈیو کے ذریعہ ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ کرنے کی سہولت دی گئی تھی۔ان فوجی مبصرین کا کام مقامی سطح پر لائن کو دیکھنا اور اس کو دونوں ملکوں کے درمیان برقرار رکھنا اور اس جنگ بندی لائن کی خلاف ورزی کی چھان بین کرنا ہوتا تھا۔بعض اوقات جنگ بندی لائن کی خلاف ورزیاں معمولی نوعیت کی ہوتیں تھیں اور غیر فوجی نوعیت بھی ہوتی تھیں لیکن بعض اوقات دونوں ملکوں کے تعلقات میں خرابی آجانے سے جنگ بندی لائن کے دونوں طرف مخالف فوجوں کے درمیان بھی سرگرمی شروع ہو جاتی تھی۔اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کا کام خطرات سے پُر تھا اور ان پہاڑوں پر سفر کے دوران کئی فوجی ہلاک بھی ہوئے تھے جس میں ایک چیف ملٹری آبزرور بھی شامل تھا جو ہیلی کاپٹر سے گر کر ہلاک ہوا تھا۔ بہر حال یہ کام سر انجام دیتے ہوئے ان فوجی مبصرین کی زندگیوں کو ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔29 دسمبر 1949ء کو سکیورٹی کونسل کا ایک اجلاس ہوا جس میں یہ طے کرنا تھا کہ جموں کشمیر کے تنازعہ کے حوالے سے مزید کیا اقدامات کیے جائیں۔دو سال سے سکیورٹی کونسل نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا حل ابھی تک بہت دور لگ رہا تھا۔ جنگ بندی کا معاہدہ اور اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کی تقرری کے مقاصد حاصل کر لیے گئے تھے جو جنگ بندی پر پہرہ دے رہے تھے۔ یہ دونوں مخالف اور لڑنے کے لیے بے چین فوجوں کے درمیان کوئی آسان معاہدہ نہیں تھا۔ریاست جموں کشمیر کے عوام کے لیے بھی ان کے مستقبل کو طے کرنے کے لیے حالات ابھی تک اتنے ہی غیر یقینی تھے جتنے 1947ء کے الحاق اور حملے کے وقت غیر یقینی تھے۔سیکیورٹی کونسل نے ایک بار پھر کچھ تجاویز کے ساتھ دونوں ملکوں کے نمائندوں کے ساتھ مذاکرات جاری رکھے اور دونوں ملکوں کو تجویز دی گئی تھی کہ وہ فوجوں کا انخلاء اس حد تک کر دیں کہ جنگ بندی لائن کے دونوں طرف رہنے والوں کے لیے خوف کا باعث نہ بنیں اور شمالی علاقے گلگت بلتستان کو مقامی حکام کے انتظامی کنٹرول میں دیا جائے جو اقوام متحدہ کی نگرانی میں رہیں گے۔

یہ نیا منصوبہ سیکیورٹی کونسل کے صدر جنرل میکنائن جو کنیڈ کی طرف سے تھا جو اس

نے پیش کیا تھا۔ میکنائن جو کنیڈ سیکیورٹی کونسل کے نئے صدر بنائے گئے تھے۔ پاکستان نے جنرل میکنائن کے منصوبے کو کسی حد تک قبول کر لیا تھا جس میں چند چھوٹی اہمیت کی قانونی تبدیلی تجویز کرتے ہوئے جبکہ ہندوستان نے پھر زور دیا تھا کہ آزاد کشمیر فوج کو مکمل طور پر ختم کر کے اس سے اسلحہ واپس لیا جائے اور گلگت بلتستان پر ہندوستانی فوج کے قبضے پر بھی زور دیا تھا۔ سیکیورٹی کونسل کے نئے صدر کی تجاویز پر بحث کے لیے تین مزید اجلاس کیے گئے تھے اور یہ تجاویز ڈرافٹ کی قرارداد میں شامل کی گئی تھیں یہ ڈرافٹ کی گئی قرارداد کیوبا، ناروے، برطانیہ اور امریکہ نے پیش کی تھی اور گیارہ وفود میں سے آٹھ نے اس ڈرافٹ کی حمایت کی تھی سوویت نمائندہ جیکب ملک چپ سادھے رہا اور یوگوسلاویہ نے اس ڈرافٹ پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ 14 مارچ 1950ء کو یہ قرارداد منظور کی گئی جو آٹھ ووٹوں سے منظور ہوئی تھی اور دو ووٹ غیر جانبدار رہے تھے اس قرارداد میں ہندوستان اور پاکستان کو 5 ماہ میں فوجوں کے انخلاء کی تیاری کے لیے پروگرام بنانے کو کہا گیا تھا۔ اس قرارداد میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی جگہ ایک نمائندہ مقرر کیا گیا تھا جس کے پاس ثالثی کے اختیارات ہوں گے اور وہ فوجوں کے انخلاء پر ہونے والے کسی بھی سمجھوتے کی اطلاع سیکیورٹی کونسل کو کرے گا۔ اس نمائندے کو یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ جموں کشمیر کے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے اپنی تجاویز پیش کرے۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں نے اس قرارداد کو قبول کیا تھا گو کہ ہندوستان اس کا نفاذ چاہتا تھا۔ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ جموں کشمیر کے سوال پر سیکیورٹی کونسل میں نہ ختم ہونے والی بحثوں اور غور وخوض کے دوران سیکیورٹی کونسل کے ممبران کی اکثریت ہمیشہ پاکستانی موقف کے قریب رہی تھی۔ اس وقت تک بین الاقوامی سطح پر پریس بھی ہندوستان کو موردالزام ٹھہراتا تھا کہ وہ جموں کشمیر میں بین الاقوامی اداروں کی نگرانی میں استصواب رائے نہیں ہونے دیتا اور دنیا میں ہندوستان کے بارے میں یہ رائے پائی جاتی تھی کہ ہندوستان کو یقین ہی نہیں تھا کہ استصواب رائے میں ووٹ اس کی حمایت میں ڈالا جائے گا۔ سیکیورٹی کونسل نے اس بار ایک آسٹریلین جج کو جو ہائی کورٹ کا ممبر تھا کو کمیشن کی جگہ اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا یہ

مشہور آسٹریلین جیورسٹ (Jurist) اُون ڈکسن تھا (Owen Dixon) ہندوستان کے پریس میں کہا گیا تھا کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی جگہ نمائندہ مقرر کرنے سے ہندوستانی موقف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ شیخ عبداللہ نے اقوام متحدہ کے نئے ثالث کے بارے میں کہا تھا کہ اگر وہ میکنائن کی تجاویز لے کر آرہا تھا تو ناکامی اس کا مقدر ہوگا۔ سر اُون ڈکسن 27 مئی 1950ء کو برصغیر آیا جو اپنے ساتھ اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ سے ایک ممبر کو بھی ساتھ لایا تھا جو جموں کشمیر کے مسئلے کے ساتھ شروع سے کام کر رہا تھا اس کا نام آرتھ کمپبل تھا (Comapbell) اس نے ہندوستان اور پاکستان اور جموں کشمیر کے دارالحکومتوں کے دورے کیے اور 20 جولائی 1950ء کو چار روزہ کانفرنس دہلی میں کرائی جو دونوں ملکوں کے وزرائے اعظموں لیاقت علی خان اور پنڈٹ نہرو کے ساتھ شروع کروائی گئی تھی۔ یہ کانفرنس بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی بلکہ اقوام متحدہ کی قرار داد کو منظور ہوئے بھی 10 ماہ گزر گئے جس میں دونوں ملکوں کو 5 ماہ کا عرصہ دیا گیا تھا کہ دونوں اپنی فوجوں کے انخلاء کی تیاری کریں لیکن اقوام متحدہ کی طرف سے بھیجے گئے نمائندے اُون ڈکسن نے محسوس کیا کہ اس سلسلے میں کچھ بھی عمل نہیں کیا گیا تھا اُون ڈکسن نے لکھا تھا کہ دونوں ملک اس بات پر راضی ہیں کہ استصواب رائے کے ذریعہ جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا لیکن ابھی تک اس کے لیے جو ضروری اقدامات کرنے تھے وہ نہیں کیے گئے حالانکہ دونوں ملکوں کے پاس بہت سا وقت موجود تھا اُون ڈکسن نے مایوس ہونے کی بجائے اس نے اپنا منصوبہ پیش کیا تھا اور اس پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

اُون ڈکسن نے پاکستان کی فوج کی ریاست کے علاقوں میں موجودگی کو بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے انہیں ریاست سے نکالنے پر زور دیا تھا کیونکہ ہندوستان کا بھی یہی مطالبہ تھا کہ پاکستان کو حملہ آور قرار دے کر ریاست سے نکل جانے کا حکم دیا جائے اور اسے جارحیت پسند قرار دیا جائے تا کہ باقی معاملات اس کے بعد کیے جائیں گے۔ اُون ڈکسن نے اس کے بعد ہندوستان کو بھی اپنی فوج کا بڑا حصہ ریاست سے نکالنے کو کہا تھا۔ پاکستانی وزیراعظم نے پہلا قدم اٹھاتے ہوئے اپنی فوج ریاست سے نکالنے

پر رضا مندی کا اظہار کیا تھا لیکن سر اُون ڈکسن کا اطمینان دیر پا ثابت نہ ہوا تھا۔ کیونکہ فوجوں کے انخلاء کا منصوبہ بھارت نے مسترد کر دیا تھا۔ سر اُون ڈکسن نے اب اپنی کوشش آزاد علاقوں کی انتظامیہ کے مسائل کو حل کرنے کی طرف موڑتے ہوئے تجویز دی کہ ذمہ داریاں مقامی حکام کے حوالے کیں جائیں جن کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہا جائے گا اور ان کے اختیارات کو اقوام متحدہ کے آفیسرز نگرانی کریں گے۔ ہندوستان نے اس تجویز پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ یہ انتظامی امور چلانے والے لوکل مجسٹریٹ آزاد کشمیر میں چلنے والی حکومت سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے تھے اور ان کے ذریعہ عوام کے مسائل حل کرنے میں مدد لی جاسکتی تھی۔

اس کے بعد اُون ڈکسن نے اپنی توجہ شیخ عبداللہ کے کنٹرول میں ہونے والے علاقوں کی حکومت پر دی تھی یہ تجویز دیتے ہوئے کہ ریاستی حکومت استصواب رائے میں ریاستی عوام کو مکمل آزادی سے رائے دینے کی یقین دہانی کروائے گی۔ اس بار بھی ہندوستان نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے پھر کہا تھا کہ ریاست کے دفاع اور امن وامان کی ذمہ داری بھارت کی ہوگی اور دوسرا نقطہ اعتراض پھر یہ اٹھایا کہ پاکستان کو ہندوستان کے برابر کا فریق نہیں بلکہ ریاستی علاقوں کی خلاف ورزی کرنے والا جارحیت پسند فریق قرار دیا جائے۔ سر اُون ڈکسن نے صبر کے ساتھ ایک اور متبادل طریقہ کار تجویز کیا تھا۔ اس نے یہ تجویز دی تھی کہ استصواب رائے کروانے کے دوران ساری ریاست میں ایک ہی حکومت قائم کی جائے جو ایک اتحادی حکومت دو مخالف سیاسی پارٹیوں پر مشتمل ہو یا پھر ایک غیر جانبدار انتظامیہ یا کسی غیر سیاسی شخصیت جو سب کے لیے اعتماد والی ہو، کی زیر نگرانی بنائی جائے یا ایک سپروائزری اتھارٹی اقوام متحدہ کے نمائندوں کی بنائی جائے۔ اس بار بھی بھارت نے اُون ڈکسن کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ اُون ڈکسن نے بڑے دکھ اور افسوس سے سیکیورٹی کونسل کو رپورٹ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ’’آخر میں اس کو یقین تھا کہ بھارت فوجوں کے انخلاء پر کبھی بھی رضا مندی ظاہر نہیں کرے گا اور نہ ہی استصواب رائے کو ایسی حالت میں ہونے دے گا جو ڈراؤ دھمکاؤ کے ماحول کے بغیر ہو سکے اور دوسری قسم کے اثرات جو استصواب رائے کو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں ہونے دیں بلکہ بھارت کی کوشش ہوگی ایسے استصواب رائے کو ہونے

سے روکا جائے جو آزادانہ اور مناسب ماحول میں ہو سکے۔

اس کے بعد اُون ڈکسن مزید ایک نیا منصوبہ لے کر آیا تھا‘‘۔ اس منصوبے میں دونوں ملکوں کی حکومتوں کے خیالات کے مطابق ان کو یقین دہانی کروائی تھی کہ استصواب رائے علاقوں کی بنیاد پر کرایا جائے گا اور ہر علاقہ جو جس ملک کو ووٹ دے گا اسی ووٹوں کے مطابق اس ملک کے حوالے کیا جائے گا۔ گویا ووٹوں کے نتائج کے مطابق علاقہ ہندوستان اور پاکستان کے حوالے کیا جائے گا اور استصوائے رائے کو صرف وادی کشمیر تک محدود کر دیا جائے گا۔ اس بار اُون ڈکسن کو پاکستانی وزیر اعظم کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا ہندوستان اور پاکستان پوری ریاست جموں کشمیر میں استصواب رائے کروانے پر زور دے رہے تھے۔ تاہم بھارت نے وادی کشمیر اور اس کے ارد گرد کے علاقوں تک محدود استصواب رائے کروانے کی طرف اشارہ دیا تھا اور اس پر رضامندی کا اظہار بھی کیا تھا۔ اُون ڈکسن نے بھارت کی اس تجویز کو مناسب بتایا تھا کہ ریاست کے کون سے علاقے پاکستان اور کون سے ہندوستان کے حوالے کیے جائیں لیکن پاکستان نے اپنی پوزیشن سے ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ پاکستان نے سیدھا بٹوارہ کرنے پر اپنی رضامندی کا اشارہ دیا تھا جس میں وادی کا سارا علاقہ پاکستان کے حوالے کیا جائے لیکن یہ بھارت کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ اس کے بعد اُون ڈکسن نے آخری کوشش کے طور پر دونوں ملکوں کی حکومتوں کو ایک اور تجویز پیش کی تھی۔ اس نے وسیع تناظر میں جموں کشمیر میں صرف استصواب رائے کروایا جائے اور وادی کو فوجوں سے بالکل پاک کر دیا جائے اور اقوام متحدہ کے آفیسرز کی ایک انتظامی باڈی تشکیل دی جائے جو استصواب رائے کروائے جو صرف وادی کشمیر تک محدود ہوگا۔ اس تجویز کردہ حل کو پاکستان نے مسترد کر دیا تھا۔ لیکن سر اُون ڈکسن کی یہ تجویز کے دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم ڈکسن سے مل کر مزید بات چیت کریں پاکستان نے بادل نخواستہ قبول کی تھی۔ تاہم اُون ڈکسن نے لکھا کہ ہندوستانی وزیر اعظم نے ٹیلگرام کے ذریعہ جواب میں ایسی کسی بھی تجویز کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

اب ثالثی کے تمام راستے ناکام ہو گئے تھے اور سر اُون ڈکسن 23 اگست 1950ء

کو برصغیر سے چلا گیا تھا۔اس نے اپنی رپورٹ میں آخری نتیجہ نکالتے ہوئے لکھا کہ اس تنازعہ میں ثالثی کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں مشکلات تھیں اوراس نے اس میں بہت جان فشانی سے کام کیا تھا اور کئی متبادل حل اور تجاویز پیش کی تھیں لیکن اس باضمیر انسان کو مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا گو کہ اس ناکامی میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا دراصل یہ ساری تفصیلات بیان کرنے کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ جموں کشمیر کے عوام کے سامنے ہندوستان اور پاکستان کے حکمرانوں کا ان کی ریاست کے مسئلہ کے حل کے لیے جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں وہ سامنے لانا تھا اور یہ کہ جتنے بھی حل اقوام متحدہ کے ذریعہ سامنے لائے گئے تھے ان میں صرف ہندوستان اور پاکستان کے مفادات کو سامنے رکھا گیا تھا۔اس کے باوجود دونوں ملکوں کی حکومتوں نے ریاست کا مسئلہ حل نہیں ہونے دیا تھا اور ساتھ ہی ریاست جموں کشمیر کے دونوں طرف کے لیڈروں کا اصل کردار بھی عوام کے سامنے لانا ضروری تھا تا کہ ریاستی عوام کو علم ہو سکے کہ کس طرح ان کے اپنے لیڈروں نے ان کو دھوکہ دیا تھا اور آج تک دیتے آرہے ہیں ۔ان تمام منصوبوں کے ناکام ہونے کے بعد اُون ڈکسن نے کہا تھا جموں کشمیر کے مسئلے کے حل کے لیے سمجھوتے کی کوئی امید نہیں تھی جس کی بنیاد پر اس کو حل کیا جاتا اور اب صرف اس ریاست کو جنگ بندی لائن کے ساتھ ہی تقسیم کر دیا جائے تا کہ یہی حل اس خطے میں پائیدار امن لا سکے اُون ڈکسن کو شک تھا کہ اقوام متحدہ میں اتنی اہلیت ہی نہیں تھی کہ وہ کوئی جبری حل ہندوستان پر مسلط کر سکے۔اب اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی طرف سے کی گئیں ساری کوششیں ناکام ہونے کے بعد اب امید یہ تھی کہ جموں کشمیر کا تنازعہ کامن ویلتھ (Common Wealth) کے وزرائے اعظموں کے جنوری 1951ء کے اجلاس میں زیر بحث لایا جائے گا۔یہ اجلاس لندن میں ہوا تھا اوراس میں پہلے سات گھنٹے جموں کشمیر کے تنازعہ پر کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

لیاقت علی خان نے دھمکی دی تھی کہ وہ کامن ویلتھ کے اجلاس میں شریک نہیں ہوگا اگر اس میں جموں کشمیر کے تنازعہ پر بات چیت نہیں ہوئی۔اس اجلاس میں بات چیت ہوئی لیکن کچھ بھی حاصل نہ کیا گیا اور اسی پر بات چیت جاری رکھی گئی تھی کہ فوجوں کا انخلاء کیسے عمل

میں لایا جائے تا کہ استصواب رائے کروانے سے پہلے بیرونی حملے سے ریاست کومحفوظ رکھا جائے۔آسٹریلیا کے وزیراعظم نے تین تجاویز اس مسئلہ کوحل کرنے کے لیے دیں تھیں۔

ا۔ جموں کشمیر میں کامن ویلتھ کے ملکوں کی فوجوں کوتعینات کیا جائے۔

۲۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کی مشترکہ فوج وہاں رکھی جائے۔

۳۔ استصواب رائے کروانے والے اقوام متحدہ کے ایڈمنسٹریٹر کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ مقامی فوج بھرتی کرکے ریاست میں تعینات کرے۔

پاکستان نے ان تینوں تجاویز کوقبول کرلیا تھا۔لیکن بھارت نے تینوں تجاویز کوقبول کرنے سے انکارکردیا تھا۔ 21 فروری 1951ءکوسیکیورٹی کونسل میں ایک بارپھر جموں کشمیر کے مسئلہ پرزوردار بحث شروع ہوئی تھی۔ برطانوی نمائندے نے سیکیورٹی کونسل کو یاددہانی کروائی تھی کہ جموں کشمیر کا تنازعہ جو 10 ماہ پہلے بحث کا حصہ بنایا گیا تھا وہ ابھی تک ظاہر ہورہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بڑی رکاوٹ بن کرکھڑا ہےاوراس رکاوٹ کوفوراًدور کرنا چاہیے تا کہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کے درمیان باہمی تعاون اور امداد بڑھے۔اس کے بعد برطانیہ اورامریکہ کے نمائندوں نے 21 فروری کو ہی ایک ڈرافٹ کی گئی قرارداد پیش کی تھی اوردوسری قرارداد بھی ایک ماہ کے بعدتھوڑی سی ترمیم کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ یہ تجویز کردہ قرارداد پہلے سے دو اصلی قراردادوں جواقوام متحدہ کے کمیشن نے 13 اگست 1948ءکواور 5 جنوری 1949ءکوپیش کی گئی تھیں کو جاری رکھنے کا اعادہ کرتی تھیں اورہندوستان، پاکستان دونوں نے قبول کی تھیں۔ دراصل یہ ان کی باہمی قبولیت سے استصواب رائے پرزوردیتی تھیں۔ ایک بارپھر اقوام متحدہ کا نمائندہ مقررکیا گیا تھا جوحکومت پاکستان اور ہندوستانی حکومت سے مشورہ کرکے تین ماہ میں فوجوں کے انخلاء کے بارے میں بندوبست کرے گا اور ناکامی کی صورت میں یہ نمائندہ سیکیورٹی کونسل کورپورٹ کرے گا کہ کن نقاط پردونوں فریقوں میں اختلاف پایا گیا تھا۔اقوام متحدہ کے کمیشن کی منظورکی گئی قراردادوں کولاگوکرنے میں اوران کی تشریح کرنے میں ان فریقوں کا کیا اختلاف موجود تھا۔ اس قرارداد میں یہ بھی دونوں فریقوں سے کہا گیا تھا کہ ناکامی کی صورت میں وہ ایک ثالث کوقبول کریں یا ثالثوں کا ایک

پینل قبول کریں جو بین الاقوامی عدالتِ انصاف کے صدر کا مقرر کیا ہوگا جو دونوں فریقوں کے باہمی مشورے سے مقرر کیے جائیں گے۔قرارداد کے ابتدائیہ میں جموں کشمیر کے اندرونی حالات پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا کیونکہ شیخ عبداللہ ریاست کے ایک حصہ میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کی تیاری کر رہا تھا جس میں اسمبلی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ ریاست کے ہندوستان سے الحاق کے سوال کو آخری شکل دے۔

برطانیہ اور امریکہ کی تجویز کردہ قرارداد پر آٹھ سیکیورٹی کونسل کے اجلاس ہوئے تھے سیکیورٹی کونسل میں جن وفود نے قرارداد کو سپورٹ کیا ان کے علاوہ 6 مزید ملکوں نے اس قرارداد کی حمایت کی تھی اور قرارداد 30 مارچ 1951ء کو آٹھ ووٹوں سے منظور کی گئی تھی تین ممبران نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ایک ماہ کے بعد ڈاکٹر فرینک گراہم کو اقوام متحدہ کی طرف سے جموں کشمیر کے لیے نمائندہ مقرر کیا گیا تھا۔پاکستان نے سیکیورٹی کونسل کی اس قرارداد کو قبول کر لیا تھا لیکن بھارت نے اس قرارداد کو اس لئے مسترد کر دیا تھا کہ اس میں ثالثی کی نئی تجویز دی گئی تھی۔پنڈٹ نہرو اور اس کے پیروکاروں نے اعلان کیا تھا کہ وہ ریاست کے 4 ملین لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کسی تیسرے فرد کو کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔حالانکہ نہرو کو علم تھا کہ ریاست کا آخری فیصلہ کسی ٹرائبونل (Tribunal) نے نہیں کرنا تھا۔اس قرارداد میں تنازعے کے دونوں فریقوں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ آپس میں اتفاق کریں تو ریاست کا فیصلہ استصواب رائے کے ذریعہ کیا جائے گا۔سیکیورٹی کونسل،،اس کا کمیشن اور اُون ڈکسن نے بھی بار بار ہر موقع پر اس سمجھوتے کی تصدیق کی تھی۔یہ ریاست کو فوجوں سے خالی کروانے کا اقدام تھا اور اگر فریقین سمجھوتہ کرنے میں ایک بار پھر ناکام ہو جائیں تو اس ناکامی کی رپورٹ ثالثی کے لئے پیش کی جائے گی۔ہندوستان پر اس سلسلے میں تنقید ضروری بنتی ہے کیونکہ ملکوں کے بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ میں اکثر ایسا ہوتا آیا تھا کہ ملک اپنے جھگڑے کسی ٹربیونل کے پاس لے جاتے تھے اور جموں کشمیر کے جھگڑے میں بھی یہ قدم کوئی منفرد نہیں تھا۔امریکہ کی مثال ہمارے سامنے موجود تھی جس نے 1914ء تک 86 کیسز (Cases) بین الاقوامی ثالثی کے لیے پیش کیے تھے۔

اس کے علاوہ اقوام متحدہ کا چارٹر ہندوستان کو اور دیگر ملکوں کو پابند کرتا ہے جو اس چارٹر پر دستخط کیے ہوئے ہیں وہ ریاستیں پیراگراف ایک اور آرٹیکل 33 کے تحت کسی بھی تنازعہ میں فریق ہیں سب سے پہلے بات چیت، چھان بین، صلح صفائی، امن، ثالثی اور عدالتی طریقہ سے کسی مسئلے کا حل نکالیں لیکن اس تنازعہ میں بھارتی لیڈرشپ کا رویہ بڑا ہی عجیب تھا کیونکہ ہندوستان ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں خود لے گیا تھا لیکن اب اسی تنازعہ کا فیصلہ کرنے کے لیے جو قدم بھی اقوام متحدہ کی طرف سے اٹھایا جاتا تھا ہندوستان اسے پہلے ہی مسترد کر دیتا تھا۔ جب کسی تنازعے کے دو فریق ہوتے ہیں تو فیصلہ ہمیشہ دونوں فریقوں کے درمیان صلح کروانے کے لیے کیا جاتا ہے ہندوستان کا سکیورٹی کونسل میں رویہ ایسا تھا جیسا اس کا مقصد یہاں آنے کا صرف ایک ہی تھا اور وہ مقصد اس فورم پر پاکستان کو شکست دینی تھی۔ دوسری طرف پاکستان کا رویہ بھی ایسا ہی تھا لیکن محض تجاویز پر پاکستان کا رویہ معقول بھی تھا۔ ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کی نوعیت ہی دونوں ملکوں نے دوطرفہ بنا دی تھی جو پارٹی یعنی جموں کشمیر کے عوام جو تنازعہ کے بنیادی فریق تھے اس مسئلے سے باہر رکھے گئے تھے اور ریاست کی لیڈرشپ بھی دونوں ملکوں کی طرف سے پیش کیا گیا کیس کے ساتھ ہی فریق بنی ہوئی تھی اس میں ریاستی عوام کی نمائندگی کوئی بھی نہیں کر رہا تھا جبکہ دعویٰ دونوں ملکوں کا یہ تھا کہ وہ دونوں ہی ریاستی عوام کو اور ان کی خواہشات کی نمائندگی کرتے تھے۔

دراصل یہ دونوں ملک ریاست کے زیادہ سے زیادہ علاقے ہتھیانے میں دلچسپی لے رہے تھے اور ریاستی عوام کے حقوق کو دونوں نظر انداز کر رہے تھے اقوام متحدہ کے نمائندوں کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ریاستی عوام کے حقوق کو نظر انداز بھی کیا جاتا تھا اور سب سے زیادہ اس تنازعہ کی وجہ سے مصیبتیں بھی ریاست کے عوام برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہندوستان کے لیڈرز بار بار ثالث کو مسترد کر رہے تھے۔ جبکہ ہندوستانی لیڈروں نے بین الاقوامی تنازعات کو ثالث کے ذریعہ حل کرنے کے عمل کو اعلیٰ آدرش قرار دیا تھا اور ہندوستان کے آئین C کا آرٹیکل 51 کہتا ہے کہ ریاست کو کوشش کرنی چاہیے کہ بین الاقوامی قانون اور معاہدوں کی پاسداری کرے اور اس کو پروموٹ

کرے اور عزت دے اور ایک قوم کے منظم لوگوں کے ساتھ اس طرح کا اچھا سلوک کرنا ضروری ہے۔ بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے ثالث کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ پنڈٹ نہرو نے 1950ء کے شروعات میں خود تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کو پاکستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنا چاہیے اور آپس کے تمام تنازعات پر امن طریقے سے بات چیت کے ذریعہ، صلح وصفائی سے اور ثالث کے ذریعہ حل کرنا ہوں گے۔ لیاقت علی خان نے ٹھوس تجاویز دیتے ہوئے جموں کشمیر کا تنازعہ ثالث کے ذریعہ حل کرنا چاہا اور ہندوستان پاکستان کے درمیان دیگر مسائل بھی اس طرح حل کرنا چاہے تھے اس پر نہرو نے لیاقت علی خان کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ جموں کشمیر کا مسئلہ قانونی نہیں بلکہ سیاسی مسئلہ تھا اور اسے کسی جوڈیشل ٹربیونل کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان نے جموں کشمیر کے مسئلہ پر یہ دعویٰ کررکھا تھا کہ ریاست ہندوستان کا پہلے سے ہی حصہ تھا اور پاکستان کو جارح اور حملہ آور تصور کیا جائے۔ نہرو کی اپنی سوچ میں تضاد تھا یا نہروں ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر ریاست کا تنازعہ اقوام متحدہ میں لایا تھا اور اب اسے اقوام متحدہ کے طریقہ کار کا علم ہوا تھا تو اس کی امید بجھ سی گئی تھی ورنہ ایسا کسی بھی عمل سے نظر نہیں آرہا تھا کہ بھارت واقعی ریاست کے تنازعہ کا حل چاہتا تھا اور اقوام متحدہ میں اس کے آنے کا مقصد اس وقت کچھ اور تھا اور اب اقوام متحدہ نے جموں کشمیر کے مسئلہ کا وہی حل تجویز کیا جو قانون آزادی ہند میں بھی اسی طرح کے حل پر دونوں سیاسی جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ نے اتفاق کیا تھا اور کسی بھی متنازعہ ریاست کا حل استصواب رائے کے ذریعہ کروایا جائے گا۔

جونا گڑھ اور حیدر آباد میں ہندوستان نے خود ریفرنڈم کروا کر ان کو ہندوستان کا حصہ بنایا تھا جبکہ جموں کشمیر میں تنازعہ پیدا ہوا تھا تو اس کا حل بھی ریفرنڈم اور عوام کی رائے کے ذریعہ اس کا فیصلہ کروانا تھا جبکہ یہاں ہندوستان نے تنازعہ اقوام متحدہ میں لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور جب اقوام متحدہ نے عوامی رائے کے ذریعہ فیصلہ کروانے کے لیے سارے جتن کیے ہندوستان نے ماننے سے انکار کردیا تھا اگر ریاست کے الحاق کی وجہ سے ریاست ہندوستان کا حصہ بن گئی تھی تو اس کو متنازعہ تسلیم کرکے اس کا مسئلہ اقوام متحدہ میں ہندوستان

کیوں لے گیا تھا؟ اگر ہندوستان کی اس بات کو درست مان لیا جائے کہ پاکستان جارح اور حملہ آور تھا اور اسے ریاست سے اقوام متحدہ کے ذریعہ ہی نکالنا ضروری تھا اور ہندوستان یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان کی جارحیت اور ریاست پر حملہ ہی بنیادی تنازعہ تھا تو پھر بھارت نے سیکیورٹی کونسل میں یہ شکایت پاکستان کے خلاف اقوام متحدہ کے چارٹر کے چیپٹر (Chapter 7) سات کے مطابق درج کیوں نہیں کروائی تھی کیونکہ چیپٹر (Chapter 7) سات کے تحت درج کروائی گئی شکایات کو ہی حملہ اور جارحیت سے متعلق تصور کیا جاتا تھا اور ان جیسے سنگین اور فوری نوعیت کے حل طلب تنازعات کو چارٹر کے چیپٹر (Chapter 7) سات کے تحت حل کروایا جاتا تھا۔ بھارت نے جموں کشمیر کا تنازعہ چارٹر کے چیپٹر (Chapter 6) چھ کے تحت درج کروانے کی درخواست کیوں دی تھی کیونکہ اقوام متحدہ کے چارٹر کا چیپٹر (Chapter 6) چھ صرف مخصوص نوعیت کے تنازعات کو حل کروانے سے متعلق تھا۔ اگر یہ بھارت کو غلطی لگ گئی تھی اور وہ اسے درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو پھر بھی یہ مشکوک قرار دیا جائے گا کیونکہ اس چیپٹر کے تحت بھارت نے اس تنازعہ کی کاروائی سیکیورٹی کونسل میں اتنے لمبے عرصے تک کیوں ہونے دی تھی؟ ہندوستان قانونی طور پر یہ حق رکھتا تھا کہ وہ سیکیورٹی کونسل کو درخواست دے کر سیکیورٹی کونسل کی کاروائی کو صرف پاکستان کی جارحیت کے عمل تک محدود کروا سکتا تھا اور سیکیورٹی کونسل اسی مسئلے پر مزید کاروائی کرتے ہوئے اسے ہی تنازعہ کی بنیاد بنا سکتی تھی جبکہ ہندوستان نے جموں کشمیر کے تنازعہ کا حل اقوام متحدہ کی قراردادوں کی بنیاد پر قبول کیا تھا جو قراردادیں براہِ راست پاکستانی جارحیت کی مذمت بھی نہیں کرتیں تھیں۔

آخر ہندوستان کو بار بار یہ اعتراض کیوں ہوتا تھا کہ سیکیورٹی کونسل، اقوام متحدہ کا تشکیل دیا گیا کمیشن اور اُون ڈکسن نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا تھا کہ پاکستان کو حملہ آور قرار دے کر ریاست سے اپنی فوج نکالنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ یہ درست اس لئے نہیں تھا کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی دونوں قراردادوں اور اُون ڈکسن کی سفارشات میں پاکستانی فوج کی ریاست میں موجودگی کو رد کیا گیا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان کا یہ اعتراض بھی تھا کہ اخلاقی طور پر اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کو پاکستان کے ریاست پر حملے کی مذمت کرتے ہوئے

اسے ریاست سے نکل جانے کا حکم دینا چاہیے اور پاکستان کو تنازعہ کا فریق کے بجائے جارحیت پسند قرار دینا چاہیے تھا۔ جبکہ ہندوستان کی اپنی اخلاقی حالت یہ تھی کہ جب نارتھ کوریا کی کمیونسٹ حکومت نے جنوبی کوریا پر حملہ کیا تھا تو اقوام متحدہ نے اس کی مذمت کی تھی اور جب چین نے اس حملہ میں ساتھ دیا تو پھر بھی اقوام متحدہ نے چین کی بھی مذمت کی اور قرارداد منظور کی تھی اس قرارداد پر بھارت نے ووٹ دینے سے انکار کر دیا تھا چین اور شمالی کوریا کے فوجی حملے کی مذمت بھی نہیں کی تھی جبکہ پاکستان کے حوالے سے اس کا زور ہی صرف اسی اخلاقی پہلو کی طرف تھا اور سیکیورٹی کونسل پر الزام ہی بھارت یہ لگا رہا تھا کہ اس نے حملے کی مذمت میں قرارداد منظور نہیں کی تھی۔ ملکوں کی پالیسیاں تضادات سے بھری ہوتیں تھیں لیکن ان تضادات پر کوئی بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ 30 مارچ 1951ء کی سیکیورٹی کونسل کی قرارداد کی ناکامی یقینی تھی چونکہ حالات ہی ایسے بنے ہوئے تھے۔ نہرو نے اس قرارداد کو قابل اعتراض قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی تھی اور ہندوستان کی عزت کے لیے اسے ایک چیلنج قرار دیا تھا۔ نہرو نے کہا تھا کہ کوئی ملک کوئی تنظیم اس سے کوئی تعلق نہ رکھے کہ ہندوستان نے جموں کشمیر میں کیا تھا اور کیا کر رہا ہے۔ جموں کشمیر میں اقوام متحدہ کے نمائندے کے خلاف احتجاجی مظاہرے کروائے گئے تھے۔ دوسری طرف شیخ عبداللہ نے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے آئین ساز اسمبلی سے جموں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کو دوبارہ منظور یا اس کی تصدیق کروا دی تھی۔

شیخ عبداللہ کے اس کارنامے پر ہندوستان کی جمہوریہ نے نہرو کو انگریز کا جانشین ہونے کا اعزاز دیا تھا اور اعلان کیا گیا تھا کہ نہرو نے یہ پوزیشن وراثت میں حاصل کی تھی جو انگریز حکومت میں تھا وہ سب نہرو کے کنٹرول میں آچکا تھا کیونکہ نہرو کو جموں کشمیر کے الحاق کے علاوہ سب کچھ انگریز ہی تو چھوڑ گئے تھے۔ اب ہندوستان انگریز دور کے پرانے اور نئے ہندوستان کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں حاصل کر چکا تھا۔ ان حقوق اور ذمہ داریوں میں ان ریاستوں کا تحفظ بھی شامل تھا جو ہندوستان سے الحاق کر چکی تھیں اور ان ریاستوں کا تحفظ بھی جنہوں نے پاکستان سے الحاق نہیں کیا تھا۔ جمہوریہ ہندوستان نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ اگر

جموں کشمیر کی ریاست نے ہندوستان سے الحاق نہ بھی کیا ہوتا تو پھر بھی ہندوستان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ جموں کشمیر کی عوام کو بیرونی جارحیت کے خلاف تحفظ فراہم کرے۔ ہندوستانی حکومت نے کہا تھا کہ جموں کشمیر بین الاقوامی قانون کے مطابق ایک تسلیم شدہ ریاست تھی لیکن اب ہندوستان کا اندرونی حصہ بن چکی تھی۔ ہندوستان کا بٹوارہ ریاست جموں کشمیر کے بارے میں ہندوستان کی ذمہ داریوں پر کوئی فرق نہیں ڈال پایا تھا کیونکہ ریاست جان بوجھ کر پاکستان کا حصہ نہیں بنی تھی۔ اب ریاستی لیڈر شپ شیخ عبداللہ کی شکل میں ہندوستان کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہوئے بری طرح ریاستی وحدت کا تشخص پامال کر چکی تھی اور ہندوستان کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ نہرو بڑی ہوشیاری سے شیخ عبداللہ اور اس کی سیاسی پارٹی کو اپنے ملکی مفادات کے لیے استعمال کر چکا تھا اور ریاست پر اپنا قانونی جواز بھی شیخ عبداللہ کی بنائی گئی آئین ساز اسمبلی سے حاصل کر چکا تھا۔

اب ایک طرف ریاستی لیڈر شپ پوری طرح ہندوستان کے آگے سرینڈر کر چکی تھی اور بڑے آرام سے اپنے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے رسی ہندوستان کو پیش کر چکی تھی اور اس لیڈر شپ کا سب سے بڑا کنفوژن یہ بن گیا تھا کہ وہ ہر حال میں ریاست کو پاکستان سے بچانا چاہتی تھی یہاں تک تو درست سوچ تھی لیکن اپنے سارے انڈے ہندوستان کی ٹوکری میں ڈالنا کوئی دانشمندی کا مظاہرہ بھی نہیں تھا لیکن اس وقت شیخ عبداللہ اور اس کی جماعت کی سوچ نہ صرف یکطرفہ تھی بلکہ شیخ عبداللہ نہرو اور کانگریسی حکومت کے ارادوں سے بالکل بھی واقف نہیں تھا جس کی وجہ سے آگے چل کر اس غفلت کی سزا بھی شیخ عبداللہ نے ہندوستان کی جیلوں میں قید کاٹ کر خود ہی بھگتی تھی اور ریاست کو ہمیشہ کے لیے بٹوارے کے حوالے کر گیا تھا اور عوام کو ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کے حوالے کر گیا تھا۔ 1951ء کے موسم گرما میں ہندوستان اور پاکستان ایک بار پھر مکمل جنگ کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ نہرو نے پاکستان پر الزام لگایا تھا کہ وہ مغربی پنجاب میں ہندوستان کے خلاف فوجیں جمع کر رہا تھا اور جموں کشمیر میں کیا گیا امن معاہدہ کی سنگین خلاف ورزی کر رہا تھا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے نہرو پر بھی اسی قسم کا الزام عائد کیا تھا۔ دونوں ملکوں کے وزرائے اعظموں نے ایک دوسرے کو دھمکیوں

بھرے ٹیلیگرام بھی بھیجے تھے۔

1952ء کے نئے سال کے پیغام میں نہرو نے پاکستان کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر پاکستان نے غلطی سے بھی جموں کشمیر پر حملہ کیا تو نہ صرف ہندوستان اسے ریاست کی سرزمین پر فوجی ملاقات کرے گا بلکہ یہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مکمل جنگ ہوگی۔ ایسے ماحول میں اقوام متحدہ کا نمائندہ ڈاکٹر فرینک گراہم جموں کشمیر سے فوجوں کے انخلاء کی کوششوں میں لگا ہوا تھا چونکہ اس کا مشن صرف اسی خالص ذمہ داری تک محدود تھا جو آزادانہ استصواب رائے سے متعلق ضرورتوں سے جڑا تھا۔ سیکیورٹی کونسل نے ڈاکٹر گراہم سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے کام سے متعلق نتائج کی رپورٹ تین ماہ میں پیش کرے لیکن سال گزارنے کے باوجود ڈاکٹر گراہم اپنی کامیابی کی رپورٹ نہ پیش کر سکا تھا۔ ڈاکٹر گراہم نے دہلی، کراچی، سرینگر، جنیوا، پیرس اور نیویارک کا سفر کیا اور اس نے نے فوجوں کے انخلا کے کام کو بڑی تفصیل سے مطالعہ کیا تھا اور اس نے کئی تجاویز ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو پیش کی تھیں۔ اس نے کئی قراردادیں ڈرافٹ کیں اور کئی منصوبے پیش کیے تھے تاکہ جموں کشمیر کو پہلے غیر فوجی علاقہ بنایا جائے اور پھر استصواب رائے کروایا جائے۔ ڈاکٹر گراہم نے اس مسئلہ پر پانچ رپورٹیں سیکیورٹی کونسل میں پیش کی تھیں اور سیکیورٹی کونسل کی درخواست پر اس کی کوششیں ابھی تک جاری تھیں۔ ڈاکٹر گراہم نے آخر میں دونوں ملکوں کے رویوں کی گہری چھان بین کرنے کے بعد اس نے اپنا ایک پلان پیش کیا تھا جو (12) بارہ تجاویز پر مشتمل تھا ان تجاویز میں سب سے اہم استصواب رائے کے لیے اقوام متحدہ کے ایڈمنسٹریٹر کا تقرر کرنا تھا۔ پاکستان نے زور دیا کہ اقوام متحدہ کا ایڈمنسٹریٹر جتنا جلدی ہو سکے اپنے آفس کا چارج سنبھالے لیکن ہندوستان نے اس کام کو قبل از وقت قرار دیئے ہوئے پہلے فوجوں کے انخلاء کو ضروری قرار دیا تھا۔ اقوام متحدہ کے نمائندے نے پہلے بحث کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہوئے تجویز پیش کی تھی کہ 12 ہزار سے 18 ہزار کے درمیان فوجی سپاہی ہندستانی زیرِ کنٹرول جموں کشمیر کے علاقوں میں تعینات کیے جائیں اور ان کے ساتھ مقامی ریاست کی ملیشیاء کے 6 ہزار افراد کو بھی تعینات کیا جائے اور 3 ہزار سے 6 ہزار سپاہی آزاد کشمیر فوج کے پاکستانی زیر

کنٹرول جموں کے علاقوں میں تعینات کیے جائیں اور اس کے ساتھ ہی گلگت بلتستان کے 3 ہزار 5 سو سکاؤٹس شمالی علاقہ جات میں تعینات کیے جائیں۔ تب اس نے اپنی تجویز میں ترمیم کرتے ہوئے 18 ہزار ہندوستان کی طرف اور 6 ہزار پاکستان کی طرف فوج تعینات رکھنے کا منصوبہ پیش کیا تھا۔

ہندوستان نے اقوام متحدہ کے نمائندے کا پیش کیا ہوا منصوبہ اور اس کی تمام تجاویز کو ایک بار پھر مکمل طور پر مسترد کر دیا تھا۔ ہندوستان نے اپنی فوجوں کی کم سے کم تعداد 21 ہزار رکھنے پر زور دیا تھا اور ریاستی ملیشیاء کو اس تعداد میں تعینات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان نے آزاد کشمیر کو فوج سے مکمل پاک وصاف کرنے پر زور دیتے ہوئے صرف 4 ہزار افراد کی سول فورس رکھنے کی تجویز دی تھی ان میں سے بھی دو ہزار افراد آزاد کشمیر حکومت کے حامی ہوں گے اور دو ہزار افراد آزاد کشمیر کے عام شہری ہوں گے جن کا آزاد کشمیر حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس کا سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان شیخ عبداللہ کی حکومت کے علاقوں میں ہی استصواب رائے کروانے کی تجویز دے رہا تھا اور وہ بھی 27 ہزار ہندوستان کی حامی فوج کے سپاہیوں کی موجودگی اور شیخ عبداللہ کی موجودگی میں جبکہ آزاد کشمیر میں استصواب رائے 4 ہزار سول فورس کی موجودگی میں کروایا جائے گا اور ان میں سے بھی آدھے وہ لوگ ہوں گے جو شیخ عبداللہ کے علاقوں سے مہاجرین آئے ہوئے تھے جنہوں نے ریفرنڈم کے بعد واپس شیخ عبداللہ کی حکومت کے کنٹرول والے علاقوں میں جانا تھا۔ پاکستان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی طرف جموں کشمیر میں سپاہیوں کی تعداد ابھی بھی زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود پاکستان نے ڈاکٹر گراہم کی تجاویز کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ جب سیکیورٹی کونسل نے 23 دسمبر 1952ء کو ایک قرارداد منظور کی تھی جس قرارداد میں دونوں ملکوں کی حکومتوں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ فوجوں کے انخلاء پر 30 دنوں کے اندر رضامندی ظاہر کریں جس کی بنیاد ڈاکٹر گراہم کی پیش کردہ تجاویز ہوں۔ بھارت نے ایک بار پھر اس قرارداد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن پاکستان نے اسے قبول کر لیا تھا۔ تاہم ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کے درمیان بات چیت کا عمل دوبارہ بحال ہو گیا تھا۔ پہلے ان کے درمیان بات

چیت نیویارک میں شروع ہوئی تھی اور بعد میں فروری 1953ء میں جنیوا میں شروع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر فرینک گراہم نے چھ مزید تجاویز پیش کی تھیں جن میں ریاست کو غیر فوجی علاقہ بنانے کا طریقہ کار اور استصواب رائے کے لیے ایڈمنسٹریٹر کے لیے آفس میں آنے کا وقت متعین کرنا بھی شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر گراہم نے اپنی پچھلی تجویز کو دوہرایا تھا کہ آزاد کشمیر میں فوجی سپاہیوں کی تعداد 6 ہزار افراد سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ دوسری طرف اس نے ہندوستان کی بات مانتے ہوئے ہندوستانی فوج کی تعداد 21 ہزار تک بڑھا دی تھی۔ لیکن اقوام متحدہ کا یہ نمائندہ اب اپنے آپ کو اسی حالت میں اور اس جگہ محسوس کر رہا تھا جہاں پہلے والا نمائندہ سر اُون ڈکسن نے اپنے آپ کو ستمبر 1951ء میں پایا تھا۔ ڈاکٹر گراہم نے اپنی پانچویں رپورٹ کا نتیجہ نکالتے ہوئے سیکیورٹی کونسل میں اس امید کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ 40 کروڑ عوام کے لیڈرز اقوام متحدہ کی مدد سے شاید بات چیت کریں اور جموں کشمیر کے مسئلے پر کوئی سمجھوتہ کریں تاکہ عوام اس خطے میں امن کی طرف اپنا مارچ کریں۔

ایک بار پھر اقوام متحدہ کا یہ سہولت کار نمائندہ مایوس ہو کر اسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا جس نتیجے پر سر اُون ڈکسن پہنچا تھا کہ دونوں فریق اقوام متحدہ کی ثالثی پر کبھی راضی نہیں ہوں گے سوائے اس کہ دونوں آپس میں رضا مند ہو جائیں اس کے علاوہ اس تنازعے کا کوئی حل نہیں تھا۔ اب حکومت پاکستان کے لیے اندرونی مشکلات کا سامنا کرنا آسان نہیں تھا کیونکہ آزاد کشمیر کی فورسز کے لیے اتنے لمبے عرصے تک صبر کرنا اور خاموش رہنا مشکل تھا۔ آزاد کشمیر کی حکومت نے بھی دھمکی دی تھی آزاد کشمیر کے عوام اب خود اپنی ذمہ داری پر دوسری طرف کے بھائیوں کو آزاد کروائیں گے اور اس دفعہ جنگ آخری مرحلے تک لڑی جائے گی چاہے حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ پاکستانی وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے اعلان کیا تھا اب پاکستان کے صبر کی بھی ایک حد ہے اور اس نے کہا کہ وہ کشمیریوں کی آزادی تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

24 اکتوبر 1952ء کو پورے پاکستان میں ''یوم کشمیر'' بنایا گیا تھا کئی اجلاس کیے گئے تھے اور کئی قراردادیں پیش کی گئی تھیں۔ اقوام متحدہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ وہ

تاخیری حربے استعمال نہ کرے اور پاکستان کو اقوام متحدہ سے نکل جانے کی تجویز دی گئی تھی۔ یہ چاہے پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں پر دباؤ بنانے کے لیے کیا گیا ہو یا سیکیورٹی کونسل اور اقوام متحدہ کے نمائندے کے لیے کیا گیا تھا لیکن یہ بات بالکل صاف نظر آئی تھی کہ پاکستانی عوام کے اندر شدید مخالفت پائی جاتی تھی کہ اقوام متحدہ جموں کشمیر کے مسئلے کے حل کے قریب بھی نہیں پہنچا تھا اور اس ناکامی پر پاکستانی عوام میں بہت غصہ پایا جاتا تھا۔ اب ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو اقوام متحدہ کے تاخیری کام سے غیر مطمئن ہونے کا جواز مل گیا تھا یا عوامی دباؤ زیادہ بڑھ گیا تھا دونوں ملکوں کی حکومتوں نے 1953ء میں فیصلہ کیا تھا وہ اقوام متحدہ کے سرگرم کردار کو الگ کرتے ہوئے دوطرفہ مذاکرات کے ذریعہ جموں کشمیر کے تنازعے کا حل تلاش کرتے ہیں جس طرح دونوں حکومتوں نے 1947ء میں بات چیت کی تھی۔ 1953ء کے موسم بہار میں محمد علی کو پاکستان کا وزیر اعظم بنایا گیا تھا جو پہلے امریکہ میں پاکستان کا سفیر تھا۔ اس نے ہندوستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے بارے میں اور جموں کشمیر کے مسئلہ کے حل کے بارے میں پرامید بیانات دیئے تھے۔ جون 1953ء میں نہرو اور وزیر اعظم پاکستان محمد علی لندن میں ملے تھے اور جموں کشمیر کے مسئلے پر غیر رسمی بات چیت کی تھی۔ 25 جولائی 1953ء میں نہرو نے کراچی کا دورہ کیا تھا اور اس مسئلے پر بحث کی گئی تھی اور کئی دیگر مسائل پر بھی بات کی گئی تھی۔ آئندہ بات چیت جاری رکھنے کا اعادہ کیا گیا تھا۔ تاہم 9 اگست 1953ء کو شیخ عبداللہ کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا کر جیل بھیج دیا گیا تھا اور اس کی جگہ بخشی غلام محمد کو جموں کشمیر کا وزیر اعظم بنایا گیا تھا۔

وادی کشمیر میں اس واقعہ کی وجہ سے کئی افراد مارے گئے تھے اور ہندوستان پاکستان کے درمیان جو تھوڑی سی بات چیت کی امید پیدا ہوئی تھی وہ بھی ختم ہوگئی تھی۔ پاکستانی وزیر اعظم جلدی سے دہلی گیا تا کہ وہ پاکستانی عوام کے غصے کو کم کر سکے دوسرا سرینگر میں پیدا شدہ صورتحال کو سامنے رکھ کر نہرو کو قائل کر سکے کہ وہ جموں کشمیر کے مسئلہ کو جتنا جلد ہو سکے حل کرے۔ چار دنوں کے صلاح مشورے کے بعد دونوں ملکوں کے وزرائے اعظموں نے ایک مشترکہ بیان میں دونوں ملکوں کے درمیان تمام حل طلب مسائل کو بات چیت سے حل کرنے پر

اتفاق کا اظہار کیا تھا۔ جموں کشمیر کے تنازعہ کے حوالے سے کہا گیا تھا کہ اس ریاست کا مسئلہ ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق حل ہونا چاہیے کیونکہ یہ مسئلہ سب سے زیادہ ریاستی عوام کی زندگیوں کو متاثر کرتا تھا اور اس کو حل کرنے کا بہترین طریقہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دونوں ملکوں کے وزرائے اعظموں نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا تھا کہ بنیادی نوعیت کے ایشوز پر دونوں کو براہِ راست سمجھوتے کی طرف بڑھنا چاہیے اور اس کے بعد استصواب رائے کے لیے ایڈمنسٹریٹر کا تقرر کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں عارضی وقت مقرر کیا جائے اور اپریل 1954ء کے آخر تک استصواب رائے کے لیے ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جانا چاہیے۔ چار ماہ گزر گئے تھے جب ہندوستان اور پاکستان کے ماہرین اپنے اپنے وزرائے اعظموں کو مشورے کے لیے ملے تھے جو جموں کشمیر سے فوجوں کے انخلاء جیسے اہم مسائل سے متعلق تھے۔ دہلی میں ہندوستان اور پاکستان کے ماہرین کی کانفرنس دسمبر 1953ء میں بغیر کسی کامیابی کے ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد پاکستانی وزیراعظم نے ہندوستانی وزیراعظم سے ملنے کے لیے اسے کئی خطوط لکھے لیکن ملاقات کرنے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اپریل کے آخری ہفتے تک نہ کوئی بنیادی مسئلہ حل ہوا نہ ہی استصواب رائے کے لیے ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوا تھا۔ جو لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ اقوام متحدہ کو اس مسئلے سے دور رکھ کر دوطرفہ مذاکرات سے مسئلہ حل کرلیا جائے گا وہ ایک سال کے دوطرفہ مذاکرات کے نتیجہ میں سامنے والے واقعات سے مایوس ہوئے تھے۔ اقوام متحدہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے جان چھڑوالے جس میں قوموں کے درمیان امن قائم کرنے کی ذمہ داری بھی شامل تھی۔

اب دوطرفہ مذاکرات ناکام ہوجانے سے اقوام متحدہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنا صلح کاری کا کردار بحال کرے۔ اب ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ سیکیورٹی کونسل اگر مسئلہ حل نہیں کرواسکی تو ضروری تھا کہ اس کے حل کے لیے دوسرے متبادل راستے بھی تلاش کیے جائیں۔ اس کے لیے یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ جموں کشمیر کا مسئلہ سیکیورٹی کونسل کے ایجنڈے سے ہٹا کر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے حوالے کیا جائے کیونکہ جنرل

اسمبلی کی سفارشات ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتی تھیں اور اخلاقی حمایت بھی 60 میں سے اکثریت ممبران کی حاصل ہوگی۔ جنرل اسمبلی ہندوستان اور پاکستان دونوں سے اپیل کرسکتی تھی کہ وہ جموں کشمیر کو غیر فوجی علاقہ بنائیں جس طرح 23 دسمبر 1952ء کی سیکیورٹی کونسل کی تجویز میں اسے منظور کیا گیا تھا اور استصواب رائے کے لیے مزید اقدامات کریں جس طرح اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی قرارداد میں اس پر رضامندی ظاہر کی گئی تھی۔ جنرل اسمبلی کی سفارشات کے ناکام ہونے کی صورت میں یہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس سے ریاست کے ہندوستان سے الحاق کے بارے میں قانونی رائے بھی مانگ سکتی تھی۔

جنرل اسمبلی ہندوستان اور پاکستان سے اپیل کرسکتی تھی کہ وہ ثالث کو قبول کریں اور کم از کم فوجوں کے انخلاء کے طریقہ کار پر ہی ثالث قبول کریں اور تنازعہ کے دونوں فریقوں کے درمیان اگر مزید رضامندی نہ ہوتو وہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی قراردادوں کی تشریح کے لیے ہی رجوع کرسکتی تھی۔ جنرل اسمبلی دونوں فریقوں اور اقوام متحدہ کی فوجوں کو جموں کشمیر اور پاکستان کے بارڈر پر تعینات کرنے کی تجویز بھی دے سکتی تھی اور اس طرح جموں کشمیر کی ریاست کو مکمل غیر فوجی علاقہ بنایا جاسکتا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ پاکستان کے لیے یہ تجویز قبول کرنا مشکل ہوتا لیکن یہ ہندوستان کے لیے باعث اطمینان ہوسکتا تھا جموں کشمیر کے دفاع کے لیے اور بیرونی جارحیت کے خطرے کو لے کر ہندوستان کو مطمئن کیا جاسکتا تھا۔ یہ پاکستان کا مقصد بھی پورا کرسکتا تھا خاص کر کے فوجی انخلاء کا مقصد اور استصواب رائے کے لیے آزادی رائے کا مقصد بھی پورا ہوسکتا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ تجاویز مکمل طور پر مسترد ہو جائیں۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے پرامن راستے تھے جموں کشمیر کا تنازعہ حل کرنے کے لیے جس میں ریاست کے عوام کی خواہشات کا مکمل خیال رکھا جاتا اور اظہار رائے کی آزادی کی یقین دہانی کروائی جاتی لیکن یہ دونوں ملکوں کی مرضی اور دوستی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ جموں کشمیر میں حالات بدل چکے تھے شیخ عبداللہ کی گرفتاری نے سب کو حیران کردیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے مئی 1949ء میں سرینگر میں پنڈت نہرو کو کہا تھا کہ ”میں چاہتا ہوں کہ آپ یقین کرو کہ جموں کشمیر آپ کا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی اور ہر کشمیری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ

ہندوستانی ہے اور ہندوستان اس کا وطن ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ، شیخ عبداللہ آزاد ریاست جموں کشمیر کا دعویٰ بھی کیا کرتا تھا اور دوسرے مواقع پر وہ اس خیال کو نا قابل عمل قرار دیا کرتا تھا۔ مارچ 1952ء میں شیخ عبداللہ نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ نہ ہندوستانی پارلیمنٹ نہ دنیا کی کسی اور پارلیمنٹ کو ریاست جموں کشمیر پر کوئی قانونی حق تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کو بھی ریاست کی ترقی کے بارے میں بولنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ چند دنوں کے بعد شیخ عبداللہ نے کہا تھا کہ ''جموں کشمیر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک پل تھا اور اسے متحد کر کے دوبارہ ایک ملک بنایا جا سکتا تھا'' اور دو دن کے بعد شیخ عبداللہ نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان اور جموں کشمیر کے تعلقات نا قابل جدا تھے اور دنیا کی کوئی طاقت ان تعلقات کو توڑ نہیں سکتی۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ نے ہندوستانی حکومت کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ جموں کشمیر کا وجود ہندوستان کی مالی امداد کا محتاج نہیں تھا اور نہ ہی تجارت اور دفاع میں ہندوستان کا محتاج تھا۔ شیخ عبداللہ نے کہا تھا کہ ہندوستان کی طرف سے ریاست کو دی جانے والی مالی امداد کو کسی غیر معمولی تعلق سے جوڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔ دھمکیاں اور دباؤ شیخ عبداللہ کو ہندوستان کا غلام نہیں بنا سکتیں۔

شیخ عبداللہ آہستہ آہستہ ریاست کو ہندوستان سے بہت دور لے گیا تھا۔ اس کے ایک سیاسی مخالف نے کہا تھا کہ شیخ عبداللہ کشمیر اور جموں میں کیمونسٹ تھا اور ہندوستان میں وہ ایک قوم پرست تھا۔ شیخ عبداللہ ایک وقت لڑاکا انقلابی لیڈر تھا تو دوسرے وقت میں وہ ایک موقع پرست تھا۔ کبھی وہ آمر بن جاتا تھا اور اپنی ہی چالوں اور پالیسیوں میں پھنس جاتا تھا۔ مارچ 1948ء میں ریاست کے مہاراجہ ہری سنگھ کو کہا گیا تھا کہ وہ ایمرجنسی ریاستی انتظامیہ کو ختم کرے اور شیخ عبداللہ کو جموں کشمیر کا وزیر اعظم نامزد کرے۔ ریاستی اسمبلی تحلیل کر دی گئی تھی۔ مہاراجہ اس وقت بمبئی میں جبری جلاوطن تھا۔ مہاراجہ اس اقدام سے اپنے تمام اندرونی معاملات میں اختیارات سے محروم ہو گیا تھا۔ شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھی ریاست کے اصلی حکمران بن گئے تھے۔ شیخ عبداللہ کو کشمیر کے لوگ شیر کشمیر کے نام سے جانتے تھے اور ان کے لیے وہ ایک جمہوریت پسند اور سوشلسٹ لیڈر تھا۔ تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا شیخ عبداللہ کی

پالیسی اس کی جدید سیاسی تھیوری پر مسخ شدہ سایہ ڈالتی گئی۔ جموں کشمیر پر 1947ء کے حملے سے پہلے شیخ عبداللہ کا موقف یہ تھا کہ اس کی ریاست کو ڈوگروں سے آزادی ملے اور پھر ہندوستان اور پاکستان سے ریاست کا الحاق کا فیصلہ ہو۔

1948ء میں شیخ عبداللہ جموں کشمیر کا وزیر اعظم بن گیا تو اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے لوگوں کی مرضی اور خواہش کو قبول کرے گا۔ گو کہ شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھی ہندوستانی جمہوریہ کے اندر ہی ریاست کے لیے مراعات اور سپیشل حقوق لینے میں کامیاب ہو گئے تھے جو کسی دوسری ہندوستانی ریاست کو حاصل نہیں تھے۔ 1947ء میں جب شاہی ریاستوں نے ہندوستان سے الحاق کیا تھا تو ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کا وائسرائے ہونے کی حیثیت سے ریاستوں کو یقین دلایا تھا کہ ان کے پاس سارے اختیارات ہوں گے صرف خارجہ امور، دفاع اور کمیونیکیشن کے معاملات مرکزی حکومت کے حوالے کریں گے۔ جب مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست جموں کشمیر کا الحاق کیا تھا تو اس وقت الحاق کے کاغذات میں اس قانونی حیثیت کا تعین کیا گیا تھا۔ لیکن جلد ہی ان شاہی ریاستوں کے اختیارات ختم کر دیئے گئے تھے اور انہیں ہندوستانی یونین میں ضم کر دیا گیا تھا۔ تاہم ریاست جموں کشمیر نے ہندوستانی یونین میں ضم ہونے کی بجائے اپنی اندرونی خودمختاری برقرار رکھی تھی۔ دہلی میں سیاستدانوں نے شیخ عبداللہ کی آزادانہ ذہنیت اور اندرونی خودمختاری کے ایشو پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستانی مالی امداد سے جموں کشمیر کی حکومت سارے فوائد بھی حاصل کر رہی تھی اور گرانٹس بھی لے رہی تھی لیکن ہندوستانی تحفظ اور کنٹرول سے ریاست دور بھی ہوتی جا رہی تھی۔ ہندوستانی حکومت نے کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ شیخ عبداللہ کو قائل کریں کہ وہ بھی اپنی ریاست کے لیے وہی حیثیت قبول کرے جو باقی ہندوستانی ریاستوں کو ملی ہوئی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے تھے شیخ عبداللہ نے ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان میں ضم کرنے کی تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنی طاقت کو مزید اقتدار پر مضبوط کر لیا تھا۔

شیخ عبداللہ کے بارے میں یہ افواہیں پھیلائی گئی تھیں کہ وہ ریاست کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے کا منصوبہ بنا رہا تھا جس میں ریاست کے ہندوستان سے الحاق کو منظور

کروانے کی بجائے وہ وادی کشمیر کو آزاد ملک بنانے کا اعلان کرنے والا تھا۔ یہ بھی افواہ پھیلائی گئی تھی کہ امریکہ آزاد مختار وادی کشمیر کے خیال کا حمایتی تھا اور شیخ عبداللہ کی حوصلہ افزائی امریکی سفیر ایڈلائی سیٹونیسن (Adlai Stevenson) نے کی جب اس نے مئی 1953ء میں سرینگر کا دورہ کیا تھا اور یہاں تک کہا گیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کا بھی اس منصوبہ پر اتفاق ہو چکا تھا کہ وہ کشمیر وادی کو آزاد ملک بننے پر گارنٹی دینے کے لیے راضی ہو چکے تھے اور ریاست کے باقی علاقے دونوں کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں گے اور یہ تقسیم موجود جنگ بندی لائن کے مطابق ہی کر دی جائے گی۔ جبکہ ہندوستانی اور پاکستانی حکومتوں نے ایسی رپورٹس کی تردید کی تھی۔ امریکی سفیر نے بھی اس کی تردید کی تھی کہ وہ جموں کشمیر کے اندرونی معاملات میں کس قسم کی مداخلت کر رہے تھے۔ دراصل ہندوستان کی دائیں بازو کی ہندو انتہا پسند جماعتوں نے ایک مہم چلائی تھی کہ جموں کشمیر کو ہندوستان میں ضم کیا جائے اس مہم کا حصہ جموں کی ہندو انتہا پسند جماعت براجا پرشید بھی تھی اور جموں میں اس مہم کے دوران کافی زوردار اور پرتشدد کاروائیاں کی گئی تھیں جن میں پل اڑانے کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ شیخ عبداللہ نے اس پر دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ دائیں بازو کے انتہا پسندوں کی ان کاروائیوں نے ہندوستان اور جموں کشمیر کے تعلقات کی بنیادوں کو ہی ہلا کر رکھ دیا تھا اور شیخ عبداللہ نے اگست کے پہلے ہفتے میں ایسی حیران کن باتیں کی تھیں اور بیانات جاری کیے تھے کہ سب حیران رہ گئے تھے۔ شیخ عبداللہ نے کہا تھا ریاست کا الحاق ہندوستان سے جبراً ہوا تھا کیونکہ ہندوستان نے الحاق کے بغیر فوجی مدد دینے سے انکار کر دیا تھا اس وقت تک شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس میں دو گروپ واضع بن چکے تھے۔ بخشی غلام محمد نے شیخ عبداللہ کے بیان پر ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا کہ ریاست کے عوام اپنی زندگیوں پر کھیل کر ہندوستان سے ریاست کے الحاق کا دفاع کریں گے۔ شیخ عبداللہ نے دہلی معاہدہ کو وقتی اور عارضی قرار دیا تھا اور الحاق ہندوستان کو عارضی اور مشروط قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے ابھی تک ریاستی عوام نے منظور نہیں کیا اس لئے یہ اس وقت تک مشروط اور عارضی ہی رہے گا۔ شیخ عبداللہ نے یہ بھی کہا تھا کہ ریاست کی جغرافیائی حالت ایسی تھی کہ اس کی

خوشحالی دونوں ملکوں کے ساتھ تجارت سے وابستہ تھی۔ شیخ عبداللہ نے یہاں تک کہا کہ صرف ریاست کے مسلمانوں کو الحاق ہندوستان کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا غیر مسلم صرف ہندوستان کے علاوہ کسی اور آپشن کے لیے سوچتے تک نہیں تھے۔ بہر حال شیخ عبداللہ اب بدل چکا تھا شیخ عبداللہ کے مخالف گروپ نے ریاست کے صدر کو ایک میمورنڈم دیا تھا کہ اسمبلی کا ایمرجنسی اجلاس بلایا جائے۔ شیخ عبداللہ نے اجلاس بلانے سے انکار کر دیا تھا اور چھٹی گزارنے کے لیے گل مرگ چلا گیا تھا جو ایک سیاحت افزاء مقام تھا۔

9 اگست 1953ء کی صبح کے وقت مہاراجہ کے محل میں شیخ عبداللہ کے خلاف ایک ڈرامہ تیار کیا گیا تھا۔ صدر ریاست کرن سنگھ کو موقع مل گیا تھا کہ وہ اپنے باپ مہاراجہ ہری سنگھ کا شیخ عبداللہ سے بدلہ لے۔ مہاراجہ کو 1947ء میں شیخ عبداللہ نے جلاوطن کر دیا تھا۔ کرن سنگھ نے شیخ عبداللہ کو وزیراعظم کے عہدے سے برطرف کر دیا تھا اور بخشی غلام محمد کو ریاست کا وزیراعظم نامزد کر دیا تھا۔ شیخ عبداللہ کو گل مرگ کے سیاحتی مقام سے جیل پہنچا دیا گیا تھا۔ اب شیخ عبداللہ کا سیاسی عروج ختم ہو گیا تھا وہ قومی انقلابی لیڈر کی حیثیت سے ابھرنے والا اور شیر کشمیر کا خطاب حاصل کرنے والا عوامی پاپولر شیخ اچانک منظر سے غائب کر دیا گیا تھا۔ شیخ عبداللہ اپنے ہی تیار کردہ ساتھیوں کے ہاتھوں گائیل (زخمی) ہوا تھا جو اس کی جدوجہد کے دنوں کے ساتھی تھے۔ بخشی غلام محمد نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالتے ہی فوراً پالیسی بیان جاری کیا تھا کہ شیخ عبداللہ کی آزادی کشمیر کی پالیسی کو بڑی طاقتوں کی سازش قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ ایک آزاد اور خودمختار کشمیر جو سامراجی طاقت کے اثر ورسوخ میں ہوگا وہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے لیے ایک بڑا خطرہ ہوگا۔ شیخ کے منظر سے غائب ہو جانے سے کچھ لوگوں کے لیے حیرت اور کچھ لوگوں کے لیے خوشی کا باعث تھا۔ لیکن شیخ عبداللہ کشمیری بولنے والوں کا ابھی تک عظیم رہنما تھا اس کی گرفتاری پر سینکڑوں لوگ پولیس کے ہاتھوں مارے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں جیل گئے تھے۔

احتجاج کے دوران مارے جانے والوں کی تعداد 800 آٹھ سو افراد تک بتائی گئی تھی۔ بخشی غلام محمد نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے شیخ عبداللہ کے آمرانہ

ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اپنے مخالفین کو جیلوں میں ڈال دیا تھا۔نہرو یہ سب کچھ ہوتا ہوا دیکھ کر آنکھیں بند کر چکا تھا۔بخشی غلام محمد نے جب اپنی پوزیشن مضبوط کر لی تو اس نے ریاست کو ہندوستان میں ضم کرنے کے لیے آخری اقدامات کرنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ کرنے کے لیے اسے ریاست کی اسمبلی سے، ہندوستان سے الحاق کی منظوری لینی تھی اور جولائی 1952ء کا دہلی معاہدہ کو لاگو کرنا تھا جو شیخ عبداللہ نے کرنے کی کوشش کی تھی تو اس پر سبوتاژ کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ 6 فروری 1954ء کو بخشی غلام محمد دہلی والوں سے مشورہ کر کے واپس آیا تو اس کے بعد آئین ساز ریاستی اسمبلی نے ہندوستان سے الحاق کو دوبارہ منظور کیا تھا۔ریاستی اسمبلی کے 75 ممبران میں 64 جو اسمبلی میں موجود تھے نے مشترکہ ووٹ الحاق کی منظوری کے حق میں دیا تھا۔گیارہ اسمبلی ممبران غیر حاضر تھے جن میں 6 چھ کو جیلوں میں قید کیا گیا تھا۔اسمبلی کے اجلاس سے الحاق کی منظوری لینے کے بعد بخشی غلام محمد نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ریاست نے چھ سال پہلے ہی ہندوستان سے الحاق کر دیا تھا اور آج وہ ہندوستان کے ساتھ اس نا قابل جدا رشتے کا اسمبلی میں دوبارہ اعادہ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔بخشی کی تقریر کسی فاتح کی تقریر سے کم نہ تھی۔اسی اسمبلی کے اجلاس میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے دہلی اور سرینگر کی حکومتوں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے رپورٹ میں قوائد وضوابط پیش کیے تھے۔

رپورٹ میں کہا گیا کہ مرکزی حکومت کو اس قابل بنانا کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرے جو آئین کی روح سے اس پر عائد ہوتیں ہیں اور ہندوستانی آئین میں جو قانون یا کلاز ریاست پر لاگو کرنے ضروری ہوں انہیں ریاست پر لاگو کرنے کے قابل بنایا جائے اور مناسب اقدامات کیے جائیں۔ریاست کی اندرونی خودمختاری کو بحال رکھتے ہوئے باقی تمام ذمہ داریاں جو الحاق سے جڑی ہوئی ہیں یا جو دہلی معاہدے میں بیان ہوئی ہیں ہندوستان کے آئین کا مناسب حصہ بنا چاہیے۔اس رپورٹ کا عملی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ حکومت ہند نے کسٹم کی تمام رکاوٹیں ہٹا دیں تھیں اور جموں کشمیر معاشی لحاظ سے بھی ہندوستان کا اندرونی حصہ بن گئی تھی۔حکومت ہند نے سرینگر کی حکومت کو ہر سال دوملین روپے دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی

جو کسٹم ریونیو کے نقصان کو پورا کرنے کے لیے دیئے گئے تھے۔ایک ماہ بعد 14 مئی 1954ء کو ہندوستان کے صدر نے آئین کے آرٹیکل 370 کے تحت ایک آرڈر جاری کیا تھا جس میں دہلی اور سرینگر کے تعلقات کو اسی طرح قبول کیا گیا تھا جس طرح انہیں معاہدہ دہلی میں بیان کیا گیا تھا اور جس طرح سرینگر کی آئین ساز اسمبلی نے منظور کیا تھا۔اب ہندوستانی آئین کی بہت سی شقوں کا جموں کشمیر کی ریاست پر اطلاق کیا گیا تھا۔ریاست کی آئین ساز اسمبلی سے الحاق ہندوستان کی دوبارہ تصدیق کروانا اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی 30 مارچ 1951ء کی قرارداد کے بنیادی اصولوں کے خلاف عمل کیا گیا تھا اور یہ عمل 20 اگست 1953ء کے نہرو محمد علی معاہدے کے بھی خلاف تھا۔

ریاست جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے پاس یہ اختیار موجود ہی نہیں تھا کہ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کے الحاق ہندوستان کی تصدیق کرے۔ کیونکہ ریاستی اسمبلی نے عوام کی رائے لینے کے لیے اس ایشو پر کوئی ریفرنڈم نہیں کروایا تھا اور نہ ہی اسمبلی کے الیکشن کے دوران عوامی نمائندوں کا انتخاب ہندوستان سے الحاق کے مسئلے پر ریاستی شہریوں کی رائے پر کروایا گیا تھا۔اگر ریاستی عوام نے اپنے اسمبلی نمائندوں کو ووٹ دیتے وقت اس رائے کا اظہار کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے نمائندوں کو یہ اختیار بھی دیتے کہ وہ ریاست کا ہندوستان سے کیا گیا الحاق ان عوام کی خاطر دوبارہ تصدیق کردیں اور نہ ہی اسمبلی کے نمائندوں نے عوامی رائے عامہ کو اس مسئلہ پر ووٹ مانگا تھا نہ ہی اسمبلی میں اس ایشو کو عوام کے سامنے رکھ کر ووٹ مانگا تھا یہ اسمبلی ممبران نے ایک طرح سے اپنے عوام کو دھوکہ دیا تھا کیونکہ ووٹ تو عوام سے دوسرے مسائل کے حل کے وعدوں پر لیے تھے اور اسمبلی میں جا کر الحاق ہندوستان کی تصدیق کردی جو کسی بھی حوالے سے جائز اقدام نہیں تھا۔اس کے علاوہ 20 اگست 1953ء میں نہرو اور محمد علی کے درمیان یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ دونوں ملک ریاست کا مسئلہ ریاستی عوام کی خواہشات اور ان کی مرضی سے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ حل کریں گے اور آپس میں بات چیت کے ذریعہ ریفرنڈم کے لیے پرامن حالات پیدا کریں گے ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظموں نے چار دنوں تک ریاست کے حوالے سے اور دیگر مسائل پر تفصیل سے

بات چیت کی تھی اور تمام مسائل مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے پر اتفاق ہوا تھا۔

30 مارچ 1951ء کی سیکیورٹی کونسل کی قرارداد کے خلاف یہ اقدام اس لئے تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اس قانون کو قبول کرلیا تھا جو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پاکستان اور ہندوستان نے اپنی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قراردادوں میں جموں کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے جو سفارشات اور تجاویز پیش کی تھیں اور سیکیورٹی کونسل کی قرارداد 14 مارچ 1950ء میں دونوں ملکوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا اور دوبارہ اپنی خواہش کی تصدیق بھی کی تھی کہ جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ جمہوری طریقہ سے کرایا جائے گا۔ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کروایا جائے گا۔ متعلقہ حکام اور تمام حکومتوں کو یہ یاددہانی کروائی جاسکتی تھی کہ اصولی طور پر یہ سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں کے مطابق جو 21 اپریل 1948ء، 3 جون 1948ء، 14 مارچ 1950ء اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی قراردادیں جو 13 اگست 1948ء، 5 جنوری 1949ء میں منظور کی گئی تھیں کے مطابق ریاست جموں کشمیر کا آخری اور حتمی فیصلہ ریاستی عوام کی آزادانہ رائے جو جمہوری طریقہ سے اقوام متحدہ کے تجویز کردہ استصواب رائے سے کروایا جائے گا۔ اب دونوں ملکوں نے پہلے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں قبول کیا تھا اور سیکیورٹی کونسل نے ایک طریقہ کار طے بھی کرلیا تھا کہ اس تنازعہ کو اس طرح حل کرنا تھا اب ریاستی اسمبلی کے ذریعہ اس تنازعہ کا حل تلاش کرنا اور وہ بھی یکطرفہ حل جو ہندوستان اور ایک ریاستی جماعت نیشنل کانفرنس کو پسند تھا اور وہ ریاست کے ایک حصے کے عوام پر مسلط کرنا کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اب سیکیورٹی کونسل نے یہ اعلان کیا تھا کہ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ ایسے تنازعات کا حل تلاش کرے اور بین الاقوامی امن اور سیکیورٹی کو قائم رکھے اور سیکیورٹی کونسل نے دونوں فریقوں کی مدد کی تھی اور اس جموں کشمیر کے تنازعے کا پُرامن حل نکالنے کے لیے سیکیورٹی کونسل نے اس کا جلد حل نکالنے کی کئی کوششیں کی تھیں تاکہ بین الاقوامی امن اور تحفظ کو قائم رکھا جائے۔

ریاست جموں کشمیر کی اسمبلی ایسی کوئی کوشش نہیں کرسکتی جس میں ریاست کے

مستقبل کے لیے کوئی حتمی حل کی کوشش کی جائے کیونکہ ایسا کرنا بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی اور سیکیورٹی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی قراردادوں کی بھی خلاف ورزی تصور کی جائے گی۔ کوئی ادارہ یا حکومت ریاست کے کسی ایک علاقہ کا حل تلاش کرے یا ساری ریاست کا فائنل حل نکالنے کی کوشش کرے وہ یکطرفہ تصور کیا جائے گا اور ریاستی عوام کی خواہشات اور اقوام متحدہ کے فیصلے کے خلاف اقدام ہوگا۔ ریاست کا مسئلہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ریفرنڈم میں طے کیا جائے گا۔

اقوام متحدہ کی قراردادیں دو طرح کی ہیں۔ قراردادوں کا ایک حصہ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں پیش کی گئی قراردادیں تھیں اور منظور کی گئیں تھیں اور دوسرا حصہ سیکیورٹی کونسل کے کمیشن نے پیش کی تھیں اور منظور کی تھیں۔ سیکیورٹی کونسل کا تشکیل کیا گیا کمیشن کا نام UNCIP تھا کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان تھا۔ سیکیورٹی کونسل اقوام متحدہ کا با اختیار ادارہ ہے۔ اس ادارے کی قراردادوں کی نوعیت اس کے چارٹر اور چیپٹر کے حساب سے اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ سیکیورٹی کونسل کی قراردادیں ممبر ممالک کے تنازعات کی نوعیت اور تنازعہ کی درجہ بندی کے حساب سے درج کروائی جاتیں ہیں۔ جس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ جموں کشمیر کے تنازعہ کے حوالے سے جو قراردادیں ہیں وہ زیادہ تر اقوام متحدہ کے چارٹر کے چیپٹر (6) چھ کے تحت درج کروائی گئیں شکایات ہیں اور ان کی نوعیت اخلاقی ہے اور دونوں فریقوں کی رضامندی سے تنازعہ کا حل پیش کرتیں ہیں۔ اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان سیکیورٹی کونسل کے ممبران کا تشکیل دیا گیا ذیلی ادارہ ہوتا ہے اس کی طرف سے پیش کی گئیں قراردادوں کی نوعیت سفارشات اور گزارشات کا درجہ ہی رکھتیں ہیں اس ادارے کی حیثیت بھی عارضی نوعیت کی تھی کیونکہ سیکیورٹی کونسل نے یہ کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کا ادارہ جموں کشمیر میں استصواب رائے کروانے کے لیے تشکیل دیا تھا اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد اس ادارہ کا جواز بھی ختم ہو جاتا ہے ریاست جموں کشمیر کے حوالے سے سیکیورٹی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن میں جو قراردادیں ہیں ان کا متن حسب ذیل ہے۔

1۔ سیکیورٹی کونسل کی قرارداد 21 اپریل 1948ء

جموں کشمیر کے تنازعہ سے متعلق ہندوستان کی شکایت کو تفتیش کے لیے شامل کر لیا گیا تھا۔ ہندوستانی نمائندے کی بات ہی اس شکایت کی حمایت میں سنی گئی اور پاکستانی نمائندے کا جواب اور اس کے بارے میں جوابی شکایات بھی سنی گئی تھیں۔ اس پر ہماری (سیکیورٹی کونسل) یہ مضبوط رائے ہے کہ جموں کشمیر میں جلدی سے جلدی امن وامان بحال کرنا ضروری ہے اور ہندوستان اور پاکستان کو فوراً ہر طرح کی لڑائی روک دینی چاہیے۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کی خواہش ہے کہ جموں کشمیر کا الحاق کا سوال ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ جمہوری طریقہ سے آزادانہ استصواب رائے سے طے کیا جائے۔ (سیکیورٹی کونسل) اس مسئلہ کو جاری رکھنا بین الاقوامی امن اور سیکیورٹی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ 17 جنوری کو قرارداد کی دوبارہ تصدیق کرتے ہوئے یہ طے کیا جاتا ہے کہ 20 جنوری 1948ء کی سیکیورٹی کونسل کی قرارداد میں کمیشن کے ممبران کی تعداد میں اضافہ کر کے 5 کی جائے اور اس قرارداد میں جتنی ممبر شپ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے علاوہ ممبران کو بھی شامل کیا جائے اگر کمیشن کے ممبران کی تعداد 10 دنوں کے اندر مکمل نہ کی گئی جس دن سے یہ قرارداد منظور کی گئی تھی تو سیکیورٹی کونسل کا صدران ممبران کو نامزد کرے گا جس طرح اقوام متحدہ کی ضرورت ہے کہ وہ 5 ممبران کی تعداد مکمل کرے۔ سیکیورٹی کونسل کمیشن کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کی طرف سفر کرے اور وہاں اپنا آفس قائم کرے۔ صلح کاری کا کام حکومت ہندستان اور پاکستان کے مطابق کرے اور ان کی مدد کرے تا کہ ضروری اقدامات کیے جائیں۔ امن وامان بحال کیا جائے تا کہ دونوں ملک استصواب رائے کروانے میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور کمیشن سے تعاون کریں۔ کمیشن کو ہدایت دی جائے کہ وہسیکیورٹی کونسل کو مطلع کرے اور اس عمل کے بارے میں جو قرارداد کے مطابق کیا گیا تھا۔ اس وقت تکسیکیورٹی کونسل ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے یہ سفارشات پیش کرتی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل اقدامات کریں اور سیکیورٹی کونسل کے اندر جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ لڑائی

رکوائی جائے اور آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے لیے خاص قسم کا ماحول پیدا کریں تاکہ یہ فیصلہ ہو سکے کہ ریاست کے لوگ ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کریں گے۔

a۔امن وامان کی بحالی

i۔ حکومت پاکستان کو اپنی پرفارمنس کے لیے بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور مندرجہ ذیل چیزوں پر عمل کرنا چاہیے۔ پاکستان کو جموں کشمیر سے قبائلیوں اور اپنے شہریوں کو نکالنے کا بندوبست کرنا ہوگا جو وہاں کے رہائشی نہیں تھے اور ریاست میں لڑنے کے مقصد کے لیے داخل ہوئے تھے اور ایسے عناصر کو ریاست میں داخل ہونے سے روکے اور ایسے عناصر کی مادی مدد کو بھی روکے جو ریاست میں لڑ رہے تھے۔

ii۔ ایسے اقدامات کرے جو سب کو معلوم ہوں اور تمام ریاستی شہریوں کو اس پیراگراف میں مکمل آزادی مہیا کی گئی ہے چاہے ان کا عقیدہ ,ذات اور پارٹی کوئی بھی ہو اور چاہے وہ کیسے ہی نظریات اور خیالات کا اظہار کرتے ہوں اور وہ ریاست کے الحاق کے سوال پر ووٹ دیں گے اور ریاست میں امن وامان بحال کرنے میں تعاون کریں۔

2۔ حکومت ہندوستان کو چاہئے کہ

(a)۔ جب اقوام متحدہ کا کمیشن 20 جنوری 1948ء کی قرارداد کے مطابق قائم کر دیا جائے اور اطمینان ہو جائے کہ قبائلی ریاست سے نکل رہے ہیں اور لڑائی روکنے کا بندوبست عمل میں لایا جا چکا ہے تو وہ جموں کشمیر سے اپنی فوجوں کو نکالنے کا منصوبہ اقوام متحدہ کے کمیشن کے مشورے سے عمل میں لانے کی تیاری کرے۔ انہیں تعداد میں اس حد تک کم کر دے جو کم سے کم تعداد سویلین حکومت کی مدد کے لیے اور

امن وامان قائم کرنے کے لیے ضروری ہو۔

(b)۔ یہ یقین دہانی کرائی جائے کہ انڈین انخلا مختلف مراحل میں ہو رہا ہے اور ہر مرحلہ مکمل ہونے پر اس کا اعلان کیا جائے۔

(c)۔ جب ہندوستانی فوجیں اپنی کم سے کم تعداد میں رہ جائیں گی جو سیکشن (A) میں ذکر کیا گیا ہے تو باقی ماندہ فوجوں کی تعیناتی کا بندوبست کمیشن کے مشورے سے مندرجہ ذیل اصولوں کے مطابق کیا جانا چاہیئے۔

i۔ ان فوجوں کی موجودگی کسی قسم کے خوف کا باعث نہ بنے یا ریاستی شہریوں کے لیے اس فوج کی موجودگی کسی قسم کے خوف کا باعث نہ ہو۔

ii۔ کم سے کم تعداد میں جتنی فوج ممکن ہو سکے اگلے علاقوں میں تعینات رکھی جائے۔

iii۔ جو بھی ریزرو فوج کُل تعداد میں شامل ہوگی یہ ضروری ہے کہ اس کی جگہ موجودہ بیس(base) علاقہ ہی ہو۔

3۔ حکومت ہندوستان کو اس پر راضی ہونا چاہیئے کہ جس وقت تک استصواب رائے کا ایڈمنسٹریٹر ریفر (refer) کرتا ہے اور ضروری خیال کرتا ہے کہ سمت کے تعین کے لیے اس کا حکم ضروری ہے اور ریاستی فوجوں اور پولیس کی نگرانی کرتا ہے جو پیراگراف 8 میں اسے مہیا کی گئی ہیں یہ فورسز وہاں تعینات کی جائیں گی جہاں استصواب رائے کے ایڈمنسٹریٹر کی رضامندی ہوگی۔

4۔ جو منصوبہ پیراگراف (a)2 میں اوپر ذکر کیا گیا ہے اس پر عمل شروع ہو گیا ہے جو افراد مقامی سطح پر ہر ضلع سے فورسسز میں بھرتی کیے گئے ہیں وہ اب تک ممکن ہو جانا چاہیے کہ انہیں امن وامان کو دوبارہ بحال کرنے کے قابل ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور اقلیتوں کے تحفظ کے قابل بنایا جائے اور اس

طرح کی ضروری اور اہم ذمہ داریاں جو پیراگراف 7 میں استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر نے سپیشل بیان کیا ہے۔

5۔ اگر یہ مقامی فورسسز اپنے فرائض کے لیے نااہل پائی گئیں تو کمیشن حکومت ہندوستان اور پاکستان کو درخواست کرسکتا ہے کہ وہ ایسی فوجوں کا بندوبست کریں جو کسی بھی ڈومینین (Dominion) سے تعلق رکھتی ہوں اور انہیں استعمال کیا جائے اور جو اس خاص مقصد کے لیے استعمال کے قابل ہوں۔

b۔استصواب رائے:۔

6۔ حکومت ہندوستان وعدہ کرے اور یقین دہانی کروائے کہ جموں کشمیر کی ریاستی حکومت تمام بڑے سیاسی گروہوں کو دعوت دے گی اور ان کے ذمہ دار نمائندوں کو نامزد کرے گی جو درست نمائندے ہوں گے اور جو منسٹر کی سطح کے انتظامی امور چلائیں گے جبکہ استصواب رائے کی تیاری ہو چکی ہوں گی اور یہ مرحلہ مکمل ہو چکا ہوگا۔

7۔ ہندوستانی حکومت کو یہ ذمہ داری لینی ہوگی کہ جموں کشمیر میں استصواب رائے کروانے کے لیے کمیشن تشکیل دیا جائے گا جو جتنا جلدی ہو سکے ریاست میں اس سوال پر استصواب رائے کروائے کہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے ہو یا پاکستان سے۔

8۔ ہندوستانی حکومت کو یہ ذمہ داری قبول کرنا ہوگی کہ ریاستی حکومت استصواب رائے کرنے والے ایڈمنسٹریٹر کو ایسے اختیارات تقویض کرے گی جو وہ ضروری خیال کرے گا اس کے پاس ہوں جو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے لیے ضروری ہوں ان اختیارات میں ریاستی فوجوں اور پولیس کی نگرانی کرنا اور انہیں احکامات دینا بھی شامل ہے۔

9۔ حکومت ہندوستان کو استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر کی درخواست پر

ہندوستانی فوجوں کو بھی تیار رکھنا ہوگا اگر ایڈمنسٹریٹر کو اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے ان کی مدد درکار ہو تو یہ مہیا ہوں۔

10۔ (a) ہندوستانی حکومت کو اس بات پر رضا مندی ظاہر کرنا ہوگی کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا نامزد کیا ہوا ہی استصواب رائے کروانے والا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جائے گا۔

(b) استصواب رائے کروانے والا ایڈمنسٹریٹر ہی جموں کشمیر ریاست کی طرف سے ایک آفیسر کے طور پر کام کرے گا اور اس کے پاس اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنا مددگار نامزد کرے اور دیگر اہلکار ماتحت عملہ کو نامزد کرے اور قوائد واضوابط ڈرافٹ کرے جو استصواب رائے کروانے کی شرائط طے کرے۔ ایسی نامزدگیاں پہلے سے ہونی چاہئے اور ایسے ڈرافٹ کیے گئے قواعد وضوابط پہلے سے نافذ ہونے چاہئیں اور جموں کشمیر کی ریاست کی طرف سے ہوں گے۔

(c) ہندوستانی حکومت کو چاہیے کہ وہ ذمہ داری لے کہ جموں کشمیر کی حکومت ایسے اہلیت والے افراد کی تقرری کرے گی جو استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر نے نامزد کیے ہوں گے جو سپیشل مجسٹریٹ کے طور پر فرائض سرانجام دیں گے جو ریاستی عدالتی نظام کے اندر ہوگا اور ایسے کیسز کی شنوائی کریں گے جو استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر کی رائے میں سنجیدہ لینا ضروری ہوگا کیونکہ یہ ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کروانے کے لیے اور اس کی تیاری کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔

(d) ایڈمنسٹریٹر کی خدمات کے لیے شرائط اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور حکومت ہندوستان کے درمیان الگ بحث ہونی چاہیے۔ ایڈمنسٹریٹر کو اپنے مددگاروں اور ماتحت عملے کی خدمات کی مدت کا تعین خود کرنا

ہوگا۔

(e) ایڈمنسٹریٹر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ براہِ راست ریاستی حکومت سے رابطہ رکھ سکے اور سیکیورٹی کونسل کے کمیشن سے بھی رابطہ کرسکتا ہے اور کمیشن کے ذریعہ سیکیورٹی کونسل سے حکومت ہندوستان اور حکومت پاکستان سے اور کمیشن میں ان کے نمائندوں سے بھی رابطے کرسکتا ہے۔

یہ اس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسی چیزوں کو بھی نوٹس میں لائے اور جو ایسا ماحول پیدا کررہی ہوں جو شاید اس کی رائے میں استصواب رائے کی آزادی میں مداخلت کا باعث بن سکتے ہوں۔

11۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو چاہیے کہ اس کی ذمہ داری لے اور اسے روکے اور ایڈمنسٹریٹر کو پوری حمایت دے اور اس کے سٹاف کو بھی کسی خطرے سے بچائے اور خطرات کو روکے، جبر اور تشدد، رشوت خوری اور دوسرے غیر ضروری اثرات سے ووٹروں کو بچائے تاکہ استصواب رائے پر اثر انداز نہ ہوں اور ہندوستانی حکومت کو رائے عامہ کے سامنے یہ اعلان کرنا چاہیے اور ریاستی حکومت کو بھی اعلان کروانا چاہیے کہ یہ بین الاقوامی ذمہ داریاں تمام پبلک حکام اور جموں کشمیر کے سرکاری اہلکاروں کو پوری کرنی ہوں گی۔

12۔ حکومت ہندوستان کو خود اور ریاستی حکومت کے ذریعہ یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ریاست جموں کشمیر کے تمام شہری چاہے ان کا مذہب، فرقہ، ذات یا پارٹی کچھ بھی ہو وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں آزاد ہوں گے اور ریاست کے الحاق کے سوال پر ووٹ دینے میں بھی (فری) آزاد ہوں گے اور انہیں پریس کی آزادی ہوگی، تقریر وتحریر کی آزادی، اسمبلی کرنے کی آزادی اور ریاست میں سفر کرنے کی آزادی ہوگی اس میں قانونی طور پر داخلہ اور باہر جانے کی آزادی ہوگی۔

13۔ ہندوستانی حکومت کو چاہیے کہ وہ اس چیز کی گارنٹی دے اور ریاستی حکومت بھی اپنی

بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور تمام ہندوستانی شہریوں کا ریاست سے انخلاء کرے سوائے ان کے جو یہاں رہائش پذیر ہیں اور جو 15 اگست 1947ء کو ریاست میں قانونی مقاصد کے لیے داخل ہوئے تھے۔

14۔ ہندوستانی حکومت گارنٹی دے کہ ریاستی حکومت تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرے اور اس سلسلے میں تمام اقدامات کرے تاکہ

(a): ریاست کے تمام شہری جو گڑبڑ کی وجہ سے ریاست چھوڑ گئے تھے انہیں واپسی کی دعوت دی جائے اور وہ اپنے گھروں کو واپس آنے کے لیے آزاد ہیں۔ ایسے شہری ہونے کے ناطے وہ اپنے حقوق کا استعمال کریں۔

(b): جنہیں کوئی تنگ نہ کرے۔

(c): ریاست کے تمام حصوں میں اقلیتوں کو مناسب تحفظ فراہم کیا جائے۔

15۔ سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کو چاہیے کہ استصواب رائے کے آخر میں سیکیورٹی کونسل کو اس بات کی تصدیق کرے کہ آیا استصواب رائے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ تھا یا نہیں۔

C:۔ General Provision: جنزل پرویژن: عام قانونی بندوبست:

16۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو دعوت دی جائے کہ وہ اپنا اپنا نمائندہ نامزد کریں جو کمیشن کے ساتھ منسلک ہو اور کمیشن کی ایسی مدد کرے جو اس کے فرائض کی انجام دہی کے لیے ضروری ہو۔

17۔ کمیشن جموں کشمیر میں ایسے مبصروں کو تعینات کرے جو ایسی کاروائیوں کے لیے ضروری ہوں جو اوپر والے پیراگراف میں ذکر کی گئیں ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے ایسے اقدامات کی ضرورت ہو۔

18۔ سیکیورٹی کونسل کے کمیشن کو جو فرائض اور ذمہ داریاں دی گئیں ہیں وہ انہیں پورا کرے۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی قراردادیں:۔

13 اگست 1948ء کی کمیشن کی قرارداد:۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان نے بڑی احتیاط سے ان خیالات پر غور وخوض کیا ہے جن پر ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں نے جموں کشمیر کی صورتحال پر اظہار خیال کیا ہے اور اس کے متعلق یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ فوراً لڑائی کو روکا جائے، ان حالات کی درستگی کی جائے جن کے جاری رہنے سے عالمی امن اور سیکیورٹی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور ان کوششوں کے ذریعہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی مدد کرتے ہوئے اس صورتحال کو آخری حل کی طرف لے جانا اور آخری حل لاگو کرنے میں مدد دینا۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو اکٹھے ہی مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی جاتیں ہیں

پارٹ نمبر 1 (Part-1)

جنگ بندی کا حکم: Cease Fire Order

a۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی اس پر رضا مندی ہے کہ دونوں ملکوں کی اعلیٰ قیادت الگ الگ اور اکٹھے جنگ بندی کا حکم جاری کریں گے یہ حکم ان تمام فوجوں اور قوتوں پر لاگو ہوگا جو ان دونوں ملکوں کے کنٹرول میں ہیں اور جموں کشمیر میں موجود ہیں جو بھی فوری تاریخ ہو جس پر عمل کیا جائے اور آپس میں باہمی رضا مندی سے دونوں حکومتوں نے ان تجاویز کے قبول کرنے کے چار دنوں کے بعد رضا مندی ظاہر کی ہو۔

b۔ ہندوستان اور پاکستان کی اعلیٰ فوجی قیادت رضا مند ہے کہ وہ ایسے اقدامات سے باز رہیں گے جس سے ان کے کنٹرول میں جموں کشمیر میں فوجوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔

c۔ ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کے کمانڈر ز انچیف فوراً ایک دوسرے سے مشورہ کریں اگر کوئی مقامی سطح پر ضروری تبدیلی رونما ہوئی ہو جو موجودہ صورتحال میں جنگ بندی میں مدد دے۔

d۔ کمیشن کا یہ فیصلہ کرنے کا حق اور کمیشن شاید اسے بہتر سمجھے کہ وہ فوجی مبصرین کا تقرر کرے گا جو کمیشن کی اتھارٹی کے کنٹرول میں اور دونوں فوجوں کی کمانڈ کے تعاون سے جنگ بندی لائن کی نگرانی کریں گے۔

e۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اس پر رضا مندی کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ اپنے عوام سے اپیل کریں گی کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرنے اسے قائم رکھنے میں مدد کریں جو ماحول مستقبل میں مزید مذاکرات کے حق میں ہو۔

پارٹ-II(Part-II)

معاہدہ جنگ بندی:۔

دونوں ملک فوراً جنگ بندی کی تجویز کو قبول کرتے ہیں جس طرح کی تجویز پارٹ I میں بیان کی گئی ہے۔ دونوں حکومتیں مندرجہ ذیل اصولوں کو قبول کرتی ہیں جو جنگ بندی معاہدہ کی بنیاد بنے جس کی تفصیل دونوں حکومتوں کے نمائندوں اور کمیشن کے درمیان بحث کے دوران طے ہوں گی۔

A۔ جیسا کہ پاکستانی فوجوں کی جموں کشمیر کی سرزمین پر موجودگی مادی صورتحال میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے جس طرح حکومت پاکستان نے

پہلے سیکیورٹی کونسل کے سامنے صورتحال پیش کی تھی اور حکومت پاکستان رضا مندی ظاہر کرتی ہے کہ وہ ریاست سے اپنی فوجوں کا انخلاء کرے گی۔

B۔ حکومت پاکستان اپنی بہترین کوشش کرے گی کہ وہ اپنی فوج کا جموں کشمیر سے انخلاء کرے گی، قبائلیوں اور پاکستانی شہریوں کو ریاست سے نکالے گی جو یہاں کے رہائشی نہیں ہیں اور یہ ریاست میں لڑنے کے لیے داخل ہوئے تھے۔

C- جب تک اس مسئلہ کا آخری حل کا انتظار ہے اس وقت تک جو علاقہ پاکستانی فوج خالی کرے گی وہ کمیشن کی زیرنگرانی مقامی حکام کے انتظامی کنٹرول میں دیا جائے گا۔

D۔ جب کمیشن ہندوستانی حکومت کو مطلع کرے گا کہ قبائلی اور پاکستانی شہری جن کا ذکر پارٹ-II ,A ,2 میں کیا گیا ہے وہ انخلاء کر چکے ہیں جو صورتحال ہندوستانی حکومت نے سیکیورٹی کونسل میں پیش کی تھی وہ ختم ہو چکی ہے اور ہندوستانی فوجوں کو جموں کشمیر میں موجودگی کا جو موقع ملا تھا اور مزید یہ کہ پاکستانی فوجوں کا جموں کشمیر سے انخلاء ہو چکا تھا اور اب ہندوستانی حکومت راضی ہے کہ وہ اپنی فوجوں کا ایک بڑا حصہ ریاست سے مرحلہ وار نکالنا شروع کرے گی جس طرح کمیشن سے طے پائے گا۔

2۔ جس طرح ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کا آخری حل کے لیے انتظار کیا جا رہا ہے تاکہ شرائط قبول کی جائیں اس وقت تک ہندوستانی حکومت جو جنگ بندی لائن اس وقت موجود ہے وہ اپنی فوجوں کی کم سے کم تعداد قائم رکھے گا جو کمیشن کے ساتھ سمجھوتے میں ضروری خیال کیا گیا تھا کہ (لوکل اتھارٹی) مقامی حکام کو امن وامان پر نظر رکھنے میں مدد دے گا۔ کمیشن اپنے مبصرین تعینات کرے گا جہاں بھی اسے

ضروری لگا۔

3۔ ہندوستان کی حکومت وعدہ کرے گی کہ وہ یقین دہانی کرواتی ہے کہ حکومت جموں کشمیر وہ تمام اقدامات کرے گی جو اس کے اختیار کے اندر ہوں گے۔ یہ رائے عامہ کے علم میں لایا جائے گا کہ امن اور قانون کا تحفظ کیا جائے گا اور تمام انسانی اور سیاسی حقوق کی گارنٹی دی جائے گی۔

c۔ جنگ بندی معاہدے کی ساری تحریر جس پر دستخط ہیں یا ایک مراسلہ جو ان اصولوں پر مبنی ہو جو دونوں حکومتوں اور کمیشن کے درمیان قبول کیا گیا ہو عوام میں عام کیا جائے گا۔

پارٹ Part-III(III)

حکومت ہندوستان اور حکومت پاکستان اس خواہش کی دوبارہ تصدیق کرتے ہیں کہ جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ اور اس کا تعین عوام کی مرضی کے مطابق کیا جائے گا اور آخر میں جب جنگ بندی کا معاہدہ قبول کر لیا جائے گا تو دونوں حکومتیں راضی ہیں کہ وہ کمیشن سے مشاورت میں اس بات کا تعین کرے گی کہ کیا معقول اور مناسب شرائط پوری ہو چکی ہیں جہاں اظہار رائے کی آزادی کی یقین دہانی ہوتی ہو۔

5 جنوری 1949ء کی کمیشن کی قرارداد:۔

اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان نے حکومت ہندوستان اور حکومت پاکستان سے 23 دسمبر اور 25 دسمبر 1948ء کو موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق دونوں نے مندرجہ ذیل اصولوں کو قبول کر لیا ہے جو کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد میں شامل تھے۔

1۔ ریاست جموں کشمیر کا الحاق کا سوال ہندوستان پاکستان کے ساتھ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے جمہوری طریقہ سے طے کیا جائے گا۔

2۔ استصواب رائے اس وقت کروایا جائے گا جب کمیشن کو لگے گا کہ جنگ بندی اور جنگ بندی کا معاہدہ کا اعلان پارٹ I اور پارٹ II کے مطابق ہوا اور کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرار لاگو کی گئی ہے اور استصواب رائے کروانے کا بندوبست مکمل کرلیا گیا ہے۔

3۔ اقوام متحدہ کا سیکرٹری جنرل کمیشن سے رضا مند ہوگا کہ استصواب رائے کروانے کے لیے ایک ایڈمنسٹریٹر کو نامزد کیا جائے جو بین الاقوامی رتبے والی شخصیت ہو اور عام بندے کے اعتماد پر پورا اترتا ہو۔ اس کا جموں کشمیر کی حکومت کی طرف سے آفس میں تقرر کیا گیا ہوگا۔

b۔ استصواب رائے کروانے کے لیے ایڈمنسٹریٹر کے لیے جو اختیارات ضروری ہوں گے وہ جموں کشمیر حکومت سے حاصل کرے گا انتظامی اور استصوراب رائے کا بندوبست کرنے کے لیے اسے یقین دہانی کروانا ہوگی کہ استصواب رائے کے لیے آزادی اور غیر جانبداری کا ماحول موجود ہے۔

c۔ استصواب رائے کروانے والے اڈمنسٹریٹر کے پاس (مددگار سٹاف) یا ماتحت عملہ مدد کے لیے تعینات کرنے کا اختیار ہو اور مبصرین کی بھی شاید ضرورت ہو۔

4 (a): کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کا پارٹ I اور پارٹ II کے لاگو ہونے کے بعد اور جب کمیشن کو اطمینان ہو جائے کہ ریاست میں پرامن حالات بحال ہو چکے ہیں تو کمیشن اور استصواب رائے کروانے والا ایڈمنسٹریٹر یہ تعین کریں گے حکومت ہندوستان کے مشورے سے ہندوستانی فوج اور ریاستی فوج کی آخری تعیناتی کیسے ہو اور یہ تعیناتی ریاست کے تحفظ اور آزادانہ استصواب رائے کے لیے ہوگی۔

b۔ جس علاقے کا ذکر A-2 کے پارٹ II میں کیا گیا ہے جو 13 اگست کی

قرارداد میں فوجوں کی آخری تعیناتی کا تعین اس علاقے میں کمیشن اور استصواب رائے کروانے والا ایڈمنسٹریٹر مقامی حکام کے صلاح ومشورے سے کریں گے۔

5۔ تمام سول اور فوجی حکام جو ریاست کے اندر موجود ہیں اور اعلیٰ سیاسی عناصر جو خود ریاستی ہیں ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ استصواب کروانے والے ایڈمنسٹریٹر سے استصواب رائے کی تیاری میں تعاون کریں۔

6 (a): تمام ریاستی شہری جو ریاست کو گڑبڑ کی وجہ سے چھوڑ گئے تھے انہیں واپسی کی دعوت دی جائے گی اور انہیں واپس آنے کی آزادی ہوگی اور شہری ہونے کے ناطے وہ اپنے تمام حقوق کا اظہار کریں گے۔ تمام ریاستی شہریوں کو واپسی میں مدد کے لیے دو کمیشن مقرر کیے جائیں گے جن میں ایک ہندوستان کا نامزد کیا ہوگا اور دوسرا پاکستان کی طرف سے نامزد کیا ہوا ہوگا۔ کمیشن اپنا کام استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر کی ماتحتی میں اپنے فرائض سرانجام دے گا۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے علاوہ ریاست کے اندر کام کرنے والے تمام حکام استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر سے تعاون کریں گے اس قانون کو لاگو ہوتے ہی یہ تعاون شروع کریں گے۔

b۔ وہ تمام افراد جو 15 اگست 1947ء کو ریاست کی سرزمین میں داخل ہوئے اور قانونی مقاصد کے بغیر دخل ہوئے تھے وہ ضروری ہے کہ ریاست سے نکل جائیں۔

7۔ ریاست جموں کشمیر کے تمام حکام اس کی گارنٹی دیں گے کہ وہ استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر سے تعاون کریں گے جن کے تعاون کی نوعیت مندرجہ ذیل ہوگی۔

a۔ استصواب رائے میں حصہ لینے والے ووٹرز کے لیے کوئی خطرہ، کوئی جبر، خوف اور رشوت وغیرہ یا دیگر غیر ضروری اثر ورسوخ استعمال نہیں کیا

جائے گا۔

b۔ ساری ریاست میں جائز سیاسی سرگرمیوں پر کوئی قدغن نہیں لگائی جائے گی۔ تمام ریاستی (شہری) باشندے چاہے ان کا مذہب، ذات یا سیاسی پارٹی کوئی بھی ہو وہ محفوظ ہوں گے اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے آزاد ہوں گے اور الحاق کے سوال پر کہ آیا ریاست ہندوستان یا پاکستان کا حصہ بنے گی۔ پریس کی آزادی ہونی چاہیے اور تقریر اور اکٹھا ہونے کی آزادی اور ریاست میں سفر کرنے کی آزادی جس میں قانونی طور پر ریاست میں داخلہ اور چھوڑنا بھی شامل ہے۔

c۔ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے گا۔

d۔ ریاست کے سارے حصوں میں اقلیتوں کو معقول تحفظ فراہم کرنا۔

e۔ کسی قسم کا جبر وتشدد نہیں ہوگا۔

8۔ استصواب رائے کروانے والا ایڈ منسٹریٹر اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان سے ایسے مسائل کا ذکر کرے جس میں اسے شاید مدد درکار ہو اور کمیشن اپنے اختیارات کے مطابق استصواب رائے کروانے والے ایڈ منسٹریٹر سے کہہ سکتا ہے کہ اپنی ذمہ داریاں اس کے ایماء پر سرانجام دے جو اس کو تفویض کی گئی ہیں۔

9۔ استصواب رائے کے آخر میں استصواب رائے کروانے والا ایڈ منسٹریٹر نتائج کی رپورٹ کمیشن کو کرے گا اور جموں کشمیر حکومت کو بھی رپورٹ کرے گا۔ تب کمیشن سیکیورٹی کونسل کو تصدیق کرے گا کہ آیا استصواب رائے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوا کہ نہیں ہوا۔

10۔ جنگ بندی معاہدہ پر دستخط ہو جانے کے بعد اوپر بیان کی گئی تجاویز کی تفصیل پر کام کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے ساتھ شامل پارٹ III کے ساتھ ملا کر بیان کیا جائے گا۔ استصواب رائے کروانے والا ایڈ منسٹریٹر اس مشاورت میں پوری طرح شامل ہوگا۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی تعریف کی گئی ہے کہ

انہوں نے جنگ بندی کے حوالے سے فوراً عمل کیا ہے جو یکم جنوری 1949ء کی آدھی رات کو لاگو ہو جائے گی یہ کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے معاہدے کے مطابق ہی عمل کیا گیا ہے۔ برصغیر کے مستقبل کی طرف سے فوراً عائد کی گئی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے جو اس پر 13 اگست 1948ء کی قرارداد نے ڈالی ہیں اور جو اوپر بیان کیے گئے اصولوں کے مطابق ہیں۔

14 مارچ 1950ء کی سیکیورٹی کونسل کی قرارداد:۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی طرف سے موصول کی گئی رپورٹس کو دیکھتے ہوئے جو 20 جنوری اور 21 اپریل 1948ء کی قراردادوں نے تشکیل دیا ہے۔ A.G.L. مکیناٹن کی طرف سے موصول ہونے والی رپورٹس کے مطابق اس کی ہندوستانی اور پاکستانی نمائندوں کے ساتھ بحث کے نتیجہ میں جو فیصلے اس سلسلے میں سیکیورٹی کونسل نے 17 دسمبر 1949ء میں لئے تھے وہ بھی اس (قرارداد) کے مطابق شروع کیے گئے تھے۔ ہندوستانی اور پاکستان کی حکومتوں کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے دانشمندانہ اقدامات کیے ہیں اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قرار دادوں کے مطابق سمجھوتے پر پہنچنے کے لیے اور جنگ بندی کے لیے اور جموں کشمیر سے فوجوں کے انخلاء کے لیے اور ریاست کے آخری حل کے لیے جو لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو اور جمہوری طریقے سے ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ طے کیا جائے اور ان فریقوں کی کوششوں کو سراہا گیا جنہوں نے قراردادوں کے کچھ حصوں کو لاگو کرنے میں عملی کردار ادا کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ لڑائی کو روکنا جو یکم جنوری 1949ء سے لاگو ہوئی تھی۔

۲۔ 27 جولائی کو جنگ بندی لائن کو تشکیل دینا۔

۳۔ اس پر سمجھوتہ کرنا کہ فلیٹ ایڈمرل چسٹر استصواب رائے کروانے والا ایڈمنسٹریٹر ہوگا۔

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ قرار داد میں بہت مشکلات ہیں اس کی بنیاد معقول اقدامات پر ہونی چاہیے جو بنیادی اصولوں پر رضامندی پہلے ہی حاصل کر لی گئی ہے اور ریاست کو غیر فوجی علاقہ بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں اور اس کے مستقبل کا فیصلہ کا تعین اس کے عوام کی آزادانہ خواہش کے مطابق ہونا چاہیے۔

1۔ ہندوستان اور پاکستاان کی حکومتوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ فوراً کسی تعصب کے بغیر اور ان کے حقوق اور دعوؤں کے ساتھ بندوبست کریں، جو امن وامان کی ضروریات کے مطابق ہوں اس قرارداد کی تاریخ کے 5 ماہ کے اندر اس کی تیاری کریں اور اس پر عمل کریں جو پروگرام غیر فوجی علاقہ قرار دینے کے اصول کی بنیاد جو پیراگراف 2 میں میکنائن کی تجویز میں بیان کیا گیا ہے یہ ان اصولوں میں تبدیلی کی جائے اگر باہمی دونوں کی رضامندی ہو تو اس تبدیلی کے بارے میں۔

2۔ یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اقوام متحدہ کا ایک نمائندہ مندرجہ ذیل مقاصد کے لیے مقرر کیا جائے جس کے پاس اختیار ہوتا کہ وہ اپنے فرائض سرانجام دے سکے ایسی جگہوں پر جو یہ مناسب سمجھتا ہو۔

a۔ یہ غیر فوجی علاقہ بنانے کے پروگرام کی تیاری میں مدد کرے اور اسے لاگو کرنے میں نگرانی کرے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور اس معاہدے کی تشریح کرے جو غیر فوجی علاقہ قرار دینے پر دو فریقوں کے درمیان ہوا ہے۔

b۔ اور اپنی خدمات ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی ایماء پر سرانجام دے اور ان حکومتوں کے سامنے اور سیکیورٹی کونسل کے سامنے ایسی تجاویز پیش کرے جو اس کی رائے میں تنازعے کے مستقل حل کے لیے فائدہ مند ہو سکتیں ہیں جو تنازعہ جموں کشمیر کے اوپر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان پیدا ہوا ہے۔

c۔ اپنے تمام اختیارات اور ذمہ داریوں کی سرانجام دہی کے لیے جو اقوام

متحدہ کے کمیشن نے اس پر ڈالی ہیں جس کی وجہ سیکیورٹی کونسل کی موجودہ قرار دادیں ہیں اور جس کی وجہ دونوں فریقوں کی رضامندی ہے جو اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قراردادوں کا حصہ ہے۔

d۔ مناسب مرحلہ پر غیر فوجی علاقہ بنانے کا بندوبست کرنا جو استصواب رائے کروانے والے ایڈمنسٹریٹر کے فرائض سرانجام دینے کے لیے کہا گیا ہے جو سمجھوتہ دونوں فریقوں کے درمیان طے ہوا ہے۔

e۔ سیکیورٹی کونسل کو رپورٹ کرنا جیسا کہ وہ اپنا نکالا ہوا نتیجہ کے مطابق اس کو داخل کرے اور ایسی سفارشات کرے جو اس کی خواہش کے مطابق ہوں۔

3۔ دونوں حکومتوں سے درخواست کرے کہ وہ تمام ضروری اقدامات کریں تاکہ ان کے درمیان جنگ بندی کے معاہدے اچھی طرح سے نگرانی کیے جائیں اور انہیں کہا جائے کہ وہ تمام ممکنہ اقدامات کریں جو معقول ماحول پیدا کرنے اور اسے قائم کرنے کی یقین دہانی کرواتے ہوں اور مزید مذاکرات کو پروموٹ کریں۔

4۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کے ممبران کا بہت شکریہ ادا کرے اور خاص کر جنرل AGL میکنائن کا جس کی سخت محنت کی وجہ سے ہی اس کا پھل ملا۔

5۔ اس پر رضامند ہے کہ اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کا خاتمہ کر دیا جائے اور یہ فیصلہ اس وقت کیا جائے جب ایک ماہ بعد دونوں فریق اقوام متحدہ کے نمائندے کو مطلع کر دیں کہ اسے اس کی ذمہ داریوں اور اختیارات سمیت جو اقوام متحدہ کے کمیشن نے اسے تفویض کر رکھی ہیں جن کا ذکر پیراگراف 2 میں اوپر C میں کیا گیا ہے۔

d۔ 30 مارچ 1951ء کی سیکیورٹی کونسل کی قرارداد:۔

سر اُون ڈکسن جو اقوام متحدہ کا نمائندہ برائے ہندوستان اور پاکستان ہے کی طرف سے موصول ہونے والی رپورٹ جو سیکیورٹی کونسل کی 14 مارچ 1950ء کی قرارداد کے بارے میں ہے جو مشن شروع کیا گیا تھا سیکیورٹی کونسل نے دیکھا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کا یہ اقدام قبول کرلیا ہے جو کمیشن کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء اور سیکیورٹی کونسل کی قرارداد 14 مارچ 1950ء کی قرارداد میں اس کی دوبارہ تصدیق کی گئی ہے کہ ان کی خواہش ہے کہ جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ جمہوری طریقہ کار سے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے سے طے کیا جائے گا جو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کروایا جائے گا۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ آل جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے 27 اکتوبر 1950ء کو ایک قرارداد منظور کی تھی جس کا مقصد جموں کشمیر کے مستقبل کی شکل اور تعلقات کا تعین کرنا ہو۔ دیکھا گیا ہے کہ ذمہ دار حکام کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے جو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا اور اس کی تجویز پیش کی گئی ہے اور جس علاقے سے یہ آئین ساز اسمبلی منتخب ہو گی یہ صرف ریاست جموں کشمیر کا ایک علاقہ ہی ہوگا۔ حکومتوں اور متعلقہ حکام کو یاددہانی کروائی جاتی ہے کہ جو اصول سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں 21 اپریل 1948ء، 3 جون 1948ء اور 14 مارچ 1950ء کا حصہ ہے اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی قراردادیں 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء جن میں کہا گیا ہے کہ جموں کشمیر کا حتمی فیصلہ اس کے عوام کی آزادانہ رائے سے جمہوری طریقہ کار کے ذریعہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے سے کیا جائے گا جو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کروایا جائے گا۔ آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کرنا اور اس کی تصدیق کرنا جس طرح آل جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے سفارش کی ہے اور یہ اسمبلی ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا تعین کرنے اور اس کا تعلق اور شکل طے کرنے کی کوشش کرے یا ریاست کے ایک

حصے یا ساری ریاست کا معاملہ طے کرے یہ ریاست کے مستقبل کا حتمی فیصلہ تصور نہیں کیا جائے گا جو اوپر اصول بیان کیے گئے ان کے مطابق بھی یہ آخری فیصلہ نہیں ہوگا۔ اپنے یقین کا اظہار کرتے ہوئے سیکیورٹی کونسل نے اعلان کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیکیورٹی کونسل کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ بین الاقوامی امن اور سیکیورٹی کے لیے فریقین کی مدد کرے تاکہ وہ جموں کشمیر کے تنازعہ کا پرامن حل تلاش کریں اور اس تنازعے کا فوری حل بین الاقوامی امن اور سیکیورٹی کے لیے بہت اہم ہے۔

اُون ڈکسن کی رپورٹ میں دیکھا گیا ہے جو اختلاف کے بڑے نقاط ہیں دونوں فریقوں کو کسی رضامندی سے روکتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

a۔ طریقہ کار اور غیر فوجی علاقہ بنانے کی حدود اور ریاست میں استصواب رائے کروانے کی تیاری کرنا۔

b۔ ریاستی حکومت کو کنٹرول کرنا اور اس کی سرگرمیوں کی حدود کا تعین کرنا تاکہ ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کروایا جائے۔

سیکیورٹی کونسل The Security Council

1۔ سر اُون ڈکسن کی درخواست کا جواب دیتے ہوئے سیکیورٹی کونسل نے اس کا استعفیٰ قبول کرلیا تھا اور اُون ڈکسن کی عظیم صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی خدمات کا شکریہ ادا کیا تھا کیونکہ اس نے اپنے آپ کو اس مشن کے ساتھ وقف کر دیا تھا۔

2۔ سیکیورٹی کونسل نے اُون ڈکسن کو اقوام متحدہ کا نمائندہ برائے ہندوستان اور پاکستان مقرر کروانے کا فیصلہ کیا تھا۔

3۔ اقوام متحدہ کے نمائندے کو ہدایت دی کہ وہ برصغیر کے دورے پر جائے اور ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے مشورہ سے جموں کشمیر کو غیر فوجی علاقہ بنائے جو اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قرار

دادوں کی بنیاد پر عمل درآمد کروائے۔

4۔ تنازعہ کے فریقوں سے درخواست کرے کہ وہ اقوام متحدہ کے نمائندے سے مکمل تعاون کریں ریاست کو غیر فوجی علاقہ بنانے کے سلسلہ میں۔

5۔ اقوام متحدہ کے نمائندے کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ سیکیورٹی کونسل کو اپنے برصغیر پہنچنے کے تین ماہ بعد رپورٹ کرے۔ اگر اسی رپورٹ کے وقت وہ غیر فوجی علاقہ بنانے کا نتیجہ نہ حاصل کرسکا جس کا ذکر اوپر پیراگراف 3 میں کیا گیا ہے یا فریقوں میں سمجھوتہ نہ کروا سکا جو غیر فوجی علاقہ بنانے کے منصوبے کا حصہ ہے تو اقوام متحدہ کے نمائندے کو چاہیے کہ وہ سیکیورٹی کونسل کو ان اختلافی نقاط کے بارے میں رپورٹ پیش کرے جو فریقین کے دومیان 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قراردادوں کی تشریح اوران پر عمل پیرا ہونے پر موجود ہیں اوراس کی رائے میں یہ حل ہونے ضروری ہیں تا کہ غیر فوجی علاقہ بنانے کا منصوبہ عمل میں لایا جائے۔

6۔ فریقین سے کہا گیا ہے کہ ان کی اقوام متحدہ کے نمائندے کے ساتھ جو بحث مباحثہ ہوا ہے اس میں ناکامی ہوئی جو مکمل سمجھوتے کی وجہ بنی جس میں ثالثی قبول کی گئی تمام اختلافی معاملات میں جو اقوام متحدہ کی نمائندے نے رپورٹ پیش کی جو پیراگراف 5 میں اوپر موجود ہے ایسی ثالثی ایک ثالث کے ذریعہ سرانجام دی جائے یا پینل کی ثالثی ہو جس کا ثالث انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے صدر کی طرف سے مقرر کیا جائے اور فریقوں کے مشورے سے کیا جائے۔

7۔ فیصلہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ کا فوجی مبصرین کا گروپ ریاست میں جنگ بندی کی نگرانی جاری رکھے گا۔

8۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس چیز کی گارنٹی دیں کہ ان کے درمیان جنگ بندی کے معاہدہ کی نگرانی یقین سے جاری رہے گی اوران سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ تمام ممکنہ اقدامات کریں جو معقول

ماحول پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی گارنٹی دیں تا کہ مزید مذاکرات کے لیے ماحول پیدا ہو سکے اور ایسے اقدام سے باز رہیں جو اس مسئلہ کے پرامن حل کو خطرہ میں ڈالے۔

9۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے نمائندہ برائے ہندوستان اور پاکستان کو ایسی خدمات اور سہولیات مہیا کرے جو اس قرارداد کو لاگو کرنے کے لیے ضروری ہوں۔

اقوام متحدہ کی تمام قراردادیں ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کا دوطرفہ حل تجویز کرتیں ہیں اور اس حل میں ریاستی عوام کو جو حق دیا گیا ہے وہ محدود کر دیا گیا ہے ریاست جموں کشمیر کے عوام کو یہ حق تو دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ استصواب رائے کے ذریعہ کریں لیکن انہیں حق خودارادیت نہیں دیا گیا بلکہ ریاستی عوام کے حق خودارادیت کی نفی کی گئی ہے اس لیے ریاست جموں کشمیر کے تنازعے کا دوطرفہ حل کی تجویز پیش کرنے سے اس مسئلے کی نیچر کو نظر انداز کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا کوئی حل نہیں نکل سکا کیونکہ اس مسئلہ کا حل سہ فریقی ہے جو تینوں فریقوں کی بات چیت سے حل ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆

گیارہواں باب

آزاد کشمیر حکومت کا قیام، کردار، معاہدہ کراچی اور گلگت بلتستان

آزاد کشمیر کے علاقے کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ اس میں مہاراجہ دور کا پرانا ڈسٹرکٹ میر پور اور پونچھ ڈسٹرکٹ کی پرانی دو تحصیلیں، سندھنوتی اور باغ اور کشمیر صوبے سے ضلع مظفر آباد کو 1947ء کے حملے میں الگ کیا گیا تھا۔ اس وقت میر پور کے تین (3) ڈسٹرکٹ، پونچھ کی دو تحصیلوں کے چار (4) ڈسٹرکٹ اور مظفر آباد کے تین (3) ڈسٹرکٹ بن چکے ہیں۔ اس وقت آزاد کشمیر کی آبادی (40) چالیس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اس خطے کا رقبہ 4471 مربع میل ہے جو ریاست جموں کشمیر کے کل رقبے کا 5% کے قریب بنتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے مظفر آباد کے علاقوں کے سوا جو اب تین ڈسٹرکٹ بن چکے ہیں باقی آزاد کشمیر کا سارا علاقہ جموں صوبے سے تعلق رکھتا ہے اور یہاں کی زبان پہاڑی، گوجری، ڈوگری یا پوٹھوہاری ہے۔ مظفر آباد کا علاقہ انتظامی لحاظ سے کشمیری صوبے کا حصہ ضرور رہا ہے لیکن اس خطے کی زبان بھی پہاڑی اور ہندکو ہے۔ انتظامی لحاظ سے آزاد کشمیر کے خطے کو تین ڈویژن میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مظفر آباد، پونچھ اور میر پور ڈویژن اور اس سے چھوٹا انتظامی یونٹ ڈسٹرکٹ ہے۔ اس سے نیچے تحصیلوں میں انتظامی یونٹ کو تقسیم کیا گیا ہے۔ ان علاقوں کو 1947ء میں

ریاست سے الگ کیا گیا تھا اور نیا حکومتی ڈھانچہ قائم ہوا تھا اس بٹوارے سے ریاست کے تین ٹکڑے ہو گئے تھے اور تینوں حصوں میں مختلف حکومتی سیٹ اپ قائم کیا گیا تھا ہندوستان کے زیر انتظام علاقوں کا سیٹ اپ 1974ء تک صدر ریاست اور وزیر اعظم اور ریاستی اسمبلی کے دو ایوان قائم کیے گئے تھے جبکہ تیسرے حصے گلگت بلتستان میں جو پاکستان کے زیر کنٹرول آیا تھا میں پرانا انتظامی ڈھانچہ قائم کیا گیا اور مہاراجہ دور کا صوبائی ڈھانچہ ختم کر کے پولیٹکل ایجنٹ کا نظام ایف۔سی۔آر۔ کے نظام کو بحال رکھا گیا تھا جسے بعد میں بدل دیا گیا تھا۔ آزاد کشمیر کے خطے میں بھی صدر، وزیر اعظم کے نظام کے تحت پارلیمانی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا تھا جو ایکٹ 74 جو 1974ء میں لایا گیا تھا جو ابھی تک قائم ہے۔ گو کہ آزاد کشمیر حکومت کا باقاعدہ اعلان پاکستانی حملے کے دو دن بعد کیا گیا تھا اس طرح 24 اکتوبر 1947ء کو ہی آزاد کشمیر حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا تھا جبکہ پاکستان نے 22 اکتوبر 1947ء کو حملے کے ذریعہ اس خطے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

24 اکتوبر کو جو حکومت آزاد کشمیر میں قائم کی گئی تھی اور جو حکومتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا تھا وہ ایک جنگی کونسل طرز کا ڈھانچہ تھا اور وار کونسل کی طرح کام کرتا تھا اس حکومتی ڈھانچہ کو چلانے کے لیے جو رولز بنائے گئے تھے جس کے تحت یہاں کے انتظامی امور چلائے جاتے تھے اس کے مطابق انتظامی اور قانونی اختیارات صدر آزاد کشمیر کے پاس تھے۔ 1948ء میں عدلیہ اور قانون کا نظام بنایا گیا تھا جو عدالتی انتظامیہ کو چلانے کے لیے عمل میں آیا تھا اور کچھ قوانین سابقہ جموں کشمیر ریاست کے جاری رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تاہم 1952ء میں یہ رولز تبدیل کیے گئے تھے۔ اس نظام میں انتظامیہ اور قانون ساز دونوں ادارے مہیا کیے گئے تھے۔ اس کے بعد 1957ء میں ایک بار پھر ان رولز میں تبدیلی کی گئی تھی۔ اس حکومتی نظام میں جو 1947ء سے 1960ء تک چلا تھا وہ شخص جو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اعتماد حاصل کرتا تھا اسے صدر آزاد کشمیر جموں کشمیر نامزد کیا جاتا تھا۔ شروع کے کئی سالوں میں سپریم ہیڈ کا آفس بھی قائم رہا جو آزاد کشمیر کے لیے قانون سازی کی اجازت دیتا تھا لیکن سپریم ہیڈ کا آفس 1952ء میں ختم کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد صرف صدر آزاد

کشمیر ہی انتظامیہ کا سربراہ ہوتا تھا جس کو کچھ وزراء کی مدد حاصل ہوئی تھی۔

1960ء میں صدارتی انتخابات کا نظام متعارف کروایا گیا تھا جو ووٹ اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت آزاد کشمیر کونسل کا ادارہ تشکیل دیا گیا تھا جس کا انتخاب بھی بنیادی جمہوریتوں کے تحت کیا جاتا تھا۔ یہ کونسل آزاد کشمیر سے 12 ممبران پر مشتمل ہوتی تھی جو آزاد کشمیر کے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے تھے اور 12 ممبرانِ کونسل مہاجرین جموں کشمیر کی طرف سے منتخب ہوتے تھے جو پاکستان میں مقیم تھے۔ 1964ء میں یہ نظام بھی تبدیل کردیا گیا تھا اور آزاد جموں کشمیر گورنمنٹ ایکٹ 1964ء کو عمل میں لایا گیا تھا اور سٹیٹ کونسل کے قانون میں ترمیم کی گئی تھی اور اس حد تک تبدیلی کی گئی تھی کہ 8 سٹیٹ کونسلرز کو آزاد جموں کشمیر کی بنیادی جمہوریتوں کے تحت انتخاب کیا جاتا تھا۔ 1965ء میں قانون بنایا گیا تھا کہ صدر آزاد کشمیر دو ممبران کو مہاجرین جموں کشمیر جو پاکستان میں مقیم تھے میں سے نامزد کرے گا۔ سٹیٹ کونسل کے چیئر مین کو 1964ء کے ایکٹ کے مطابق چیف ایڈوائزر ممبران میں سے نامزد کرے گا۔

1968ء میں آزاد جموں کشمیر گورنمنٹ ایکٹ 1968ء عمل میں لایا گیا اور 8 ممبران کا انتخاب کیا گیا تھا تاہم چار ممبران کو چیف ایڈوائزر مہاجرین جموں کشمیر مقیم پاکستان میں سے نامزد کرے گا۔ کونسل کے چیئر مین کا انتخاب کونسلروں کے ذریعہ کیا گیا تھا جو صدر کا عہدہ تھا یا آفیشل پوزیشن صدر کی طرح تھی۔ 1969ء میں عارضی حکومت کا نظام متعارف کروایا گیا تھا۔ 1970ء میں بڑی آئینی تبدیلیاں لائی گیں جب بالغ رائے دہی کا نظام اختیار کیا گیا تھا اور آزاد کشمیر میں ایک جمہوری سیٹ اپ متعارف کروایا گیا تھا جو ایکٹ 1970ء کے تحت متعارف ہوا تھا۔ اس نظام کے تحت پہلی بار آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی اور صدر آزاد کشمیر کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیا گیا تھا۔ ان کا انتخاب آزاد کشمیر کے عوام اور مہاجرین جموں کشمیر مقیم پاکستان کے ووٹوں سے کیا گیا تھا۔ یہ آزاد کشمیر کے عوام اور مہاجرین مقیم پاکستان کو پہلی بار ووٹ کا حق دیا گیا تھا۔ اسمبلی 24 منتخب اراکین پر مشتمل تھی اور ایک عورت اسمبلی ممبران کی طرف سے نامزد کی گئی تھی۔ یہ صدارتی نظام (4) چار سال تک کام کرتا

رہا تھا جب تک 1974ء میں آزاد کشمیر میں عبوری ایکٹ 1974ء کے تحت پارلیمانی نظام حکومت متعارف کروایا گیا تھا جو اس وقت تک 18 ترامیم کے مراحل سے گزر چکا ہے۔ 1974ء کے ابتداء میں اسمبلی 40 اراکین پر مشتمل تھی جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ہوتے تھے اور دو عورتوں کو اسمبلی کے ممبران منتخب کرتے تھے جبکہ اب اسمبلی 41 اراکین پر مشتمل ہے جو منتخب ہوتے ہیں اور 8 ممبران کو اسمبلی منتخب کرتی ہے جس میں 5 عورتیں ہیں ان میں سے ایک سیٹ علماء اور مشائخ کی اور دوسری سیٹ ٹیکنوکریٹ کی ہے اور ایک سیٹ جموں کشمیر کے اورسیز جو آزاد کشمیر کے شہری بیرون ملک مقیم ہیں ان کی ہے۔ 1975ء سے وزیراعظم آزاد کشمیر کا انتخاب قانون ساز اسمبلی کے اراکین کرتے ہیں۔ وزیراعظم ریاستی انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے جبکہ صدر آزاد کشمیر ایکٹ 1974ء کے تحت ریاست کا آئینی سربراہ ہوتا ہے۔

انتظامیہ اور قانون ساز ادارے کے علاوہ آزاد کشمیر میں ایک آزاد عدلیہ بھی موجود ہے۔ اس عدلیہ کی اعلی عدالت سپریم کورٹ ہے اس کے نیچے ہائی کورٹ اور ماتحت عدالتیں موجود ہیں ان کے علاوہ کئی دوسری عدالتیں بھی مختلف قوانین کے تحت تشکیل دی گئی ہیں۔ آزاد کشمیر میں پارلیمانی نظام پاکستان کے طرز کا ہی تشکیل دیا گیا ہے صرف آزاد کشمیر میں پاکستان کے سینٹ کی جگہ ایوان بالا یا اپر ہاؤس کشمیر کونسل کو بنایا گیا ہے۔ آزاد کشمیر کونسل کے ممبران کی تعداد 14 ہوتی ہے جن میں 8 اراکینِ کونسل حکومت آزاد کشمیر کی طرف سے اور 6 اراکین حکومتِ پاکستان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ آزاد جموں کشمیر کونسل کا چیئرمین وزیراعظم پاکستان ہوتا ہے۔ یہ ادارہ غیر منتخب شدہ ہے اور اس کے اراکین بھی عوامی ووٹوں سے نہیں بلکہ دونوں حکومتوں کی طرف سے نامزد ہو کر کونسل کے ممبر بنتے ہیں۔ اس کونسل کے علاوہ جو آزاد کشمیر اسمبلی کے 49 اراکین ہوتے ہیں ان کے پاس برائے نام ہی قانون سازی کے اختیارات ہوتے ہیں حالانکہ 49 اراکین میں 41 اراکین براہِ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر قانون ساز اسمبلی کے ممبرز بنتے ہیں۔ لیکن ان پر غیر منتخب اداروں کا کنٹرول زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک فیڈرل منسٹر وفاق کی طرف سے بھی ہوتا ہے جس کو وزیر امورِ کشمیر کہا

جاتا ہے اس وزیر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کی قومی اسمبلی کا ممبر ہو اور اس کو ایک وفاقی وزیر کے برابر ہی تصور کیا جاتا ہے اس کے اختیارات بھی وفاقی وزیر کے برابر ہوتے ہیں اس وفاقی وزیر کی وزارت کو وزارت امور کشمیر کہا جاتا ہے اور یہی وزارت گلگت بلتستان کے معاملات کی دیکھ بحال کی ذمہ دار ہوتی ہے اور آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے امور یہی وزارت چلاتی ہے۔ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے علاقوں کے پاس پاکستان کا صوبائی درجہ موجود نہیں ہے اس لیے اسی وزارت کے ذریعہ ہی دونوں خطوں کا نظام چلایا جاتا ہے۔ وزارت امور کشمیر کو جنوری 1949ء میں تشکیل دیا گیا تھا اس وزارت کا سیکرٹریٹ اسلام آباد میں قائم کیا گیا ہے وزارت امور کشمیر کو آزاد کشمیر کے معاملات میں برتری اور فوقیت (supermacy) حاصل ہے۔ وزیر امور کشمیر اور 5 اراکین پارلیمنٹ پاکستانی وزیر اعظم کی جانب سے جموں کشمیر کونسل کے ممبران نامزد کیے جاتے ہیں۔

آزاد جموں کشمیر کونسل کو مخصوص سرگرمیاں اور شعبہ جات میں خاص فرائض تفویض کیے گئے ہیں اور آزاد کشمیر کونسل نے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں پاکستان کی فیڈرل گورنمنٹ کے حوالے کر رکھی ہیں جن میں دفاع، سیکیورٹی، امور خارجہ اور بیرونی تجارت، کرنسی اور سکوں سے متعلقہ ذمہ داریاں بھی حکومت پاکستان کے پاس ہیں۔ آزاد کشمیر میں آج تک ہونے والے انتخابات ایکٹ 1974ء کے تحت ہی کروائے جاتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے عبوری آئین ایکٹ 74 کے تحت کشمیر کونسل کو اس لیے تشکیل دیا گیا تھا کہ یہ حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر حکومت کے درمیان پل کا کردار ادا کرے۔ پاکستان کا وزیر اعظم اس کونسل کا چیئرمین اور فیڈرل منسٹر یا وزیر امور کشمیر اس کا انچارج وزیر ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ آزاد کشمیر کی عدلیہ کے ججوں کا تقرر کرے جس میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججز شامل ہیں کونسل کو آزاد کشمیر کے چیف الیکشن کمشنر کا تقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔

1۔آزاد کشمیر الیکشن کمیشن:۔

آزاد جموں کشمیر الیکشن کمیشن کی تشکیل عبوری آئین کے آرٹیکل 50 کے تحت کی گئی ہے اور اس کمیشن کا ایک چیئرمین اور دو ممبران بھی ہوتے ہیں اس کمیشن کے کمشنر اور اراکین کے لیے اہلیت کا معیار مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ کوئی بھی شخص الیکشن کمشنر نہیں بن سکتا اگر وہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کا جج نہ رہا ہو۔ یا آزاد گورنمنٹ میں 21 گریڈ کا سِول سرونٹ یا ملازم نہ رہا ہو۔ اس کمیشن کی ذمہ داری ہوگی کہ یہ صدر آزاد کشمیر اسمبلی کے اراکین، کشمیر کونسل کے اراکین اور لوکل باڈیز کے لیے الیکشن کا بندوبست کرے اور ایسے الیکشن کروانے کا بندوبست کرے جو دیانتداری غیر جانبداری اور قانون کے مطابق کروائے جائیں، چیف الیکشن کمشنر اور ممبران کی مدد ملازمت 5 سال کر دی گئی ہے۔ آزاد کشمیر میں ہر 5 سال بعد انتخابات ہوتے ہیں اور اب پاکستان میں مارشل لاء لگنے سے آزاد کشمیر حکومت تبدیل نہیں کی جاتی جبکہ جنرل ضیاء کے دور میں آزاد کشمیر کی حکومت تبدیل کر کے ایک بریگیڈیئر کو آزاد کشمیر کا صدر بنوایا گیا تھا۔ آزاد کشمیر کے عبوری آئین کے ایکٹ 74 میں 18 وی ترمیم کی وجہ سے کچھ اختیارات آزاد کشمیر حکومت کو دیئے گئے ہیں جون 2018ء میں یہ ترمیم آزاد کشمیر میں لاگو کی گئی تھی اس ترمیم کے تحت حکومت آزاد کشمیر کے لیے اپنے طور پر بڑے معاشی فیصلے کرنا آسان ہوگیا ہے اس حکومت آزاد کشمیر کو روزمرہ کے معاملات چلانے میں بھی اختیارات مل گئے ہیں۔ ان اختیارات کی منتقلی سے کشمیر کونسل جو فیڈرل گورنمنٹ کی بیوروکریسی کے کنٹرول میں تھی، کسی حد تک مظفر آباد حکومت کو اس پر کئی امور میں فوقیت مل گئی ہے۔ اس ترمیم میں قانون سازی، انتظامی امور اور مالی معاملات آزاد کشمیر حکومت کے کنٹرول دیئے گئے ہیں جس کی وجہ سے آزاد کشمیر حکومت قانون بنا سکتی ہے۔ انتظامی امور چلا سکتی اور ریونیو حاصل کر سکتی ہے اس سے پہلے یہ اختیارات جموں کشمیر کونسل کے کنٹرول میں تھے۔ گو کہ آزاد کشمیر کی اپوزیشن سیاسی جماعتوں نے ان ترامیم کو آزاد کشمیر میں مزید مداخلت کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس طرح حکومت پاکستان آزاد

کشمیر کو صوبائی طرز کے سیٹ اپ کی طرف لے کر جائے گی اور اس طرح آزاد کشمیر پاکستان کا صوبہ بن سکتا ہے۔ اس 18 ترمیم کے ذریعہ آزاد جموں کشمیر کونسل کو ایک ایڈوائزری باڈی میں تبدیل کیا گیا ہے اس کے ذریعہ آزاد کشمیر حکومت کو کافی مالی اختیارات حاصل ہوئے ہیں۔ اب تمام ٹیکس آزاد کشمیر حکومت کو لینے کا اختیار مل گیا ہے جس میں زمین پر ریونیو بھی آزاد کشمیر حکومت حاصل کر سکے گی۔ مزید کشمیر کونسل کے ترقیاتی ونگ کو اب آزاد کشمیر میں ترقیاتی سکیموں کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی چونکہ یہ متوازی انتظامیہ چلانے کے مترادف تھا اور آزاد کشمیر حکومت کو کمزور کرنا اس کا مقصد تھا۔

قدرتی وسائل کو آزاد کشمیر میں محفوظ رکھنے کے لیے یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ آزاد کشمیر اسمبلی کی اجازت کے بغیر کوئی نیا منصوبہ نہیں شروع کیا جا سکتا۔ واپڈا کے لیے اب ضروری ہوگا کہ وہ پانی کے استعمال کے چارجز پنجاب اور پختونخواہ کے ریٹ یا قیمت کے برابر ادا کرے۔ مزید آزاد کشمیر حکومت مقامی سطح پر پیدا کی گئی بجلی استعمال کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ اکثر ریونیو دینے والے شعبے جیسا کہ پاور جنریشن (بجلی کی پیداوار) سیاحت، انکم ٹیکس اور سماجی بہبود کا محکمہ اب حکومت آزاد کشمیر کے زیر نگرانی چلائے جائیں گے۔ 32 (سبجیکٹس) یا محکمے اب بھی حکومت پاکستان کے دائرہ کار کے اندر رہیں گے۔ اس کے علاوہ آزاد کشمیر اسمبلی 22 معاملات پر حکومت پاکستان کی مرضی سے قانون سازی کر سکتی ہے۔ فیڈرل گورنمنٹ نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ آزاد کشمیر کو نیشنل فنانس کمیشن (NFC)، اکنامک کوآرڈینیشن کمیٹی (ECC) اور انڈس ریور (Indus River) کے نظام میں مبصر کا رتبہ دے گی۔ لیکن پوری ممبر شپ کسی میں بھی نہیں دے جائے گی۔ کیونکہ سرکاری طور پر اور آئینی لحاظ سے آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں ہے۔

آزاد کشمیر کے چند سیاستدان اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے آزاد کشمیر کے آئین میں انقلابی تبدیلیوں کو ہمیشہ وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے تا کہ منتخب حکومت کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے اور فیڈرل گورنمنٹ کے اختیارات میں کمی کی جائے جو کشمیر کونسل کے نام پر استعمال کیے گئے ہیں آزاد کشمیر حکومت کا سیٹ اپ پارلیمانی طرز کا بنایا گیا

ہےاس کاارتقائی عمل مختصر سا بیان کیا گیا ہے۔اس میں آج تک جوتبدیلیاں کی گئی ہیں ان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔اس حکومت کےممبران جو براہِ راست انتخابات کے ذریعہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں ان کی تعداد 41 ہےاسمبلی کے اراکین کی تعداد کل 49 ہے یہ پارلیمانی طرز حکومت ہونے کے باوجود اس کے بنیادی ڈھانچے میں کافی خرابیاں ہیں چونکہ موجودہ آزاد کشمیر کا حکومتی ڈھانچہ ایکٹ 1974ء کےتحت تشکیل دیا گیا ہےاس ڈھانچے کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیےضروری ہے کہ ایکٹ 74 میں ترمیم اور تبدیلی لائی جائے تاکہ مطلوبہ ضروری تبدیلی لائی جائے۔اگر درست انداز میں اس آزاد کشمیر کےحکومتی ڈھانچے کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بنیادی خرابی علاقائی خودمختاری کی کمی ہے اس علاقائی خودمختاری سے کیا مراد ہے اور اس کو کیسے حاصل کیا جائے؟ علاقائی خودمختاری سے مراد آزاد کشمیر حکومت کا بااختیار ہونا ہے۔

آزاد کشمیر حکومت کے جو اختیارات 18 ترمیم میں بحال کیے گئے ہیں وہ ناکافی ہیں۔آزاد کشمیر کےحکومتی ڈھانچہ میں تبدیلی لانے کے لیےضروری ہے کہ ایکٹ 74 کا خاتمہ کیا جائے اور اس کی جگہ نیا آئین لایا جائے اور اس کے تحت آزاد کشمیر حکومت کا نیا ڈھانچہ تشکیل دیا جائے۔ نیا آئینی ڈھانچہ موجودہ حالات اور آزاد کشمیر کےعوام کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق ہونا چاہیے۔اس نئے آئینی ڈھانچہ میں آزاد کشمیر کومکمل علاقائی خودمختاری کی گارنٹی دی گئی ہو۔اس علاقائی خودمختاری میں آزاد کشمیر کوایک الگ شناخت تسلیم کیا گیا ہواور آزاد کشمیر کی الگ علاقائی شناخت کو اپنے علاقے کی حدود میں اپنے علاقائی ریاستی معاملات چلانے کےمکمل اختیارات پاکستان کے آئین میں تسلیم کیے گئے ہوں اور معاہدہ کراچی کوختم کرکے اس کی جگہ نیا معاہدہ کیا جائے جس میں پاکستان اور آزاد کشمیر کے علاقائی تعلقات کو نئےسرے سے طے کیا جائے اور دونوں علاقوں کےتعلقات کوآئینی تحفظ دیا جائے۔

آزاد کشمیر کا موجودہ حکومتی ڈھانچہ مکمل جمہوری نہیں ہے بلکہ اسے حقیقی عوام کا منتخب کیا گیا عوامی جمہوریہ کا درجہ دیا جائے اور اس حکومت کو بغیر کسی بیرونی دباؤ کے اپنے اندرونی فیصلے خود کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہواس کا مطلب یہ ہوگا آزاد کشمیر کےحکومتی ڈھانچہ کو اپنے

سیاسی، معاشی اور علاقائی مسئلے حل کرنے کا پورا اختیار ہو۔ اس پر کسی بھی قسم کی بیرونی مداخلت اور دباؤ موجود نہ ہو۔ موجودہ حکومتی وزراء اور دیگر اراکین اسمبلی کو آزاد کشمیر کے عوام کے ووٹوں سے ضرور منتخب کیا جاتا ہے لیکن ان کے کام میں بیرونی مداخلت اور دباؤ موجود ہوتا ہے بلکہ سول بیوروکریسی اور لینٹ (Lent) آفسران جو فیڈرل گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کیے جاتے ہیں اپنے انتظامی اختیارات فیڈرل حکومت کی مرضی سے ہی استعمال کرتے ہیں ان کے اختیارات مکمل ختم کر کے ان کو حکومت آزاد کشمیر کے ملازم قرار دیا جائے اور پاکستان کی طرف سے افسر شاہی کے ذریعہ آزاد کشمیر کے انتظامی امور میں مداخلت کا عمل مکمل طور پر ختم کیا جائے بیوروکریسی کے تمام اہلکاروں کو آزاد کشمیر حکومت کے ذریعہ ملازمتیں دی جائیں انہیں حکومت آزاد کشمیر کے کنٹرول میں دیا جائے۔ پاکستان کی طرف سے آزاد کشمیر میں صرف ان لوگوں کو ملازمت میں رکھا جائے جو کسی کام میں مہارت رکھتے ہوں اور آزاد کشمیر میں ایسا کوئی فرد اس کام کے لیے موجود نہ ہو تب پاکستانی شہریوں کو حکومت آزاد کشمیر خود ملازمت میں رکھے ورنہ پاکستان کے کسی بھی شہری کو حکومت آزاد کشمیر میں سرکاری ملازمت نہ دی جائے کیونکہ آزاد کشمیر میں مقامی سطح پر پرائیویٹ سیکٹر نہ ہونے کی وجہ سے یہاں روزگار کے مواقع صرف گورنمنٹ سیکٹر میں ہی محدود پیمانے پر پائے جاتے ہیں جن سے آزاد کشمیر کے اپنے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اس طرح پاکستان کے شہریوں کو یہاں ملازمت نہ دینے سے مقامی نوجوانوں کو چند ملازمتوں میں مزید مواقع مل جائیں گے۔

حکومتی سطح پر آزاد کشمیر میں جلد سے جلد پرائیویٹ سیکٹر کو ترقی دینے اور مقامی سطح پر چھوٹی چھوٹی صنعتوں کا جال بچھایا جائے تاکہ آزاد کشمیر کے لاکھوں نوجوان، روزگار کے لیے عرب ملکوں میں جاتے ہیں انہیں مقامی سطح پر ہی روزگار مہیا کیا جائے۔ اس طرح آزاد کشمیر کے نوجوانوں کو پاکستان کے فیڈرل گورنمنٹ میں زیادہ سے زیادہ ملازمتوں کے مواقع مہیا کیے جائیں تاکہ یہ پاکستان کے بارے میں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں یہ تاثر ختم ہو کہ پاکستان نے آزاد کشمیر کے علاقوں کو نوآبادی کی طرح کا سلوک 1947ء سے ہی شروع کر رکھا ہے۔ چونکہ پاکستان نے آزاد کشمیر کے حکومتی ڈھانچہ میں غیر منتخب اداروں کے ذریعہ اس حکومت کے

اختیارات کو محدود کیا ہوا ہے۔ آزاد کشمیر میں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ یہاں انتخابات کے عمل میں سیاسی جماعتوں کے ذریعہ اور خفیہ ذرائع سے مداخلت کر کے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کیے جاتے ہیں اس عمل کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ معاہدہ کراچی اور ایکٹ 74 کو ختم کر کے نیا آئین اور نیا معاہدہ کیا جائے تا کہ آزاد کشمیر اور پاکستان کے تعلقات کو نئے سرے سے تعین کیا جائے۔ جو تعلقات آج سے 74 سال پہلے قائم کیے گئے تھے وہ ہنگامہ خیز حالات کا نتیجہ تھا اور آج تک اسی ہنگامی صورتحال کے تحت اس خطے کا نظام چلانا بنیادی جمہوری اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ نہ صرف حالات بدل چکے ہیں بلکہ اس خطے کی آبادی بھی 10 گنا زیادہ ہو چکی ہے اس لیے آج کی آبادی کے مسائل نیا حکومتی ڈھانچہ تشکیل دے کر ہی حل کیے جا سکتے ہیں۔ 1947ء میں آزاد کشمیر میں جو حکومتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا تھا اس میں تبدیلیاں تو ضروری کی گئی ہیں لیکن وہ کسی طرح بھی مقامی آبادی کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر نہیں کی گئی ہیں بلکہ مقامی حکمران طبقات کے مفادات اور پاکستانی ریاست کے مفاد کو سامنے رکھ کر ان کی ضرورتوں کے لیے یہ ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے۔

آج آزاد کشمیر کی آبادی کی ضرورتوں کے مطابق حکومتی ڈھانچہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے تا کہ یہ مقامی آبادی کی جمہوری خواہشات کو پورا کرے آزاد کشمیر کا خطہ بھی ریاست جموں کشمیر کے دیگر خطوں کی طرح ریاست کے تنازعہ کا حصہ ہے اور یہ علاقہ بھی متنازعہ ہے اس کے انتظامی امور یہاں کے عوام کی حقیقی منتخب نمائندہ علاقائی اتھارٹی کے کنٹرول میں ہونے ضروری ہیں جب تک ساری ریاست کا تنازعہ حل نہیں ہوتا اس وقت تک آزاد کشمیر کے خطے کو اندرونی حق خود اختیاری اور حق خود ارادیت بھی دیا جائے پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ اس خطے کی آزاد حکومت کے ساتھ دفاع، خارجہ امور اور کرنسی کے لئے نئے سرے سے معاہدے کرے اور اسی حکومت کو گلگت بلتستان تک وسعت دے کر اس وقت آزاد حکومت تشکیل دے کر اسے اقوام متحدہ میں مبصر کا درجہ دلوایا جائے یا اسے مکمل خود مختاری دے کر چین روس اور دیگر ملکوں سے بھی اس کے دفاع کی گارنٹی لی جائے اور ریاست کے وہ علاقے جو ہندوستان کے کنٹرول میں ہیں انہیں بھی اس کے ساتھ شامل کرنے کا مطالبہ کیا

جائے اور ایسا ہی حق آزادی اور حق خود ارادیت کا مطالبہ کیا جائے تا کہ ریاست کی وحدت بھی بحال ہو جائے اور ریاست کا تنازعہ بھی حل ہو جائے اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پاکستان اپنی پرانی ریاستی پالیسی بالکل ختم کر دے اور نئی جموں کشمیر پالیسی تشکیل دے۔ ریاست جموں کشمیر کے کئی ایسے حل موجود ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر ریاست کا تنازعہ حل کرنے کی ضرورت بن سکتے ہیں ان مختلف حل کا ذِکر آگے آئے گا۔ آزاد کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے معاہدہ کراچی کو ختم کیا جائے۔

1۔ معاہدہ کراچی

معاہدہ کراچی 28 اپریل 1949ء میں حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر حکومت کے درمیان ہوا تھا۔ یہ معاہدہ آزاد کشمیر اور پاکستان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے۔ یہ معاہدہ دونوں حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے اختیارات کا تعین بھی کرتا ہے۔ اس معاہدے کے ذریعہ آزاد کشمیر حکومت نے گلگت بلتستان کے علاقوں کا کنٹرول پاکستان کے حوالے کر دیا اور ان علاقوں کو مکمل طور پر پاکستان کے کنٹرول میں دے دیا تھا اور آزاد کشمیر کے علاقوں کے اختیارات بھی جن میں دفاع، خارجہ، کمیونیکشن، کرنسی اور کئی انتظامی امور بھی حکومت آزاد کشمیر کے دائرہ اختیار سے حکومت پاکستان کو منتقل کر دیئے تھے۔ کراچی معاہدہ پاکستان کی طرف سے مشتاق گورمانی وزیر بے محکمہ اور آزاد کشمیر کی طرف سے سردار ابراہیم خان صدر آزاد کشمیر کے علاوہ چوہدری غلام عباس سربراہ آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے دستخطوں سے طے ہوا تھا۔ یہ معاہدہ 1990ء تک ایک خفیہ ڈاکومنٹ کے طور پر رکھا گیا تھا۔ یہ معاہدہ 1949ء میں بھی کسی اخبار میں رپورٹ نہیں کیا گیا تھا ایسا سننے میں آیا ہے اور نہ ہی سردار ابراہیم نے اپنی سوانح میں اس کا کوئی ذکر کیا ہے۔ کراچی معاہدہ اس وقت ظاہر کیا گیا تھا جب 1990ء میں گلگت بلتستان کے حوالے سے آزاد کشمیر ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ سامنے آیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ معاہدہ 28 اپریل 1949ء میں کیا گیا تھا اس معاہدہ میں آزاد کشمیر کے علاقوں کو اختیارات سے محروم کر کے اور کئی ذمہ داریاں حکومت

پاکستان کو دی گئی ہیں اور یہ معاہدہ دراصل گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کے علاقوں کو مکمل طور پر پاکستان کے کنٹرول میں دیتا ہے۔ اس معاہدے کی عبارت یا (Text) مندرجہ ذیل ہے:۔

پاکستان نے کراچی معاہدے کے ذریعہ جو شرائط حکومت آزاد کشمیر سے طے کیں ہیں ان کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے۔

(الف) حکومت پاکستان کے کنٹرول میں دیے گئے معاملات

۱۔ دفاع

۲۔ آزاد کشمیر کی خارجہ پالیسی

۳۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان سے مذاکرات

۴۔ پاکستان اور بیرونی دنیا میں نشر و اشاعت

۵۔ مہاجرین کی آبادکاری اور بحالی کا انتظام وانصرام

۶۔ رائے شماری کے ضمن میں نشر و اشاعت کا انتظام وانصرام

۷۔ پاکستان کے اندر تمام ریاستی معاملات، مثلاً مہاجرین کے کیمپوں کے لیے خوراک، ادویات، علاج معالجے اور دیگر اشیاء ضرورت کی فراہمی کا انتظام وانصرام

۸۔ گلگت بلتستان کے تمام انتظامی معاملات پر پولیٹیکل ایجنٹ کا مکمل کنٹرول

(ب): آزاد کشمیر حکومت کے انتظام میں دیئے گئے معاملات

۱۔ آزاد کشمیر حکومت کے علاقے کی انتظامی پالیسی

۲۔ آزاد کشمیر کے علاقے میں انتظامی معاملات کی عمومی دیکھ بھال

۳۔ آزاد کشمیر حکومت اور انتظامیہ کے معاملات کی نشر و اشاعت

۴۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کے لیے وزیر بے محکمہ کو مشورہ اور صلاح دینا۔

۵۔ آزاد کشمیر کے خطے کے لیے معاشی وسائل کی ترقی

(ج): مسلم کانفرنس کے زیر انتظام دیئے گئے معاملات:

ا۔ آزاد کشمیر کے خطے میں رائے شماری کے حوالے سے نشر و اشاعت

۲۔ بھارتی زیر قبضہ علاقے میں نشر و اشاعت اور زمینی سرگرمیاں

۳۔ آزاد کشمیر کے خطے میں اور بھارتی مقبوضہ ریاستی علاقے میں سیاسی سرگرمیوں کی تنظیم

۴۔ رائے شماری کے ضمن میں عبوری اقدامات

۵۔ رائے شماری میں شرکت کے لیے تنظیم

۶۔ پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجرین کے اندر نشر و اشاعت اور سیاسی سرگرمیاں

۷۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کے لیے وزیر بے محکمہ کو مشاورت دینا

1۔ پہلے حصے میں یہ معاہدہ آزاد کشمیر کے علاقے کی سول انتظامیہ کے ڈھانچے اور اس کے کام کے طریقہ کار کا احاطہ کرتا ہے جس میں آزاد کشمیر حکومت کے لیے قوائد وضوابط کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

2۔ دوسرے حصے میں مالی انتظام کا بندوبست کرنے کا طریقہ موجود ہے جو پاکستان مالی مدد فراہم کرے گا۔ معاہدے کے تیسرے حصے میں حکومت آزاد کشمیر، حکومت پاکستان اور مسلم کانفرنس کے درمیان ذمہ داریوں کو تقسیم کیا گیا ہے۔ اختیارات کی تقسیم میں حکومت پاکستان نے 8 اہم امور اپنے کنٹرول میں رکھے ہیں جس میں دفاع، کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ مذاکرات، امور خارجہ، نشر و اشاعت کا کام بیرونی ممالک میں، مہاجرین سے تعاون کرنا، انہیں مدد دینا ان کی آباد کاری کرنا، رائے شماری کے لیے تمام معاملات کا بندوبست

کرنا، پاکستان کے اندر تمام سرگرمیاں کرنا جو ریاست کے متعلقہ ہوں، اور آخر میں گلگت بلتستان کے تمام امور کو اپنے کنٹرول میں رکھنا۔ آخری حصے میں جو معاملات طے کیے گئے ہیں اس کے تحت آزاد کشمیر گلگت بلتستان کے علاقوں سے اپنا کنٹرول کھو چکا ہے جو ہمیشہ کے لیے یہ علاقے اپنے کنٹرول سے کھونے کے مترادف ہے۔ یہ آزاد کشمیر حکومت کے اس دعوے کی نفی کرتا ہے کہ وہ سابق جموں کشمیر کی ریاستی حکومت کا متبادل ہے اور یہ اس علاقے کو ریاست کا ایک کٹا ہوا حصہ ظاہر کرتا ہے جس کی ایک محدود اختیارات رکھنے والی حکومت ہے ایک چھوٹے سے ریاستی علاقے تک محدود انتظامیہ تصور کی جاتی ہے۔ پاکستان آزاد کشمیر کے تمام دفاعی معاملات کو اپنے کنٹرول میں کر لیتا ہے جس میں آزاد کشمیر فوج کا کنٹرول بھی شامل ہے۔

پاکستان آزاد کشمیر کے علاقوں سے متعلق ہندوستان سے تعلقات کا کنٹرول اور ہندوستان کے کنٹرول میں ریاستی امور سے متعلق امور کا کنٹرول بھی اپنے اختیار میں کر لیتا ہے اور اس کے بعد آزاد کشمیر کا کوئی بین الاقوامی کردار نہیں رہتا جس میں وہ ریاستی امور سے متعلق فرائض ادا کر سکے۔ آزاد کشمیر حکومت کو صرف چار امور میں ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں ان میں سے تین امور تو آزاد کشمیر کے انتظامی معاملات، پالیسی اور اپنے معاشی وسائل کو ترقی دینے سے متعلق ہیں۔ آزاد کشمیر حکومت کی چوتھی ذمہ داری یہ لگائی گئی ہے کہ وزیر بے محکمہ کو صلاح ومشورہ دے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان (UNCIP) کے ساتھ مذاکرات کے دوران اس کی مدد کرے۔

آزاد کشمیر حکومت اور مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ نے یہ معاہدہ کراچی اس لئے قبول کیا تھا کہ وہ آزاد کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانا چاہتے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ استصواب رائے کے وعدے کی تکمیل کے ساتھ ہوگا۔ اس معاہدے کی رو سے حکومت آزاد کشمیر نہ صرف

اپنے اختیارات سے دستبردار ہوگئی بلکہ پاکستان کی طرف سے وزارت امور کشمیر کے جوائنٹ سیکرٹری کو آزاد کشمیر حکومت کا عملاً سربراہ بنا لیا تھا۔گلگت بلتستان کے حوالے سے سردار محمد ابراہیم خان کا یہ کہنا تھا کہ اس خطے کا آزاد کشمیر سے کوئی رابطہ ہی موجود نہیں تھا اور ان علاقوں کا عارضی کنٹرول حکومت پاکستان کے حوالے کرنا آسان تھا کیونکہ ان علاقوں کا انتظام پشاور اور راولپنڈی سے چلانا آسان تھا۔تاہم بعد کی سالوں میں آزاد کشمیر نے گلگت بلتستان کے علاقوں کا کنٹرول حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کی تھی۔ 1972ء میں آزاد کشمیر اسمبلی نے گلگت بلتستان کو اپنا علاقہ قرار دینے کے لیے ایک قرارداد منظور کی تھی۔

آزاد کشمیر کا عبوری آئین 1974ء میں بنایا گیا تھا اور اس میں گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر کا حصہ قرار دیا گیا تھا۔اسی طرح 1992ء میں آزاد کشمیر ہائی کورٹ نے ایک رٹ پٹیشن منظور کی تھی جس پر فیصلہ سناتے ہوئے آزاد کشمیر ہائی کورٹ نے حکومت آزاد کشمیر کو حکم دیا تھا کہ وہ گلگت بلتستان کے علاقوں کا کنٹرول حاصل کرے۔تاہم اس حکم کو آزاد کشمیر سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا تھا جس کو سپریم کورٹ آزاد کشمیر نے روک دیا تھا لیکن یہ سپریم کورٹ نے بھی تسلیم کیا تھا کہ گلگت بلتستان ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہے۔اس ٹیکنیکل فیصلہ نے آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے اس حکم کو لاگو ہونے سے روک دیا تھا کہ آزاد کشمیر حکومت کا دائرہ کار گلگت بلتستان تک بڑھایا جائے اور ان علاقوں کو آزاد کشمیر کے انتظامی کنٹرول میں لیا جائے کیونکہ آزاد کشمیر جموں کشمیر ریاست نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ ہے اس لئے گلگت بلتستان سابقہ ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہے نہ کہ موجودہ آزاد کشمیر کا حصہ ہے۔لیکن گلگت بلتستان کے لوگ کراچی معاہدے سے خوش نہیں ہیں کیونکہ اس معاہدے میں گلگت بلتستان کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا جبکہ اس معاہدے میں گلگت بلتستان کی قسمت کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

1۔ آزاد کشمیر کے خطے میں ایکٹ 1974ء عبوری آئین کے تحت دیئے گئے سیاسی، معاشی، سماجی، انتظامی اور علاقائی حقوق نہ صرف محدود ہیں بلکہ بعض کی نفی اس لیے ہوجاتی ہے کہ ان پر پاکستانی اداروں کا براہِ راست کنٹرول موجود ہے اب کراچی معاہدے کی بنیاد کو سمجھ لینے کے بعد یہ واضع ہوجاتا ہے کہ ایکٹ 74 کی بنیاد کراچی معاہدہ بنا ہوا ہے چونکہ

آزاد کشمیر کے ساتھ پاکستان کے تعلق کی نوعیت کا فیصلہ کراچی معاہدہ طے کرتا ہے سب سے پہلے کراچی معاہدہ ختم کیا جائے گا تو اس کے بعد ہی آزاد کشمیر کے لوگوں کے سیاسی معاشی اور جمہوری حقوق بحال ہونگے۔ یہ درست ہے کہ آزاد کشمیر میں منتخب لیڈر ہی انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے تاہم پاکستانی حکومت کچھ اہم انتظامی امور کو براہِ راست اور کچھ امور کو بلواسطہ(Indirectly) دوسرے ذرائع سے کنٹرول کرتی ہے۔ پاکستان کی طرف سے انتظامی امور چلانے والے افراد آزاد کشمیر کے ووٹروں کے آگے جوابدہ نہیں ہیں۔

اس طرح آزاد کشمیر کا خطہ سیاسی لحاظ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد نہیں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آزاد کشمیر کو سیاسی آزادی نہیں دی گئی اور جو سیاسی آزادی موجود ہے وہ محدود ہے۔ اسی طرح یہ خطہ سب سے پہلے اپنی سیاسی آزادی کی بحالی کا مطالبہ کرے اور اپنے علاقائی سیاسی معاملات میں مکمل آزادی حاصل کرے۔ آزاد کشمیر میں الیکشن کے طریقہ کار کو زیادہ فری اور غیر جانبدارانہ بنایا جائے تاکہ ووٹروں کو اپنے ووٹوں کی طاقت کا احساس ہو۔ اس وقت تک مختلف سیاسی، سماجی اور قبائلی حربے استعمال کر کے ووٹروں پر اثر انداز ہوا جاتا ہے تو دوسری طرف فیڈرل حکومت کے اہلکار خاص کر وزارت امورِ کشمیر کے ذریعہ آزاد کشمیر کے انتخابات پر اثر انداز ہوا جاتا ہے۔ کچھ سیاسی جماعتوں کی برانچیں آزاد کشمیر میں بھی قائم کی گئی ہیں جو آزاد کشمیر کے انتخابات میں پاکستانی سیاسی جماعتوں کی مخالفت اور حمایت کے ذریعہ آزاد کشمیر کے انتخابات پر اثر انداز ہوتیں ہیں۔ پاکستان کی طرف سے دو طرح سے اب آزاد کشمیر کے خطے کی سیاست کو کنٹرول کیا جاتا ہے، ایک طریقہ ریاستی اداروں اور وزارت امور کشمیر کے ذریعہ اور دوسرا طریقہ پاکستانی سیاسی جماعتوں کے ذریعہ آزاد کشمیر کی سیاست پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا گیا ہے حالانکہ آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبائی درجہ نہیں دیا گیا اور نہ ہی پاکستان کی پارلیمنٹ میں آزاد کشمیر کو نمائندگی دی گئی ہے۔ یہ یکطرفہ سیاسی تعلق کی وجہ سے آزاد کشمیر کے عوام کی آواز پاکستانی سیاسی نظام میں دب کر رہ گئی ہے۔

2۔کیا انتخابی قوانین اور فریم ورک غیر جانبداری سے کام کرتے ہیں!

انتخابی فریم ورک بھی کسی حد تک پاکستانی حکام کے کنٹرول اور اثر میں ہوتا ہے۔مثال کے طور پر آزاد کشمیر کونسل کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ آزاد کشمیر کے چیف الیکشن کمشنر کا تقرر کرے اور آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے لیے انتخابی نظام غیر ضروری طور پر مہاجرین مقیم پاکستان کو آزاد کشمیر کے شہریوں سے زیادہ حمایت دیتا ہے۔مہاجرین جموں کشمیر مقیم پاکستان کے لیے حکومت پاکستان کے اہلکار انتخابات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جو بھی سیاسی جماعت مرکز میں حکومت کرتی مہاجرین جموں کشمیر کی نشستیں جیتنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔اس طرح پاکستانی جماعتوں کو اپنی آزادکشمیر میں جماعتوں کو جتوانے کی دوڑ لگ جاتی ہے۔آزادکشمیر کے امیدوار آزادکشمیر کے مسائل پر الیکشن لڑنے کی بجائے پاکستانی مسائل کی بنیاد پر آزادکشمیر میں الیکشن لڑتے ہیں ۔اس طرح ریاستی جماعتوں کو آزادکشمیر کے انتخابات سے باہر کردیا گیا ہے۔اس کے علاوہ آزادکشمیر میں قانون ساز اسمبلی کے لیے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ امیدوار الحاق پاکستان کے نظریہ کا حامی ورنہ وہ الیکشن میں امیدوار نہیں بن سکتا ۔امیدوار کو یہ حلف نامہ دینا پڑتا ہے کہ وہ ریاست جموں کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے نظریے کا حامی ہے۔اس طرح آزاد کشمیر میں ان سیاسی جماعتوں کو الیکشن میں حصہ لینے کا حق نہیں دیا گیا جو ریاست جموں کشمیر کی آزادی کی حمایت کرتی ہیں۔اس انتخابی عمل کو غیر جانبدار اور آزادانہ جمہوری طرز طریقہ انتخاب نہیں کہا جاسکتا جس میں سماج کی کئی سیاسی جماعتوں کو قانونی طور پر انتخابی عمل سے دور رکھا جائے۔اس انتخابی عمل سے چھوٹی چھوٹی قوم پرست آزادی پسند سیاسی جماعتوں کو دور رکھا جاتا ہے اور انہیں انتخابی عمل کا حصے بننے سے روکا جاتا ہے۔ایسے سیاسی کارکن جو پاکستانی فیڈریشن کا حصہ بننے کی مخالفت کرتے ہیں ان کی سرگرمیوں کی خفیہ طور پر نگرانی کی جاتی ہے اور بعض کو خوف وہراس کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔آزاد کشمیر کا عبوی آئین ایکٹ 74 ایسی سیاسی جماعتوں پر انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی لگاتا ہے جو ریاست کا الحاق پاکستان نہ کرنا چاہتے ہوں۔آزادکشمیر

میں ایسے سیاسی کارکنوں کو جیلوں میں بند نہیں کیا گیا نہ کسی کو آج تک ایسی سیاسی سرگرمیاں کرنے پر لمبی جیل ہوئی ہے لیکن ان سیاسی جماعتوں کو انتخابی عمل کا حصہ بنائے بغیر آزاد کشمیر میں ایک مکمل عوامی جمہوری حکومت کا قیام ناممکن ہے۔

3۔کیا آزاد کشمیر کا انتخابی عمل بیرونی قوتوں کے اثر سے آزاد ہوتا ہے؟

اس حوالے سے دیکھا جائے تو جواب نفی میں ہوگا کیونکہ آزاد کشمیر کے ووٹرز پاکستان کے الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے اس لئے پاکستان کے فیڈرل حکومتی اہلکار اور وہ تمام قوتیں جو پاکستان سے متعلق ہیں آزاد کشمیر کے ووٹروں کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ نہیں ہیں۔اسی طرح آزاد کشمیر میں سیکیورٹی ایجنسیوں کا کام بھی فیڈرل حکومت کے زیر نگرانی ہوتا ہے۔ یہ خفیہ ادارے جس سیاسی پارٹی یا سیاستدان کو چاہیں ڈرا دھمکا کر اپنی مرضی منوا سکتے ہیں اگر ایسی جماعت یا کوئی سیاستدان پاکستان سے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرے۔

4۔جنس یا جنڈر کی بنیاد پر انتخابات میں کوئی امتیازی سلوک کیا جاتا ہے؟

آزاد کشمیر اسمبلی میں عورتوں کی مخصوص نشستیں رکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی عورت عام سیٹ سے انتخابات میں حصہ لینا چاہیے تو جنس کی بنیاد پر کوئی پابندی موجود نہیں ہے۔اسی طرح عورتوں اور مردوں کو آزاد کشمیر کے انتخابات میں ووٹ دینے کا برابر حق دیا گیا ہے۔

5۔آزاد کشمیر حکومت کتنی آزادی سے اپنے خطے کے معاملات چلاتی ہے؟

آزاد کشمیر میں انتظامیہ کے سربراہ کے اختیارات محدود ہیں۔کیونکہ وزیراعظم پاکستان، وزیر امور کشمیر اور ان کے ذریعہ فیڈرل سول سروس، لینٹ افسران اور خفیہ اداروں کے اہلکار آزاد کشمیر حکومت کے کاموں کو اچھی طرح کنٹرول کرتے ہیں جس طرح پاکستان میں بھی فوج اور خفیہ ادارے حکومت کرنے اور پالیسیاں بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے خطے میں کوئی معقول مالی خودمختاری موجود نہیں ہے۔فیڈرل گورنمنٹ کی طرف

سے ٹیکس عائد کیے جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں فیڈرل گورنمنٹ کی طرف سے فنڈز ملتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے علاقے کے مقامی منتخب نمائندوں کو پاکستانی صوبوں کی طرح بین الالصوبائی مالی وسائل میں حصہ داری پر مذاکرات کرنے سے باہر رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شفافیت اور حکومتی انفارمیشن (Information) بھی آزاد کشمیر میں محدود ہے۔ حکومت آزاد کشمیر نے شفافیت کے حوالے سے اپنے محکموں کی بنیادی معلومات کو آن لائن (Online) کر کے اس عمل کو بہتر بنانے کے لیے چند قدم ضرور اٹھائے ہیں لیکن ابھی اس کام کو مزید بہتر کرنے کے لیے مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔ آزاد کشمیر کے خطے کے مالی وسائل کو کنٹرول کرنے سے پاکستان اس علاقے کو مالی لحاظ سے اپنا محتاج بنا لیتا ہے جس کی وجہ سے باقی آزادیاں بھی محدود ہو جاتیں ہیں۔ آزاد کشمیر کے خطے کو مالی خودمختاری دیے بغیر خود کفیل اور سیاسی لحاظ سے اپنے فیصلے کرنے کے قابل نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ کسی بھی خطے کے مالی وسائل کا کنٹرول اس کی خودمختاری کی ضمانت ہوتا ہے۔

6۔شہری آزادیاں اور اظہار رائے کی آزادی؟

آزاد کشمیر میں ایسے قوانین موجود ہیں جو شہری آزادیوں کے ساتھ اظہار رائے کو بھی محدود کرتے ہیں خصوصاً ایسے معاملات میں جو اس علاقے کی سیاسی حیثیت سے متعلق ہوں۔ تمام میڈیا ہاؤسسز کو آزاد کشمیر کونسل اور وزارت امور کشمیر سے اجازت لے کر ہی کام کرنا ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر میں اپنا کوئی ٹیلی ویژن چینل موجود نہیں ہے اور کئی طریقوں سے اپنے ٹیلی ویژن چینل کھولنے میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ اس طرح پرنٹ میڈیا کو بھی آزادی میسر نہیں ہے۔ اس کے باوجود آزاد کشمیر میں میڈیا کا کثیر حصہ موجود ہے اور سرگرم ہے لیکن پاکستانی ریاستی بیانیہ کے علاوہ متبادل آوازیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسی طرح خبریں دینے اور سیاسی رپورٹنگ کے لیے بھی پاکستانی ریاست کے نقطہ نظر کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ ایسی رپورٹنگ اور خیالات میڈیا کے ذریعہ پھیلائے جاتے ہیں جس میں صرف یہ دیکھایا جاتا ہے کہ تمام ریاست جموں کشمیر کے دونوں طرف کے عوام پاکستان سے الحاق کرنے کے حامی

ہیں۔آزادکشمیر کے خطے میں پاکستانی ریاست کے الحاق کے خلاف کام کرنے والے گروپوں یا انفرادی طور پر ایسا نقطہ نظر رکھنے والوں کو آزاد کشمیر کے محدود میڈیا اور پاکستانی میڈیا پر اپنا موقف بالکل پیش نہیں کرنے دیا جاتا اور یکطرفہ موقف دکھایا جاتا ہے جس میں پاکستان کے حامی سیاسی جماعتوں اوران کے رہنماؤں کو ہی یہ حق دیا گیا ہے کہ وہی اپنا یکطرفہ پاکستان نواز موقف پیش کریں۔ یہ تابعداری سنسرشپ، سیلف سنسرشپ اور خوف وہراس کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے۔کئی میڈیا کے ادارے حکام نے پچھلے کئی سالوں میں بند بھی کیے ہیں جو سرکاری زبان اور بیانیہ سے انحراف کا باعث بنتے تھے۔آزادکشمیر کے خطے میں مذہبی عقائد کی بھی اتنی ہی آزادی دی گئی ہے جتنی باقی چیزوں میں دی گئی ہے۔اس خطے میں ساری آبادی مسلم ہے اس لئے ان کے مذہبی عقائد بھی سرکاری سطح پر بیان کیے گئے مذہبی عقائد کے مطابق ہونے چاہئیں جو حربے اور دباؤ عقائد کے اظہار کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔اس کے ذریعہ سرکاری سطح پر مذہبی تعبیر وتشریح کو فالو کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مذہبی عقائد سنی مسلک کا رجحان خطے میں حاوی ہے لیکن شیعہ اور دیگر فرقوں کی آبادی بھی موجود ہے۔

7۔تعلیمی اداروں کی آزادی اور تعلیمی نظام:(Academic Freedom)

ہر خطے میں اپنے معروضی حالات کے مطابق لوکل ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیمی نظام ترتیب دیا جاتا ہے اور ہر خطہ اپنے تعلیمی نظام کو اپنے خطے کی پیشہ وارانہ ضرورتوں کے مطابق پروان چڑھاتا ہے اور تعلیم کی اہمیت ہی تب ہوتی ہے کہ یہ ملازمت حاصل کرنے اور پیشہ وارانہ تربیت کرنے میں معاون ثابت ہو۔تاہم آزادکشمیر میں نہ تو تعلیم کا نظام بنیادی ضرورتوں کے مطابق ہے اور نہ ہی تعلیمی اداروں میں آزادی کو برداشت کیا جاتا ہے۔تاہم تعلیمی اداروں میں آزادکشمیر کی آئینی حیثیت کے بارے میں بہت زیادہ حساسیت پائی جاتی ہے۔تعلیمی اداروں میں کوئی بحث مباحثہ اور نہ ہی کوئی ایسا مواد برداشت کیا جاتا ہے جس میں پاکستان کے ریاست پر دعوے کو چیلنج کیا گیا ہو یا سوال کیا گیا ہو۔طلبہ یونینز پر مکمل پابندی عائد کی گئی ہے اور ان طلبہ یونینز کی سرگرمیوں کو ریاست کی طرف سے نگرانی

(Monitoring) کی جاتی ہے جن میں قوم پرستی کی سیاست کا نقطہ نظر رکھنے والے گروپ پائے جاتے ہوں۔ آزاد کشمیر کے خطے کی زبان لوکل سکولوں میں بالکل نہیں پڑھائی جاتی ہے۔ اس طرح یہاں کی زبان اقوام متحدہ کی ان زبانوں کی لسٹ میں شامل ہو چکی ہے جو مستقبل میں ناپید ہونے والی زبانیں ہیں۔ اس طرح یہ خطہ اپنی علاقائی شناخت بھی کھو چکا ہے۔ چونکہ آزاد کشمیر کا علاقہ خطۂ جموں کا مغربی حصہ ہے لیکن اس کی شناخت کشمیری بولنے والے خطے سے جوڑ دی گئی ہے جس سے ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی بحالی یا ریاست کا پاکستان سے الحاق کے خلاف کوئی سوچ وفکر کا پہلو نکلنے کا اندیشہ ہو۔ اس طرح آزاد کشمیر کے تعلیمی اداروں میں ریسرچ کا کام بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسا ریسرچ کا کام کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی جس میں سرکاری سوچ اور فکر سے ہٹ کر کوئی موقف اختیار کیا گیا ہو۔

8۔ اظہار رائے کی انفرادی آزادی:۔

حکومت پاکستان کی طرف سے فیڈرل خفیہ اداروں کے اہلکاروں کی موجودگی آزاد کشمیر میں ہر جگہ ہوتی ہے۔ سرکاری بیانیہ سے ہٹ کر کوئی سیاسی اور مذہبی بحث ومباحثہ کافی زیادہ خطرناک بن سکتا ہے۔ آزاد کشمیر حکومت کے ملازموں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ الحاق پاکستان کی سیاست کو فروغ دیں اور جو سرکاری اہلکار اپنی مرضی سے ریاست کے حوالے سے کوئی دوسری سوچ پروموٹ کرنے کی کوشش کریں گے انہیں ملازمت سے برطرف یا معطل بھی کیا جاسکتا ہے۔ سرکاری اہلکاروں نے سوشل میڈیا کی سرگرمیوں کو واچ کرنا بڑھا دیا ہے اور بعض اوقات ایسے افراد کو سزا دی جاتی ہے جو علیحدگی پسندی اور آزادی کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے افراد کو پاکستان مخالف سمجھا جاتا ہے۔

9۔ اکٹھا ہونے کی آزادی (Freedom of Assembly):۔

آزاد کشمیر میں عوام کو اکٹھا ہو کر اپنے مسائل پر بات چیت کرنے کی آزادی محدود ہے۔ حکومتی اہلکاروں کی طرف سے ایسے اجتماعات کو مانیٹرنگ کیا جاتا ہے جو ریاستی بیانیہ کو چیلنج

کرتے ہوں اور الحاق پاکستان کے مخالف گروہوں کو محدود آزادی دی جاتی ہے جس میں جلسے جلوس بھی شامل ہیں لیکن کسی ریاستی مقصد کے لیے یا ریاست کی وحدت کی بحالی کے لیے کسی بڑے اجتماع کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ پاکستان کی جموں کشمیر کی پالیسی کو رد کرے۔ البتہ آزاد کشمیر کی تمام سیاسی جماعتوں کو ہندوستان کے خلاف ہر طرح کی سیاسی سرگرمی کرنے کی اجازت دی جاتی ہے چاہے پاکستان سے الحاق کی مخالفت کرنے والے سیاسی گروپ ہی کیوں نہ ہوں بلکہ آزاد کشمیر کے اکثر آزادی پسند ہندوستان سے آزادی کے ہی حق میں ہیں۔ ان میں سے چند ہی ہیں جو ریاست کو پاکستان سے الگ کرنے کا نظریہ رکھتے ہوں گے۔ اسی لیے پاکستان نے ان گروپوں کو بھی جو آزادی پسند کہلاتے ہیں آزاد کشمیر میں ہندوستان کے خلاف ہر طرح کی سرگرمی کی اجازت دے رکھی ہے۔

پاکستانی ریاست روائیتی طور پر آزاد کشمیر کے خطے کو ہندوستان کے خلاف احتجاج کے لیے اور بیس کیمپ کے طور پر استعمال کرتی رہی ہے اور ہندوستان کی طرف سے کشمیری شہریوں کے ساتھ کیا گیا برا سلوک کا پاکستان نے ہمیشہ نوٹس لیا ہے جبکہ اپنی طرف اپنی ریاستی پالیسیوں کے خلاف آزاد کشمیر کے شہریوں کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی اپنے زیر انتظام علاقوں کی آزادی کو پاکستان جائز قرار دیتا ہے حالانکہ پاکستان کی طرف سے ایسے سیاسی گروپوں کو قانونی لحاظ سے آزاد کشمیر کی حکومت کے ذریعہ نا اہل قرار دیا جاتا ہے۔ وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتے اگر وہ ریاست جموں کشمیر کا الحاق پاکستان سے کرنے کے حامی نہ ہوں۔ کوئی احتجاج پاکستان کی آئینی حیثیت کو مسترد نہ کرے ایسے احتجاج کو برداشت کیا جاتا ہے۔ جب ہندوستان نے اپریل 2019ء میں لائن آف کنٹرول کے آر پار تجارت کو معطل کیا تو مظفر آباد میں تاجروں نے احتجاج کیا تھا۔ جب ہندوستان نے اگست 2019ء میں اپنے زیر انتظام جموں کشمیر کا سپیشل درجہ ختم کیا تو آزاد کشمیر کی حکومت کے اہلکاروں نے اس کے خلاف بیان جاری کیے اور آزاد کشمیر اسمبلی میں اس کی مذمت کی گئی تھی اور حکومتی اہلکاروں نے سڑکوں پر احتجاج کیا تھا لیکن ایسا کوئی بھی احتجاج آزاد کشمیر حکومت پاکستان سے اپنے لیے آئینی حیثیت مانگنے کے لیے کرنا چاہے تو اجازت نہیں دی جائے گی یا ایسا کرنا بھی

مشکل ہوگا کیونکہ حکومت میں وہی ہوتا ہے جو پہلے سے پاکستان کی طرف سے دی گئی آزاد کشمیر کی آئینی حیثیت سے متفق ہوتا ہے۔اسی طرح جموں کشمیر پیپلز نیشنل الائنس کی طرف سے دی گئی احتجاجی کال کو مظفر آباد میں اجازت تو دی گئی تھی لیکن پولیس نے اس پر تشدد بھی کیا تھا اور پرامن احتجاج کو آزاد کشمیر اسمبلی کی طرف نہیں جانے دیا گیا تھا کیونکہ اس ریلی کا مقصد آزاد کشمیر میں نئی آئین ساز اسمبلی کا مطالبہ بھی تھا۔کئی احتجاج کرنے والے گرفتار بھی کیے گئے تھے جب کچھ گروپوں نے ہندوستان کی طرف مارچ کیا تھا۔

10۔انسانی حقوق کی تنظیموں کی سرگرمیوں کو آزادی:۔

انسانی حقوق کی تنظیموں کے لیے آزاد کشمیر میں سخت رجسٹریشن کی پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور انہیں آزاد کشمیر جانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وزارت داخلہ میں رجسٹریشن کروائیں اور اجازت لیں۔ یہ قوانین بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیموں کے لیے ہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیموں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ حکومتی اہلکاروں کی مرضی سے آزاد کشمیر میں کام کریں۔ جو این جی اوز سیاسی اور انسانی حقوق کے لیے کام کرتیں ہیں انہیں حکومتی پابندیوں کا سامنا زیادہ ہوتا ہے اور کچھ کو ہراساں بھی کیا جاتا ہے۔

11۔ٹریڈ یونین کی آزادی:۔

آزاد کشمیر میں مزدوروں کے لیے ایسے قوانین موجود ہیں جو پاکستان میں لیبر یونینز کے لیے قوانین موجود ہیں تاہم یونینز اور پیشہ وارانہ تنظیموں کو ان کے کام سے روکا جاتا ہے۔ لیبر قوانین اور یونین کی سرگرمیاں آزاد کشمیر میں پسماندہ حالت میں ہیں۔

12۔قانون کی حکمرانی اور عدلیہ کی آزادی:۔

آزاد کشمیر میں عدلیہ برائے نام ہی آزاد ہے پاکستان کی مرکزی حکومت عدلیہ کے ججوں کی تقرری میں نہایت ہی اہم کردار ادا کرتی ہے۔آزاد کشمیر کی عدلیہ کو حساس نوعیت کے سیاسی ایشوز پر آزادانہ فیصلے کرنے اور پاکستان میں حکومت کی پالیسی سے ہٹ کر آزاد عدلیہ کی

طرح کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔صدر آزاد کشمیر اپنے علاقے کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا تقرر آزاد کشمیر کونسل کے مشورے سے کرتا ہے۔ دیگر اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کا تقرر بھی صدرِ آزاد کشمیر کونسل کے مشورے کرتا ہے اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سے بھی مشورہ کیا جاتا ہے۔قانون کی حکمرانی کا انداز بھی آزاد کشمیر میں پاکستان کے باقی علاقوں سے ملتا جلتا ہی ہے پولیس کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے اور پولیس بھی عدلیہ کی طرح حکومتی وزراء اور اعلیٰ انتظامی اہلکاروں کے دباؤ سے آزاد نہیں ہے۔آزاد کشمیر میں پولیس کے سربراہ کو پاکستان سے ہی تقرر کروایا جاتا ہے اور پولیس اپنے اعلیٰ حکام کا ہر جائز و ناجائز حکم ماننے کی پابند ہوتی ہے۔ پولیس کے محکمے میں احتساب کا کوئی اچھا اور کارگر نظام موجود نہیں ہے۔اعلیٰ پولیس حکام چھوٹے پولیس اہلکاروں پر دھونس اور دھمکی سے کام لیتے ہیں۔ پولیس کے نظام کو جدید بنانے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور پولیس کے اعلیٰ آفیسر چھوٹے پولیس ملازموں کا سخت استحصال کرتے ہیں۔ عام پولیس کے عہدیدار کو ڈیوٹی کے دوران کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا جاتا اور نہ ہی ان کو ضروریاتِ زندگی کے مطابق سہولتیں دی جاتی ہیں۔ پولیس کے عام ملازم کی تنخواہ اتنی کم ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر گزارنے کے لیے اور اپنے خاندان کو معاشی مسائل سے چھٹکارا نہیں دے سکتا۔عام پولیس اہلکار کی جتنی تنخواہ کم ہے اتنی ہی ڈیوٹی کا دورانیہ لمبا ہوتا ہے اور انہیں گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے مناسب سہولتوں کی شدید کمی ہے۔ پولیس اہلکاروں میں مالی کرپشن بہت زیادہ ہے اس مالی کرپشن سے انہیں دور رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کی تنخواہیں اتنی زیادہ کردی جائیں کہ انہیں رشوت اور دیگر کرپشن کے طریقوں کا سہارا ہی نہ لینا پڑے۔ پولیس کی نوکری کرنے والے ملازمین اتنا زیادہ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی اپنے بچوں کو جدید تعلیم اور دیگر زندگی کی ضروریات مہیا نہیں کر پاتے تو وہ اپنے کام سے مایوس ہو جاتے ہیں اور اپنے اعلیٰ افسران کے ظالمانہ رویے سے ان کی زندگی اور ڈیوٹی دونوں پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پولیس اہلکاروں کی تربیت کا آزاد کشمیر میں کوئی ادارہ موجود نہیں ہے۔اس محکمے کی ضرورت سب سے زیادہ حکمران طبقات کو ہوتی ہے اور اس کے باوجود حکومت پولیس ملازموں کو جدید سہولتوں سمیت تنخواہوں میں اضافہ نہیں کرتی۔

سویلین عدالتوں میں آزاد کشمیر میں عدالتی کاروائی کا پورا نظام موجود ہے اور کاروائی کو قانون کے مطابق کرنا گارنٹی دیتا ہے۔اس میں دفاع کرنا اور دفاع کے لیے وکیل رکھنے کا حق بھی موجود ہے۔عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق بھی دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسی گرفتاریاں بھی ہوتیں ہیں جو ایجنسیوں اور ججوں کی مرضی سے ان پر کاروائیاں کی جاتی ہیں خاص کر کے سیکیورٹی سے متعلقہ ایشوز پر ایسا زیادہ کیا جاتا ہے۔پاکستان میں انٹی دہشتگردی کی عدالیں (ATA) اکثر حکومتی مخالفین کو دبانے کے لیے استعمال ہوتیں ہیں۔وہ ایسے جرائم کو بھی لیتی ہیں جو درست طریقے سے ان کے دائرہ کار میں نہیں آتے اور ایسے لوگوں کو ٹرائل کے بغیر حراست میں رکھا جاتا ہے۔پاکستانی حکومت نے 2015ء سے ان شہریوں کے لیے جو سویلین دہشت گردی کے مقدمات بھگت رہے ہیں یا فرقہ پرستی اور تشدد میں ملوث ہیں ان پر فوجی عدالتوں میں مقدمات چلانے کی اجازت دے رکھی ہے۔انہیں قانونی کاروائی کے دوران چند ہی تحفظات حاصل ہوتے ہیں اور انہیں سزائے موت تک دی جاسکتی ہے۔

13۔دوران حراست قانونی تحفظ:۔

آزاد کشمیر میں دوران حراست ناچر اور تشدد کے چیدہ چیدہ واقعات ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ اتنے زیادہ وسیع پیمانے پر کبھی رپورٹ نہیں ہوتے کیونکہ سیاسی بنیادوں پر یہاں آزاد کشمیر میں بڑے پیمانے پر مخالفین کو جیلوں میں بند رکھنے کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ آزاد کشمیر میں حکومتی اراکین ہوں یا اپوزیشن پارٹیاں یہ کسی بھی عوامی مفاد میں ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کرتے ان کی مخالفت پاکستانی اداروں اور حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سبقت لے جانے کے لیے ہوتی ہیں۔البتہ جرائم پیشہ افراد کو پولیس کے حراست سنٹروں میں یا تھانوں میں جسمانی تشدد کے ذریعہ ہی تفتیش کی جاتی ہے اور انہیں جرم قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن آزاد کشمیر پولیس کا ایسا ریکارڈ موجود نہیں ہے جہاں عام شہریوں کو جرائم میں ملوث کر کے جبر و تشدد کا وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہو لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پولیس کا نظام آزاد کشمیر میں عوام دوست بالکل بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے واقعات

شہریوں سے ضرور پیش آتے ہیں جہاں سماج کے طاقتور طبقوں کے خلاف پولیس نے غریب اور کمزور کو اس کی مرضی سے انصاف مہیا کیا ہو۔ آزاد کشمیر میں عدالتوں اور پولیس کے نظام میں بہت زیادہ تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور دونوں محکموں میں عوام کو سستا انصاف مہیا کرنے کے لیے اپنی ڈیوٹی اور ذمہ داریوں کو وقف کر دینا چاہیے اور سماج میں انصاف کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے اس کے لیے ضروری ہے کہ آزاد کشمیر میں عدلیہ کو مکمل آزادی دی جائے اور سیاسی دباؤ سے مکمل تحفظ دیا جائے۔ آزاد کشمیر میں بھارتی مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے افراد اور خاندانوں کو پولیس اور فیڈرل خفیہ اداروں کی طرف سے حراساں کیا جاتا ہے ان کو آزاد کشمیر میں شہری حقوق نہیں دیئے جاتے جو انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ عدلیہ اور پولیس کو ان خاندانوں کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات اٹھانے چاہیے وہ بھی ریاست جموں کشمیر کے شہری ہیں اور پاکستان کی حکومت انہیں اپنی حکومت کی طرف سے شناختی کارڈ جاری کرے اور آزاد کشمیر کی عدلیہ کو اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرنا چاہیے اور ان کے ریاستی حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے۔

14۔خاندانی تحفظ اور سماجی رویہ:۔

آزاد کشمیر کا سماج اب بھی کافی پسماندہ ہے لوگ برادریوں قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں سماجی لحاظ سے معاشرہ رجعت پسندی میں لتھڑا ہوا ہے قدیم رسم ورواج سماج میں حاوی ہیں عورتوں اور مردوں کے درمیان جنسی برابری کا سوال موجود ہے اور سماجی گروہوں کے درمیان بھی برابری موجود نہیں ہے عددی برتری کی بنیاد پر دوسرے سماجی گروہوں پر حاوی ہونے کے رجحانات عام پائے جاتے ہیں۔ ذات پات اور برادری کے نظام کو سماج میں مضبوط کرنے کے لیے ان سماجی شناختوں کو سیاسی ضرورتوں کے لیے ہتھیار بنایا گیا ہے آزاد کشمیر میں انتخابات کا سارا نظام ہی برادری، قبیلہ اور ذات پات کے گرد گھومتا ہے سیاسی جماعتیں آزاد کشمیر میں انتخابات جیتنے کے لیے برادری اور پیسے کا سہارا لیتی ہیں جس کی وجہ سے سماج کا ارتقاء بری طرح متاثر ہوا ہے۔ گھریلوں تشدد کے واقعات بہت ہی کم رپورٹ ہوتے ہیں

لیکن گھروں میں عورتوں پر تشدد کیا جاتا ہے شاید یہ تشدد پاکستان کے دیہاتوں کی طرح وسیع پیمانے پر نہ ہو لیکن یہ موجود ضرور ہے آزاد کشمیر میں گھریلو تشدد کو جرم تصور کیا جاتا ہے اور قانونی لحاظ سے گھریلو تشدد اور عزت کے نام پر قتل کو جرم کے طور پر ہی ڈیل کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ نقصان دہ روایتی عمل جاری ہے جس میں جنس، شادی بیاہ کے ایشوز میں یہ سماجی رویے حاوی ہیں کمزور قانون کا نفاذ اور عدم تحفظ کی وجہ سے پرانے خیالات رکھنے والے دیہاتی علاقے ایسے معاملات میں زیادہ ملوث ہوتے ہیں۔ ایسے گھریلو تشدد اور جنسی زیادتی جیسے واقعات عورتوں کے خلاف جرائم دیہاتوں اور گاؤں کی سطح پر اس لئے زیادہ ہوتے ہیں کہ یہاں انصاف کا پرانا روائتی طریقہ موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان جرائم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جرائم کا شکار ہونے والی عورتوں کو مزید نقصان پہنچتا ہے۔ گاؤں کی سطح تک قانون کا نفاذ کرنے اور ان جرائم کا شکار ہونے والی خواتین کے لیے مدد کا ایک نظام ہونا چاہیے اور حکومتی سطح پر اس کا اہتمام کیا جائے اور پولیس کا الگ یونٹ قائم ہو جو صرف عورتوں پر مشتمل ہو اور جنسی تشدد کا شکار عورتوں کی مدد کرے۔

15۔ معاشی ترقی اور روزگار کے یکساں مواقع:۔

آزاد کشمیر کا علاقہ تاریخی لحاظ سے ترقی میں پیچھے رہ جانے والا خطہ تصور کیا جاتا ہے یہ معاشی لحاظ سے بہت ہی پسماندہ علاقہ ہے۔ آزاد کشمیر کا علاقہ مکمل طور پر لیبر (Labor) کی ہجرت پر انحصار کرنے والا خطہ بن چکا ہے آزاد کشمیر میں صنعت اور دیگر روزگار مہیا کرنے والے پرائیویٹ سیکٹر کو سرے سے ترقی نہیں دی گئی۔ چھوٹے پیمانے پر بھی انڈسٹری نہیں لگائی گئی جس کی وجہ سے یہاں مقامی سطح پر روزگار کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں اور مقامی سطح پر وسائل پر کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے آزاد کشمیر کی حکومت کی ترجیحات میں پڑھے لکھے نوجوانوں کو روزگار مہیا کرنا شامل ہی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ آبادی کا کثیر حصہ روزگار کی تلاش میں بیرون ملک چلا جاتا ہے جو حصہ بچ جاتا ہے وہ روزگار کی تلاش میں پاکستان کے شہروں کا رخ کرتا ہے۔ آزاد کشمیر میں پرائیویٹ سیکٹر نہ ہونے کی وجہ سے حکومتی

شعبہ میں روزگار محدود ہے اس لیے مردوں کی آبادی کا بہت بڑا حصہ معاشی تنگ دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہجرت کرنے پر انحصار کرتا ہے اس وقت ایک محتاط اندازے کے مطابق آزاد کشمیر کے بیس (20) اور پچیس (25) لاکھ کے لگ بھگ شہری مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور شمالی امریکہ میں روزگار کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ آزاد کشمیر کے شہریوں کی ہمیشہ سے یہ شکایت رہی ہے کہ انہیں اپنے قدرتی وسائل کے فوائد سے محروم رکھا گیا ہے اس وقت آزاد کشمیر میں بجلی کے کئی پراجیکٹ لگائے گئے ہیں لیکن ان کا کنٹرول پاکستان کے پاس ہے جس کی وجہ سے آزاد کشمیر کا خطہ ایک طرف تو بجلی کی پیداوار کی انکم سے محروم ہے تو دوسری طرف بجلی کے استعمال کے لیے بھی پاکستان کا محتاج ہے آزاد کشمیر کی مقامی سیاسی لیڈر شپ میں ذرا بھی ہمت نہیں ہوتی ہے کہ وہ پاکستان سے مل بیٹھ کر اپنے وسائل کو استعمال کرنے کا حق ہی حاصل کر لیں۔ ایسی لیڈر شپ کا عوام کو کیا فائدہ ہے جو ان کے مفادات کے خلاف کام کرتی ہو۔

آزاد کشمیر کے لیڈروں کی تابعداری کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے عوام کو بنیادی سہولتوں سے محروم رکھنے اور اپنے وسائل کو پاکستان کے کنٹرول میں رکھنے پر فخر کرتے ہیں اپنے عوام کو اندھیروں میں رکھ کر پاکستان کو روشن رکھنے کا نعرہ تمام سیاسی رہنماؤں کا مشترکہ ہے اس پر کسی بھی سیاسی لیڈر اور جماعت کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا چونکہ پاکستان میں حقوق مانگنے والے سیاسی لیڈروں کو شروع سے ہی غدار تصور کیا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر کے لیڈروں کو اپنا علاقائی حق مانگنے سے اور اپنے وسائل کا جائز حصہ لینے سے بھی ڈر لگتا ہے اور خوف کی وجہ سے وہ اپنے علاقائی حقوق کا ذکر کرنے سے گھبراتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں ایک بھی سیاسی جماعت یا کوئی ایک لیڈر موجود نہیں ہے جو اپنے عوام کے لیے پاکستان سے صرف اتنا ہی کہہ دے کہ آزاد کشمیر کے وسائل کو آزاد کشمیر پر خرچ کیا جائے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہاں ایسا تابعداری اور غلامی پر مبنی سیاسی کلچر کو فروغ دیا گیا ہے جو اس خطے کے عوام میں شدید مایوسی اور احساس محرومی پیدا کر چکا ہے اور اس وقت عوام اور آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈروں کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ چکا ہے۔ آزاد کشمیر میں بچوں سے مشقت کا کام لیا جاتا ہے جبکہ آزاد کشمیر حکومت نے 2016ء میں ایک ایکٹ کے ذریعہ آزاد کشمیر میں بچوں سے مشقت کے کام پر پابندی عائد کر دی ہے

اور اسے ایمپلائمنٹ چائلڈ ایکٹ 2016ء کہا گیا ہے جس میں بچوں کو ملازمت میں رکھنے پر پابندی لگائی تھی اور اس ایکٹ میں 2017ء میں ترمیم کی گئی تھی اس ترمیم شدہ قانون کے مطابق آزاد کشمیر کے کسی بھی کاروبار میں آزاد کشمیر کے رہائشی کو 17 سال سے کم عمر میں ملازمت میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اس کے باوجود آزاد کشمیر کے خطے میں پھیلی ہوئی غربت کی وجہ سے بچوں کو کام کر کے خاندان کی انکم میں حصہ دار بننا پڑتا ہے گو کہ آزاد کشمیر میں روزگار کے مواقع بڑوں کے لیے ہی موجود نہیں ہیں تو بچوں کو روزگار کہاں سے ملے گا اس کے باوجود دیہاتوں اور گاؤں کی سطح پر والدین اپنے بچوں سے مل کر محنت مشقت کا کام کرتے ہیں اور اپنے پیٹ پالتے ہیں آزاد کشمیر میں بچوں کی بڑی تعداد سکول جاتی ہے کیونکہ تعلیم کے بغیر انہیں یقین ہے کہ بڑے ہو کر روزگار نہیں ملے گا جو والدین بہت زیادہ غریب ہیں وہ مجبور ہوتے ہیں کہ بچوں کو پاکستان کے شہروں میں ہوٹلوں کی نوکری اور گھریلو ملازمتوں میں اپنے بچوں کو کام کرنے دیتے ہیں کئی معذور والدین ہوتے ہیں جنہیں آزاد کشمیر حکومت پوری مدد نہیں کرتی جس کی وجہ سے ان کے بچوں کو تعلیم چھوڑ کر محنت مشقت کر کے اپنے والدین کی روزی روٹی کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ حکومت آزاد کشمیر کو غریب ، نادار اور خاص کر معذور افراد کی کفالت کے لیے نیا پروگرام شروع کرنا چاہیے۔

1۔ سردار ابراہیم حکومت کا خاتمہ اور پونچھ بغاوت :۔

فروری 1955ء میں آزاد کشمیر کی تحصیل سندھنوتی میں پاکستانی ریاست کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی اور ایک سال تک یہ بغاوت جاری رہی۔ اکتوبر 1956ء میں اس بغاوت کو پاکستانی سیکیورٹی فورسسز نے کچل دیا تھا۔ پونچھ بغاوت کا لاوا اس وقت پکنا شروع ہوا جب 1950ء میں سردار ابراہیم خان کو صدر کے عہدے سے برخاست کر دیا گیا۔ سردار ابراہیم خان نے 1947ء کے قبائلی حملے میں نہ صرف پاکستان کی حمایت کی تھی بلکہ پونچھ کی تحصیل باغ اور سندھنوتی کے علاقوں میں مہاراجہ کے خلاف مقامی فوجیوں کی بڑی تعداد کو ریاستی حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کیا تھا۔ سردار ابراہیم خان کو تحصیل سندھنوتی اور

باغ سے ریاستی اسمبلی پرجا سبھا کا ممبر بھی منتخب کیا گیا تھا جس اسمبلی کے انتخابات 1946ء میں کروائے گئے تھے۔ یہ متحدہ ریاست کے آخری انتخابات ثابت ہوئے۔

سردار ابراہیم نے مہاراجہ حکومت کا حصہ ہوتے ہوئے بھی پاکستان کا ساتھ دیا تھا کیونکہ جموں خطے میں مسلم کانفرنس ریاست جموں کشمیر کا الحاق پاکستان سے کرنے کے لیے مہم چلا رہی تھی اور اس جماعت کا سربراہ چوہدری غلام عباس 1946ء کی سول نافرمانی کی تحریک کے دوران جیل میں قید تھا۔ سردار ابراہیم خان کو کشمیر لبریشن کمیٹی کا ممبر بنایا گیا تھا جو پاکستانی حکومت کی ایماء پر بنائی گئی تھی۔ 1947ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف پونچھ کے لوگوں کو تیار کرنے کے لیے سردار ابراہیم خان کا کلیدی کردار تھا۔ 24 اکتوبر 1947ء کو انہوں نے آزاد کشمیر حکومت کے صدر کا حلف لیا اور 12 مئی 1950ء کو انہیں حکومت پاکستان نے صدارت کے عہدے سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد سید علی احمد شاہ کو 30 مئی 1950ء کو صدر بنایا گیا اور 2 دسمبر 1951ء کو میر واعظ یوسف شاہ کو صدر آزاد کشمیر بنایا گیا لیکن یہ 18 مئی 1952ء تک ہی صدارت کے عہدے پر رہے۔ 18 مئی 1952ء کو راجہ حیدر خان کو صدر بنایا گیا لیکن انہیں صرف 33 دنوں کے لیے صدر بنایا گیا تھا۔ 21 جون 1952ء کو انہیں ہٹا دیا گیا اور کرنل شیر احمد خان کو 21 جون 1952ء کو آزاد کشمیر کا صدر بنایا گیا تھا۔ کرنل شیر احمد 30 مئی 1956ء تک آزاد کشمیر کے صدر رہے اور ان کے دور میں ہی پونچھ میں بغاوت ہوئی اور ان کے دور میں ہی اسے کچل دیا گیا تھا۔ اس کے بعد 30 مئی 1956ء میں ایک بار پھر کرنل شیر احمد کو ہٹا کر میر واعظ یوسف شاہ کو صدر بنایا گیا اور 4 ماہ کے بعد میر واعظ کو بھی ہٹا دیا گیا اور سردار قیوم کو صدر بنایا گیا۔ 7 ماہ کے بعد انہیں بھی صدارت سے ہٹا کر ایک بار پھر سردار ابراہیم خان کو 13 اپریل 1957ء میں آزاد کشمیر کا صدر بنایا گیا اور 30 اپریل 1959ء کو انہیں ہٹا کر یکم مئی 1959ء میں خورشید حسن خورشید کو آزاد کشمیر کا صدر بنایا گیا۔ کے ایچ خورشید صاحب 7 اگست 1964ء تک آزاد کشمیر کے صدر رہے۔ انہیں ہٹا کر عبدالحمید خان کو صدر بنایا گیا اور انہیں 7 اکتوبر 1969ء کو صدارت سے ہٹا کر بریگیڈیئر عبدالرحمان کو صدر بنایا گیا اور انہیں بھی 30 اکتوبر 1970ء کو ہٹا کر سردار عبدالقیوم خان کو صدر بنایا گیا جو 16 اپریل

1975ء تک صدر رہے۔

1970ء میں آزاد کشمیر میں ایکٹ 1970ء لایا گیا اور پھر 1974ء میں اس ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور ایکٹ 74 لایا گیا اس ایکٹ 74 کے تحت آزاد کشمیر میں پارلیمانی نظام متعارف کروایا گیا اور پہلی بار بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزاد کشمیر میں حکومتوں کا نظام لایا گیا لیکن یہ محدود جمہوری نظام تھا اس کے پاس اختیارات محدود تھے۔ اس نظام میں بھی سردار عبدالقیوم خان کو صدارت سے ہٹا کر ایک بار پھر سردار ابراہیم خان کو 5 جون 1975ء سے 30 اکتوبر 1978ء تک صدر بنایا گیا۔ پھر ایک بار بریگیڈیئر حیات خان کو لایا گیا منتخب حکومتوں کا نظام بھی نہ چلنے دیا گیا تو اب آزاد کشمیر کے ان لیڈروں کو علم ہو گیا تھا کہ پاکستان کی حکومتوں کے ارادے کیا ہیں اور پاکستان کسی صورت آزاد کشمیر میں ایک جمہوری طرز کا خود مختار ڈھانچہ تشکیل دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جبکہ سردار ابراہیم جیسے لیڈروں کی شاید پہلے یہ غلط فہمی تھی کہ پاکستان میں شامل ہونے سے انہیں اپنے علاقوں میں اپنی مرضی سے ریاستی معاملات چلانے کی اجازت ہو گی یہی وجہ تھی کہ سردار ابراہیم خان ریاست جموں کشمیر کی ریاستی اسمبلی کے ممبر ہونے کے باوجود آزاد کشمیر میں 1947ء میں مہاراجہ ہری سنگھ حکومت کے خلاف چلنے والی مہم کا حصہ بن گئے تھے۔ پھر اسی دوران آزاد کشمیر میں قبائلی حملہ ہوا۔ اس حملے کا فیصلہ لاہور میں پاکستانی وزیر اعظم لیاقت علی خان کی سربراہی میں ہونے والے اجلاس میں کیا گیا تھا۔ اس جلاس میں کشمیر لبریشن کمیٹی بھی بنائی گئی تھی سردار ابراہیم خان کو اس لبریشن کمیٹی کا ممبر بنایا گیا تھا۔ اس لبریشن کمیٹی کا ممبر بن جانے سے سردار ابراہیم خان کو پاکستان کی طرف سے مکمل حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ اس لبریشن کمیٹی کے ذمے ریاست پر حملہ کر کے قبضہ کرنا تھا اور ریاست کو پاکستان میں شامل کرنا تھا۔

سردار ابراہیم خان کو آزاد کشمیر کے صدر کے عہدے سے اس لئے ہٹایا گیا تھا کہ انہوں نے آزاد کشمیر حکومت کے لیے مزید خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا۔ انتظامی امور اور بجٹ کے حوالے سے مزید اختیارات آزاد کشمیر کے عوام کی بنیادی مانگ تھی اسی لیے آزاد کشمیر کے لوگوں نے پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ اسی جمہوری آزادی کے لیے آزاد کشمیر میں سب سے پہلے

پونچھ کی دو تحصیلوں میں لوگوں نے پاکستان کے حق میں ریاست جموں کشمیر کی فوج سے لڑائی شروع کی تھی۔ اسی لڑائی کی قیادت جس سیاسی لیڈر کے ہاتھ میں تھی وہ سردار ابراہیم خان ہی تھا لیکن آج اس لیڈر پر پاکستان بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ پاکستان کو شک ہو گیا تھا کہ آزاد کشمیر کے خطے کو پاکستان میں شامل کرنے کے مقاصد وہ نہیں تھے جو سردار ابراہیم وغیرہ لوگوں کو بتا کر ان کی حمایت حاصل کی گئی تھی۔ جونہی سردار ابراہیم خان نے اس خطے کے لیے محدود انتظامی اختیارات کا مطالبہ کیا انہیں فوراً عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ ڈوگرہ فوج سے جنگ لڑ کر اور قبائلی حملے کا ساتھ دینے کا مقصد صرف ایک ہی تھا کہ ریاست کو پاکستان کا حصہ بنانا ہے جبکہ ریاست کے مہاراجہ ہری سنگھ نے ہندوستان اور پاکستان سے الحاق کرنے سے انکار کر دیا تھا اور دونوں ملکوں کو معاہدہ قائمہ کرنے کی پیشکش کر دی تھی جس کو پاکستان نے قبول کر لیا تھا اور ہندوستان نے مزید وقت مانگا تھا۔ آزاد کشمیر میں انگریز فوج سے ریٹائرڈ ہو کر آئے فوجی اہلکاروں نے مہاراجہ کے ریاست کو دونوں ملکوں سے آزاد رکھنے کے منصوبے کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کر دی جس کے رابطے پاکستان کے فوجی افسران اور اس علاقے کے حاضر سروس پاکستانی فوجی اہلکاروں سے تھے کیونکہ کچھ دنوں کے بعد اس علاقے کے حاضر سروس فوجی بھی اپنا فوجی اسلحہ لے کر آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے اور اب یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ خود آئے تھے یا انہیں بھیجا گیا تھا ان میں سے کچھ نے کہا کہ انہیں آزاد کشمیر میں آنے سے روکا نہیں گیا بلکہ حوصلہ افزائی کی گئی تھی اس کے بعد ہی قبائلی اور پھر پاکستانی فوج داخل ہو گئی تھی ان سپاہیوں نے پاکستانی حملے کے لیے راستہ صاف کیا تھا اور پاکستان بھی ہندوستان نے جو کچھ جونا گڑھ میں کیا تھا اسی عمل کو ریاست میں دوہرانہ چاہتا تھا چونکہ پاکستان کے پاس جواز موجود تھا لیکن پاکستان ریاستی حکومت سے معاہدہ قائمہ (Standstill) بھی کر چکا تھا اس لیے پاکستان کے لیے اس حملے میں اپنی فوج اور اپنے شہریوں کو ملوث کرنا ممکن نہیں تھا یہی وجہ تھی پاکستان نے اپنا سارا م کام آزاد کشمیر کے ان ریٹائرڈ اور حاضر سروس فوجیوں سے کروایا تھا اور اسے مقامی بغاوت جو مہاراجہ کے خلاف تھی کا بہانہ بنایا تھا اور اپنی طرف سے قبائلیوں کو بھیج کر اپنی ریاست کے ملوث ہونے کے کوئی ثبوت نہیں مہیا کیے تھے۔ گویا آزاد کشمیر کے علاقوں کو

کنٹرول کرنے کے لیے پاکستان نے کئی گروپوں کو الگ الگ استعمال کیا تھا لیکن بڑی تعداد فوجیوں کی تھی سویلین میں سے بہت کم لوگ تھے جنہوں نے اپنی ریاستی فوج کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا لیکن عوام کی اکثریت کو زیادہ علم نہیں تھا لیکن ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہی تھیں لیکن ریاستی عوام میں سے کوئی بھی ریاست کے ٹکڑے کرنے کے حق میں نہیں تھا یہ تو عام آزاد کشمیر کے بندے کو تب علم ہوا جب ریاست اس لڑائی کے دوران ٹکڑے ہو گئی تب ان کے سامنے یہ نعرہ لگایا گیا تھا کہ آزاد کشمیر تو آزاد ہو گیا ہے باقی ریاست بھی اسی طرح پاکستان آزاد کروا کر اپنے ساتھ شامل کرے گا جبکہ یہ ایک پورا منصوبہ تھا جس کے پیچھے انگریز اور ہندوستان پاکستان کے چند لیڈرز بھی تھے اور یہ ریاست آج تک تقسیم ہی ہے اور اس تنازعہ کو حل نہیں کیا جا سکا۔

2۔ پونچھ میں 1955ء کی بغاوت

سردار ابراہیم کو آزاد کشمیر کے صدر کے عہدے سے 12 مئی 1950ء کو ہٹایا گیا تو وہ واپس اپنے حمایت یافتہ علاقوں میں چلا گیا جو راولاکوٹ اور پلندری کے علاقے تھے جو اس وقت تحصیل سدھنوتی تھی یہ سردار ابراہیم خان کے کمیونٹی یا برادری کا علاقہ تھا اس کے عہدے سے ہٹائے جانے سے یہاں کے لوگوں میں غصہ پیدا ہوا تھا اور لوگوں نے پرتشدد مظاہرے شروع کر دیئے خاص کرے پلندری اور راولاکوٹ کے علاقوں میں مظاہرے زور پکڑ گئے تھے۔ یہاں مقامی سدھن قبائل اور پاکستانی فوج جو ان علاقوں میں تعینات تھی کے درمیان چھڑپیں شروع ہو گئیں ان جھڑپوں کی وجہ سے پاکستان کی حکومت میں تشویش پیدا ہوئی۔ آزاد کشمیر پولیس اس صورتحال کو کنٹرول نہ کر پائی اور پنجاب کانسٹیبلری (P.C) بلائی گئی۔

اسی دوران پاکستان آرمی کی 12 ڈویژن جس کا ہیڈ کوارٹر مری تھا اور آزاد کشمیر میں جو پہلے سے ہی فوج تعینات تھی انہیں بھی بلا لیا گیا اور پونچھ کے ان علاقوں میں مارشل لاء لگا یا گیا۔ یہ لڑائی یکطرفہ نہیں تھی بلکہ سدھن قبائل نے بھی 150 کے قریب پنجاب کانسٹیبلری (P.C) کے اراکین کو پکڑا تھا اور ان سے اسلحہ بھی چھین لیا تھا۔ سدھنوں نے حکومت مخالف

لڑائی کا آغاز فروری 1955ء میں آزاد کشمیر کے صدر کرنل شیر احمد پر قاتلانہ حملے سے کیا تھا اور وہ معجزانہ طور پر بچ گیا تھا۔ حالانکہ کرنل شیر احمد خان بھی سندھن کمیونٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ پولیس نے صدر پر حملے کرنے والوں کو گرفتار کرنے کے لیے پلندری کی ایک مسجد میں داخل ہوگئی اس موقع پر فوج اور لوگوں میں تصادم ہوا پنجاب کانسٹیبلری (P.C) نے اس بغاوت کو بے دردی سے کچلنے کا فیصلہ کیا جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا انہیں پنجاب پراسیکیوٹنگ ایجنسی کے حوالے کیا گیا تھا جو ایک دہشت کی علامت بن چکی تھی اور ایک سال تک جو لوگ گرفتار کیے گئے تھے اسی حالتِ دہشت میں رکھے گئے تھے۔ یہ مذاحمتی تحریک سردار ابراہیم کی صدارت کے عہدے پر بحالی اور مزید جمہوری حقوق کا مطالبہ کر رہی تھی۔ سردار ابراہیم کو جونہی صدارت سے ہٹایا گیا 1951ء میں ایک متوازی حکومت کا اعلان بھی کیا گیا تھا اور اس کا دائرہ صرف تحصیل سندھنوتی کے علاقوں تک محدود تھا کیونکہ اس متوازی حکومت کی دیگر قبائل نے بھی حمایت نہیں کی تھی اور آزاد کشمیر کے دوسروں علاقوں میں سردار ابراہیم کا اثر ورسوخ نہ تھا اس لئے یہ بغاوت باغ کے چند دیہاتوں میں ضرور پھیلی لیکن یہ پونچھ کی دونوں تحصیلوں کی عوام کی بھرپور حمایت سے محروم رہی اور سردار ابراہیم کے قبیلے تک ہی محدود رہی جبکہ باغ کے شمالی علاقوں میں دوسری کمیونٹی کے افراد بھی اس میں ملوث رہے لیکن سڑکوں کے کنارے باغ کے علاقوں میں فوج نے اس تحریک کو سختی سے کچل دیا تھا۔ پاکستان نے میجر عثمان کی قیادت میں فوج کی جو ٹکڑی پونچھ کی بغاوت کچلنے کے لیے بھیجی تھی اس کی تعداد 120 فوجی اہلکاروں پر مشتمل تھی۔ سردار ابراہیم کے حمایتی لوگوں کو ابتدائی جھڑپوں کے دوران ہی غیر مسلح کر دیا گیا تھا اور یہ سارا کام وزارت امور کشمیر کی زیر نگرانی کیا گیا تھا جس کا وزیر مشتاق احمد گورمانی تھا اسلحہ چھین کر حکومت پاکستان کے حوالے کیا گیا تھا۔

اس لڑائی میں کتنے لوگ دونوں طرف سے مارے گئے کوئی ریکارڈ موجود نہیں ایسا لگتا یہ محدود قبائلی بغاوت تھی اور تھوڑے سے علاقوں تک محدود تھی اس لیے اس کا ذکر کیا ہی نہیں گیا اگر کیا بھی گیا ہے تو بہت محدود معلومات دی گئی ہیں البتہ سردار عبدالقیوم خان نے لکھا ہے اپنی کتاب (مقدمہ کشمیر) میں کہ 1955ء میں پنجاب پولیس لائی گئی تھی آزاد کشمیر میں اور یہ

ہماری تاریخ پر سیاہ دھبہ موجود رہے گا اور جب مجھے (سردار قیوم کو) آزاد کشمیر کا 1956ء میں صدر بنایا گیا تو اس دوران لوگوں کو جیل سے رہا کیا گیا اور کچھ لوگوں کو ازالہ کرنے کے لیے کچھ پیسہ میں نے مدد کے لیے دیا گیا تھا لیکن جن لوگوں کے گھر جلائے گئے تھے انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا تھا۔ سردار ابراہیم خان نے وزارت امور کشمیر کو آزاد کشمیر کی اس مذاحمتی تحریک کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ اس تحریک کو پاکستان کی بیوروکریسی کی خوشنودی کے لیے ابتداء میں جبر سے ختم کیا گیا تھا۔ آزاد کشمیر میں جمہوریت کے بارے میں سردار ابراہیم خان نے کہا کہ یہ جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے اور جمہوریت کی بدترین مثال ہے اس جمہوریت نے آزاد کشمیر کے عوام کی کوئی خدمت نہیں کی۔ وزارت امور کشمیر عوام کو ہمیشہ تقسیم کرتی ہے اور انہیں آپس میں لڑاتی ہے۔ پونچھ کی بغاوت کی وجہ سے مقامی آزاد کشمیر کی حکومت نے اور وزارت امور کشمیر نے چند سخت قسم کے سیکیورٹی قوانین بھی بنائے تھے سیکیورٹی قوانین کے تحت مندرجہ ذیل ایکٹس بنائے گئے تھے۔

۱۔ آزاد کشمیر پبلک سیفٹی ایکٹ 1953ء

Act 1953 Safty1-AJK Public

۲۔ پلندری سپیشل گڑبڑ ایکٹ 1955ء اور 1956ء

Disturbance Speciali Act Pallandari2-

۳۔ کنٹرول آف غنڈہ ایکٹ 1956ء

Goondas Act of Control3-

۴۔ آزاد کشمیر میں اغوا شدہ افراد کا ریکوری ایکٹ 1953ء اور 1956ء

Abducted Persons Act 4- AJK Recovery of 1953-1956

اس پونچھ بغاوت کے بہانے آزاد کشمیر میں سویلین کے حقوق پر مزید قدغن لگائی گئی اور پاکستان نے ان علاقوں پر وزارت امور کشمیر کا کنٹرول مزید سخت کر دیا تھا تاہم 1952ء میں عام انتخابات کروائے گئے تھے۔ جس میں کرنل شیر احمد خان کو آزاد کشمیر کا صدر

بنوایا گیا تھا اس دوران اکتوبر 1952ء میں آزاد کشمیر رولز آف بزنس بنایا گیا تو اس کے تحت تمام انتظامی اختیارات وزارت امور کشمیر کے جوائنٹ سیکرٹری کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ جس طرح ہندوستان نے اپنے زیر کنٹرول جموں کشمیر کے علاقوں کو اپنا کنٹرول مضبوط کرنے کے لیے اپنے ہی حمایت یافتہ پاپولر لیڈر شیخ عبداللہ کو 1953ء میں جیل میں ڈال کر ان کی وفاداریوں کا صلہ دیا تھا اور شیخ عبداللہ کے ساتھیوں کے ذریعہ ہندوستان نے وہی کام کیا تھا جو آزاد کشمیر کے علاقوں میں سردار ابراہیم کے ساتھیوں کے ذریعہ کیا گیا تھا۔ شیخ عبداللہ کو ہندوستان سے وفاداری کی سزا لمبا عرصہ جیل میں ڈال کر دی گئی تھی اور سردار ابراہیم کی پاکستان سے 1947ء میں کی گئی وفاداری کی سزا سارے آزاد کشمیر کے عوام اور خاص کر پونچھ کے عوام نے جبر وتشدد کی صورت میں بھگتی تھی۔ پاکستان نے 1947ء کے تمام وفاداروں کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو ہندوستان نے اپنی طرف ریاست میں اپنے وفاداروں سے کیا تھا۔ شاید ریاست کی لیڈرشپ دونوں طرف یہ بھول گئی تھی کہ دوسرے ملکوں سے تعلقات کسی مذہبی جوش وجذبے کی بنیاد پر قائم نہیں کیے جاتے اور نہ ہی ذاتی پسند وناپسند کی بنیاد پر ملکوں اور خطوں کے آپس میں تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کے عوام اور لیڈروں کے لیے اپنی 75 سالہ تقسیم شدہ ریاست کی تاریخ میں بہت سے اسباق ہیں لیکن ابھی تک کسی نے اس بٹوارے کی تاریخ میں بے شمار دکھ سہنے کے باوجود کچھ بھی سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ جو لوگ تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتے انہیں تاریخ وہی غلطیاں بار بار دہرانے پر مجبور کرتی ہے۔ ریاست جموں کشمیر کے تقسیم شدہ ہر خطے کے لیے عبرتناک اسباق موجود ہیں ریاستی لیڈروں نے 1947ء میں جس ملک کا بھی ساتھ دیا اس کے ہاتھوں ان لیڈروں اور عوام دونوں نے بے پناہ دکھ اٹھائے۔ ریاست کے آزاد کشمیر والے خطے میں موجودہ سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کو دیکھ کر اور سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کا کردار دیکھ کر اندھیروں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

☆☆☆☆

بارہواں باب

گلگت بلتستان 1947ء سے آج تک حکومتوں کا ڈھانچہ اور حیثیت

گلگت بلتستان کے علاقے 1947ء سے پہلے ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہوا کرتے تھے اور 1947ء کے بعد گلگت اور بلتستان پاکستان کے کنٹرول میں آ گئے اور لیہ اور کارگل ہندوستان کے کنٹرول میں رہ گیا تھا بلتستان لدّاخ سے ہی جدا کیا گیا ہے ریاست جموں کے متنازعہ ہونے کی وجہ سے یہ خطہ بھی اسی تنازعہ کے ساتھ ریاست کا متنازعہ خطہ بن گیا۔اس وقت گلگت بلتستان کے جو علاقے پاکستان کے کنٹرول میں ہیں یہ مغرب کی طرف سے پاکستان کے صوبہ پختون خواہ کے ساتھ ملتے ہیں اور جنوب مغرب کی طرف سے آزاد کشمیر اور شمال مغرب کی طرف سے واہ خان کی پٹی ان علاقوں کو افغانستان سے ملاتی ہے، شمالی کی جانب یہ علاقے چین کے خود مختار صوبے سنگیانک سے اور ہندوستان کے زیر کنٹرول جموں کشمیر کے علاقوں سے جنوب اور جنوب مشرق سے ملتے ہیں تاریخی لحاظ سے بھی اور جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ خطے بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں یہاں دنیا کی تین بڑی ایمپائرز ملتی تھیں زار روس کی بادشاہت، چین اور ہندوستان کی برطانوی بادشاہت اسی علاقے میں ایک دوسرے سے ماضی میں نبرد آزما بھی رہیں ہیں۔14 ویں صدی کے زمانے میں ان علاقوں میں ایران اور سنٹرل ایشیاء سے مسلم صوفی اسلام کی تبلیغ کے لیے ان علاقوں میں آئے اور گلگت کے علاقوں میں بھی اسلام اسی زمانے میں آیا جو ترک حکمران خاندان ترکھان کے ذریعہ آیا تھا۔گلگت

بلتستان پر کئی مقامی حکمران خاندانوں نے حکمرانی کی۔ بلتستان اور لدّاخ پر کئی چھوٹے چھوٹے حکمران خاندان گزرے ہیں لدّاخ کے علاقوں پر جس میں بلتستان بھی شامل ہے۔

جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے 1834ء میں پہلی بار قبضہ کرلیا ان علاقوں پر چھوٹے راجواڑوں کی حکمرانی کے باوجود ان پر کنٹرول تبّت کی بادشاہت کا تھا۔ گلاب سنگھ کے قبضے کو تبّت کی بادشاہت نے 1842ء میں جوشال معاہدے میں تسلیم کیا تھا اور یہ علاقے اس کے بعد جموں کی ریاست کا حصہ بن گئے تھے گلگت کا علاقہ پنجاب کی سِکھ خالصہ دربار نے کشمیر کے صوبے کی طرف سے اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا جب صوبہ کشمیر 1846ء کے معاہدہ امرتسر کے نتیجہ میں جموں کی ریاست کو منتقل کیا گیا تو گلگت کے وہ علاقے بھی گلاب سنگھ کی ریاست کو مل گئے جو دریائے سندھ کے مشرق کی طرف تھے اس طرح لدّاخ اور گلگت بلتستان ریاست جموں کشمیر کا حصہ بن گیا۔ اس کے بعد رنبیر سِنگھ کے دور میں ہنزہ اور نگر کی ریاستوں کو بھی جموں کشمیر کی ریاست کا حصہ بنا لیا گیا۔ جب 1947ء میں ہندوستان کے بٹوارے کا اعلان کیا گیا تو ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان علاقوں کی عوام مذہبی بنیادوں پر پاکستان کا حصہ بننا چاہتی تھی۔ گلگت ایجنسی انگریز کے کنٹرول میں لیز (Lease) پر تھی جو 1947ء میں ریاست جموں کشمیر کو واپس کر دی گئی تھی۔ گلگت کے لوگ قومیت کے لحاظ سے کشمیری اور ڈوگرہ نہیں تھے۔ اس لیے یہاں کے عوام ڈوگرہ راج سے خوش نہیں تھے۔

جب 1947ء میں ریاست کے مہاراجہ نے ہندوستان اور پاکستان سے ریاست کا الحاق کرنے کی بجائے دونوں ملکوں کے درمیان بفرزون یا اپنی ریاست کو دونوں ملکوں کے درمیان غیر جانبدار ملک کے طور پر رکھنے کی کوشش کی تو گلگت اسکاؤٹس کے انگریز کمانڈر میجر ولیم براؤن نے اسکاؤٹس کے ذریعہ مہاراجہ حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور ان علاقوں کا کنٹرول پاکستان کے حوالے کر دیا۔ بقول میجر براؤن جب گلگت اسکاؤٹس کے مقامی اہلکاروں سے ملا تو انہوں نے بلا واسطہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ جموں کشمیر کی ریاست سے کتنے ناخوش تھے۔ وہ اس ریاست سے اور اس سے جُڑی ہوئی ہر چیز سے نفرت کرتے

تھے۔ وہ انگریز کے کنٹرول میں بہت خوش تھے۔ وہ ایسا محسوس کرتے تھے کہ انگریز نے انہیں واپس ریاست جموں کشمیر کی حکومت کے حوالے کر کے دھوکہ دیا ہے اور بغیر کسی شرط کے ان کے ملک کو ریاستی حکومت کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ انگریز آفیسر اور گلگت اسکاؤٹس کے کمانڈر میجر براؤن کے بیانات ہیں جو اس نے اپنے ماتحت کام کرنے والے گلگت اسکاؤٹس کے اہلکاروں کی طرف سے دیئے ہیں۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میجر براؤن (Brown) نے اپنے ماتحت کام کرنے والے اسکاؤٹس کو استعمال کرتے ہوئے مہاراجہ حکومت کے خلاف اور پاکستان کے حق میں بغاوت کر کے یہ علاقے پاکستان کے کنٹرول میں دے دیئے۔ میجر براؤن کا ساتھ جموں کشمیر 6 انفنٹری کے مرزا حسن خان نے بھی دیا تھا۔

جموں کشمیر فوج کی 6 انفنٹری نے میجر براؤن کا ساتھ اس وقت دیا تھا جب قبائلی حملے کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ نے 26 اکتوبر 1947ء کو ہندوستان سے الحاق کر لیا تھا۔ میجر براؤن گلگت بلتستان کے عوام کے جذبات سے واقف تھا اور خود بھی ان علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے سرحد کی حکومت سے رابطے میں تھا اور فوجی بغاوت کی ہدایات لے رہا تھا۔ میجر براؤن نے یکم نومبر 1947ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کا ملازم ہوتے ہوئے بھی پاکستان کے لیے فوجی بغاوت کی ظاہر ہے ایسا کام کرنے کے لیے اس نے گلگت اسکاؤٹس کے اندر مہم چلائی ہوگی اور اپنے منصوبے میں کئی اہلکاروں کو شامل کیا ہوگا اور ریاست سے باہر خاص کر صوبہ سرحد میں اس کے رابطے پہلے سے موجود ہوئے ہوں گے اور کسی کی ہدایت کے مطابق کام کیا ہوگا کیونکہ بقول میجر براؤن کے جب گلگت اسکاؤٹس کے اہلکاروں نے بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے جموں کشمیر کی ریاستی حکومت کا حلف قرآن پر لیا ہوا تھا اور اس کی خلاف ورزی ہوگی تو تب میجر براؤن نے گلگت اسکاؤٹس کے ممبران کو بتایا تھا کہ اس نے قرآن پر نہ مسلم ممبران کو حلف دیا تھا نہ خود بائیبل (Bible) پر حلف لیا تھا بلکہ قرآن اور بائبل کی جگہ کپڑے کے غلاف میں اس نے اور اس کے ساتھیوں نے انگریزی کی ڈکشنری لپیٹ کر رکھی ہوئی تھی جس کتاب پر آپ لوگوں نے ہاتھ رکھ کر اسکاؤٹس کا حلف لیا تھا وہ مقدس کتاب نہیں بلکہ انگریزی ڈکشنری تھی۔ اس سے

ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز حکومت کے اہلکار خفیہ سرگرمیوں کے ذریعہ ریاست جموں کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کے لیے جگہ جگہ سرگرم تھے۔ کس طرح ریاست جموں کشمیر کی فوج اور سیکیورٹی کے اداروں کے اہلکاروں کو اپنی ہی ریاست کے خلاف اور اپنی عوام کے خلاف استعمال کیا جارہا تھا انگریز اہلکاروں کی یہ مکارانہ چالیں خود ان کے اپنے فوجی دماغوں کی اختراع نہیں ہوسکتی بلکہ گریٹ گیم (Great Game) کا منصوبہ انگریز حکومت نے پورے ہندوستان کے بٹوارے کے لیے تیار کررکھا تھا۔ بہرحال میجر براؤن نے اپنے خفیہ ایجنڈے کے مطابق یکم نومبر 1947ء کو گلگت کے گورنر گنھسا راسنگھ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس فوجی بغاوت میں کوئی خون خرابہ نہیں ہوا تھا۔ دوسرے دن 2 نومبر 1947ء میں اسکاؤٹس لائن میں پاکستان کا جھنڈا لہرایا گیا اور اس عبوری حکومت گلگت بلتستان کا اعلان کیا گیا تھا جس کا صدر شاہ رئیس خان کو اور مرزا حسن خان کو کمانڈر انچیف اور میجر براؤن کو چیف ملٹری ایڈوائزر بنایا گیا تھا۔ تاہم میجر براؤن نے سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کو پہلے ہی ٹیلگرام کردیا تھا اور پاکستان کو دعوت دے دی تھی کہ وہ ان علاقوں کا کنٹرول سنبھالیں۔

پاکستانی پولیٹیکل ایجنٹ عالم خان 16 نومبر 1947ء کو آیا اور گلگت بلتستان کے انتظامی امور کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ 18 نومبر 1947ء کو عبوری حکومت نے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے کی درخواست کی اور کہا کہ پولیٹیکل ایجنٹ تمام فیصلے عبوری حکومت کی مرضی سے کرے عبوری حکومت نے پولیٹیکل ایجنٹ عالم خان سے یہ مانگ بھی کی تھی کہ دونوں انگریز آفیسرز کو ان کی خدمات سے سبکدوش کر کے ان کی جگہ عبوری حکومت کے فوجی آفیسرز کو مقرر کیا جائے یہ میجر براؤن نے لکھا ہے اور بقول اس کے عالم خان نے عبوری حکومت کے اہلکاروں اور لیڈروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا ''تم بیوقوفوں کا ایک ہجوم ہو جسے ایک پاگل بندہ آواروں کی طرح لیے پھرتا ہے۔ میں ایسی بیوقوفی کی کبھی ایک مثال کو بھی برداشت نہیں کروں گا اور جب ہندوستانی فوج نے آپ پر حملے کرنے شروع کردیئے تو اس وقت پاکستان کی مدد کے لیے مت چلانا کیونکہ وہ مدد تمہیں نہیں ملے گی۔ عبوری حکومت عالم خان سے ملنے کے بعد غائب ہوگئی۔ اس کی طاقت کا اثر اور حمایت صاف طور پر اس گلگت حکومت کی عکاس تھی اور

اس حکومت کی موقع پرستانہ فطرت ظاہر ہورہی تھی۔ یہ گلگت بلتستان کی عبوری حکومت صرف 16 دن قائم رہی۔گلگت بلتستان کی بغاوت میں سویلین نے نہ ہونے کے برابر حصہ لیا تھا اور یہ پوری طرح سے فوجی لیڈرشپ کا کام تھا لیکن ان میں سے بھی سارے پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں نہیں تھے۔

دانی نے لکھا کہ اس بغاوت میں عوام کی شمولیت بالکل بھی موجود نہیں تھی لیکن گلگت کی سویلین آبادی میں پاکستان نواز جذبات موجود تھے اور اسی طرح ریاست جموں کشمیر مخالف جذبات بھی صاف پائے جاتے تھے۔گلگت کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد گلگت اسکاؤٹس اور آزاد کشمیر فوج کے لوگ لدّاخ اور بلتستان کی طرف گئے اور سکردو پر مئی 1948ء میں قبضہ کرلیا تھا۔گلگت بلتستان کا دونومبر 1947ء میں پاکستان میں شامل ہونے پر ہندوستان نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ کسی ہندوستانی لیڈر نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے اسسٹنٹ نریندرا سریلا نے لکھا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن جون 1948ء سے پہلے اپنی گورنر جنرل کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ حل کرنا چاہتا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر وی پی مینن اور گوپالا سوامی آہنگر (Gopala Swami Agnar) نے ریاست جموں کشمیر کے بٹوارے کا ایک منصوبہ تیار کرلیا تھا جس پلان کے تحت گلگت بھی پاکستان کو دینے کا منصوبہ تھا۔ 23 جولائی 1948ء کو وی پی مینن نے امریکہ کے چارج ڈی آفیئرز جو دہلی کی امریکی ایمبیسی میں تعینات تھا کو بتایا تھا کہ حکومت ہندوستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ریاست کے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے میر پور، پونچھ، مظفرآباد اور گلگت کا الحاق پاکستان سے کرنے کے لیے اور اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کے بارے میں ایک طرف یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے استعفیٰ سے پہلے ریاست کا تنازعہ حل کرنا چاہتا تھا جبکہ دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ نہرو ریاست کا تنازعہ لے کر اقوام متحدہ میں ماؤنٹ بیٹن کے دباؤ کی وجہ سے گیا اور لاہور میں پاکستان کے گورنر جنرل محمد علی جناح سے ملاقات میں ماؤنٹ بیٹن نے خود ریاست کا تنازعہ حل کرنے کی بجائے جناح صاحب کو کہا تھا کہ ریاست میں اب استصواب رائے سیکیورٹی کونسل کی زیرنگرانی کروایا جائے گا۔ریاست جموں کشمیر کے

تنازعہ کو الجھانے میں ہر انفرادی کردار نے اور حکومتوں نے اہم رول ادا کیا ہے اور ہر کردار مشکوک بھی نظر آتا ہے۔

حکومت پاکستان نے گلگت بلتستان کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں تو لے لیا تھا لیکن وہاں کوئی باقاعدہ حکومتی سیٹ اپ قائم کرنے کے بجائے گلگت ایجنسی اور بلتستان ایجنسی جو انگریز دور میں قائم کی گئی تھیں دوبارہ قائم کر دیا اور پولیٹیکل ایجنٹ پشاور سے لا کر وہاں بٹھا دیا جو جس طرح چاہے وہاں کے عوام سے سلوک کرے۔ انگریز دور کے کالے قوانین ایف۔سی۔آر۔(فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن) دوبارہ بحال کیا گیا۔ یہ قوانین ہر بندے کو جرائم پیشہ تصور کرتے تھے اور ساری آبادی کو کرائمنلائز (Criminalize) کرتے تھے۔ حکومت پاکستان نے ایجنسیوں کا نظام گلگت بلتستان میں 1947ء سے 1970ء تک قائم رکھا۔ 1970ء میں نادرن ایریاز کونسل تشکیل دی گئی تھی اور اس کے تحت گلگت بلتستان کا انتظام فیڈرل گورنمنٹ نے براہِ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا اور اسے (FANA) (Federally Administred Nothern Areas) فیڈرلی ایڈمنسٹرڈ شمالی علاقہ جات کہا جانے لگا۔ 1963ء میں پاکستان نے ایک معاہدے کے تحت ہنزہ گلگت کا علاقہ راسکم اور شاکسم وادی جو بلتستان کا علاقہ تھا چین کو دے دیا تھا۔ اس کو پاک چین سرحدی معاہدہ 1963ء بھی کہا جاتا ہے۔ شمالی علاقہ جات کا لفظ ان علاقوں کے لیے پہلے اقوام متحدہ نے استعمال کیا تھا۔ ان علاقوں کو ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقہ جات کہا تھا۔ اس وقت گلگت بلتستان کی آبادی 20 لاکھ کے لگ بھگ ہوگی اور رقبہ 28,000 مربع میل ہے اور خطے کی تین ڈویژن اور 10 ڈسٹرکٹ ہیں۔

چار ڈسٹرکٹ گلگت ڈویژن میں اور چار ڈسٹرکٹ بلتستان ڈویژن میں اور دو ڈسٹرکٹ دیامر ڈویژن میں بنائے گئے ہیں۔ 29 اگست 2009ء میں گلگت بلتستان ایمپاورمنٹ اینڈ سلف گورننس آرڈر 2009ء پاکستانی کابینہ نے پاس کیا تھا۔ اس آرڈر کے تحت شمالی علاقہ جات کے عوام کو سلف رول یا اپنی مقامی حکومت کا نظام دیا گیا تھا۔ اس آرڈر میں سابقہ شمالی علاقہ جات کا نام دوبارہ گلگت بلتستان رکھا گیا اور ایک قانون ساز منتخب صوبائی کا

قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے۔ اس خطے کے لوگوں کی علاقائی شناخت بحال کی گئی اور نام بدل دیا گیا لیکن اس خطے کی آئینی حیثیت کا تعین پاکستان میں ابھی تک نہیں کیا گیا۔ تاہم پاکستان کی سپریم کورٹ نے خطے کی آئینی حیثیت کے تعین کے بارے میں حکومت سے کہا تھا اور اپنی ایک ججمنٹ میں اہم فیصلہ دیتے ہوئے انہیں مساوی حقوق دینے کی بات ضرور کی تھی۔ نومبر 2018ء میں سپریم کورٹ کے 7 رکنی بنچ کو بتایا گیا کہ حکومت پاکستان نے ایک ہائی لیول کمیٹی تشکیل دی ہے جو گلگت بلتستان کے آئینی اصلاحات کا جائزہ لے گی۔ پاکستان کی طرف سے گلگت بلتستان کو آئینی حیثیت دینے کے سوال پر نہ صرف مقامی سطح پر پاکستانی اقدام پر تنقید کی گئی بلکہ ہندوستان نے بھی کافی شور مچایا تھا۔ اسی طرح گلگت بلتستان کی کئی سیاسی جماعتوں نے 2009ء کے پیکج کو مسترد کر دیا تھا اور اس کی بجائے گلگت بلتستان کو خود مختار طرز کی قانون سازی اسمبلی دینے کی مانگ کی گئی تھی اور اس مقامی اسمبلی کو اختیارات سمیت تشکیل دیا جائے جو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہو اور گلگت بلتستان کے عوام کی طرف سے اس کا صدر اور وزیر اعظم ووٹوں کے ذریعہ منتخب کیا گیا ہو۔ ستمبر 2009ء کی ابتداء میں پاکستان نے چین کے ساتھ ایک میگا انرجی پراجیکٹ پر دستخط کیے یہ میگا پراجیکٹ گلگت بلتستان کے علاقے بونجی ڈسٹرکٹ اَستور میں شروع کیا گیا تھا جس میں سات ہزار میگا واٹ بجلی کا ایک ڈیم بھی تعمیر کرنا شامل تھا۔ اس ڈیم کی تعمیر پر ہندوستان نے بھی احتجاج کیا تھا جو پاکستان نے مسترد کر دیا تھا اور کہا کہ ہندوستان کی تشویش بے جا ہے اور اس پر ہندوستان کو کسی طرح کا تعلق ظاہر کرنے اور تشویش کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ 29 ستمبر 2009ء کو پاکستان کے وزیر اعظم نے گلگت بلتستان کی ترقی کے لیے کروڑوں روپے کا معاشی منصوبہ کا اعلان کیا تھا جس میں یہاں کے عوام کی معاشی ترقی اور معیار زندگی کو بہتر بنانا شامل تھا۔ اس ترقیاتی منصوبہ میں تعلیم، صحت، زراعت، سیاحت اور زندگی کی بنیادی ضرورتیں شامل تھیں۔

1۔زبانیں اور کلچر

گلگت بلتستان کا خطہ مختلف زبانیں بولنے والے لسانی گروہوں پر مشتمل ہے ان لسانی اور علاقائی گروہوں میں شین (شینا بولنے والے) یاشکون، کشمیری، کاشگری، پامیری، پٹھان اور کوہستانی شامل ہیں۔اس خطے کی زبانیں مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ **شینا (Shina):**۔ یہ دردک زبان ہے اور یہ زبان گلگت، دیامر، چیلاس، داریل،تانگیر، پونیال، گاکوچ (Gahkuch) اور روندو میں بولی جاتی ہے۔

۲۔ **بلتی :**۔ یہ زبان سکردو ، شیگر (Shigar) خارمنگ (Kharmang) گلتاری، کھپلو (Khaplu) اور ماشابروم (Mashabrum) میں بولی جاتی ہے اور بلتی زبان تبّت کی فیملی زبان سے تعلق رکھتی ہے۔

۳۔ **بروشسکی (Burushaski):**۔ یہ زبان نگر-I، ہنزہ،علی آباد،نگر-II اور یاسین میں بولی جاتی ہے۔

۴۔ **خوار(Khowar):**۔ یہ زبان تحصیل گوپس (Gupis) اور تحصیل اشکومن (Ishomen) میں اکثریت کی زبان ہے لیکن یہ زبان یاسین، پونیال اور گاکوچ تحصیل میں بھی بولی جاتی ہے۔

۵۔ **واخی (Wakhi):**۔ یہ زبان ہنزہ کی تحصیل گوجال میں بولی جاتی ہے لیکن اس زبان کو بولنے والے یاسین اور اشکومن میں بھی موجود ہیں اور گوپس اور غزر ڈسٹرکٹ میں بھی یہ زبان بولی جاتی ہے۔

٦۔ **دیگرزبانیں:**۔اس کے علاوہ پشتو، کشمیری اور دوما کی (Domaaki) زبانیں بھی محدود آبادی میں بولی جاتیں ہیں۔گلگت بلتستان کی سرکاری زبان اردو ہے۔اسی طرح گلگت بلتستان میں کئی ثقافتی گروہوں پر مشتمل آبادی موجود ہے جس طرح ان کی زبانوں میں فرق ہے ان کے کلچر میں بھی فرق ہے پھر بھی یہاں کی آبادی صدیوں سے رہتی ہے اس خطے میں بڑے بڑے ثقافتی پروگرامات بھی ہوتے ہیں

جن میں شاندور پولوفیسٹول، بابوسر پولوفیسٹول اور جشن بہاراں فیسٹول یا نوروز کا جشن اور روائتی ڈانس بھی بہت مشہور ہیں۔بلتی لوگوں کا نسلی تعلق بھی تبّت سے ہے جس طرح بلتستان اور لدّاخ کی زبان ایک ہی ہے اسی طرح ان کا نسلی تعلق بھی ایک ہی ہے۔اس وقت بلتستان کا علاقہ 1947ء سے پاکستان کے زیر کنٹرول ہے جبکہ لدّاخ کے دو علاقے کارگل اور لہہ ہندوستان کے کنٹرول میں ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے زیر کنٹرول علاقوں میں سیاسی اور انتظامی نظام ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں۔گلگت اور بلتستان میں پاکستان نے ایجنسی کا نظام دوبارہ بحال کر کے 1970ء تک چلایا اور اس نظام کے تحت بلتستان ایجنسی اور گلگت ایجنسی کا نظام پولیٹیکل ایجنٹ چلاتے رہے۔یہاں کی عوام کو سیاسی،سماجی، معاشی اور عدالتی نظام بھی میسر نہیں رہا ہے۔اس وقت گلگت بلتستان میں جو حکومتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے وہ کس طرح کام کرتا ہے اور اس نظام کے تحت عوام کو علاقائی حقوق،انتظامی امور میں اختیارات اور جمہوری حقوق کس سطح تک مہیا کیے گئے ہیں اور سیاسی سماجی اور انتظامی امور میں آزادی کا معیار کیا ہے اس پر بے شمار بین الاقوامی اداروں کی رپورٹس بھی موجود ہیں جس میں فریڈم ہاؤس کی ہر سال کی رپورٹ بھی ہے جس میں 100 میں 28 پوائنٹس یا درجات ہی آزادی کے لیے مہیا کیے گئے ہیں جو کسی بھی خطے کے لیے آزادی کے مفہوم کو محدود کر دیتا ہے۔

گلگت بلتستان کا خطہ بھی ایسا ہی خطہ ہے جہاں جمہوری آزادیوں کے ساتھ علاقائی آزادی بھی محدود ہے اس علاقے کو پاکستان کا آئینی صوبہ نہیں بنایا گیا اور وہ حقوق اور انتظامی اختیارات بھی نہیں دیئے گئے جو باقی صوبوں کو میسر ہیں۔گلگت بلتستان کی صوبائی اسمبلی کو باقاعدہ عوام کے ووٹوں سے ہی منتخب کیا جاتا ہے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہی انتخابات کروائے جاتے ہیں اور اس صوبائی اسمبلی کی معیاد 5 سال ہوتی ہے۔اس خطے میں کئی سیاسی جماعتیں قائم ہیں اور انتخابات میں حصہ بھی لیتی ہیں۔آزاد کشمیر کی طرح گلگت بلتستان میں بھی پاکستان کے سیاسی جماعتوں کی برانچیں قائم کی گئی ہیں وہی انتخابات جیت کر حکومتیں

بناتی ہیں ان پارٹیوں کے ذریعہ پاکستان نے اس خطے پر اپنا انتظام اور کنٹرول دوہرا بنالیا ہے۔ ایک طرف اداروں کے ذریعے خطے کا انتظام پاکستان نے وزارت امور کشمیر کے حوالے کرر کھا تھا تو دوسری طرف سیاسی جماعتوں کے ذریعے یہاں کا سیاسی انتظام بھی پاکستان نے اپنے کنٹرول میں کیا ہوا ہے اور گلگت بلتستان کی اسمبلی منتخب ہونے کے باوجود محدود خودمختاری ہی حاصل کر پائی ہے۔ اس خطے کی پاکستان کی پارلیمنٹ میں کوئی نمائندگی موجود نہیں ہے اور نہ ہی پاکستانی صوبوں کے برابر حقوق دیئے گئے ہیں۔ پاکستان کے فیڈرل اداروں کو سیکیورٹی، عدلیہ اور بہت اہم پالیسی امور میں پہلے سے ہی زیادہ اختیارات اور اثرورسوخ حاصل ہے۔ اس خطے میں بھی ایسی سیاست کو پروموٹ کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ ریاست جموں کشمیر کا الحاق پاکستان کی صورت میں نکلے۔ جبکہ پاکستان نے اس خطے میں اظہار رائے کی آزادی سمیت کئی دیگر آزادیوں کو بھی محدود کرر کھا ہے اور ریاست جموں کشمیر کے بارے میں بھی یہاں سیاسی سرگرمیوں کو محدود کرر کھا ہے۔

2۔سیاسی حقوق اورانتخابی نظام

گلگت بلتستان حکومت کا انتظامی سربراہ وزیر اعلیٰ ہوتا ہے اور اس انتظامی عہدے کے لیے انتظامیہ کا سربراہ مقامی سطح پر منتخب کیا جاتا ہے تاہم حکومت پاکستان کئی انتظامی امور کو بلواسطہ اور بلاواسطہ کنٹرول کرتی ہے لیکن حکومت پاکستان کا کوئی بھی ادارہ اس خطے کے ووٹرز کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ گلگت بلتستان حکومت کا 2018ء کا آرڈر جو پچھلے بنیادی قانون کی جگہ لیتا ہے حکومت پاکستان نے منظور کیا جس میں 2009ء کا گلگت بلتستان ایمپاوٗرمنٹ اینڈ (Empowerment) سلف گورننس آرڈر کے تحت انتظامی امور پاکستان کی طرف سے مقرر کیا گیا گورنر اور گلگت بلتستان اسمبلی کی طرف سے منتخب کیا گیا وزیر اعلیٰ کے درمیان شیئر کئے جائیں گے۔ گورنر قانون سازی کے مسودے پر دستخط کرتا ہے اور اسے عدلیہ کے تقرر کے معاملات میں اہم اختیارات حاصل ہیں۔ گورنر کے فیصلہ کو گلگت بلتستان کی اسمبلی مسترد

نہیں کرسکتی۔ یہ آرڈر پاکستانی وزیراعظم کو وسیع اختیارات مہیا کرتا ہے اس میں ایک لمبی لسٹ ہے جن میں وزیراعظم کو انتظامی اور قانون سازی کے اہم امور میں اختیارات دیئے گئے ہیں ۔گلگت بلتستان کے (رہائشی) شہری جنہوں نے عبوری صوبائی حیثیت حاصل کی تھی انہوں نے 2018ء کے آرڈر کو پاکستان کی سپریم کورٹ میں چیلنج کردیا تھا اور 2019ء میں پاکستانی سپریم کورٹ نے حکومت پاکستان کو ہدایت جاری کی تھی کہ گلگت بلتستان کے آئینی حیثیت کے مسئلے کو حل کیا جائے۔

مئی 2020ء میں پاکستانی صدر نے آرڈر 2018ء میں ترمیم کی اور گلگت بلتستان کے لیے عارضی انتظامیہ مہیا کی گئی جو نومبر میں ہونے والے انتخابات کی نگرانی کرے گی۔اس سال ستمبر میں پاکستانی آرمی چیف نے اپنی صدارت میں ایک اجلاس کیا جس میں پاکستانی سیاستدانوں نے اس پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ گلگت بلتستان کو مکمل صوبائی حیثیت دی جائے اور تحریک انصاف نے الیکشن سے پہلے صوبائی حیثیت دینے کی مہم چلائی تھی اور صوبہ بنانے کا وعدہ کیا تھا۔تحریک انصاف نے انتخابات جیت لیے کیونکہ آزاد کشمیر اور گلگت میں روائیتاً وہی سیاسی جماعت انتخابات جیت جاتی ہے جو مرکز میں طاقت پر قابض ہو اس بار تحریک انصاف نے گلگت بلتستان میں اپنی حکومت بنائی کیونکہ مرکز میں یہی جماعت اقتدار میں تھی۔ اس بار بھی تحریک انصاف نے حکومت بناتے ہی پاکستانی وزیراعظم نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کو ذمہ داری دی گئی کہ وہ گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کے تعین کے لیے سفارشات مرتب کرے گی۔ان اقدامات کے باوجود بھی گلگت بلتستان کی حیثیت بدلنے کے حوالے سے کافی زیادہ مخالفت دیکھنے میں آئی جس میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے اندر بھی حیثیت ختم کرنے کو ہندوستانی اقدامات سے مشابہ قرار دیا گیا اور اس طرح گلگت بلتستان کو پاکستان کا مکمل صوبائی حیثیت دینے کا مطلب اس خطے کو جموں کشمیر کے تنازعہ سے باہر نکالنے کے مترادف قرار دیا گیا اور اس سے ہندوستان کے 5 اگست 2019ء کے اقدامات کو جواز مل سکتا تھا کیونکہ ہندوستانی سرکار نے اپنے زیر کنٹرول علاقوں کی ریاستی حیثیت ختم کر کے دہلی کی زیر نگرانی فیڈرل ایریا بنا دیا تھا اگر پاکستان بھی ریاست جموں کشمیر کے کسی حصے کی حیثیت

تبدیل کر کے اسے غیر متنازعہ علاقہ بنائے گا تو ہندوستان نے پہلے ہی یہ اقدام کر کے اپنے اقوام متحدہ کے دیئے گئے منڈیٹ سے تجاوز کرلیا ہے اور ریاست کی حیثیت ختم کر کے اپنے ساتھ ریاست کا رضا کارانہ تعلق ختم کر کے سخت گیر فوجی قبضہ کر دیا ہے۔

3۔انتخابات

گلگت بلتستان اسمبلی کی کل نشستیں 33 ہیں جن میں 24 براہِ راست الیکشن کے ذریعہ منتخب اراکین پر مشتمل ہوتیں ہیں چھ(6) نشستیں عورتوں کے لیے مختص کی گئی ہیں اور تین سیٹیں ٹیکنو کریٹس کے لیے مخصوص کی گئی ہیں گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی کے اختیارات خاص معاملات تک ہی محدود ہیں اور کچھ ٹاپکس پر بحث کرنا بھی منع ہے خاص کر خارجہ امور، دفاع، اندرونی سیکیورٹی اورعدالتی معاملات پر بات کرنے سے حکومت گلگت بلتستان کے آرڈر 2018ء میں ممنوع قرار دیا گیا ہے تاہم یہ آرڈر گلگت بلتستان اسمبلی کو قانون سازی کی اجازت دیتا ہے یا قانون سازی کے اختیارات پر عمل کرنے کی اجازت دیتا ہے جو امور پہلے گلگت بلتستان کونسل کو دیئے گئے تھے۔گلگت بلتستان کونسل کا اب کردار ایک ایڈوائزری کونسل کا رہ گیا ہے جس کا سربراہ پاکستان کا وزیراعظم ہوتا ہے اور وائس چیئرمین جی بی کا گورنر ہوتا ہے اور جی بی کونسل میں (6) چھ اراکین جی بی اسمبلی کے چنے ہوئے شامل ہیں اور چھ اراکین پاکستان کی پارلیمنٹ کے ممبران ہوتے ہیں جن کو وزیراعظم پاکستان جی بی کونسل کے لیے چنتا ہے اور جی بی کے وزیراعلیٰ کی بھی کونسل میں ایک نشست موجود ہے۔الیکشن کروانے والا ڈھانچہ بھی گلگت بلتستان میں پاکستانی اہلکاروں کے کنٹرول میں ہوتا ہے جیسا کہ 2020ء میں پاکستانی صدر نے مئی میں ایک آرڈر جاری کیا جس کے مطابق نومبر 2020ء میں ہونے والے جی بی اسمبلی کے انتخابات میں پاکستان کے 2017ء کے الیکشن قوانین گلگت بلتستان کے انتخابات پر بھی لاگو ہوں گے اور اس کے تحت جی بی میں ایک عارضی انتظامیہ قائم کی جائے گی جو موجودہ حکومت کی الیکشن تک جگہ لے گی۔ جی بی کے الیکشن کے لیے جو قوائد وضوابط بنائے گئے تھے ان کے مطابق سیاسی جماعتوں اور امیدواروں کے لیے یہ

ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی ایسے عمل یا تقریر کا اظہار نہ کریں جو نظریہ پاکستان اور پاکستان کی سیکیورٹی کے خلاف ہو۔ اس قانون کے تحت ان امیدواروں کو انتخابی عمل سے باہر کیا جا سکتا ہے جو قوم پرست کہلاتے ہیں اور جنہیں پاکستان کے اہلکاروں نے مسترد کر دیا ہو۔

4۔ مختلف سیاسی نظریات رکھنے والی جماعتیں

گلگت بلتستان میں پاکستان کی بڑی سیاسی جماعتیں سیاست میں اپنی مقامی برانچوں کے ذریعہ حاوی ہیں تاہم کچھ مقامی سیاسی جماعتیں بھی موجود ہیں ان مقامی سیاسی جماعتوں میں جو پاکستان نواز اور فیڈرل بیوروکریسی کی اتحادی ہیں وہ بھی ہیں علاقائی قوم پرست جماعیں بھی ہیں جو پاکستان نواز نہیں ہیں ایسی سیاسی جماعتوں کو سیاسی نظام کا حصہ بننے سے دور رکھا گیا ہے چونکہ یہ علاقائی قوم پرست پارٹیاں پاکستان میں ضم ہونے کی مخالفت کرتیں ہیں اور یہ سیاسی جماعتیں انتخابات میں کوئی اہم رول ادا نہیں کر سکتیں ہیں کیونکہ ان کو کئی طریقوں سے اور حربوں سے الیکشن سے دور رکھا جاتا ہے۔ اس طرح کے سیاسی کارکنوں کو جو پاکستان کی حمایتی جماعتوں سے تعلق نہیں رکھتے اور پاکستان کی ان علاقوں پر حکمرانی کی مخالفت کرتے ہیں ان کی خفیہ نگرانی کی جاتی ہے اور انہیں حراساں اور کچھ کو قید بھی کیا جاتا ہے۔ بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان اقتدار ٹرانسفر کرنے کا ایک معقول طریقہ کار واضع کیا گیا ہے لیکن فیڈرل حکومت کے ایک متبادل اور متوازی طریقہ کار کے مطابق ہی تبدیلی اقتدار کا یہ نظام چلتا ہے۔ 2020ء کے جی بی انتخابات میں فیڈرل سطح پر اقتدار پر قابض پارٹی نے عارضی حکومت بنا کر جی بی کی حکومت کو اقتدار میں رہ کر کوئی فائدہ نہ اٹھانے دینا دراصل اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مرکز کے اقتدار پر قابض پارٹی جی بی میں اپنی پارٹی کی برانچ کی حکومت بنوانے کے لیے ہی یہ حربے استعمال کرتی ہے جبکہ الیکشن میں جیتنے کے بعد دیگر انتخابات میں حصہ لینے والی فیڈرل سطح کی جماعتوں نے برسر اقتدار جماعت پر انتخابات میں دھاندلی کے الزامات لگائے تھے اور اس سے قبل دوسری جماعت جو مرکز میں اقتدار میں تھی، جی بی میں اپنی جماعت کی حکومت بنوانے میں کامیاب ہوئی تو باقی جماعتوں نے ایسے ہی

دھاندلی کروانے کے الزامات لگائے تھے اور فیڈرل حکومت کے اہلکاروں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ وہ جی بی کے الیکشن میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے برسر اقتدار جماعت کی برانچ کو الیکشن جتوائے گئے ہیں۔ جی بی کے ووٹرز پاکستانی انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتے اس لئے پاکستان کی مرکزی حکومت کے اہلکاروں کا احتساب جی بی کے ووٹرز جمہوری طریقے سے نہیں کر سکتے اور سیکیورٹی ایجنسیاں جو اس خطے میں کام کر رہی ہیں وہ مرکزی حکومت کے ادارے ہیں جو ان کے کنٹرول میں رہ کر کام کرتے ہیں اور انہیں ہی جوابدہ ہیں۔ یہ ادارے کسی بھی سیاسی پارٹی اور سیاستدان پر دباؤ ڈال سکتے ہیں جو ایسی لائن اختیار کرے جس کو یہ ادارے پاکستان کے مفادات کے منافی قرار دے سکتے ہیں۔

5۔ کیا جنسی تفریق موجود ہے؟

یہ درست ہے کہ جی بی کے سماج میں دیگر علاقوں کی طرح ہی مردوں کی بالادستی موجود ہے اور عورتیں سماج میں مردوں کے مساوی سماجی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی حقوق حاصل نہیں کر پاتی ہیں لیکن جی بی انتخابات میں مردوں اور عورتوں کو ووٹ دینے کا حق برابر ہے یہ الگ بات ہے کہ کوئی سماجی گروہ، قبیلہ یا کمیونٹی زبردستی عورتوں کو ووٹ دینے سے روکنے کی کوشش کرے تو حکومت شاید ایسا نہ کرنے دے اور عورتوں کو تحفظ فراہم کرے۔ اس طرح جی بی میں عام سیٹوں پر بھی عورتیں الیکشن میں حصہ لے سکتیں ہیں اور عوام کے ووٹ لے کر براہِ راست بھی منتخب ہوسکتیں ہیں لیکن اس حق کا استعمال جی بی کی عورتیں بہت کم ہی کرتی ہیں اس طرح جنرل نشستوں پر عموماً مرد ہی انتخاب لڑتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ عورتوں کی مخصوص نشستوں کو پارٹیوں میں جنرل ووٹ کے حساب سے پر کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پارٹیاں یہ فیصلہ کریں گی کہ عورتوں کی نمائندگی کون کرے گا۔ 2020ء کے الیکشن میں جی بی سے صرف 4 چار عورتوں نے جنرل سیٹوں پر انتخاب لڑا تھا۔ الیکشن کی نگرانی / مانیٹرنگ کرنے والا ایک گروپ یہ تجزیہ کرتا ہے کہ ووٹرز کی نئی رجسٹریشن کے باوجود بھی جنسی فرق (Gender Gap) پھر بھی بہت زیادہ پایا گیا ہے اور جسٹرڈ ووٹرز میں عورتوں کا

مردوں کے مقابلے میں 9 فیصد کم ووٹ پڑتے ہیں گویا عورتیں مردوں کے مقابلے میں 9 فیصد کم ووٹ ڈالنے آتی ہے جو بھی ٹوٹل ووٹرز ہیں مذہبی فرقوں کی بھی جی بی اسمبلی میں نمائندگی موجود ہے لیکن یہ تمام مذہبی فرقوں کے نمائندے جنرل ووٹوں کے ذریعہ ہی اسمبلی میں منتخب ہوتے ہیں۔

6۔حکومت کا نظام اور آزادانہ پالیسیاں

گلگت بلتستان میں منتخب انتظامیہ کے سربراہ کے اختیارات محدود ہیں کیونکہ پاکستانی وزیراعظم اور وزیرامور کشمیر / گلگت بلتستان میں فیڈرل حکومت کے اہلکاروں کے ذریعہ اس خطے کی حکومت کے کاموں کو کنٹرول کرتے ہیں جس طرح پاکستان میں بھی مرکزی حکومت کی ایجنسیاں اور ملٹری اہلکار حکومتی کاموں اور پالیسیاں بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جی بی کا خطہ مالی طور پر خودمختار نہیں ہے بلکہ فیڈرل حکومت اس خطے پر اپنی مرضی کا ٹیکس لاگو کرتی ہے اور جی بی کو اس میں سے حصہ فیڈرل گورنمنٹ کی طرف سے ملتا ہے گویا اسی ٹیکس میں سے فیڈرل فنڈز ملتے ہیں۔

اس خطے کے لوکل نمائندوں کو پاکستان کے ان اداروں سے ہی باہر رکھا گیا ہے جہاں صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم پر مذاکرات کیے جاتے ہیں۔ جی بی کو پاکستان کے آئین کے مطابق آئینی حیثیت دینے کے لیے کافی لمبی بحث کی گئی ہے تاکہ اس خطے کو عبوری صوبے کا درجہ دیا جائے اور اسے قانون سازی کے وہی اختیارات دیئے جائیں جو پاکستان کے موجودہ چاروں صوبوں کو دیئے گئے ہیں اور جی بی کو فیڈرل حکومت کی پارلیمنٹ میں بھی نمائندگی دینے کی بات کی گئی ہے۔ اس کے حمایتوں کا دعویٰ ہے کہ ایسا کرنے سے وہ قانونی تشویش بھی دور ہو جائے گی جو چین نے (CPEC) چین پاکستان اقتصادی راہداری کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے اور اس سرمایہ کاری میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے اور جی بی کے شہریوں کو وہی آئینی حقوق دیئے جائیں جو پاکستانی شہریوں کو دیئے گئے ہیں۔ تاہم جو لوگ ہندوستان کے زیرانتظام جموں کشمیر سے جڑے ہوئے ہیں انہوں نے جی

بی کے بارے میں ان تجاویز کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور کہا گیا کہ ان تجاویز پر عمل کرنے سے ریاست جموں کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے وعدے کمزور ہو جائیں گے۔ یہ بحث اسلام آباد کے فیصلہ سازوں کے درمیان 2020ء کے دوران بھی جاری رہی اور اس پر گلگت بلتستان کی بجائے اسلام آباد کا فوکس رہا کہ نئی حیثیت کا تعین کیسے کیا جائے۔

7۔کرپشن کے خلاف نظام

گلگت بلتستان میں سرکاری کرپشن کے خلاف نظام موجود ہے۔ جی بی پاکستان کے قومی احتساب بیورو کی قانونی حدود کے اندر آتا ہے اور اس احتساب بیورو کا گلگت بلتستان میں فیلڈ آفس موجود ہے۔ تاہم پاکستان کی طرح یہاں بھی یہ یقین کیا جاتا ہے کہ کرپشن ایسی بیماری ہے جو اس نظام کے ساتھ ہے اور اس کے خلاف قانونی کاروائی سیاسی اثر ورسوخ کے تحت ہی عمل میں آتی ہے۔ جی۔ بی۔ حکومت کی انفارمیشن تک رسائی عملاً محدود ہے۔ جی۔ بی۔ میں ثقافتی سرگرمیاں بھی عملاً محدود ہیں۔ حکومت نے ثقافت کے لیے چند اقدامات کیے ہیں اور کچھ معلومات جو بنیادی نوعیت کی ہیں انہیں آن لائن مہیا کیا گیا ہے لیکن یہ معلومات ناکافی ہیں اور کم ہی آن لائن دکھائی دیتی ہیں۔

8۔آبادی میں اضافہ

گلگت بلتستان میں ریاست جموں کشمیر کا مہاراجہ دور کا سٹیٹ سبجیکٹ رول (SSR) کو ختم کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے پاکستان کے دوسرے علاقوں سے لوگ جی بی میں آ کر آباد ہونا شروع ہوئے اور اسی وجہ سے آبادی میں اضافہ ہوا۔ گلگت بلتستان شیعہ اکثریتی خطہ ہے لیکن پرانا ریاستی قانون ختم ہو جانے سے سُنی آبادی میں بھی اضافہ ہوا جس کی وجہ سے یہاں سنی شیعہ فرقہ پرستی کو ہوا دینا شرارتی عناصر کے لیے آسان ہو گیا ہے۔ مرکزی حکومت کے وزیر اور اہلکاروں نے سنی شیعہ فسادات کروانے سے گریز نہیں کیا جس کی وجہ سے خطے میں فرقہ وارانہ کشیدگی قائم رکھ کر اس خطے کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ریاست کی خفیہ ایجنسیاں

مرکزی حکومت کے کنٹرول میں ہوتی ہیں۔ریاست کی خفیہ ایجنسیوں پر شک کیا جاتا ہے کہ وہ دوسرے علاقوں سے لوگوں کو گلگت بلتستان کی طرف ہجرت کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں تاکہ آبادی کو بدل دیا جائے جس سے مقامی آبادی کم ہوجائے گی اور یہ کسی بھی خطے کے مستقبل کے لیے اچھا نہیں ہوتا کیونکہ مقامی آبادی روزگار اور اپنی زمینوں سے محروم ہوجاتی ہے اور اپنے علاقائی حقوق کی مانگ کمزور پڑ جاتی ہے۔مقامی لوگوں کے وسائل کو بیرونی قوتیں لوٹ کرلے جاتی ہیں جس کا نتیجہ اقتصادی بدحالی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔2009ء کے گلگت بلتستان ایمپاوٗرمنٹ اینڈ سلف گورننس آرڈر کے تحت باہر سے آئے پناہ گیروں کو جی بی میں شہری حقوق دیئے گئے ہیں گورنمنٹ آف گلگت بلتستان آرڈر 2018ء کے تحت تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ ایسا لگ رہا ہے جی بی کے شہریت کے حقوق تمام پاکستانی شہریوں کو دے دیئے جائیں گے جو مزید پناہ گزیروں کو یہاں آنے کی حوصلہ افزائی کرے گا۔جبکہ آزاد کشمیر میں 1947ء سے پہلے والا ریاستی قانون موجود ہے جس کی وجہ سے شہریت اور رہائش اختیار کرنے پر ابھی تک بیرونی غیر ریاستی افراد پر پابندی عائد ہے۔جبکہ ہندوستان نے اپنے زیر کنٹرول ریاست کے علاقوں میں اس قانون کا خاتمہ کر دیا ہے۔

9۔شہری آزادیاں اور اظہار رائے کی آزادی:۔

گلگت بلتستان میں کچھ ایسے قوانین موجود ہیں جو آزادی اظہار رائے کو محدود یا مکمل کنٹرول کرتے ہیں خاص کر کے رپورٹ کرنا یا علاقے کی سیاسی حیثیت کے بارے میں تبصرہ کرنا وغیرہ۔میڈیا ہاؤسسز کو اپنا کام کرنے کے لیے وزارت امور کشمیر گلگت بلتستان سے اجازت لینی پڑتی ہے اس کے باوجود یہاں کئی میڈیا کے ادارے کام کرتے ہیں تاہم خبروں کی کوریج کے لیے اور سیاسی ایشوز کے حوالے سے پاکستان کے سرکاری بیانیہ سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں پیش کیا جائے گا۔اگر پاکستان کے سرکاری بیانیہ سے ہٹ کیا جائے گا تو چند اخبارات کو بندش کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔گلگت بلتستان کے خطے میں آبادی مسلم ہے اور یہاں ایسے لوگوں کو برداشت نہیں کیا جاتا ہے جو کسی مذہبی عقیدے کو نہ مانتے ہوں ایسے لوگوں

کو نہ سماج برداشت کرتا ہے اور نہ ہی سرکاری سطح پر کوئی برادشت موجود ہے اس لئے اس خطے کے ہر شہری کا عقیدہ ہونا ضروری ہے۔ گو کہ ایسا کوئی قانون موجود نہیں ہے جو ہر شہری کو عقیدہ رکھنے پر مجبور کرتا ہو لیکن ایسے لوگوں کو آزادی اظہار رائے بھی موجود نہیں ہے یہ ایک پرانا طرز کا سماج ہے جواب اپنی آزادی کی ہر نعمت کے احساس سے روشناس ہو رہا ہے نوجوانوں میں عقلیت پسندی اور ترقی پسند نظریات قبولیت حاصل کر رہے ہیں جو جی بی کے خطے میں بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ بنے گی۔ اس خطے میں مذہبی قوانین وہی ہیں جو پاکستان کے سرکاری بیانیہ کی حمایت کرتے ہیں توہین رسالت کا قانون ہو یا مذہبی تعبیر وتشریح کا معاملہ ہو پاکستانی ریاست کا دیا گیا مذہبی بیانیہ ہی حاوی نظر آتا ہے۔

10۔ تعلیمی اداروں کی آزادی

گلگت بلتستان کے خطے میں تعلیمی نظام کافی حد تک ترقی کر رہا ہے اور تعلیم کو روزگار کے لیے اور دوسرے علاقوں میں ہجرت کے لیے بہت اہمیت دی جاتی ہے عام بندے میں تعلیم حاصل کرنے اور بچوں کو اچھی تعلیم دینے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ تاہم جی بی کے تعلیمی اداروں میں اس خطے کی آئینی حیثیت کو لے کر کافی زیادہ حساس ماحول پیدا کیا گیا ہے ایسی بحث اور مواد برداشت نہیں کیا جاتا جس میں جموں کشمیر پر پاکستانی دعوے پر سوال اٹھایا گیا ہو۔ طلبہ یونین کی سرگرمیوں کو کافی حد تک مانیٹرنگ کیا جاتا ہے جس سیاست میں خاص کر کے قوم پرستی کے نظریات پائے جاتے ہوں ان کی نگرانی کی جاتی ہے۔ گلگت بلتستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن کسی بھی لوکل زبان کو یہاں کے سکول میں نہیں پڑھایا جاتا ہے۔ داریل کے علاقے میں اسلامی گروپوں نے کئی بار سکولوں پر حملے کیے ہیں جو سیکولر اور لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔

11۔ اسمبلی کی آزادی

گلگت بلتستان میں بظاہر تو کوئی قانونی پابندی عائد نہیں کی گئی لوگوں کو کسی ایک جگہ

اکٹھا ہو کر کسی خاص مسئلے پر بولنے کی آزادی ضرور دی گئی ہے۔ ریاستی اہلکار اور فیڈرل گورنمنٹ کے خفیہ ادارے فریڈم آف اسمبلی (assembly) کے حق کو محدود کر دیتے ہیں اس سے جی بی میں ایسے احتجاجوں کو سیکیورٹی ایجنسیوں کی طرف سے دباؤ کا سامنا ہوتا ہے جو پاکستانی ریاست کی جی بی کے بارے میں پالیسیوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی سیاسی پارٹی ہندوستانی کنٹرول والے ریاست کے بارے میں ہندوستان کے خلاف احتجاج کرے تو اس کو برداشت بھی کیا جاتا ہے اور حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے جو احتجاج پاکستان کے کنٹرول کو چیلنج نہ کرے اسے بھی برداشت کیا جاتا ہے اور پاکستان کے اپنے کنٹرول والے علاقوں میں آئینی حیثیت کو چیلنج کرنا بھی آسان نہیں ہے۔

پولیس اہلکار اور سیکیورٹی ایجنسیاں حراساں کرنے، خوف پھیلانے اور چیک پوائنٹ بنا کر حکومت کے خلاف احتجاجوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح انسانی حقوق کی تنظیمیں اور این جی او (NGO) اور بھی سخت رجسٹریشن کے عمل سے گزرتی ہیں اور صرف حکومتی اہلکاروں کی خوشنودی کے لیے ہی کام کر سکتے ہیں۔ جو این جی اوز (NGOs) سیاسی حقوق اور انسانی حقوق کے لیے کام کرتی ہیں انہیں حکومت کی طرف سے سخت پابندیوں سے گزرنا ہوتا ہے اور بعض کو حراساں بھی کیا جاتا ہے جی بی میں احتجاج کرنے والے 14 ایسے افراد کو لمبی سزائیں بھی عدالت کی طرف سے دی گئی تھیں اور انہیں 2011ء میں جیل بھیجا گیا تھا اور گیارہ سال بعد انہیں رہا کر دیا گیا جن میں بابا جان ایک ترقی پسند لیڈر اور کچھ دیگر انقلابی رہنما بھی شامل تھے ان میں افتخار کربلائی جیسے انقلابی لیڈر کو بھی لمبی سزا سنائی گئی تھی جنہیں بعد میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہا کر دیا گیا تھا۔ جی بی میں لیبر قوانین اور لیبر یونین کی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مزدوروں کے تحفظ کے لیے اور ان کے حقوق کی آواز اٹھانے کے لیے انہیں یونین سازی کا حق ملنا چاہیے لیکن جی بی میں انڈسٹری نہ ہونے کی وجہ سے مقامی سطح پر روزگار نہیں ہے اسی وجہ سے یہاں کے محنت کشوں کو پاکستان کے دیگر شہروں کا رخ کرنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ مقامی سطح پر روزگار کے مواقع کم ہونے کی وجہ سے مزدور طبقہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوتا ہے اگر مقامی سطح پر اس خطے کے لوگوں کو اگر روزگار مہیا کیا جائے تو

یہاں کے عوام خوشحال ہو سکتے ہیں اور مقامی سطح پر مزدور تنظیمیں بھی بن سکتیں ہیں۔

12۔قانون کی حکمرانی

گلگت بلتستان میں عام شہریوں کے تحفظ کے لیے عدالتوں کا نظام موجود ہے لیکن اس خطے میں عدلیہ برائے نام ہی آزاد ہے اور عدلیہ کی تقرریوں میں بھی پاکستان کی مرکزی حکومت کا کردار اہم ہوتا ہے حساس نوعیت کے سیاسی معاملات میں جی بی کی عدلیہ پاکستانی حکومت سے آزادانہ فیصلے نہیں کر سکتی۔ جی بی میں چیف جج اور سپریم اپلیٹ کورٹ کے دیگر ججوں کی تقرری تین سال کے لیے پاکستانی وزیر اعظم جی بی کے گورنر کی سفارشات پر کرتا ہے ۔2019ء میں جی بی کے 2018ء گورننس آرڈر کے بارے میں رولنگ دیتے ہوئے پاکستانی سپریم کورٹ نے اپنا اختیار جی بی کے شہریوں اور عدلیہ تک بڑھا دیا ہے۔اس طرح سپریم کورٹ آف پاکستان نے مزید قانونی شکوک شبہات جو اس خطے کی آئینی حیثیت کو گھیرے ہوئے ہیں بڑھا دیئے ہیں چونکہ اس خطے کی آئینی حیثیت کا مسئلہ 2020ء میں حل نہیں ہوسکا تھا۔ اگر یہ خطہ پاکستان کا آئینی حصہ نہیں ہے تو پاکستانی عدلیہ اس علاقے کے شہریوں کے فیصلے کیسے کرے گی؟ سویلین عدالتوں میں قانون کے مطابق کاروائی کی گارنٹی دی گئی ہے جس میں وکیل، دفاع اور اپیل کا حق بھی شامل ہے لیکن اس کے باوجود سیکیورٹی سے متعلق ایشوز میں اور دیگر کئی مقدمات میں ماروائے عدالت گرفتاریاں بھی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں دہشت گردی کے متعلق ایکٹ کو مخالفین کی آواز دبانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جن میں ایسے مقدمات بھی ہوتے ہیں جو قانونی پہلو سے واضع نہیں ہوتے اور اس ایکٹ کے تحت کسی کو بھی مقدمہ چلائے بغیر قید میں رکھا جاسکتا ہے۔گلگت بلتستان میں آئے روز کسی سیاسی کارکن یا لیڈر کو گرفتار کیا جاتا ہے اور اس کی چھان بین دہشت گردوں کی طرح کی جاتی ہے لیکن ابھی تک کسی کو اس طرح کے سیاسی مقدمات میں جیل میں نہیں رکھا سوائے 14 قیدیوں کے جنہیں گیارہ سالوں تک جیلوں میں رکھا گیا تھا۔2015ء میں حکومت پاکستان نے فوجی عدالتوں کو اجازت دی کہ وہ ان سویلین کے مقدمات سنیں جن پر دہشت گردی اور

فرقہ وارانہ بنیادوں پر کیس قائم کیے گئے ہیں۔ ان فوجی عدالتوں میں مجرموں کو وہ قانونی تحفظ نہیں دیا جاتا جو سویلین عدالتوں میں دیا جاتا ہے۔

13۔ انفرادی آزادی اور سفر کرنے کا حق

گلگت بلتستان کے شہری پاکستان کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ رکھتے ہیں۔ اس علاقے کے لوگوں کو بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا شہری ہی تصور کیا جاتا ہے۔ جو سیاسی لیڈرز اور کارکن پاکستانی بیانیہ کو تسلیم نہیں کرتے ان پر سفری پابندیاں اور پاسپورٹ ایشو نہ کرنے کا حکم دیا جاسکتا ہے۔ اس خطے کے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پاکستان سے وفاداری ثابت کریں تب ہی وہ سفری دستاویزات کے حق دار ہو سکتے ہیں اس خطے کی عوام نے ابھی تک اپنے مستقبل کا فیصلہ نہیں کیا ہوا لیکن پاکستان کے دوسرے شہریوں کی طرح انہیں بھی ایسی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے ابھی تک حکومت پاکستان کی طرف سے کسی بھی جی بی کے شہری کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا ہے۔

14۔ سٹیٹ سبجیکٹ رول یا (SSR)

گلگت بلتستان کے لوگوں نے اس پر ہمیشہ تشویش ظاہر کی ہے کہ اس خطے میں 1947ء سے پہلے والا شہریت کا قانون ختم کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے مقامی لوگوں کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ دیگر علاقوں سے لوگ یہاں آکر ان کی پراپرٹی خرید سکتے ہیں۔ مہاراجہ دور کا قانون خطے سے باہر والوں کو یہاں جائیداد خریدنے کا حق نہیں دیتا اور صرف مقامی باشندے ہی جائیداد حاصل کرنے کا قانونی حق رکھتے ہیں۔ جی بی کے شہریوں نے اس پر بھی تشویش کا اظہار کیا کہ ان کے کئی خاندان چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبے کی وجہ سے بے گھر ہو سکتے ہیں۔

15۔سماجی آزادی اور گھریلو تشدد

سماجی آزادی ہی کسی انسان کو سماج میں عزت اور وقار سے رہنے کے قابل بناتی ہے ۔سماجی آزادی فرد کی آزادی سے جڑی ہوئی ہے اگر فرد کی آزادی موجود نہیں تو سماجی آزادی بھی نہ ہونے کے برابر ہوگی۔گلگت بلتستان میں قانونی لحاظ سے گھریلو تشدد کو جرم قرار دیا گیا ے اورعزت کے نام پر قتل بھی جرم ہے۔لیکن روایتی اور نقصان دہ عمل سماج میں موجود ہیں خاص کر کے جنس اور شادی کو لے کر امتیازی سلوک موجود ہے اور ایسے انفرادی رویوں کے سماج میں حاوی ہونے کی وجہ قانون کو لاگو کرنے میں کمزوری ہوتی ہے اوراس وجہ سے انہیں تحفظ نہیں مل پاتا خاص کر ان علاقوں میں جو سماجی لحاظ سے پسماندہ ہوں۔گاؤں کی سطح پر جو انصاف کا نظام قائم ہے وہی بنیاد بنتا ہے ایسے واقعات کی جس میں جنسی زیادتی اور گھریلو تشدد عورتوں کے خلاف ہوتا ہے اوران گاؤں والوں کے فیصلے مظلوم کو مزید نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

16۔معاشی ترقی کے مواقع

گلگت بلتستان میں بنیادی معاشی ترقی کرنے والا ڈھانچہ ہی نہیں بنایا گیا اور یہ خطہ تاریخی لحاظ سے ترقی میں بہت پیچھے رہ گیا ہے اور جی بی میں آبادی کا انحصار ہجرت کرنے والی لیبر کی آمدنی پر ہوتا ہے۔مقامی سطح پر معدنیات نکالنے کی انڈسٹری پر مقامی افراد کا کنٹرول کم ہونے کی وجہ سے ان کی شکایات رہتی ہیں اور یہ شکایات زیادہ تر اس وجہ سے کی جاتی ہیں کہ مقامی شہری اپنے قدرتی وسائل سے فوائد حاصل کرنے سے محروم ہیں۔گلگت بلتستان میں لوگ (CPEC) چین پاکستان اقتصادی راہداری کے بارے میں بھی مختلف رائے رکھتے ہیں کہ آیا یہ مرکزی حکومت کے انتظام میں چلنے والا منصوبہ جی بی کے عوام کے لیے کوئی معاشی خوشحالی لائے گا؟ جی بی کی آبادی کا بڑا حصہ تعلیم اور روزگار کے حصول کے لیے پاکستان کے بڑے شہروں کا رخ کرتا ہے جی بی کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بڑی تعداد کراچی، لاہور، اسلام آباد میں رہتی ہے اپنے علاقوں میں بے پناہ قدرتی وسائل ہونے کے باوجود ان نوجوانوں کو فوائد نہیں مل رہے۔مقامی صوبائی حکومت کا اختیار زیادہ نہیں ہے کہ اپنے عوام کے لیے مرکزی

حکومت سے کچھ زیادہ معاشی مفادات حاصل کر سکے کیونکہ جی بی کو آئینی صوبائی حیثیت نہ دینے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو شکایت ہے کہ اس وجہ سے وہ اپنے لیے بہتر معاشی مواقع اور سرمایہ کاری حاصل نہیں کر پا رہے۔ جی بی میں سیر وسیاحت کی انڈسٹری کو فروغ دے کر کافی زیادہ آمدنی حاصل کی جا سکتی ہے یہاں ہوٹل انڈسٹری کو فروغ دیا جاسکتا ہے معدنیات کی ترقی کے لیے بڑا ڈھانچہ تعمیر کیا جاسکتا ہے جس میں ہزاروں نوجوانوں کو روزگار مہیا کیا جاسکتا ہے یہاں خشک میوہ جات کی درآمد کا کام کیا جاسکتا ہے۔ گلگت بلتستان کی مقامی حکومت کے کنٹرول میں یہ سارا کام ممکن ہے۔

گلگت بلتستان کی معاشی ترقی اس خطے کی علاقائی خودمختاری اور سیاسی سوال کے حل سے جڑی ہوئی ہے کسی بھی خطے کی ترقی کے لیے ضروری ہے وہاں ایک مضبوط سیاسی نظام حکومت قائم ہو کیونکہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ ہی اس خطے میں عوامی مسائل حل کرنے پر توجہ دے سکتا ہے۔ گلگت بلتستان کے خطے کو سب سے پہلے ایک مضبوط جمہوری نظام حکومت چاہیے اس خطے کو پاکستان کے اداروں کی مضبوط گرفت سے بھی آزادی چاہیے جب تک مقامی صوبائی حکومت کو اندرونی طور پر مکمل خودمختاری حاصل نہیں ہے اور اپنے علاقے کے انتظامی، سیاسی، معاشی اور علاقائی معاملات چلانے میں ذمہ دار نہیں بنایا جاتا۔ عوام کے مسائل حل نہیں ہوں گے اور نہ ترقی کے عمل کو تیز کیا جاسکتا ہے۔ گلگت بلتستان کے عوام کو مکمل جمہوری نظام دینا وقت کی ضرورت ہے پاکستان کی مرکزی حکومت اسے اپنا آئینی صوبہ بنا کر اس کی متنازعہ حیثیت ختم نہیں کرنا چاہتی اس کا مطلب یہ بھی نہیں لیا جانا چاہیے کہ ان کے حقوق بھی متنازعہ ہیں۔ یہ خطے متنازعہ ضرور ہیں لیکن ان کے حقوق اور جمہوری نظام متنازعہ نہیں ہے اس خطے کو اندرونی خودمختاری دے کر یہاں کے عوام کی محرومیوں کا کسی حد تک ازالہ کیا جاسکتا ہے لیکن ریاست جموں کشمیر کے کسی بھی تقسیم شدہ علاقے کا تنازعہ الگ تھلگ کر کے حل نہیں کیا جاسکتا بلکہ ساری ریاست کا تنازعہ حل طلب ہے۔

☆☆☆☆

تیراھواں باب

بھارتی جموں کشمیر میں 1947ء کے بعد حکومتوں کا ڈھانچہ

بھارت کے زیرِ انتظام اسمبلی ودھان سبھا کا قیام 1957ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس اسمبلی کے دو ایوان تھے، ایوان بالا کو جموں کشمیر قانون ساز کونسل کہا جاتا تھا اور ایوان زیریں کو جموں کشمیر قانون ساز اسمبلی کہا جاتا تھا۔ ودھان سبھا کا قیام 1957ء میں نئے ریاستی آئین کے تحت عمل میں لایا گیا تھا۔ نئے آئین کے لیے آئین ساز اسمبلی بنائی گئی تھی اور آئین ساز اسمبلی کے انتخابات 1951ء میں کروائے گئے تھے۔ اسمبلی کی کل 75 نشستیں تھیں اور اس آئین ساز اسمبلی کی 75 سیٹیں جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے جیتی تھیں۔ اس آئین ساز اسمبلی کا کام ریاست جموں کشمیر کے لیے نیا آئین بنانا تھا اور آئین لاگو ہونے تک ہی اس آئین ساز اسمبلی کی مدتِ معیاد بھی تھی۔ 1957ء میں اس آئین ساز اسمبلی نے نیا ریاستی آئین منظور کرلیا تھا۔ ریاست جموں کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کی ابتداء میں 100 نشستیں تھیں جو بعد میں بیسویں (20) ترمیم کر کے 1988ء میں بڑھا کر 111 کردی گئی تھیں۔ ان نشستوں میں 24 نشستیں ان علاقوں کے لیے رکھی گئی جو 1947ء میں پاکستان کے زیر کنٹرول آگئے تھے اور یہ نشستیں سرکاری طور پر ریاستی آئین کی سیکشن 48 کے تحت ابھی

تک خالی پڑی ہیں۔ لیکن ان نشستوں کو قانون ساز اسمبلی کے کُل اراکین میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ ان علاقوں کی آبادی بھی بھارتی علاقوں میں موجود نہیں تھی اس لیے ان کی نمائندگی علامتی طور پر ہی رکھی گئی تھی تا کہ اسمبلی کے کورم اور قانون سازی کے لیے اکثریتی ووٹ اور حکومت سازی کے فیصلہ میں ان کی ضرورت نہ پڑے۔ اس وقت ریاستی اسمبلی کی کل نشستیں جن کے لیے الیکشن کروائے جاتے ہیں ان کی تعداد 87 تھی ان میں سے 46 نشستیں کشمیر ڈویژن کی ہیں اور 37 نشستیں جموں ڈویژن اور 4 نشستیں لدّاخ کی ہوتی تھیں۔ اس اسمبلی کے اراکین کی مدت 6 سال ہوا کرتی تھی جو 2019ء سے پہلے والی ریاستی اسمبلی تھی۔ 2019ء کے بعد اسمبلی کی مدت 5 سال کر دی گئی ہے اسمبلی کی تمام سیٹیں براہِ راست الیکشن کے ذریعہ پُر کی جاتی تھیں۔

ریاست جموں کشمیر میں آئین منظور ہونے کے بعد بھی وزیر اعظم اور صدر ریاست کے عہدے نئے آئین کے مطابق برقرار رکھے گئے تھے۔ ریاست کا پہلا منتخب وزیر اعظم شیخ عبداللہ کو چنا گیا تھا اور ڈاکٹر کرن سنگھ کو صدر ریاست بنایا گیا تھا۔ 8 اگست 1953ء میں شیخ عبداللہ کو وزیر اعظم کے عہدے سے صدر ریاست کرن سنگھ نے ہٹا دیا تھا اور اس کی جگہ ڈپٹی وزیر اعظم بخشی غلام محمد کو وزیر اعظم جموں کشمیر بنایا گیا تھا۔ صدر کی حیثیت آئین کے تحت ریاست کے سربراہ کی ہوتی تھی۔ بخشی غلام محمد کو 9 اگست 1953ء کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا اور اسی دن شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا تھا۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری پر شدید احتجاج ہوا جس میں 70 کے لگ بھگ لوگ مارے گئے تھے۔ 6 فروری 1954ء کو ریاست کی آئین ساز اسمبلی نے ووٹ کے ذریعہ ریاست کے ہندوستان سے الحاق کو توسیع کی تھی۔ ہندوستانی جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی نے 17 نومبر 1956ء کو ریاستی آئین کی منظوری دی اور 26 جنوری 1957ء کو ریاستی آئین لاگو ہو گیا تھا۔

جموں کشمیر اسمبلی کے الیکشن 24 فروری سے 25 مارچ 1957ء تک ہوئے اور جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے 75 میں سے 68 سیٹیں قانون ساز اسمبلی کی جیت لیں تھیں۔ پرا جا پرشید نے قانون ساز اسمبلی کی 5 نشستیں جیتی تھیں۔ شیخ عبداللہ کو 8 جنوری 1958ء کو جیل سے رہا کیا گیا تھا لیکن شیخ عبداللہ کو 29 اپریل 1958ء کو حکومتی پولیس نے پھر دوبارہ

گرفتار کرلیا تھا۔ جموں کشمیر میں پھر انتخابات فروری 17-18، 1962ء کو کروائے گئے اور جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے اس بار بھی 75 میں 70 نشستیں حاصل کرلیں تھیں۔ قانون ساز اسمبلی میں پھر اکثریت حاصل کی تھی۔

وزیر اعظم غلام محمد بخشی نے 4 اکتوبر 1963ء کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا اور 12 اکتوبر 1963ء کو خواجہ شمس الدین نے جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کی طرف سے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا اور حکومت تشکیل دی۔ وزیر اعظم شمس الدین نے 29 فروری 1964ء کو استعفیٰ دے دیا اور غلام محمد صادق نے نیشنل کانفرنس کی طرف سے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا اور اپنی نئی حکومت تشکیل دی۔ 8 اپریل 1964ء کو شیخ عبداللہ کو ایک بار پھر جیل سے رہا کیا گیا۔ 9 مئی 1965ء میں شیخ عبداللہ کو ایک بار پھر دہلی میں اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ بیرون ملک دورے سے واپس آرہے تھے۔ 30 مئی 1965ء کو ریاستی آئین میں ترمیم کے ذریعہ وزیر اعظم جموں کشمیر کی حیثیت کو چیف منسٹر (وزیر اعلیٰ) میں بدل دیا گیا تھا۔ 6 جون 1965ء میں جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کو انڈین نیشنل کانگریس میں ضم کردیا گیا تھا۔

ریاست میں نیا بحران

5 اگست 1965ء میں پاکستان کی طرف سے مسلح باغیوں نے حکومتی اداروں پر حملے شروع کردیئے جن میں پولیس اور فوج پر حملے کیے گئے۔ اس کے فوراً بعد پاکستانی فوج نے یکم ستمبر 1965ء کو جموں کشمیر ریاست پر مکمل فوجی حملہ کردیا۔ 5 ستمبر 1965ء کو ہندوستانی فوج نے پاکستانی فوج پر جوابی حملہ کردیا۔ 19 ستمبر 1965ء کو چین نے ریاست جموں کشمیر کے عوام کے حق ارادیت کی جدوجہد کی مکمل حمایت کردی۔ 22 ستمبر 1965ء میں دونوں فریقوں نے جنگ بندی پر رضامندی ظاہر کردی۔ 10 جنوری 1966ء میں سوویت یونین کی مصالحت سے ہندوستانی اور پاکستانی حکومتوں کے نمائندوں نے تاشقند معاہدے پر دستخط کردیئے۔ 5-6 مارچ 1967ء میں جموں کشمیر ریاست کی اسمبلی کے انتخابات کروائے گئے اور انڈین نیشنل کانگریس نے 75 میں 61 نشستیں قانون ساز اسمبلی کی حاصل کیں۔

جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے قانون ساز اسمبلی کی 8 نشستیں حاصل کیں اس دھڑے کی قیادت سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کررہے تھے۔ 8 دسمبر 1967ء کو شیخ عبداللہ کوایک بار پھر جیل سے رہا کیا گیا۔12 دسمبر 1971ء میں وزیر اعلیٰ غلام صادق وفات پاگئے اور سید میر قاسم نے انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے وزیر اعلیٰ جموں کشمیر کا عہدہ سنبھالا اور اپنی حکومت قائم کی۔ 8 فروری 1972ء میں پھر ریاستی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور انڈین نیشنل کانگریس نے 75 میں سے 58 نشستیں حاصل کیں۔ جموں کشمیر جماعت اسلامی نے قانون ساز اسمبلی کی 5 نشستیں حاصل کی تھیں۔

13 نومبر 1974ء میں شیخ عبداللہ کے نمائندوں اور ہندوستانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے درمیان کشمیر معاہدے پر دستخط ہوئے۔ 25 فروری 1975ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی مدد سے شیخ عبداللہ نے حکومت تشکیل دی اور وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ جولائی 1975ء میں جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کو دوبارہ تشکیل کیا گیا اور اس کی آزاد حیثیت قائم رکھی گئی۔ 16 مارچ 1977ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے شیخ عبداللہ کی ریاستی حکومت کی حمایت ختم کردی۔ شیخ عبداللہ نے وزیر اعلیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ 17 مارچ 1977ء سے ریاست جموں کشمیر میں صدارتی حکم نافذ کردیا گیا اور ریاست دہلی کے صدارتی حکم نامے کے ماتحت آگئی۔

ریاست جموں کشمیر ایک نئے موڑ کی طرف

30 جون 1977ء میں ریاست جموں کشمیر میں ایک بار پھر الیکشن ہوئے اور جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے اس بار 75 میں 47 نشستیں قانون ساز اسمبلی کی حاصل کی تھیں۔ جنتا پارٹی نے قانونی ساز اسمبلی کی 13 نشستیں حاصل کی تھیں۔ 9 جولائی 1977ء میں ایک بار پھر شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کی طرف سے ریاست میں حکومت تشکیل دی اور پھر ریاستی وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ 8 ستمبر 1982ء میں وزیر اعلیٰ ریاست جموں کشمیر شیخ عبداللہ کی وفات ہوگئی۔ 8 ستمبر 1982ء میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کی طرف سے

حکومت قائم کی اور ریاستی وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ 6 جون 1983ء کو ریاست جموں کشمیر میں اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے 75 میں سے 46 نشستیں قانون ساز اسمبلی کی حاصل کی تھیں۔ نیشنل کانگریس نے قانون ساز اسمبلی کی 26 نشستیں حاصل کی تھیں۔ 12 جون 1983ء میں فاروق عبداللہ نے نئی ریاستی حکومت تشکیل دی اور وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔

11 فروری 1984ء میں جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کے بانی اور ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی بحالی اور اس کی مکمل آزادی کے حامی لیڈر مقبول بھٹ کو دہلی کی تہاڑ جیل میں ہندوستانی حکومت نے پھانسی دے دی تھی۔ 2 جولائی 1984ء میں فاروق عبداللہ کو وزیر اعلیٰ کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور نیشنل کانفرنس کی طرف سے غلام محمد شاہ نے نئی ریاستی حکومت تشکیل دی اور وزیر اعلیٰ کا عہدہ حاصل کیا۔ 6 مارچ 1986ئ کو وزیر اعلیٰ غلام محمد شاہ کی حکومت بھی ختم کر دی گئی اور ریاست جموں کشمیر میں 6 مارچ 1986ء سے 7 نومبر 1986ء تک ایک بار پھر صدارتی حکم نامہ نافذ کر دیا گیا اور ریاست کا کنٹرول ہندوستان کے پاس چلا گیا۔ 7 نومبر 1986ء میں فاروق عبداللہ نے ایک اتحادی حکومت بنائی اور خود وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔

23 مارچ 1987ء کو ایک بار پھر ریاست جموں کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے اور نیشنل کانفرنس نے 76 میں سے قانون ساز اسمبلی کی 40 نشستیں حاصل کیں اور انڈین نیشنل کانگریس نے 26 نشستیں حاصل کی تھیں۔ 16 جنوری 1989ء میں جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی تشکیل کی گئی تھی۔ 13 جولائی 1989ء میں 3 پولیس اہلکاروں کو اسلامی مسلح گروپ نے قتل کر دیا تھا انہیں سرینگر شہر میں قتل کیا گیا تھا۔ ستمبر 1989ء میں جماعت اسلامی کا مسلح گروپ حزب المجاہدین تشکیل دیا گیا جو حکومت مخالف گروپ تھا۔ 8 دسمبر 1989ء کو جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) نے جموں کشمیر میں ہندوستانی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ 18 جنوری 1990ء میں وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ نے استعفیٰ دے دیا اور ہندوستانی حکومت نے ایک بار پھر ریاست میں صدارتی حکم نامہ نافذ کر دیا

۔ ریاست جموں کشمیر کا ہندوستانی خطہ ایک نئے بحران میں داخل ہو چکا تھا۔ ریاست کے کشمیری بولنے والے علاقے اور اس کے نزدیک جموں کے چند ڈسٹرکٹ میں بھی مسلح کاروائیاں ہندوستانی قبضے کے خلاف شروع کر دی گئی تھیں۔ 20 جنوری 1990ء میں ہندوستانی فوج نے سرینگر کے گوا کدل پُل (Bridge) پر 100 احتجاج کرنے والے کشمیری شہریوں کو گولیاں مار کر شہید کر دیا تھا۔

19 فروری 1990ء میں ہندوستانی حکومت نے ریاست کی قانون ساز اسمبلی کو توڑ دیا تھا اور ایک لاکھ پچیس (25) ہزار ہندوستانی فوج کو ریاست جموں کشمیر میں تعینات کر دیا تھا۔ یکم مارچ 1990ء میں ہندوستانی فوج نے سرینگر میں 33 احتجاج کرنے والے افراد کو گولیاں مار کر قتل کر دیا۔ 6 اگست 1990ء میں سرینگر میں لبریشن فرنٹ کے کمانڈر یاسین ملک کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ 6 جنوری 1993ء میں اسلام پسند عسکریت پسندوں نے گھات لگا کر بارڈر سیکیورٹی فورس کے ایک ممبر کو قتل کر دیا تھا یہ واقعہ سوپور میں ہوا تھا۔ 12 مارچ 1993ء میں جے وی کرشنا راؤ کو جموں کشمیر کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ 31 جولائی 1993ء میں 23 علیحدگی پسند پارٹیوں کا ایک اتحاد قائم کیا گیا جس کا نام آل پارٹیز حریت کانفرنس رکھا گیا تھا۔(APHC) 22 اکتوبر 1993ء میں بیج بھاڑہ میں ہندوستانی فوج نے 37 پر امن احتجاج کرنے والے کشمیریوں کو فائرنگ کر کے مار ڈالا۔ 17 مئی 1994ء میں لبریشن فرنٹ کے کمانڈر یاسین ملک کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ یاسین ملک جو لبریشن فرنٹ کی نمائندگی کر رہا تھا نے 21 مئی 1994ء کو یکطرفہ ہندوستانی حکومت سے جنگ بندی کا اعلان کر دیا تھا۔ 17 جون 1994ء کو ہندوستانی فوج نے 19 عسکریت پسندوں کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا تھا ہندوستانی فوج نے 29 جولائی سے 6 اگست 1994ء تک درگاہ حضرت بل کو گھیرے میں رکھا۔

24 دسمبر 1994ء میں عسکریت پسندوں نے 10 ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کو ہلاک کر دیا تھا صرف ایک سال میں 1994ء میں 1300 سویلین، 200 پولیس کے ملازم اور 1600 عسکریت پسند مارے گئے تھے اور یہ لوگ اسی سیاسی تشدد کے نتیجے میں

ریاست جموں کشمیر میں مارے گئے تھے جو عسکریت پسندوں اور ہندوستانی فوج کے درمیان شروع ہوا تھا۔ جنوری 30، 1995ء میں عسکریت پسندوں اور ہندوستانی فوج میں تصادم ہوا جس کے نتیجے میں 19 افراد مارے گئے تھے۔ 22 جولائی 1995ء کو عسکریت پسندوں نے گھات لگا کر ہندوستانی فوج پر حملہ کیا جس میں 7 فوج کے سپاہی اور دو عسکریت پسند مارے گئے۔

ریاست جموں کشمیر میں عسکریت پسندوں کی تحریک کے دوران 7 ستمبر سے 30 ستمبر تک ریاستی اسمبلی کے انتخابات کروائے گئے ان الیکشن میں جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے 87 میں سے 57 قانون ساز اسمبلی کی نشستیں حاصل کی تھیں۔ بھارتی جنتا پارٹی نے قانون ساز اسمبلی کی 8 نشستیں حاصل کی تھیں۔ ان انتخابات سے پہلے 567 افراد مارے گئے تھے۔ 9 اکتوبر 1996ء میں ریاست جموں کشمیر سے صدارتی حکم نامہ ختم کر دیا گیا تھا۔ 9 اکتوبر 1996ء میں نیشنل کانفرنس کے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ریاستی حکومت تشکیل دی اور وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔

22 مارچ 1997ء میں اسلامی عسکریت پسندوں نے سنگرام پورہ گاؤں میں 7 کشمیری ہندو پنڈتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ 14 مئی 1997ء میں ہندوستانی فوج نے 15 عسکریت پسندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ 3 جون 1997ء میں تین ہندوستانی فوجی لینڈ مائن سے ہلاک ہو گئے تھے۔ 6 جون 1997ء کو ہندوستانی فوج نے 13 عسکریت پسندوں کو مار ڈالا تھا۔ 23 اکتوبر 1997ء میں جموں شہر کے قریب عسکریت پسندوں نے ایک ہندوستانی فوجی کو ہلاک کر دیا تھا۔ 25 جنوری 1998ء میں 23 کشمیری پنڈتوں کو ہلاک کیا گیا جن میں 9 عورتیں اور چار بچے بھی شامل تھے یہ کام پاکستانی حمایت یافتہ عسکریت پسند اسلامی گروپ لشکر طیبہ نے کیا تھا۔ یہ قتل وندانہ ٹاؤن میں کیے گئے تھے۔ 27 جنوری 1998ء میں امریکی حکومت نے ان 23 پنڈتوں کے قتل کی مذمت کی تھی جو وندانہ میں کیے گئے تھے۔ 17 جنوری 1998ء میں ہندوستانی حکومت نے لبریشن فرنٹ پر پابندی کی مدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ 17 اپریل 1998ء میں 26 کشمیری پنڈتوں کو عسکریت پسندوں نے پران کوٹ اور ڈھکی کورٹ ادہم پور ڈسٹرکٹ میں قتل کر دیا تھا۔

19 جون 1998ء میں ڈوڈہ ڈسٹرکٹ میں 25 ہندو پنڈتوں کو عسکریت پسندوں نے ہلاک کیا تھا۔اس کے بعد بھی عسکریت پسندوں اور ہندوستانی فوج کا تشدد جاری رہتا ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں بے گناہ شہری بھی مارے گئے۔ ایسی ہی تشدد کی کاروائی میں 28 جولائی 1998ء میں ڈوڈہ ڈسٹرکٹ میں 15 کشمیری پنڈتوں کو قتل کردیا گیا تھا۔ یکم جون 1998ء میں اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی نے جموں کشمیر کے عوام کی حق خودارادیت کی حمایت کی تھی۔ اسلامی عسکریت پسند گروپ حزب المجاہدین نے 2000ء میں یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کردیا۔ یکم اگست 2000ء میں پہلگام میں 30 ہندو یاتریوں کو ہلاک کیا گیا۔ 23 مارچ 2001ء میں ہندوستانی فوج نے عسکریت پسندوں سے جنگ بندی ختم کر کے ایک بار پھر فوجی آپریشن شروع کیا تو عسکریت پسندوں نے ریاستی قانون ساز اسمبلی کی عمارت پر بموں سے حملہ کردیا تھا اور اس بم حملے میں 38 افراد مارے گئے تھے۔ 30 مارچ 2002ء میں جموں کے ایک مندر میں خودکش حملہ کر کے 11 افراد کو ہلاک کیا گیا تھا۔تشدد کی کاروائیاں جاری تھیں اور ریاستی اسمبلی کے انتخابات 6 ستمبر سے 8 اکتوبر 2002ء میں کروائے گئے۔نیشنل کانفرنس نے 87 میں سے 28 نشستیں ہی حاصل کیں اور کانگریس نے 20 نشستیں حاصل کی تھیں۔ ان انتخابات سے پہلے والے تشدد میں 580 افراد مارے گئے تھے۔ ہندوستانی حکومت نے جموں کشمیر ریاست کو ایک بار پھر صدارتی حکم نامے کے تحت 18 اکتوبر سے 2 نومبر 2002ء تک دہلی کے کنٹرول میں رکھا۔نومبر 2002ء میں مفتی سعید پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف اتحادی حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے اور چیف منسٹر بنائے گئے۔

24-25 نومبر 2002ء میں جموں مندر کے سامنے پولیس اور عسکریت پسندوں کے درمیان تصادم کے نتیجے میں 14 افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ اس واقعہ کی امریکہ نے بھی مذمت کی تھی۔ 23 مارچ 2003ء میں اسلامی عسکریت پسندوں نے ایک حملے میں گاؤں نندی مرگ میں 24 کشمیری پنڈتوں کو قتل کر دیا تھا۔ یہ گاؤں پلوامہ ڈسٹرکٹ میں ہے۔ ایک دوسرے تصادم میں ہندوستانی فوج نے 12 جون 2003ء کو 8 عسکریت پسندوں کو مار ڈالا۔

28 جون 2003ء میں عسکریت پسندوں نے ایک فوجی کیمپ پر حملہ کر کے 12

سپاہیوں کو مار ڈالا اور دو عسکریت پسند بھی اس حملے میں مارے گئے۔ 29 جون 2003ء میں ایک بار پھر عسکریت پسندوں اور ہندوستانی فوج میں تصادم ہوا اور اس میں 9 افراد مارے گئے۔ 20 جولائی 2005ء میں سرینگر میں ایک خودکش بمبار نے 4 ہندوستانی سپاہی ہلاک کردیئے تھے۔ 29 جولائی 2005ء میں عسکریت پسندوں نے سرینگر میں دو افراد کو ہلاک کردیا تھا۔ 18 اکتوبر 2005ء میں عسکریت پسندوں نے وزیر تعلیم غلام نبی لون کو سرینگر میں قتل کردیا تھا۔ 2 نومبر 2005ء میں غلام نبی آزاد نے انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے ریاستی حکومت تشکیل دی اور وزیر اعلیٰ بن گئے۔ عسکریت پسندوں نے 30 اپریل 2006ء میں 35 ہندوؤں کو اودھم پور میں ہلاک کردیا تھا۔ 11 جولائی 2006ء میں لشکر طیبہ کے عسکریت پسندوں نے سرینگر میں 8 افراد کو ہلاک کردیا تھا۔ اس طرح 2007ء اور 2008ء میں عسکری کارروائیاں اور جوابی فوجی کارروائیوں میں کئی فوج اور عسکریت پسند مارے گئے۔

30 جنوری 2008ء میں حزب المجاہدین کے 4 عسکریت پسند مارے گئے۔ 23 مارچ 2008ء میں سرینگر میں فوج اور عسکریت پسندوں میں تصادم ہوا اور 4 فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ 11 جولائی 2008ء میں ریاست پر ایک بار پھر صدارتی حکم نامہ نافذ کردیا گیا۔ 19 جولائی 2008ء میں سرینگر میں ایک بم حملے میں ہندوستان کے 9 فوجی مارے گئے تھے۔ ریاست میں ایک بار پھر انتخابات کروائے گئے جو 17 نومبر سے 24 دسمبر 2008ء میں منعقد ہوئے اور جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے 28 نشستوں پر کامیابی حاصل کی تھی اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی نے قانون ساز اسمبلی کی 21 نشستیں حاصل کی تھیں۔ 5 جنوری 2009ء میں صدارتی رول ختم کردیا گیا اور 5 جنوری 2009ء میں عمر عبداللہ نے اتحادی حکومت بنائی اور خود وزیر اعلیٰ بن گیا۔ لیکن تشدد کی کارروائیوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

28 جنوری 2010ء میں ایک تصادم میں دو بھارتی فوجی عسکریت پسندوں کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے تھے۔ یہ تصادم ضلع کشتواڑ میں ہوا تھا۔ اسی طرح 4 مئی 2010ء اور 6 مئی 2010ء میں فوج اور عسکری گروپوں میں تصادم کے نتیجے میں 4 فوجی ہلاک اور 4 عسکریت پسند مارے گئے تھے۔ 29 جون 2010ء کو پولیس فائرنگ سے تین احتجاج کرنے

والے سویلین قتل ہو گئے اور 6 جولائی 2010ء میں سرینگر میں پولیس فائرنگ سے تین افراد احتجاج کے دوران مارے گئے۔ یکم اگست 2010ء میں 9 افراد سرینگر کے پامپور علاقے میں پولیس فائرنگ سے مارے گئے۔ 2 جون 2011ء میں کپواڑہ میں تین عسکریت پسند مارے گئے تھے۔ 15 جولائی 2011ء میں کپواڑہ میں تین عسکریت پسند مارے گئے تھے۔ 19 اپریل 2012ء میں عسکریت پسندوں نے سرینگر میں ایک پولیس اہلکار کو ہلاک کر دیا تھا۔ 2 ستمبر اور 25 ستمبر 2012ء میں عسکریت پسندوں اور سیکیورٹی فورسز میں تصادم کے نتیجہ میں ایک سپاہی اور ایک عسکریت پسند مارا گیا تھا، یہ واقع ہندواڑہ میں ہوا تھا۔ 13 مارچ 2013ء کو حزب المجاہدین کے عسکریت پسندوں نے سنٹرل ریزرو پولیس (CRPF) کے کیمپ پر حملہ کیا جو بیمنہ ڈسٹرکٹ سرینگر میں واقع تھا جس میں 5 سنٹرل ریزرو پولیس کے ممبرز مارے گئے تھے۔

24 جون 2013ء میں عسکریت پسندوں نے سرینگر میں فوج پر حملہ کر کے 8 سپاہی مار دیئے۔ یکم جولائی 2013ء کوترال میں عسکریت پسندوں اور پولیس میں تصادم ہوا جس میں دو عسکریت پسند اور ایک پولیس سپاہی مارا گیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ان تشدد کی کاروائیوں میں 50 ہزار سے زیادہ افراد مارے جا چکے ہیں جن میں 7 ہزار کے لگ بھگ ہندوستانی سیکیورٹی فورسز کے افراد، 20 ہزار کے قریب عسکریت پسند مارے جا چکے ہیں اور 10 ہزار افراد کو سیکیورٹی ایجنسیوں نے غائب کیا ہوا ہے۔ کئی ہزار افراد ہجرت کر کے ہندوستان کے شہروں میں اور کئی افراد لائن آف کنٹرول عبور کر کے آزاد کشمیر کے مختلف علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے جن کی حالت کیمپوں میں بد سے بدتر ہو چکی ہے۔ یہ اعداد و شمار امریکہ کی آکنساس یونیورسٹی نے اکٹھا کر رکھے ہیں لیکن حقیقت میں ریاست جموں کشمیر میں ہندوستانی ریاست نے 8 لاکھ کے قریب اپنی فوج رکھی ہوئی ہے اور جس طرح ہندوستانی فوج نے عسکریت پسندوں کے خلاف فوجی آپریشن میں آبادی کے سویلین حصے پر جبر و تشدد اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا ہے ہلاکتوں کی تعداد کئی زیادہ ہے کیونکہ تشدد میں جو لوگ مارے گئے۔ ہندوستانی فوج نے ان کی لاشوں کو بھی غائب کرنے کا کام کیا ہے۔ کئی اجتماعی قبریں بھی جموں کشمیر کے ہندوستانی علاقوں میں دریافت ہوئی ہیں۔ ایک طرف

پاکستانی ریاست کے حمایت یافتہ عسکریت پسند تھے تو دوسری طرف ان کے خلاف جوابی کاروائیاں کرنے والے ہندوستانی فوج کے سپاہی جو نہ صرف ان علاقوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ انہیں مذہبی تعصب کی وجہ سے تشدد کی طرف اکسایا گیا تھا۔ ہندوستانی ریاست کا عسکریت پسندوں سے سلوک انگریز دور کے آزادی پسندوں سے کئی گنا زیادہ ظالمانہ اور جابرانہ تھا کیونکہ ہندوستانی فوج کی تربیت بھی انگریز زمانے کے نوآبادیاتی رویوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ ہندوستانی سپاہی علاقائی اور ریاستوں کے اندر چلنے والی جائز حقوق کی تحریکیں بھی کچلنے کے لیے وہی غیر ملکی قابض فوج کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کی عسکریت پسند تحریک کو ہندوستانی فوج نے پاکستانی حمایت کا لیبل لگا کر ظالمانہ طریقے سے جبر وتشدد کا نشانہ بنایا اور جس طرح کے فوجی آپریشنز کیے گئے ان میں دہشت پھیلانے اور سویلین آبادی کو خوف زدہ کرنے کا عنصر ابتداء میں ہی غالب تھا۔

ہندوستانی ریاست کا یہ ظالمانہ سلوک کشمیری عوام کے ساتھ ہی رہا ہے کیونکہ مسلح جدوجہد کا محور صرف کشمیری بولنے والا مسلم علاقہ ہی رہا ہے۔ ابتداء میں جموں کے مسلم اکثریت والے چند ضلعوں میں کشمیری مسلح گروہوں کی حمایت بھی رہی ہے۔ دراصل ہندوستان کا رویہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ کسی طریقے سے مسلح جدوجہد اور سیاسی تحریک میں مذہبی رجحان حاوی رہے تو اس سے ہندوستان اپنے فائدے کے لیے اور تحریک کو ایک ریاستی علاقے میں محدود اور ایک مذہب کے ماننے والوں تک رکھنا چاہتا تھا۔ یہی حال مسلح جدوجہد میں شامل اسلامی گروہوں کا تھا وہ مسلم آبادی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر پاکستان سے زیادہ سے زیادہ اس تحریک کے لیے مالی امداد سمیت سیاسی مدد بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ریاست کی آزادی کے لیے ریاست کے تنازعہ کو ہندو، مسلمان اور ہندوستان کے بٹوارے کی نظر سے حل کرنے کا پرانا 1947ء والا فارمولا ہی کارآمد تصور کرتے تھے جس کا سارا فائدہ ہندوستان نے اٹھایا کیونکہ تحریک ریاست کے دوسرے حصوں میں پھیل نہ سکی۔ غیر مسلم ریاستی عوام وادی کی اس کی مسلح تحریک کو اپنے خلاف تصور کرتے تھے اور تحریک میں شامل گروپوں کو ریاست کی آزادی کی بجائے مذہب کی جنگ تصور کرتے تھے۔ اس کا فائدہ

بھی ہندوستان کو ہوا کیونکہ اسلامی تحریک کے خلاف ریاست کی غیر مسلم آبادی نے ہندوستان کی حمایت کی تھی اور اس اسلامی تحریک کا مقصد ریاست کے کشمیری بولنے والے مسلم علاقے کو پاکستان میں شامل کرنا تھا۔ اس تحریک کے لوگوں کا ویژن بہت ہی محدود اور سوچ بہت ہی پسماندہ تھی جس کی وجہ سے ریاست کے تنازعہ میں ریاستی عوام کو تیسرا فریق تسلیم کروانے کی بجائے وہ تنازعہ کے ایک فریق پاکستان کی جنگ دوسرے فریق ہندوستان سے لڑ رہے تھے۔ اسی وجہ سے ریاست جموں کشمیر کے عوام تقسیم ہو گئے اور دونوں فریقوں کی جنگ میں حصہ دار بن گئے۔ کشمیری مسلم عوام نے جموں اور لدّاخ کے عوام کو اپنے سے دور کر دیا اور اپنی فرقہ وارانہ مذہبی تحریک کا بھی دُشمن بنالیا۔

ریاست جموں کشمیر کے علاقے جو ہندوستان کے زیر کنٹرول ہیں وہاں کی عوام پر اس علاقائی مذہبی کشمیری خطے کی تحریک کے شدید منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں اس وقت غیر مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ ہندوستان کا حمایتی ہو گیا اور مسلم آبادی بھی ہندوستان نوازی اور پاکستان نوازی میں بٹ چکی ہے جبکہ اس ریاست کی وحدت کی بحالی کی تحریک تمام مذاہب اور تمام ریاستی خطوں کی حمایت سے ممکن ہے۔ اب ہم ریاست جموں کشمیر کے ہندوستان کے زیر انتظام علاقوں کو جو ہندوستانی آئین میں خصوصی درجہ ملا ہوا تھا۔ اس میں سیاسی، سماجی، معاشی اور علاقائی آزادی کا درجہ کیا تھا؟ 5 اگست 2019ء میں ریاست کی حیثیت ختم ہونے سے یونین علاقہ بن جانے سے ریاستی عوام کی سیاسی، سماجی، معاشی اور علاقائی آزادی کا معیار کیا رہ گیا ہے، اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

1۔علاقائی، انتظامی اور سیاسی تبدیلیاں

ہندوستان کے زیر انتظام جموں کشمیر کی ریاست کو ہندوستانی آئین میں معقول علاقائی خودمختاری ملی تھی۔ تاہم اس ریاست کی اندرونی خودمختاری کی حیثیت 2019ء میں ختم کر دی گئی تھی اور اس کے بعد جو ریاست جموں کشمیر ہوا کرتی تھی اسے دو یونین علاقوں میں تقسیم کر کے دہلی کے براہِ راست کنٹرول میں دے دیا گیا۔ اب یہ ریاست نہیں رہی بلکہ

ہندوستان کی مرکزی حکومت کے زیر کنٹرول دو علاقے ہیں ایک کو یونین علاقہ جموں کشمیر (UTJK) اور دوسرے کو یونین لدّاخ (UTL) کہا جاتا ہے۔ ہندوستانی حکومت نے جس طرح ریاست جموں کشمیر کی ریاستی حیثیت کو ختم کیا تھا وہ ہندوستانی آئین کے بھی منافی قدم اٹھایا گیا تھا اس لیے اس اقدام کو ہندوستان کی عدالت میں چیلنج کیا گیا ہے لیکن ہندوستان کی موجود حکومت نے عدلیہ سمیت ریاستی اداروں کو سیاسی دباؤ میں رکھا ہوا ہے۔ کرپشن بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے تین سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود عدلیہ نے ریاستی حیثیت کے خاتمے پر اپنا فیصلہ نہیں دیا اور نہ اس کی سماعت شروع کی ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بی جے پی کی حکومت نے ریاستی اداروں کو بھی مذہبی تعصب کا شکار کر دیا ہے یا ان پر انتظامی دباؤ اتنا بڑھا دیا ہے کہ وہ حساس سیاسی معاملات میں عدلیہ بھی مرکزی حکومت کے خلاف فیصلے دینے سے گریز کرتی ہے۔ عدلیہ کا فیصلہ ریاست کے حق میں یا خلاف آئے لیکن انصاف میں اتنی دیر کرنے سے وہ انصاف ناانصافی میں بدل جاتا ہے۔ ریاست کو یونین علاقہ بنانے سے جموں کشمیر کے شہریوں کے کئی سیاسی حقوق ختم کر دیئے گئے ہیں جو پہلے سیاسی نظام میں انہیں میسر تھے۔ سول حقوق اس لئے محدود کر دیئے گئے ہیں تاکہ عوامی مخالفت کو کنٹرول کیا جائے اور ختم کیا جا سکے جو ریاست کی تنظیم نو کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ ہندوستانی سیکیورٹی فورسز پر بار بار انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے الزام لگ رہے ہیں لیکن انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے باوجود چند سیکیورٹی اہلکاروں کو سزا دی گئی ہے۔

ریاست جموں کشمیر کے خطے کو 2019ء میں سیاسی تنظیم نو کے دوران شہریوں کے لیے انٹرنیٹ کی سہولت محدود کر دی گئی اور اسمبلی (اکٹھا ہونا) کی آزادی 2020ء میں بھی شدید پابندیوں کا شکار رہی ہے۔ ہزاروں کشمیری باشندے جو پچھلے سال پکڑ دھکڑ کے دوران قید کیے گئے تھے وہ ابھی تک قیدِ تنہائی میں ہیں۔ ہندوستانی حکومت نے مارچ اور اکتوبر 2020ء میں اس قانون میں ترمیم کر دی تھی جس کی وجہ سے یہ ممکن بنا دیا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہندوستانی وہاں کے مستقل باشندے بن سکتے ہیں اور جموں کشمیر میں زمین خرید سکتے

ہیں۔ یہ اقدامات تشویش پیدا کرتے ہیں کہ ہندوستانی حکومت ریاست جموں کشمیر کا لسانی، علاقائی اور مذہبی اکثریتی حیثیت ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مئی 2020ء میں ایک عسکریت پسند کشمیری لیڈر کا ہندوستانی سیکیورٹی فورسز کے ہاتھوں قتل کے بعد احتجاج کی ایک شدید لہر کے دوران پولیس کی پُرتشدد کاروائی کی وجہ سے ایک کشمیری فائرنگ سے مارا گیا اور درجنوں زخمی ہوگئے تھے۔ ریاست میں معاشی صورتحال بدترین ہوگئی اور اس سارے عرصے کے دوران کیونکہ سیکیورٹی کی شدید پابندیاں لائی گئی تھیں اور نقل وحرکت پر نئی پابندیاں عائد کی گئی تھیں جو بعد میں کوڈ-19 کی وجہ سے مزید سخت کردی گئی تھیں۔

2۔سیاسی حقوق اور آزادانہ الیکشن کا طریقہ

اگست 2019ء سے پہلے ریاست جموں کشمیر ہندوستان کے آئین کے آرٹیکل 370 کے تحت سپیشل اندرونی خودمختاری کی حیثیت رکھتی تھی۔ ریاست کا وزیر اعلیٰ جو اسمبلی میں اکثریتی پارٹی کا سربراہ ہوتا تھا اس کے پاس انتظامیہ کے سربراہ کے اختیارات بھی ہوتے تھے۔ قانون ساز اسمبلی ریاستی اسمبلی کا ایوان زیریں کہلاتا تھا۔ اب جموں کشمیر کی تنظیم نو کے ایکٹ 2019ء کے مطابق جو ہندوستانی پارلیمنٹ نے اگست 2019ء میں منظور کیا تھا اس کے تحت خطے کی اندرونی خودمختاری کی حیثیت کو ختم کردیا گیا ہے اور اس کا ریاست کا درجہ کم کر کے یونین علاقہ بنا دیا گیا ہے۔ لدّاخ کو الگ کر کے اسے دوسرا یونین علاقہ بنایا گیا ہے۔ اس وقت انتظامیہ کے نگران کی حیثیت لیفٹیننٹ گورنر کو دی گئی اور گورنر کو ہندوستان کا صدر، وزیراعظم کے مشورے سے مقرر کرتا ہے۔ جموں کشمیر میں لیفٹیننٹ گورنر کو وزیراعلیٰ اور کابینہ کی مدد درکار ہوتی ہے جو ایک منتخب قانون ساز باڈی محدود اختیارات کے ساتھ ذمہ داری سنبھالے اور جموں کشمیر میں ایسی قانون ساز باڈی یا ہاؤس 2022ء کے آخر تک منتخب نہیں کی گئی تھی۔ جموں کشمیر کی ریاستی حیثیت اور خودمختاری جس طریقہ کار کے تحت ختم کی گئی تھی اس پر شدید تنقید کی گئی اور اس طریقہ کار کی قانونی حیثیت پر شکوک شبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس طریقہ کار کے مخالفین نے اور دیگر تجزیہ نگاروں نے یہ دلیل دی ہے کہ مرکزی حکومت نے ریاستی انتخابات

جو 2018ء میں شروع ہونے والے تھے غیر معقول طریقے سے لیٹ کیے تھے اور جلدی میں ریاست کی تنظیم نو کا قانون منظور کیا تھا جس پر معمولی نوعیت کی بحث کی گئی تھی۔

3۔ ریاستی قومی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات

ریاست جموں کشمیر کی تنظیم نو کے ایکٹ (Reorganization Act) 2019ء سے پہلے اس خطے کی اسمبلی کے دو ایوان تھے۔ قانون ساز اسمبلی جو 87 اراکین پر مشتمل تھی اور اس اسمبلی کے اراکین براہِ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے تھے اور ان کی مدت 6 سال ہوتی تھی۔ ایوان بالا و دھان پرشید کو قانون ساز کونسل کہا جاتا تھا جو 28 اراکین پر مشتمل ہوتی تھی اس کونسل کے 8 اراکین کو ریاست کا گورنر نامزد کیا کرتا تھا اور باقی 20 اراکین کو قانون ساز اسمبلی کے ممبران نامزد کیا کرتے تھے۔ کونسل کے اراکین براہِ راست عوام کے ووٹوں کی بجائے عوام کے منتخب نمائندوں کے ووٹوں سے قانون ساز کونسل کے ممبر چنے جاتے تھے۔ جموں کشمیر کے ریاستی انتخابات جو 2014ء میں ہوئے انہیں ماضی کے انتخابات سے زیادہ آزادانہ اور شفاف مانا جاتا ہے کیونکہ ان انتخابات کے دوران ووٹروں کے ساتھ خوف و ہراس کرنے اور تشدد کا درجہ کم استعمال کیا گیا تھا جس طرح ماضی کے الیکشن میں ہوا تھا اور گورنر نے ریاستی پارٹیوں کی طرف سے نئی ریاستی حکومت بنانے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ بی جے پی نے اتحادی حکومت کی حمایت واپس لے کر اس آخری اتحادی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا جو بھارتیہ جنتا پارٹی اور جموں کشمیر پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے اتحاد سے بنی تھی۔ اس دوران مرکزی حکومت نے ریاست پر دہلی کا براہِ راست راج لاگو کر دیا اور اس کی مدت میں اضافہ کر دیا۔ ریاست میں نئے انتخابات کو 2019ء کے موسم گرما تک ملتوی کر دیا تھا تب ریاست میں تنظیم نو ایکٹ لاگو کر کے سب کو حیران کر دیا اور کسی کو بات چیت کے قابل ہی نہ چھوڑا۔

ریاست جموں کشمیر کے لیے 2019ء میں جو نیا انتظام کا بندوبست کیا گیا تھا اس کے تحت ریاست جموں کشمیر کی نئی قانون ساز باڈی محدود اختیارات کے ساتھ ایک ہی ایوان پر مشتمل ہوگی اور اس کے منتخب اراکین کی تعداد 83 ہوگی اور 24 نشستوں کو پاکستانی زیر

کنٹرول ریاست کے علاقوں کے لیے خالی رکھا جائے گا تاہم انتخابات 2022ء تک متوقع ہو سکتے ہیں جو نئی حلقہ بندیوں کے مکمل ہونے تک ہی ممکن ہوں گے۔لدّاخ کی نئی یونین ٹرٹیری (علاقہ) البتہ لیفٹیننٹ گورنر کے انتظام میں ہی رہے گی جس کی اپنی کوئی قانون ساز اسمبلی نہیں ہوگی۔اس طرح اکتوبر 2019ء میں مقامی بلاک ڈویلپمنٹ کونسل کے الیکشن کا مقامی سطح کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے بائیکاٹ کیا تھا۔تاہم ڈسٹرکٹ ڈویلپمنٹ کونسلز کے انتخابات جو نومبر اور دسمبر 2020ء میں کروائے تھے۔ان کشمیری جماعتوں کے اتحاد نے 20 میں سے 13 نشستیں جیتیں جو علاقائی خودمختاری کی حمایت کرتی ہیں اس کے باوجود ان کے امیدوار جیتے جن کی شکایات یہ تھیں کہ انہیں پورا وقت نہیں دیا گیا اور اپنے انتخابات کے لیے ووٹ لینے میں ادھر ادھر جانے کو بھی محدود کیا گیا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کو اس الیکشن میں کافی نقصان ہوا تھا لیکن وہ لدّاخ کی ہل ڈویلپمنٹ کونسل کے انتخابات جو اکتوبر میں ہوئے لہہ ڈسٹرکٹ کا کنٹرول حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

الیکشن کے لیے ریاست میں جو قانونی ڈھانچہ 2019ء سے پہلے موجود تھا اس کو بڑے پیمانے پر صاف اور شفاف ہی تصور کیا جاتا تھا جبکہ انتخابات کروانے والے کارکنوں اور انتخابی اہلکاروں کو عسکریت پسند گروپ ڈراتے دھمکاتے تھے جس کی وجہ سے بعض اوقات انتخابی قوانین درست طرح سے لاگو کرنا مشکل ہوتا تھا کیونکہ عسکریت پسندوں کی مداخلت کی وجہ سے الیکشن کے قوانین اور ضوابط کا اطلاق کرنے میں مشکلات کا سامنا بھی ہوتا تھا لیکن اس کی نگرانی انڈین الیکشن کمیشن نے کی تھی جو ایک آزاد اور باعزت ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ نے جموں کشمیر ریاست کی تنظیم نو ایکٹ جلدی میں منظور کیا اور کشمیریوں کی طرف سے اس میں اہم کردار کے بغیر ہی انتخابی نظام میں بنیادی تبدیلی کر دی گئی اور ریاستی شہریوں کو بڑے پیمانے پر ووٹ کے اختیار سے بھی محروم کر دیا۔

4۔مختلف سیاسی جماعتوں کا کردار

ریاست جموں کشمیر کے ہندوستانی علاقوں میں ملٹی پارٹی یعنی مختلف خیالات اور نظریات رکھنے والی سیاسی جماعتیں موجود ہیں۔ 2019ء سے پہلے بھی اس خطے میں مختلف

الخیال اور نظریات رکھنے والی سیاسی جماعتوں کا وجود تھا۔نئی سیاسی جماعت کو الیکشن کمیشن میں اپنے آپ کو رجسٹرڈ کروانا پڑتا ہے سیاسی جماعتوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ آزادانہ طور پر بنائی جاسکتی ہیں اور ایسا طریقہ کار بھی موجود تھا جس کے تحت آزاد امیدوار بھی کسی آفس کے لیے الیکشن میں حصہ لے سکتے تھے۔

سیاسی پارٹی کے لیے جو بڑی رکاوٹیں الیکشن کے حوالے سے تھیں وہ عسکریت پسندوں کی طرف سے تشدد اور خوف و ہراس کا ڈر اور ان کی طرف سے الیکشن کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔اگست 2019ء کے بعد سیاسی سرگرمیاں مکمل طور پر ختم کردی گئی تھیں اور سیکیورٹی اہلکاروں نے ہزاروں سیاسی کارکنوں اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے ممبران کو کسی مقدمے کے بغیر ہی قید میں ڈال دیا تھا۔اس میں کشمیری مین سٹریم (Mainstream) سیاسی قائدین اور پارٹیاں بھی شامل تھیں اور کانگریس پارٹی کی ریاستی برانچ کے کارکن اور قائدین بھی شامل تھے۔کئی سابق وزرائے اعلیٰ اور موجودہ اسمبلی ممبران بھی ان قیدیوں میں شامل تھے ان میں سے کچھ کو جیلوں سے رہا بھی کیا گیا ہے لیکن ان میں سے کئی 2020ء کا سارا سال ہی جیل میں رہے ہیں۔

اکتوبر 2020ء میں آخری منتخب وزیر اعلیٰ محبوبہ مفتی کو جیل سے رہا کیا گیا تو اس کی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی نے عوامی اتحاد گپکار کا اعلان کیا جس میں کئی دوسری کشمیری سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں۔اس کی سابقہ حریف پارٹی جموں کشمیر نیشنل کانفرنس بھی شامل ہے۔یہ نیا اتحاد اس خطے کی خود مختاری بحال کروانے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہے جو ہندوستانی آئین کے تحت ریاست کو خود مختاری ملی ہوئی تھی۔دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے ریاست کا اقتدار دو بڑی کشمیری سیاسی پارٹیوں کے درمیان ہی گھوم رہا ہے۔

یہ دو بڑی سیاسی جماعتیں JKNC اور JKPDP ہیں۔ہندو قوم پرست BJP جو اس وقت دہلی کے اقتدار پر قابض ہے اس نے حالیہ سالوں میں انتخابات کے ذریعہ بہت اہمیت حاصل کرلی ہے اور اس نے پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ مل کر 2015-2018ء تک ریاست جموں کشمیر میں اتحادی حکومت قائم کی تھی۔ریاستی انتخابات کے ملتوی ہونے اور اس خطے کی تنظیم نو کرنا اور اس سے جڑے ہوئے عوامی گرفتاریوں کی وجہ سے اپوزیشن پارٹیوں

کی اہلیت کومزید کم کردیا ہے کہ وہ اس کا مقابلہ کرسکیں اور مستقبل کی جموں کشمیر کی حکومت کا حصہ بن سکیں یا خودحکومت بناسکیں۔عوامی اتحاد گپکار اعلان نے حکومت ہند پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ اتحاد کی الیکشن مہم میں رکاوٹیں ڈال کر اس کی آزادانہ اہلیت کوکم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ یہ الزام گپکار اتحاد نے نومبر اور دسمبر کے ڈسٹرکٹ ڈویلپمنٹ کونسلز کے انتخابات کے دوران لگایا گیا تھا جبکہ گپکار اتحاد نے اس کے باوجود یہ انتخابات سارے ہی جیت لیے تھے۔ لدّاخ کی یونین ٹریٹری کے لیے مرکزی حکومت کی طرف سے لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا گیا جوصرف انتظامیہ کے سربراہ کی تبدیلی کا فیصلہ ہے۔اس کی اپنی قانون ساز باڈی (Body) نہیں ہے۔گویا انتخابات کے ذریعہ اقتدار میں رہنے والی اتھارٹی کو بدلنا ممکن نہیں ہوگا خاص کر کے لدّاخ خطے کی حدود میں انتظامیہ کے سربراہ کی تبدیلی کا فیصلہ اب دہلی سے ہوا کرے گا۔

لدّاخ خطے میں بھی ڈسٹرکٹ ڈویلپمنٹ کونسلز کے الیکشن ہوئے ہیں لیکن ان کے اختیارات کو جموں کشمیر کی طرح سرکاری اہلکار ہی استعمال کرتے ہیں۔ ان منتخب کونسلرز پر سرکاری اہلکار حاوی ہوتے ہیں۔عسکریت پسند علیحدگی پسندوں کی سرگرمیاں اور ہندوستانی سیکیورٹی اداروں کی بڑے پیمانے پر موجودگی نے بعض علاقوں میں لوگوں کے لیے سیاسی نظام کا حصہ بننے کے پراسیس کو بہت ہی مشکل بنا دیا تھا اور آزادانہ الیکشن میں حصہ لینا بھی آسان نہیں تھا۔اگست 2019ء سے ریاست میں لاکھوں ہندوستانی فوجیوں میں مزید اضافہ کرکے اس خطے میں تعینات کیا ہے تا کہ ریاست کی تنظیم نو کے ایکٹ کی مخالفت کرنے والوں کو طاقت سے دبایا جائے۔فوجوں کی تعیناتی کے بارے میں رپورٹس ہیں کہ یہ خوف اور تشدد کی علامت بن گئے ہیں خاص کر سویلین آبادی کے لیے فوج کا تشدد مزید بڑھ گیا ہے۔ پانچ ہزار سے زیادہ لوگوں کو جن میں پرامن احتجاج کرنے والے بھی شامل ہیں، 2019ء کے سال میں گرفتار کیا گیا ہے۔

5۔مذہبی،سیاسی اورجنس کی بنیاد پرامتیازی سلوک

ریاست جموں کا سابق آئین 18 سال سے زیادہ عمر کے مستقل باشندوں کوریاستی

اسمبلی کے الیکشن میں ووٹ دینے کا حق دیتا تھا۔اس خطے میں 2018ء تک عورت ریاست کی وزیر اعلیٰ تھی لیکن اس کے باوجود عورتوں کی سیاست میں نمائندگی بہت کم ہے۔2019ء کے تنظیم نو ایکٹ سے پہلے پاکستان سے آئے ہوئے 1947ء کے مہاجرین جن کی بڑی تعداد ہندو ہے انہیں مستقل رہائش کا حق نہیں تھا اور وہ ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں ووٹ نہیں دے سکتے تھے جبکہ وہ ہندوستانی پارلیمنٹ کے لیے ووٹ دے سکتے تھے۔ایسے افراد کو پہلی بار نومبر 2020ء میں ڈسٹرکٹ ڈویلپمنٹ کونسلز کے انتخابات میں ووٹ دینے کی اجازت دی گئی ہے۔کونسلز کے انتخابات کی مہم کے دوران مسلمان کشمیری امیدواروں کو اور ان کی جماعتوں کو انتخاب سے محروم کیا گیا کیونکہ انہیں جیلوں میں ڈال کر الیکشن کروائے جانے کا الزام ہے۔انہیں پولیس کی طرف سے الیکشن مہم میں حصہ لینے پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں اور ان میں کئی پر پابندیاں سیکیورٹی کی وجہ سے عائد کی گئی تھیں۔2019ء سے ریاست میں تنظیم نو کے عمل نے لدّاخ کی بدھ اور مسلم آبادی کو حکومت کے منتخب اداروں سے اپنے خطے میں محروم کر دیا ہے۔وہاں ابھی تک دو خود مختار ہل کونسلز (Hill Council) موجود ہیں جو لدّاخ کے ضلعوں لہہ اور کارگل کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن کارگل میں آبادی کی اکثریت نے 2019ء کی تبدیلیوں کی مخالفت کی ہے۔ وہاں کی سیاسی پارٹیوں کے ایک اتحاد نے جس میں حکومتی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی بھی شامل تھی نے اکتوبر 2020ء کے ہل کونسل کے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی تھی کہ جب تک مرکزی سرکار اس بات کا وعدہ نہ کرے کہ وہ لوگوں کو زمین کے ملکیتی حقوق کے بارے میں تشویش اور دیگر خدشات کو دور کرے جو لدّاخ کی نئی حیثیت کے اثرات سے پیدا ہوئے ہیں۔

6۔حکومتوں کی کارکردگی اور منتخب نمائندں کو پالیسیاں بنانے کا اختیار

ریاستی حکومت کی پالیسیاں کبھی ریاستی مفادات اور عوام کی مرضی اور مفادات کے مطابق نہیں چلائی گئیں کیونکہ ریاست جموں کشمیر کا سارا خطہ متنازعہ ہے۔اس لیے اس متنازعہ خطے کی پالیسیاں ہندوستان کی مرضی سے بنائی جاتی رہیں ہیں۔ہندوستان نے ریاستی عوام کو حق

خودارادیت دینے کے لیے کبھی ریفرنڈم نہیں کروایا جس طرح ہندوستان نے اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق استصواب رائے کروانے کا وعدہ کیا تھا لیکن آج تک یہ تنازعہ دو ملکوں کے درمیان لٹکا ہوا ہے۔ جموں کشمیر کے خطے کو 2019ء سے پہلے کسی حد تک اندرونی خودمختاری ملی ہوئی تھی لیکن 2019ء سے ریاست میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کیا گیا لیفٹیننٹ گورنر کے ذریعے حکومت کی جارہی ہے اور جموں کشمیر سے الگ کیا گیا لدّاخ کے خطے کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا ہے۔ جموں کشمیر میں ایک قانونی طریقہ کار موجود ہے جس میں ایک منتخب قانون ساز باڈی کی تشکیل ضروری ہے۔ اس قانون ساز باڈی کے اختیارات محدود ہوں گے اور 2020ء کے دوران ریاست میں کوئی قانون ساز باڈی اپنا وجود نہیں رکھتی جو ریاست کی حکومت نے کئی قانون پاس کیے تھے ان کو بدلا جائے گا یا ان میں ترمیم کی جائے گی۔ نئے نظام کے تحت یہی ضروری قرار دیا گیا ہے جو ہندوستانی پارلیمنٹ مزید قوانین بنائے گی۔

اب وہ ریاست جموں کشمیر میں بھی لاگو ہوں گے۔ یونین ٹریٹری کو اب اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے قوانین بنائے خاص کر کے عوامی امور اور لاء اینڈ آرڈر کے معاملات میں مرکزی حکومت کے قوانین لاگو ہوں گے۔ اس طرح کرپشن عام ہے۔ 2011ء میں انٹی کرپشن کمیشن قائم کیا گیا تھا جس کے پاس چھان بین کے کافی وسیع اختیارات تھے۔ ایک پینل جس کو سٹیٹ نگران کمیشن کہا جاتا تھا اس نے ایک ہزار سے زیادہ شکایات پر اسس کیں۔ 2013ء میں اس کمیشن کے پہلے کمشنر نے تقرر کے بعد خاص کر پبلک آفیسروں کے خلاف مٹھی بھر رشوت کے کیسز (Cases) ہی فائنل کیے اور چند ہی میں سزائیں ہوئیں۔ 2020ء میں یہ کمیشن ختم کر دیا گیا جب جموں کشمیر کی علاقائی حکومت نے یہ قانون ہی بدل دیا۔ جب سے 2019ء میں ریاست کا انتظامی ڈھانچہ بدلا گیا ہے انتظامیہ اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ اس حکومت نے پریس کی آزادی پر شدید پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور شفافیت کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ کئی سرکاری ایجنسیوں نے شفافیت کو پروموٹ کرنے کی کوشش کی اور اچھی حکومت جس میں ریاست کا انفارمیشن کمیشن بھی شامل ہے انہیں 2019-2020ء میں بند کر دیا گیا تھا۔

7۔شہری آزادیاں اور میڈیا کی آزادی

ہندوستان کے زیر انتظام جموں کشمیر میں 2019ء تک میڈیا نے خوب ترقی کر لی تھی۔آن لائن (Online) میڈیا کافی پھیل چکا تھا جو خبروں کے لیے نیا ذریعہ بن گیا تھا اور معلومات کے لیے اچھا پلیٹ فارم مہیا ہو گیا تھا۔ خطے کا انتظامی ڈھانچہ بدلنے کے اعلان کے ساتھ ہی لوکل اور بین الاقوامی میڈیا پر شدید دباؤ ڈالا گیا اور کشمیری خطے میں میڈیا پر غیر اعلانیہ پابندی عائد کر دی گئی تھی۔انٹرنیٹ سروس سارے جموں کشمیر میں بند کر دی گئی تھی جس کا نتیجہ شدید مشکلات کی صورت میں سامنے آیا خاص کر تعلیم کے شعبے اور تاجر طبقے کو شدید نقصان ہوا کیونکہ سال سے زیادہ انٹرنیٹ سروس معطل رہی تھی۔سرکاری اہلکار 2020ء کا سارا سال انٹرنیٹ سروس کو معطل کر کے پہرہ دیتے رہے۔ سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد محدود پیمانے پر موبائل سروس بحال کی گئی لیکن ہائی سپیڈ موبائل سروس ایک سال کے بعد بھی بحال نہیں کی گئی تھی۔انٹرنیٹ سروس 2021ء میں بحال کی گئی اور خطے کو مکمل طور پر ایک کرفیو کی حالت میں رکھا گیا تھا۔ لمبے وقت تک کرفیو اور لوگوں کی نقل وحرکت پر پابندیاں اور بعد میں کووڈ-19 (COVID) کی وجہ سے لاک ڈاؤن نے بھی میڈیا کے لیے شدید مشکلات پیدا کیں اور وہ پورا سال اپنا کام کرنے سے قاصر رہے۔

جون 2020ء میں نئی میڈیا پالیسی متعارف کروائی گئی جس میں حکومتی اہلکاروں کو اختیار دیا گیا کہ وہ جعلی خبروں کو چیک کریں، ٹاپکس کو سنسر کریں، نقالی، غیر اخلاقی مواد اور ملک دُشمن سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔کئی صحافیوں سے سوال کیے اور ان پر سال کے دوران ان کے کام کی وجہ سے مقدمات بنائے گئے تھے۔کئی صحافیوں پر ملک دُشمن ہونے کے الزام لگا کر ان کی چھان بین کی گئی اور انہیں ملک دُشمن عناصر کی سرگرمیوں کی تعریف کرنے اور دہشت گردی کی تعریف کرنے پر جو انہوں نے سوشل میڈیا پر پوسٹ کی تھیں کے لیے ایک سال تک زیر نگرانی رکھا گیا۔اکتوبر 2020ء میں سرکاری اہلکاروں نے گریٹر کشمیر کے آفس پر چھاپہ مارا جو ایک انگریزی روزنامہ اور مشہور اخبار ہے۔ یہ چھاپہ مار کاروائی ان کاروائیوں میں سے ایک تھی جو علیحدگی پسند سرگرمیوں کو مالی مدد مہیا کرنے والوں کو نشانہ بنانے کے لیے کی گئی تھی۔اس

کے علاوہ 2020ء میں کئی ایسی رپورٹس بھی آئی ہیں جن میں صحافیوں پر تشدد کرنے کے واقعات کی تفصیل موجود ہے جو ان کے کام کی وجہ سے پولیس اور دیگر سیکیورٹی اداروں کی طرف سے تشدد کیا گیا تھا۔

ریاست کی حیثیت ختم کرنے کے بعد مرکزی حکومت نے لاکھوں مزید سیکیورٹی فورسز کو یونین ٹریٹری میں شہریوں کی آزادیوں کو محدود کرنے کے لیے تعینات کیا۔ کشمیر ڈویژن میں عام شہریوں کی نقل وحرکت پر بھی سخت پابندیاں لگائی گئیں اور وادی کے شہری علاقوں میں فوراً کرفیو لگا کر سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں کی گئیں اور عام شہریوں کو کشمیر میں کئی مہینوں تک گھروں تک محدود رکھا گیا۔ ان کی شہری آزادیاں چھین لی گئیں اور شہری حقوق غیر اعلانیہ معطل کر دیئے گئے تھے۔ ہندوستانی فوجوں کے مزید دستے شہری علاقوں میں اس انداز سے تعینات کیے گئے تھے کہ عام کشمیری شہری کو خوفزدہ کیا گیا اور ان پر ایک نئے فوجی قبضے کا سماں پیدا کیا گیا۔ اس طرح ہندوستانی ریاست نے کشمیر کے شہری علاقوں میں خوف وہراس کی فضا پیدا کی تا کہ کشمیری عوام کو فوجی جبر وتشدد سے ڈرا کر زبان بندی پر مجبور کیا جائے۔

جموں کشمیر کی عوام سے ان کی ریاست کا درجہ چھینا گیا اور اس پر انہیں احتجاج تک نہ کرنے دیا گیا۔ اس سے زیادہ کسی ملک کا جبری قبضہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ جموں خطے کے کئی لیڈروں کو بھی گھروں میں نظر بند رکھا گیا اور کئی ماہ تک جموں میں بھی شہریوں کو احتجاج کرنے کا حق نہ دیا گیا۔ کارگل میں لوگوں نے ریاست کی حیثیت ختم کرنے کے اقدام کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج کے لیے سڑکوں پر مارچ کیا لیکن سیکیورٹی اداروں نے انہیں ایسا کرنے سے جبراً روکا۔ پولیس نے لوگوں پر لاٹھی چارج کیا اور تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس طرح ساری ریاست کے عوام سے آزادی اظہار رائے کا حق بھی چھین لیا گیا۔ ابھی 2021ء تک نہ شہری آزادیاں بحال کی گئیں نہ میڈیا کو آزاد کیا گیا ہے۔

8۔ مذہبی آزادی اور مرضی کا عقیدہ رکھنے کا حق

ہندوستانی جموں کشمیر میں عام طور پر ریاست کی طرف سے مذہبی عقائد کی آزادی

دی گئی ہے اور سرکاری اداروں کی طرف سے عبادت کرنے کی آزادی کا عزت و احترام بھی کیا جاتا ہے۔ تاہم مذہبی فرقہ پرستانہ تشدد بعض اوقات بھڑک اٹھتا ہے جس کے نتیجے میں کئی لوگ زخمی ہوتے ہیں یا کئی مارے بھی جاتے ہیں۔ کشمیری خطے میں شعیہ مسلمانوں کے محرم کے جلوس پر پابندی عائد کی گئی ہے جو کئی عشروں سے برقرار رہے یہ جلوس اس سال نکالنے والوں پر پولیس اور سیکیورٹی اداروں نے تشدد کر کے رکوا دیا تھا اس طرح بڑی مذہبی سرگرمیوں پر ریاستی پابندیاں جاری ہیں اس طرح جبر سے لوگوں کو مذہبی جذبات اور خیالات کو روکنا مذہبی آزادیوں کو محدود کرنا اور شہریوں کے مذہبی عقائد میں ریاست کی مداخلت تصور کیا جاتا ہے۔ ریاست جموں کشمیر میں 2019ء کے بعد جہاں شہریوں کی ہر طرح کی آزادیوں کو معطل کیا گیا وہاں کشمیری شہریوں کی مذہبی آزادی بھی متاثر ہوئی ہے سرکاری اہلکاروں نے کئی ماہ تک مسجدوں کو عبادت کے لیے بند رکھا اور یہ کام ریاست کی 2019ء میں خودمختاری چھیننے کے فوراً بعد کیا گیا اور کئی مسجدوں کو دوبارہ بند کیا گیا اور 5 ماہ تک کوڈ 19 کے لاک ڈاؤن کے دوران بھی بند رکھا گیا اور اگست 2020ء میں پابندیوں کو کم کیا گیا تھا۔ اسی ماہ محرم کے جلوس کو سیکیورٹی فورسسز نے تشدد سے منتشر کیا جو سرینگر میں نکالا گیا تھا جس میں کئی لوگ زخمی ہوئے تھے۔

9۔ تعلیمی اداروں کی آزادی (Academic Freedom)

تعلیمی اداروں کی آزادی کو اکثر محدود کر دیا جاتا ہے۔ سرکاری اہلکار اکثر کشمیر یونیورسٹی میں جو ریسرچ کی جاتی ہے اس کی نگرانی کرتے ہیں اور سنسر شپ اور خود کو بھی سنسر شپ کا پابند کرتے ہوئے پروفیسرز اور طالب علم دونوں کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے کہ وہ ایسے سوالات کھڑے کرنے والے موضوعات (Topics) جو حساس نوعیت کے ہوں نہ چنیں اور یہ تعلیم کی اصل روح کے منافی اقدامات ہیں۔ جو تعلیم سوالات کرنے اور سوالات کے جوابات سے روکے وہ ادھوری تعلیم تصور کی جاتی ہے۔ جموں کشمیر میں ہندوستان کی مرکزی سرکار کے کہنے پر تمام سکول، کالجز اور یونیورسٹیوں کو سیکیورٹی کی بنیاد پر اور پھر کورونا کی وباء کی وجہ سے بند کیا تھا۔ گھروں سے انٹرنیٹ کی بندش کی وجہ سے تعلیم کا حصول مزید مشکل بنا دیا گیا تھا۔

10۔انفرادی آزادی

عام لوگوں کے درمیان گفتگو کی آزادی ضرور موجود ہے لیکن سرکار کی طرف سے انتقام کا خوف اور عسکریت پسندوں کا ڈر کبھی کبھی جو ممنوع تقریر نہیں بھی ہوتی اسے بھی روک دیا جاتا ہے۔2019ء میں ریاست کی خودمختاری کے خاتمے کے بعد سیاستدانوں، سیاسی کارکنوں، احتجاج کرنے والوں اور دیگر کی گرفتاریوں کا مقصد دراصل اظہار رائے کی آزادی کو کچلنا ہی تھا جو 2020ء کا سارا سال جاری رہیں اور اس کا عام آبادی پر کافی ڈراؤنا اثر ہوا ہے۔

11۔عوامی احتجاج کی آزادی اور تنظیم کا حق

اکٹھا ہونے کی آزادی کو گڑبڑ کے وقت بار بار محدود کیا گیا ہے۔سرکاری اہلکار اکثر آل پارٹیز حریت کانفرنس کی طرف سے عوامی اجتماع کی اجازت کی درخواست کو مسترد کر دیتے ہیں۔علیحدگی پسند لیڈروں کو بار بار احتجاج سے پہلے ہی گرفتار کر دیا جاتا ہے اور پرتشدد تصادم سیکیورٹی فورسسز اور احتجاج کرنے والوں کے درمیان عام ہیں۔ریاست جموں کشمیر کے کئی علاقوں میں 2020ء کے دوران کرفیو نافذ کیا گیا تھا اس کرفیو میں وہ وقت بھی شامل ہے جب اس خطے کی خودمختاری چھین جانے کا ایک سال پورا ہو رہا تھا لوگوں سے توقع تھی کہ وہ احتجاج کریں گے اور کورونا کی وجہ سے لاک ڈاؤن نے لوگوں کو اکٹھا ہونے اور اپنی مخالفت کا اظہار کرنے کی آزادی کو بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔اس وقت فون اور انٹرنیٹ کی بندش کا مقصد ہی احتجاج کی پلاننگ کو روکنا تھا۔اس کے باوجود سیکیورٹی فورسسز کے کئی جگہوں پر احتجاج کرنے والوں سے تصادم ہوئے ہیں اور ان پر آنسو گیس کا استعمال اور فائرنگ کرنے والی بندوقوں سے دھات کی گولیاں فائر کی گئیں تاکہ مجمعے کو منتشر کیا جائے۔عسکریت پسند کمانڈر ریاض نائیکو کی سیکیورٹی فورسسز کے ہاتھوں موت نے جو مئی 2020ء میں ہوئی تھی احتجاج کی شدید لہر پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے ایک آدمی کی موت ہوئی اور درجنوں افراد زخمی ہوئے تھے۔

12۔انسانی حقوق کے بارے میں کام کرنے والی این جی اوز

ریاست میں لوکل سطح کے اور ہندوستان کے سول حقوق سے متعلقہ گروپس کو عام طور پر کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن انہیں بار بار سیکیورٹی اداروں کی طرف سے خوف وہراس بھی کیا جاتا ہے۔ علیحدگی پسند تنظیم آل پارٹیز حریت کانفرنس کو ٹیکنیکل (Technically) کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن اس کے اکثر راہنماؤں کو بار بار جیلوں میں بند کیا جاتا ہے۔ 2019ء میں مرکزی حکومت نے جماعت اسلامی جموں کشمیر پر 5 سال کے لیے پابندی عائد کردی تھی اوراس کے تمام بڑے لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا تھااور یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ گروپ علیحدگی پسندانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔کئی گرفتار ہونے والوں میں ان کو بھی ٹارگٹ کیا گیا جوشہری آزادی کی وکالت کرتے تھے،انسانی حقوق کے وکیل تھے اور عام شہری سیاسی کارکن بھی تھے جنہیں 2019ء میں ریاست کی خود مختاری ختم کرنے کے فوراًبعد ہی گرفتار کرلیا گیا تھا۔سول سوسائٹی کی وہ تمام کوششیں جوکریک ڈاؤن کے دوران انسانی حقوق کی نگرانی کے لیے کی گئی تھیں ان میں شدید مشکلات انٹرنیٹ اور ٹیلی فون کی سروس معطل ہونے کی وجہ پیش آئیں تھیں۔اکتوبر 2020ء میں نیشنل انوسٹی گیشن ایجنسی نے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے کارکنوں کے دفتروں اور گھروں میں چھاپے مارے اوراین جی اوز (NOGs) کے لیے کام کرنے والے کارکنوں کی انکوائری کی گئی اورانہیں علیحدگی پسندوں کو مالی امداد دینے کے لیے مشکوک قرار دیا گیا تھا۔

13۔ٹریڈ یونینز کی آزادی

ہندوستان کے زیر کنٹرول ریاست جموں کشمیر کے خطے میں مزدوروں اور محنت کشوں کو اپنی یونینز بنانے کی آزادی حاصل ہے لیکن مزدوروں اور محنت کشوں کی زندگی پر مہنگائی اور بیروزگاری کا شدید اثر پڑتا ہے عام مزدور کی تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرسکے حکومت نے ریاست کی خودمختاری ختم کرکے یونین ٹریٹری بناتے وقت ساری ریاست میں کرفیو کا سماں پیدا کردیا،لوگوں کی نقل وحرکت پر پابندی عائد

کردی جس کی وجہ سے روزمرہ مزدوری کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے والے مزدور طبقے سے روزی روٹی کا ذریعہ بھی چھین لیا گیا۔ وہ ہر ضرورت کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا، ساری ٹرانسپورٹ سروس بند کردی گئی تھی، فروٹ کے تاجروں کا کروڑوں کا فروٹ مارکیٹوں تک نہ پہنچ سکا اور برباد ہو گیا۔ حکومت نے کوئی مدد بھی نہ دی جس کی وجہ سے سب سے زیادہ مزدور طبقہ ہی متاثر ہوا تھا۔ تاہم عام حالات میں مزدوروں کو ہندوستانی قانون کے مطابق اجتماعی سودے کا قانونی حق حاصل ہے لیکن مزدور یونینوں کے حقوق عملاً کبھی قانون کے مطابق نہیں ملے۔

14۔ قانون کی حکمرانی

ہندوستان کے زیر انتظام خطہ ریاست جموں کشمیر میں عدالتیں بھی سیاست میں ملوث ہیں اور بار بار ہندوستان کی انتظامی طاقت کی اتھارٹی کے زیرِ اثر فوجی اتھارٹی کا حصہ بن کر اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ حکومت اور سیکیورٹی فورسز بار بار عدالتوں کے فیصلوں کو نظرانداز کرتے ہیں خاص کر ان عدالتی احکامات کو جو ان کے عمل پر روک لگاتے ہوں۔ جنوری 2020ء میں ہندوستان کی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ غیر معینہ مدت کے لیے انٹرنیٹ کی بندش کا کوئی جواز نہیں تھا اور حکومت نے آئینی حقوق جو اظہار رائے اور تحریر و تقریر کی آزادی سے متعلق ہیں ان کی خلاف ورزی کی ہے لیکن سرکاری اہلکاروں نے انٹرنیٹ کی بندش کو بہت آہستہ آہستہ کھولا اور موبائل انٹرنیٹ تک رسائی 2020ء کے سال کے آخر تک بند رکھا گیا تھا۔ مقدموں میں پوری طرح کی عدالتی کاروائی جس میں وقت پر مقدمے کی کاروائی ہونا بھی شامل ہے مقدموں کی زیادتی کی وجہ سے اور وکیلوں کی ہڑتال کی وجہ سے نہیں ہو پائی تھیں۔ اس کے علاوہ جو قانون سازی کی گئی ہے خاص کر غیر معروف سپیشل آرمڈ فورسز پاور ایکٹ جو سیکیورٹی فورسز کو اجازت دیتا ہے کہ وہ گھروں کی تلاشی لیں، ملزم کو وارنٹ کے بغیر گرفتار کریں، جگہ پر گولی مار دیں اور بلڈنگ اور گھر تباہ کردیں اگر شک ہو کہ ان میں عسکریت پسندوں کے پاس اسلحہ کو رکھا گیا تھا۔ آرمڈ فورسز سپیشل پاور ایکٹ میں سیکیورٹی فورسز کو سزا یا مقدمہ مرکزی حکومت کی اجازت کے بغیر نہیں چلایا جاسکتا نہ ہی سزا دی

جاسکتی ہے اس کی اجازت کبھی نہیں دی جاتی یا نہ ہونے کے برابر دی جاتی ہے۔

اس خطے کی 2019ء میں تنظیم نو کے بعد اب مرکزی حکومت کے پاس مکمل اختیار ہے کہ وہ جب چاہے کسی بھی علاقے کو گڑ بڑ والا علاقہ قرار دے کر اسے آرمڈ فورسز سپیشل پاور ایکٹ کے تحت سیکیورٹی فورسسز کے اختیارات میں اضافہ کرسکتی ہے۔ پبلک سیفٹی ایکٹ کسی کو بھی بغیر مقدمہ چلائے اور عدالتی کاروائی کے بغیر دو سال تک قید میں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔لیکن 2012ء کی ترمیم کے بعد کسی بچے کو قید رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ قانون بڑی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو قید میں رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور دیگر مخالفین کو بھی 2019ء اور 2020ء کے دوران اس قانون کا استعمال کر کے قید میں رکھا گیا ہے۔ کئی قیدیوں کو جموں کشمیر سے باہر ہندوستان کے مختلف حصوں میں رکھا گیا تھا۔

15۔غیر قانونی جسمانی تشدد سے تحفظ

کئی سالوں کے بعد کشمیری خطے میں صورتحال میں کسی حد تک بہتری آئی تھی لیکن 2016ء میں سیکیورٹی کی صورتحال میں تیزی سے خرابی پیدا ہوئی جب برہان وانی کو سیکیورٹی فورسسز نے قتل کیا تھا جو ایک عسکریت پسند لیڈر تھا۔صورتحال 2020ء میں بھی نازک ہوئی کیونکہ کم از کم 321 سویلین، سیکیورٹی اداروں کے افراد اور عسکریت پسند مارے گئے جو ریاست میں عسکریت پسندوں اور سیکیورٹی اداروں کے درمیان چلنے والے مسلح تصادم کے نتیجے میں ہونے والے پر تشدد واقعات میں جو سارا سال جاری رہے یہ انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ ہندوستانی سیکیورٹی ایجنسیاں ٹارچر اور جبراً غائب کیے جانے کے کاموں میں بھرپور ملوث رہیں اس میں زیرِ حراست قتل بھی ہوئے خاص کر کے ان لوگوں کے جو عسکریت پسندی کے شُبے میں پکڑے گئے تھے اور ان عسکریت پسندوں کے سویلین ہمدرد بھی شامل ہیں اور سیکیورٹی فورسسز یہ کام سزا کے خوف کے بغیر کرتے ہیں۔

2019ء میں اقوام متحدہ کے ہائی کمیشنر کے دفتر سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں کشمیری خطے میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف

ورزیوں کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا تھا جو پچھلے سال کے متعلق رپورٹ تھی اور ایسی ہی ایک رپورٹ 2018ء میں بھی پیش کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں ہندوستان فوجوں کی طرف سے جبر وتشدد اور ماورائے عدالت قتل اور اس پر شدید تنقید کی گئی ہے۔ ہندوستانی حکومت پر شدید تنقید کی گئی ہے کہ وہ رپورٹ کی گئی خلاف ورزیوں کو انوسٹی گیشن نہیں کرتی۔ دوسری طرف عسکریت پسند ہندستان نواز سیاستدانوں، گورنمنٹ کے ملازمین اور حکومت کے مشکوک مخبروں، مخالف عسکریت پسند دھڑوں، سپاہیوں اور کئی سویلین کو قتل کر چکے ہیں۔ عسکریت پسند اغواء برائے تاوان میں اور کئی دیگر خوف وہراس پھیلانے والے کاموں میں ملوث ہیں اقوام متحدہ کے ہائی کمیشنر برائے انسانی حقوق کے دفتر میں عسکریت پسندوں کی طرف سے بھی شدید انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تفصیل سے رپورٹ دی ہے۔

16۔ کیا قانون اور ریاست کی پالیسیاں ساری آبادی کے لیے برابر ہیں

ہندوستان کے زیر کنٹرول جموں کشمیر میں قانون کی نظر میں اور حکومتی اداروں کی نظر میں ریاستی شہریوں کا برابر کا حق تسلیم کیا جانے کے باوجود بھی سماج میں مذہبی امتیاز موجود تھا اور مذہبی شناخت کی بنیاد پر کشمیری سماج میں ایک دوسرے سے امتیازی سلوک کیا جاتا تھا لیکن یہ اس قدر زیادہ نہیں تھا کہ یہ سماج میں مسئلہ کے طور پر حل طلب ہوتا لیکن مذہبی شناخت کو ریاست کے کئی حصوں میں سیاسی شناخت اور حقوق سے جوڑ کر پیش کیا جاتا تھا اور اس کی بنیاد تاریخی نوعیت کی تھی جب کشمیری بولنے والے خطے میں 1988ء کے آخر میں مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا اور ہندوستانی کنٹرول کو کشمیر میں چیلنج کیا گیا تو اس میں کشمیری شناخت سے زیادہ مذہبی عنصر حاوی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلح جدوجہد کا آغاز بھی پاکستانی مدد سے ہی شروع کیا گیا تھا اور تشدد کی اس لہر میں کشمیری پنڈتوں کو بھی نشانہ بنایا گیا تھا حالانکہ کشمیری شناخت کا کشمیری ہندو بھی حصہ تھے لیکن جس طرح ہندوستان کا مذہب کے نام پر بٹوارہ ہوا تھا اس کے اثرات کشمیری سماج میں موجود تھے جب مسلح جدوجہد شروع ہوئی تو اس کا واضح اظہار دونوں طرف سے سامنے آیا اور کشمیری ہندو پنڈت مذہبی بنیادوں پر اس تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے تھے

کیونکہ تحریک کا حاوی رجحان مسلم شناخت کی بنیاد پر ہندوستانی ریاست کو پاکستان کی مدد سے ہی چیلنج کر رہا تھا اس میں یہ بات واضع ہو جاتی ہے کہ کشمیری ہندو اس سکیم سے باہر ہو گیا اور اسے مسلح گروہوں نے اپنا دُشمن تصور کرتے ہوئے مسلح کاروائیوں میں اپنے ٹارگٹ کا حصہ بنا لیا اور کئی لاکھ کشمیری ہندو پنڈتوں کو مسلح کاروائیوں کے نتیجے میں اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور کئی کشمیری بولنے والے ہندو پنڈت ابھی تک مہاجر کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ مسلح گروہوں نے کشمیری پنڈتوں کو کشمیر سے نکالنے کا الزام اس وقت کی ہندوستان سرکار کے تعینات کیے ہوئے گورنر کے ذمہ لگایا جبکہ ہندوستانی سرکار اور کشمیری پنڈٹ اس کا الزام مسلح گروہوں پر لگاتے ہیں۔ یہ جس کی طرف سے بھی ہوا کشمیری شناخت کو مذہب کے نام پر توڑا گیا حالانکہ کشمیری بولنے والے ہندو پنڈتوں کی آبادی چار لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ نہ ہی اتنی چھوٹی آبادی کا حصہ مسلح گروہوں کے لیے کوئی خطرہ تھا اور نہ ہی ہندوستانی سرکار کو کوئی فائندہ پہنچا سکتی تھی لیکن ان کشمیری ہندوؤں کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر ایک طرف ہندوستانی سرکار نے خوب پروپیگنڈہ کیا تو دوسری طرف مسلح جدوجہد کرنے والے گروہوں کو اتنا شعور نہیں تھا کہ آبادی کے کسی بھی حصے کو ٹارگٹ کرنے والی مسلح جدوجہد کی تحریکیں کامیابی نہیں حاصل کر پاتیں۔ یہی حال کشمیر کی مسلح تحریک کا بھی ہوا ایک طرف مذہبی تحریک ہونے کی وجہ سے یہ ریاست کے ایک فرقے اور مذہب کے لوگوں تک محدود ہو گئی تو دوسری طرف پاکستانی حمایت یافتہ ہونے کی وجہ سے پاکستان نواز گروپوں تک محدود ہو گئی۔

اس تحریک کے محدود ہونے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ یہ صرف کشمیری بولنے والے خطے تک ہی موجود رہی اور اس تحریک کی بنیاد ہندوستانی بٹوارے کا سبب بننے والی دوقومی نظریہ کی مذہبی تھیوری تھی۔ اس تحریک میں شامل گروہوں کی سمجھ ہی پسماندہ تھی جو اس کی ناکامی کی ایک وجہ بنی۔ اس تحریک میں شامل مسلح گروہوں نے دوسری لسانی اور مذہبی کمیونٹیز کو بھی ٹارگٹ بنایا تھا جس میں گجر اور سکھ مذہبی کمیونسٹی کے لوگ بھی شامل تھے لیکن کمیونٹیز کو ٹارگٹ کرنے کو زیادہ رپورٹ نہیں کیا گیا اور نہ بڑے پروپیگنڈہ کا حصہ بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ عورتوں پر ان گروہوں کی طرف سے پابندیاں لگانے کی کوشش کی گئی اور ان کے حقوق اور ان

کی سماج میں آزادیوں کو محدود کرنے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔عورتوں کو سیکیورٹی فورسسز اور عسکریت پسندوں کی طرف سے ہراساں کرنے،خوف میں مبتلا کرنے، پرتشدد حملے کرنے، ریپ اور قتل کرنے جیسے حالات کا ریاست میں سامنا رہا ہے اور خاص کر کے ہندوستانی فوج کی طرف سے مردوں کو قتل کرنے کے بعد بھی سب سے زیادہ برے حالات کا ریاست میں عورتوں کو ہی سامنا رہا ہے کشمیری خطے میں ہزاروں کی تعداد میں عورتوں کو بے سہارا کیا گیا کیونکہ ہندوستانی سیکیورٹی اداروں نے ہزاروں مردوں کو قتل کردیا یا انہیں جیلوں میں بند کر کے بھول گئے جس طرح قدیم زمانے کے بادشاہ انسانوں کو قید خانوں میں بند کر کے بھول جاتے تھے لیکن جب کسی عورت کا خاوند مار دیا جاتا ہے یا اسے غائب کردیا جاتا ہے تو اس عورت کی زندگی میں اندھیرا ہو جاتا ہے، ریاست سہارا چھین کر پورے خاندان کو سزا دیتی ہے۔عورتوں کے لیے کوئی روزگار اور مالی مدد کا طریقہ نہیں بنایا گیا اگر کسی عورت کا بچہ قتل ہو گیا یا لمبے عرصے کے لیے جیل میں قید کردیا گیا تو اس کے لیے بھی وہ زندہ ہونے کے باوجود ایک طرح سے مرجاتا ہے۔

ہندوستانی ریاست نے کشمیر میں صرف مسلح گروہوں کے خلاف فوجی کاروائیاں نہیں کیں بلکہ کسی حد تک سارے کشمیری عوام اور اس کے سماج کے خلاف جنگ چھیڑی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں بے گناہ کشمیری شہری ہزاروں قسم کی تکلیفوں سے ماضی میں گزرے اور اب بھی گزر رہے ہیں۔کشمیری عوام مسلح گروپوں اور ہندوستان کی سیکیورٹی فورسسز کے درمیان پوری طرح سے پس گئے ہیں اور کشمیری سماج کا غریب طبقہ، بچے اور عورتیں اس جنگ میں سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔

17۔انفرادی آزادی اور شخصی حقوق

ہندوستان کے زیر انتظام جموں کشمیر میں انفرادی آزادیوں اور شخصی حقوق کو محدود کیا گیا ہے۔کشمیری بولنے والے خطے میں ہندوستان نے بہت زیادہ فوجیں سول آبادی میں تعینات کر رکھیں ہیں پچھلے 30 سالوں سے مسلح گروپوں سے لڑنے کے بہانے سویلین آبادی کو فوج کے سائے اور سنگینوں تلے زندگی گزارنے پر مجبور کر رکھا ہے اور انسانوں کی انفرادی نقل وحرکت کو بہت محدود کر رکھا ہے۔سرکاری اہلکاروں سمیت خفیہ ایجنسیوں کے لوگ اور جگہ جگہ

شہروں میں فوج کی چوکیاں ہر راہ چلتے انسان کو چیک کرنے کے بہانے تنگ کرتے ہیں۔ سویلین آبادی کے ساتھ جرائم پیشہ افراد کی طرح سلوک کیا جاتا ہے تاکہ ان کے اندر بھی احساس گناہ پیدا کیا جائے۔ سخت گیر کرفیو لاگو کر کے 2019ء میں ہندوستانی سرکار نے ریاست جموں کشمیر کی تنظیم نو کے بہانے ریاست کا درجہ ہی چھین لیا اور مسلح گروہوں سے لڑنے کا بہانہ بنا کر کشمیری عوام کو سزا دی گئی۔ یہ طریقہ اپنا کر مسلح گروہوں کو تو کچھ فرق نہیں پڑا۔ البتہ عوام کی زندگیوں میں ایک عذاب آ گیا۔ اس کے علاوہ کورونا وائرس کے بہانے ریاست میں لاک ڈاؤن کیا گیا جس کا دورانیہ سارا 2020ء سال کا رہا جس کی شدت کا اندازہ ساری ریاست کی بجائے چند علاقوں میں زیادہ محسوس کیا گیا تھا۔

اگرچہ کرفیو کا نفاذ موجود نہیں ہے اس کے باوجود اندرونِ خانہ روڈ بلاک کی وجہ سے انفرادی نقل وحرکت میں گڑبڑ موجود رہتی ہے اور کہیں احتجاج اور کہیں چیک پوائنٹس کی سی رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں۔ کشمیر کے رہائشی اپنے پاسپورٹ بنوانے اور ان کی تجدید کروانے کے لیے دو سال تک انتظار کرتے رہتے ہیں کیونکہ سیکیورٹی کا درجہ اس خطے کے لیے بہت اونچا کیا گیا ہے۔ مارچ 2020ء میں ہندوستان کی مرکزی سرکار نے جموں کشمیر میں ڈومیسائل کے قوانین بدل دیئے اور انہیں مہاجرین کے لیے آسان بنا دیا اور ہندوستان کے دیگر شہریوں کے لیے بھی تاکہ وہ جموں کشمیر میں باہر سے آ کر ریاست میں مستقل سکونت اختیار کر سکیں اور حکومت کی نوکریاں حاصل کر سکیں۔ ان کے لیے اہلیت کی شرط 15 سال تک ریاست میں سکونت قرار دی گئی یا 7 سال تک ریاست میں تعلیم حاصل کی ہو۔ یہ تبدیلی ان ریاستی لوگوں کو فائدہ پہنچائے گی جو لمبے عرصے سے ریاست میں رہائش پذیر ہیں اور جن کے پاس ڈومیسائل نہیں تھا لیکن تنقید نگاروں نے الزام لگایا ہے کہ حکومت اس طرح کرنے سے اس خطے کی مسلم اکثریت کی حیثیت کو بدلنا چاہتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں نئے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ جاری کیے گئے ہیں جو 2020ء کا سارا سال جاری ہوتے رہے۔ ریاست میں باہر کے لوگوں پر یہاں کی مستقل سکونت حاصل کرنے پر پابندی مہاراجہ ہری سنگھ کے دور میں لگائی گئی تھی تاکہ آبادی کے دباؤ کو روکا جا سکے۔

18۔انفرادی پراپرٹی کا حق

ہندوستان کے زیر انتظام جموں کشمیر میں انفرادی طور پر پراپرٹی رکھنے کا حق قانونی طور پر ہر شخص کو دیا گیا ہے لیکن پچھلے 30 سالوں سے مسلح تنازعہ نے خطے میں پراپرٹی کے حقوق کو کافی حد تک کمزور کیا ہے اس کی وجہ فوجی سرگرمیوں کی وجہ سے ہجرت بڑا سبب بنا ہے اور سخت کنٹرول والے ماحول میں نیا کاروبار شروع کرنا اور اسے چلانا بے حد مشکل ہے۔ اکتوبر 2020ء میں ہندوستانی حکومت نے جموں کشمیر میں زمین کی ملکیت کے متعلق کئی درجن قوانین بدلے جن میں پراپرٹی حاصل کرنے پر جو لمبے عرصے سے پابندیاں عائد تھیں انہیں ختم کر دیا گیا ہے اور یہ پابندیاں ان لوگوں کے لیے تھی جو ریاست کے مستقل سکونتی باشندے نہیں تھے۔ البتہ لدّاخ ان تبدیلیوں سے فوراً متاثر نہیں ہوا ہے۔ نئے قانون کے مطابق حکومت اور فوج کو وسیع اختیارات مل گئے کہ وہ زمین کو ترقی اور سٹر ٹیجی کے مقصد کے لیے اپنے لیے مختص رکھ سکیں۔

19۔انفرادی اور جنسی آزادی کا حق

کئی عورتیں گھریلو تشدد کا سامنا کرتی ہیں اور کئی دوسری طرح کی بے عزتیوں کا بھی شکار رہتی ہیں۔ کئی ایسی رپورٹس بھی آئی ہیں جن میں عورتوں کو جہیز کی وجہ سے قتل کیا گیا ہے کچھ عورتوں کو جہیز کم لانے کی وجہ سے سسرال والوں نے قتل کر دیا تو کئی عورتیں جہیز زیادہ لاتی ہیں تو ان کے جہیز کو ہتھیانے کے لیے بھی قتل کیا جاتا ہے تا کہ مرد کسی دوسری عورت سے دوبارہ شادی کر کے گھر کے لیے مزید جہیز کی صورت میں سامان لا سکے۔ قدامت پسند معاشرتی رسم ورواج افراد کو انفرادی طور پر اپنا جیون ساتھی چننے کا حق نہیں دیتے یہ انسان کی زندگی کے معاملات میں مداخلت کے سوا کچھ نہیں ہے ایک بالغ انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ساتھی اپنی مرضی سے چنے اور سماج کے قدیم رسم ورواج کی وجہ سے کسی انسان کے بنیادی حق کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے۔ ہر انسان کو انفرادی سطح پر اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق ملنا چاہیے۔

20۔معاشی حقوق کے تحفظ کا حق

کچھ سماجی گروہوں کو معاشی لحاظ سے برابری کے مواقع مہیا نہیں کیے جاتے جس کی وجہ سے وہ معاشی ترقی کے ثمرات سے محروم رہ جاتے ہیں جموں کشمیر میں ایسے سماجی گروہ موجود ہیں جنہیں معاشی ترقی سے پورا حصہ نہیں مل پاتا اور کچھ کیمونٹیز کو حکومت نے مساوی مواقع کے نام پر ملازمتوں میں کوٹا رکھا ہوا ہے کچھ غریب محنت کش عوام کے بچوں کو تعلیم میں مدد کے نام پر سکالرشپ کا بندوبست ضرور کررکھا ہے لیکن مستحقین کو اپنا ہی حق لینے میں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔نوکریوں اور تعلیم میں غریب کچلے ہوئے طبقات کی مدد کرنا ضروری ہے تا کہ وہ بھی انسانی سماج میں ترقی کر کے بہتر زندگی گزار سکیں۔

ریاست میں بچوں سے مشقت کروانے کی رپورٹس بھی سامنے آئی ہیں اور حکومت نے اس چائلڈ لیبر کے ایشو سے لڑنے کے لیے چند ہی قدم اٹھائے ہیں جو ناکافی ہیں۔ عسکریت پسندوں پر بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بچوں کو ٹریننگ دیتے ہیں اور انہیں فوج سے لڑنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ابھی تک ہندوستانی فوجوں سے لڑنے والوں میں اتنی چھوٹی عمر کا کوئی عسکریت پسند نہ تو مارا گیا ہے اور نہ پکڑا گیا ہے لیکن یہ درست ہے کہ تشدد پسندانہ ماحول میں رہنے والے بچوں کا ایسے کاموں سے متاثر ہونا بالکل فطری سی بات ہے کشمیر میں ہزاروں کی تعداد میں جو لوگ مارے گئے ہیں ان کی بڑی تعداد بہت سے نوجوانوں کی ہے جن کی عمر 18 اور 25 سال کے درمیان ہے۔ یہ نوجوان یا تو فوج کی تشدد پسندانہ کاروائیوں کی وجہ سے اپنے اردگرد ہوتا ہوا ظلم دیکھ کر بدلے کی نیت سے عسکریت پسند بن گئے ہیں یا فوج کے ہاتھوں کشمیر میں ان کے خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد مارا گیا ہے۔ کچھ نوجوان اپنے اردگرد محلے، گاؤں، شہر اور ٹاؤن کی سطح پر عسکریت پسند بننے والے نوجوانوں کو دیکھ کر انہیں اپنا ہیرو یا نجات دہندہ سمجھ کر ان کی راہ پر چل نکلے ہیں اور کچھ نوجوان ہندوستان سے لڑائی کو آزادی کی جنگ سمجھ کر اس میں خود حصہ لیتے ہیں۔

21۔ہندوستانی آئین کا آرٹیکل 370 اور 35A اور ریاست جموں کشمیر

ہندوستانی آئین کا آرٹیکل 370 ریاست جموں کشمیر کو ہندوستانی یونین میں خصوصی درجہ دیتا تھا۔ ہندوستان کے زیر انتظام ریاست جموں کشمیر کے خطے کا اپنا ریاستی آئین تھا، اپنا ریاستی جھنڈا اور اندرونی معاملات چلانے کے لیے ریاستی خودمختاری حاصل تھی۔آرٹیکل 370 ہندوستانی آئین میں پارٹ XXI (21) کے تحت ڈرافٹ کیا گیا تھا جس کو ٹائیٹل دیا گیا تھا''عارضی،عبوری اور سپیشل پرویژن (Provision)''اس ڈرافٹ میں لکھا گیا تھا کہ جموں وکشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے پاس اختیار ہوگا کہ وہ سفارشات پیش کرے گی کہ ہندوستانی آئین کا کون سا حصہ جموں کشمیر پر لاگو ہوگا۔ریاست جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی آرٹیکل 370 کو مکمل طور پر ختم کرسکتی تھی اور اس صورت میں ہندوستان کا سارا آئین ریاست پر لاگو ہوسکتا تھا۔

ریاست جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے اجلاس کے بعد اسمبلی نے سفارشات پیش کی تھیں کہ کون سے قوانین ہندوستانی آئین کے تحت ریاست میں لاگو ہونے چاہیے اور اسی سفارش کی بنیاد پر 1954ء کا ہندوستانی صدارتی آرڈر جاری کیا گیا تھا۔ چونکہ ریاستی آئین ساز اسمبلی آرٹیکل 370 کے خاتمے کی سفارش کیے بغیر ہی ختم ہوگئی تھی اس لیے یہ آرٹیکل ہندوستانی آئین کا مستقل حصہ بن چکا تھا۔اس کا فوری اثر یہ تھا کہ جموں کشمیر کے شہری مختلف قوانین کے تحت زندگی گزارتے تھے جن میں شہریت (Citizenship) پراپرٹی کی ملکیت اور بنیادی حقوق بھی شامل تھے جو ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے شہریوں کو حاصل نہیں تھے اس قانون کی وجہ سے ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے لوگوں کو ریاست جموں کشمیر میں زمین اور پراپرٹی خریدنے کی اجازت نہیں تھی۔

5 اگست 2019ء کو ہندوستانی حکومت نے ایک صدارتی آرڈر جاری کیا جس نے 1954ء کے صدارتی آرڈر کی جگہ لی اور ہندوستان کے آئین کے تحت تمام قوانین کو جموں کشمیر پر لاگو کردیا۔اس آرڈر کو ہندوستان کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے پاس کی گئی

ایک قرارداد کو بنیاد بنایا گیا تھا جو دو تہائی اکثریت سے منظور کی گئی تھی۔ 6 اگست 2019ء کو ایک مزید آرڈر جاری کیا گیا جس کی رو سے آرٹیکل 370 کے تمام کلاز ز (Clauses) کو غیر فعال بنا دیا گیا تھا سوائے اس کے کہ کلاز۔ایک (Claus-I) ایک کو ہی فعال رہنے دیا گیا تھا۔ جموں کشمیر ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق صرف تین معاملات پر ہی ہوا تھا جن میں دفاع، امور خارجہ اور کمیونیکیشن شامل تھے باقی تمام معاملات میں ریاست آزاد تھی۔

ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے نمائندوں نے ہندوستان سے درخواست کی تھی کہ ہندوستان کے آئین کے تحت وہی قوانین ریاست جموں کشمیر میں لاگو ہوں گے جو الحاق ہندوستان کی دستاویز میں بیان کیے گئے معاملات سے متعلق ہوں گے اور ریاست کی آئین ساز اسمبلی جب بنائی جائے گئی تو دیگر معاملات کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔حکومت ہندوستان کے نمائندوں نے اس مانگ پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس طرح ریاست جموں کشمیر میں ہندوستانی آئین صرف ان معاملات پر ہی لاگو ہوگا جو اصل الحاق ہندوستان کی دستاویز میں بیان ہوئے ہیں گویا ہندوستانی آئین کا دائرہ ریاست میں دفاع، امور خارجہ اور کمیونیکیشن تک محدود رہے گا۔ ہندوستان کی حکومت نے صدارتی آرڈر 2019ء ایسے حالات میں جاری کیا تھا جب ریاست جموں کشمیر کی ریاستی اسمبلی ہی موجود نہیں تھی بلکہ ریاست میں مرکزی حکومت کی طرف سے گورنر راج نافذ کیا گیا تھا۔اسی لیے ہندوستانی حکومت کے اس اقدام کو ہندوستانی آئین کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے سپریم کورٹ میں اسے چیلنج کیا گیا تھا لیکن ہندوستان کی اعلیٰ عدلیہ نے ایک 5 رکنی بنچ تشکیل دیا تھا لیکن اس پر ابھی فیصلہ نہیں آیا۔ ریاستی اسمبلی کی سفارش کے بغیر مرکزی حکومت کا یہ اقدام آئین کے منافی ہے

کسی بھی ایسے قدم کو اٹھانے سے پہلے چاہئے ریاست کا درجہ ہی کیوں نہ بدلنا ہو اس کی درخواست ہندوستانی آئین کے مطابق اسی متعلقہ ریاستی اسمبلی سے آنی چاہیے۔ اس وقت ریاست جموں کشمیر کا درجہ بدلنے کا جو طریقہ کار بنایا گیا تھا وہ اس لیے بھی غیر آئینی تھا کہ ریاستی اسمبلی موجود ہی نہیں تھی اور ریاست میں گورنر راج مرکزی حکومت کی نمائندگی کرتا ہے نہ کہ ریاستی عوام کی نمائندگی کرتا تھا اس لیے گورنر کی رضامندی کو بھی مرکزی ہندوستانی حکومت

کی مرضی ہی سمجھا جائے گا۔ اس لیے موجودہ ہندوستانی حکومت کے اس اقدام کو ہندوستانی سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا تھا لیکن سپریم کورٹ نے ابھی تک ریاست جموں کشمیر کے ان اہم آئینی معاملات پر کاروائی شروع نہیں کی۔ دہلی کی مرکزی سرکار نے کسی بھی معاملے میں آئینی طریقہ کار اختیار نہیں کیا تھا اس لیے سیاسی مصلحت کے تحت کاروائی کو تاخیری حربوں کے تحت یا مرکزی حکومت کے دباؤ کے تحت اپنی کاروائی شروع نہیں کی۔

22۔ ہندوستانی آئین کا آرٹیکل 35A اور ریاست جموں کشمیر

آرٹیکل 35A جو ہندوستانی آئین کا حصہ بنایا گیا تھا دراصل یہ مہاراجہ ہری سنگھ جو ریاست کے آخری ڈوگرہ حکمران تھا کا ہی جاری کردہ باشندہ ریاست قوانین مجریہ 1927ء اور 1932ء اسٹیٹ سبجیکٹ رول (SSR Rule) کا تسلسل تھا اور 1952ء کا دہلی کا معاہدہ اس کی بنیاد تھا جو دو وزرائے اعظموں شیخ عبداللہ اور جواہر لال نہرو نے دستخط کیا تھا۔ 1952ء کا دہلی معاہدہ ریاست جموں کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہے اور رضامندی ظاہر کرتا ہے کہ وہ باشندہ ریاست اور ریاستی شہریت کے بارے میں فیصلہ کرے۔ دہلی معاہدہ میں ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کو ہندوستانی شہریت کا حق دے کر دہری شہریت کا حق تسلیم کیا گیا ہے جو آرٹیکل 35A کے مطابق طے کیا گیا تھا۔ ریاست کے مہاراجہ ہری سنگھ نے 20 اپریل 1927ء میں ایک قانون منظور کیا تھا جس میں اسٹیٹ سبجیکٹ رول (Rule) کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ یہ قانون 31 جنوری 1927ء کے ایک حکومتی فرمان میں جاری کیا گیا تھا اور ریاست میں 20 اپریل 1927ء میں باقاعدہ لاگو ہو گیا تھا۔ اس ریاستی قانون کے مطابق ریاست جموں کشمیر کے ریاستی لوگوں کی تعریف چار قسموں میں کی گئی تھی ان ریاستی شہریوں کی کلاسیں یا درجے بنائے گئے تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اسٹیٹ سبجیکٹ رول (SSR Rule) کا دوسرا آرڈر 27 جون 1932ء میں جاری کیا تھا۔ اس آرڈر میں ریاست جموں کشمیر کے اسٹیٹ سبجیکٹ رول (SSR) کی حیثیت کا تعین بیرون ملک رہنے والے شہریوں کے بارے میں کیا گیا تھا یعنی ریاست کے وہ

لوگ جو ریاست سے باہر کے علاقوں میں رہتے تھے اور اپنے ریاستی شہریوں کے بارے میں ان ملکوں کی حکومت کو اطلاع دیتی تھی کہ ریاست کے شہریوں کی کیا حیثیت ہے جو ریاستی لوگ بیرون ملک یا ان متعلقہ ملکوں میں رہائش پذیر تھے۔ اس ریاستی حکومت کے نوٹس میں کہا گیا تھا کہ ''وہ تمام ریاستی شہری جو بیرون ملک ہجرت کر گئے ہیں یا دوسرے علاقوں میں جو ریاست کی حدود سے باہر ہیں رہائش پذیر ہیں وہ اسٹیٹ سبجیکٹ (SSR) ہی تصور کیے جائیں گے اور ان ہجرت کر جانے والوں کی اگلی دو نسلیں بھی جو بیرون ملک پیدا ہوئے ہیں

وہ بھی ریاست جموں کشمیر کے شہری تصور کیے جائیں گے۔ غیر ملکی شہری جو ریاست جموں کشمیر میں رہائش پذیر ہیں وہ ریاستی شہریت نہیں حاصل کر سکتے جب تک وہ 18 سال کے نہ ہو جائیں اور غیر منقولہ جائیداد نہ حاصل کر لیں یا خرید لیں۔ ان کے لیے جائیداد خریدنے کا اجازت نامہ اور رعایت نامہ حاصل کرنا ضروری ہے جو دس سال تک مسلسل ریاست جموں کشمیر میں رہائش پذیر رہنے سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ قانون بنیادی طور پر ریاستی شہریوں سے متعلق بنایا گیا اور یہی دراصل ریاست جموں کشمیر کے لوگوں کا باشندہ ریاست یا پشتنی باشندہ کا قانون بھی ہے اور ریاست کے عوام کی ریاستی شناخت بھی اسی قانون کی وجہ سے قائم تھی۔ ہندوستانی آئین کا آرٹیکل 35A بھی اسی قانون کو اپناتے ہوئے آئین کا حصہ بنایا گیا تھا۔

ہندوستانی آئین کے تحت آرٹیکل 35A ریاست جموں کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کو یہ اختیار دیتا ہے وہ ریاست کے مستقل باشندے کی تعریف خود مہیا کرے اور ریاستی شہریوں کو خصوصی حقوق اور مراعات مہیا کرے۔ یہ آرٹیکل ہندوستانی آئین میں شامل کیا گیا تھا جو 1954ء کے صدارتی آرڈر جو ہندوستانی صدر نے آرٹیکل 370 کے تحت جاری کیا تھا۔ ریاست جموں کشمیر نے ان مراعات کی تعریف مہیا کی ہے جس میں ریاست میں زمین خریدنے کی اہلیت ہونا اور غیر منقولہ جائیداد کا ہونا، ووٹ کی اہلیت رکھنا اور انتخابات میں حصہ لینے کا اہل ہونا، گورنمنٹ کی نوکری حاصل کرنے کا اہل ہونا اور دیگر ریاستی فوائد حاصل کرنے کے اہل ہونا، جیسا کہ اعلیٰ تعلیم اور صحت عامہ کی سہولت حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ جو لوگ مستقل ریاستی باشندے نہیں تھے جن میں ہندوستانی شہری بھی یہ مراعات لینے کے حق دار نہیں

تھے۔ یہ قانون جو آرٹیکل 35A نے آسان بنایا تھا اور ریاست کے مستقل سکونتی قوانین کو کئی سالوں سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا کیونکہ یہ امتیازی قوانین تصور کیے جاتے تھے ان میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مزدور اور محنت کش کارکنوں پر سختی لاگو ہوتی تھی کیونکہ یہ باشندہ ریاست قانون کے تحت انہیں ہجرت کر کے آنے والے مزدوروں کو مراعات میسر نہیں تھیں جو مقامی ریاستی کارکنوں کو تھیں۔ ان میں پاکستان سے 1947ء میں ہجرت کر کے آنے والے پاکستانی ہندو مہاجرین بھی شامل تھے اور ریاست کی عورتیں بھی شامل تھیں جو اپنی مستقل سکونت اور باشندہ ریاست کی حیثیت ختم کر دیتی تھیں اگر وہ ریاست سے باہر کسی فرد سے شادی کرنے کی صورت میں ان کی مستقل سکونت ختم ہو جاتی تھی لیکن کئی سال پہلے ریاست کی ہائی کورٹ نے عورتوں کی مستقل سکونت پر اپنا فیصلہ دیا ہوا ہے۔

جس میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے عورتوں کے حق کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ اگر وہ کسی غیر ریاستی فرد سے شادی کریں تو ان کا باشندہ ریاست کا حق اور مستقل سکونت کا حق برقرار رہے گا لیکن اس کے خاوند اور بچوں کو البتہ یہ حق نہیں دیا گیا تھا۔ آرٹیکل 35A میں یہ مندرجہ ذیل عبارت اس کی عکاسی کرتی ہے ان قوانین کو مستقل سکونت رکھنے والوں کے لیے جاری رکھنا اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھی انہیں ایسے ہی رہنے دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود کہ اس آئین میں جو کچھ بھی موجود ہے کوئی بھی موجودہ ریاست کا قانون اور کوئی بھی قانون اس کے بعد ریاست کی قانون ساز اسمبلی میں نہیں بنایا جائے گا۔

(a) ان افراد کی قسموں (کیٹگری) کی تعریف مہیا کرنا جو ریاست کے مستقل سکونتی یا باشندہ ریاست میں ہیں یا ریاستی باشندے ہوں گے۔

(b) ایسے مستقل باشندے ریاست یا باشندہ ریاست کے بارے میں مشورہ کرنا ان کے خصوصی حقوق اور مراعات کے بارے میں یا دیگر افراد کے متعلق کچھ پابندیاں عائد کرنا جن میں مندرجہ معاملات شامل ہوں۔

i۔ ریاستی حکومت کے ماتحت ملازمت

ii۔ غیر منقولہ ریاست میں جائیداد حاصل کرنا

iii۔ ریاست میں سکونت اختیار کرنا

iv۔ تعلیم کا حق یا دیگر امداد جو ریاستی حکومت مہیا کرتی ہو

23۔ مستقل سکونت اور ریاستی آئین

ریاست جموں کشمیر کا آئین جو 17 نومبر 1956ء میں منظور کیا گیا یا لاگو کیا گیا تھا۔ مستقل ریاستی باشندہ کی تعریف یوں کرتا ہے کہ ایسا فرد یا افراد جو 14 مئی 1954ء کو ریاست کا مستقل رہائشی تھا، سٹیٹ سبجیکٹ تھا یا جو فرد 10 سال سے ریاست میں رہائش پذیر ہو اور ریاست میں غیر منقولہ جائیداد قانونی طور پر حاصل کی ہو۔ ریاست جموں کشمیر کی قانون ساز اسمبلی مستقل سکونت کی تعریف بدل سکتی ہے یا مراعات میں کچھ تبدیلی کر سکتی ہے جو ان سے متعلق ہوں اور ایسا قانون بنا سکتے ہیں جو دو تہائی اکثریت سے اسمبلی نے پاس کیا ہو۔ جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی نے ریاستی آئین کے تحت یہ قانون بنا دیا تھا جو سیکشن 51 کے تحت ریاستی اسمبلی کی ممبر شپ کی کوالیفیکیشن یا اہلیت کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ''ایسا فرد قانون ساز اسمبلی کا رکن نہیں بن سکتا جو ریاست کا مستقل رہائشی یا باشندہ ریاست میں مستقل سکونتی نہ ہو۔ سیکشن 140 ریاستی آئین میں کہا گیا ہے کہ 18 سال سے زیادہ عمر کا فرد اور جو مستقل ریاستی باشندہ ہو ریاست اسمبلی اور دیگر اداروں کے لیے ووٹ دینے کا اہل ہوگا۔

ا۔ جو شخص ریاست کا مستقل باشندہ نہیں ہوگا وہ جائیداد کی ملکیت حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔ جو فرد ریاست کا مستقل باشندہ نہیں وہ ریاست جموں کشمیر کی گورنمنٹ کی نوکری حاصل نہیں کر سکتا۔

۳۔ جو فرد یا افراد ریاست جموں کشمیر کے مستقل باشندے یا باشندہ نہیں وہ ریاست جموں کشمیر کے کسی گورنمنٹ کالج میں داخلہ نہیں لے سکتا اور نہ ہی کسی قسم کی گورنمنٹ امداد سرکار کے فنڈز سے لے سکتا ہے۔

اب نئے ڈومیسائل قوانین کے تحت ہر فرد ریاست جموں کشمیر میں ہر طرح کی نوکری لے سکتا ہے جس میں ریاستی حکومت کی نوکری بھی شامل ہے نئے قانون میں کہا گیا ہے کہ ہر وہ

فرد یا افراد جو مندرجہ ذیل شرائط پوری کرے گا وہ جموں کشمیر کی یونین ٹریٹری (Territory) کے ڈومیسائل کا حق دار ہوگا اور ڈومیسائل کے مقاصد میں ایسی نوکری میں تقرری بھی شامل ہوگی جو تنخواہ کے لحاظ سے لیول 4 یا سکیل 4 سے اوپر نہ ہو یہ نوکری جموں کشمیر کی یونین ٹریٹری کی حدود میں ہو یا یونین ٹریٹری کی حدود میں کسی دوسری اتھارٹی کے زیر انتظام ہی کیوں نہ ہو۔

(a) ایسا فرد یا افراد بھی ڈومیسائل کا حق دار ہوگا جو 15 سال تک یونین ٹریٹری (Territory) میں مسلسل رہائش پذیر رہا ہو یا 7 سال تک ریاست میں تعلیم حاصل کی ہو اور کلاس 10 اور کلاس 12 کے امتحانات میں کسی بھی یونین ٹریٹری آف جموں کشمیر کے تعلیمی ادارے میں شامل ہوا ہو۔

☆☆☆☆

چودھواں باب

آزاد کشمیر میں ریاست کی مکمل آزادی کا دعویٰ کرنے والی جماعتوں کا کردار

آزاد کشمیر میں ریاست کی مکمل آزادی کا دعویٰ کرنے والے گروپوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی لیکن ان میں اکثریت ایسے گروپوں کی ہے جو اپنا اثر ورسوخ آزاد کشمیر کے سماج میں نہ ہونے کے برابر رکھتے ہیں۔ ان میں ایسے گروپ بھی ہیں جن کے نام بھی چند لوگوں نے سُن رکھے ہوں گے دوسرا ان گروپوں کے نظریات اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی اس قدر مماثلت پائی جاتی ہے کہ سماج کے عام آدمی کے لیے ان میں فرق کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اس لیے ان سب گروپوں کو عوام کی اکثریت ایک یا دو ناموں سے پہچانتی ہے ان گروپوں میں سے ان کی پہچان مقامی سیاسی جماعتوں کی طرح نہیں ہے جو عوام کے مسائل کے حوالے سے آزاد کشمیر اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیتی ہیں کیونکہ آزاد کشمیر میں صرف پاکستان نواز جماعتیں ہی الیکشن میں حصہ لینے کی اہل ہوتی ہیں۔ ان آزادی پسند جماعتوں کو الیکشن میں قانونی لحاظ سے نااہل قرار دیا گیا ہے اور یہ قانون آزاد کشمیر اسمبلی نے ہی منظور کر رکھا ہے دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان سیاسی گروپوں نے خود بھی کبھی مقامی مسائل میں دلچسپی نہیں لی اور یہ سارے گروپ آزاد کشمیر کے عوام کی بجائے بھارت کے زیر انتظام کشمیری بولنے والے خطے

کے عوام کی آزادی کے لیے ہی سرگرم رہتے ہیں۔

1۔ لبریشن لیگ

آزاد کشمیر میں لبریشن لیگ ہی واحد جماعت رہی ہے جو آزاد کشمیر اسمبلی کے انتخابا میں حصہ لیتی رہی ہے اس جماعت کے بانی خورشید حسن خورشید تھا جو آزاد کشمیر کی صدارت کے عہدے پر بھی رہے۔ کے۔ ایچ خورشید صاحب آزاد کشمیر حکومت کو پوری ریاست جموں کشمیر کی نمائندہ حکومت تسلیم کرنے کا پاکستان سے مطالبہ کرتے رہے۔ لبریشن لیگ ریاستی عوام کے حق خود ارادیت کی وکالت کرتی ہے اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ آزاد کشمیر کی حکومت کو آزاد تسلیم کرنا اور دیگر ملکوں سے پاکستان کی مدد سے تسلیم کروانے کی حامی ہے اور اس آزاد حکومت کے ساری دنیا کے ملکوں میں سفارتخانے کھولنے کے حامی تھے تا کہ سفارتکاری کے ذریعہ ریاست کے بھارتی زیر انتظام علاقوں کی آزادی کے لیے مہم چلائی جائے۔ لبریشن لیگ کا واضع موقف یہ ہے کہ آزاد کشمیر کو حقیقی معنوں میں آزاد علاقہ (ڈکلیئر) ہونے کا اعلان کیا جائے اور پاکستان اس کے ساتھ دفاع کا معاہدہ کرکے اس کی مدد کرے۔ لیکن پاکستانی حکومت نے کے ایچ خورشید صاحب کا مطالبہ کبھی تسلیم نہ کیا تھا اور محض نام کی حد تک ہی آزاد کشمیر کو آزاد رکھا ہوا ہے۔ کے ایچ خورشید صاحب محمد علی جناح کے بھی سیکرٹری رہے تھے اور جناح صاحب کے پرائیویٹ ایڈوائزر کے طور پر 1944ء سے 1947ء تک ان کے ساتھ کام کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خورشید صاحب جناح صاحب کے بٹوارے کی سیاست کے حامی تھے اور دوقومی نظریے کے بھی حامی تھے وہ دلی طور پر پاکستان کے نظریے کے بھی حامی تصور کیے جاتے ہیں اس کے باوجود ریاست جموں کشمیر کے حل کے لیے ان کی تجویز کو پاکستانی مفادات کے خلاف تصور کیا جاتا تھا اور خورشید صاحب ایک پاپولر لیڈر ہونے کے باوجود دوبارہ آزاد کشمیر کے صدر کبھی نہ بن سکے کیونکہ ان کی پارٹی کو ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی حامی سمجھا جاتا تھا جبکہ لبریشن لیگ نے کبھی کھل کر ریاست جموں کشمیر کی پاکستان سے الحاق کی مخالفت نہیں کی تھی اور لبریشن لیگ آج بھی اپنے سیاسی نظریات پر قائم ہے لیکن

آزاد کشمیر اسمبلی کی مہاجرین جموں کشمیر کی سیٹوں پر اکثر جیتنے والی جماعت آج کل کوئی بھی نشست نہیں جیت پائی اس کی وجہ بھی خورشید صاحب کی حادثاتی موت کے بعد پارٹی کا فعال نہ ہونا بھی تصور کیا جاتا ہے اور اپنے پرانے سیاسی نظریات اور آزاد کشمیر کو تسلیم کیے جانے کے پرانے مطالبے پر قائم رہنا بھی اس جماعت کی ناکامی کا ایک سبب ہوسکتا ہے۔ 1958ء میں جموں کشمیر لبریشن موومنٹ کے دنوں میں کے ایچ خورشید صاحب کو 4 ماہ تک جیل میں رکھا گیا تھا لیکن انہوں نے اپنے اصولی موقف پر سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق ریاست جموں کشمیر کے عوام کے حق خودارادیت کی غلط تشریح کی گئی تھی اور لبریشن موومنٹ کو جان بوجھ کر ریاست کی مکمل آزادی اور خودمختاری سے دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

2۔محاذ رائے شماری

جموں کشمیر محاذ رائے شماری کا قیام سرینگر میں نیشنل کانفرنس کے لیڈر شیخ عبداللہ کے کہنے پر 1955ء میں عمل میں لایا گیا تھا کیونکہ شیخ عبداللہ کی اپنی پارٹی کی اکثریت ان کے خلاف ہو چکی تھی اور ہندوستانی ریاست کی سازشوں کا حصہ بن کر شیخ عبداللہ کو جیل میں بھیج کر ہندستانی ریاست سے تعاون کر رہی تھی نیشنل کانفرنس کے وہ لیڈرز جو شیخ عبداللہ کی ہی سیاسی تربیت سے لیڈر بنے تھے۔ 1953ء میں شیخ صاحب کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا حصہ تھے اسی وجہ سے محاذ رائے شماری کا قیام عمل میں لایا گیا تھا تاکہ شیخ عبداللہ کی رہائی کیلئے کوئی سیاسی گروپ ہندوستانی حکومت پر دباؤ ڈال سکے۔ جب شیخ عبداللہ نے محسوس کیا کہ ان کی رہائی کے لیے کوئی بھی سیاسی پارٹی موجود نہیں ہے تو اس وقت مرزا افضل بیگ کو محاذ رائے شماری بنانے کا مشورہ دیا تھا اور افضل بیگ خود بھی شیخ صاحب کے پرانے ساتھیوں میں سے تھے ابھی تک شیخ عبداللہ کا ساتھ دے رہے تھے پہلے انہیں بھی گرفتار کیا گیا تھا لیکن ان کی رہائی ہوئی تو شیخ صاحب کے کہنے پر انہوں نے محاذ رائے شماری کی بنیاد رکھی اور ایک طرف شیخ عبداللہ کی رہائی کے لیے مہم چلائی تو دوسری طرف ریاست جموں کشمیر میں رائے شماری کروانے کا مطالبہ بھی شروع کیا گیا تھا یہ مطالبہ اسی محاذ رائے شماری کے پلیٹ فارم سے شروع

کیا گیا تھا۔اس گروپ کے ابتداء میں شیخ عبداللہ کی رہائی اور ریاست میں رائے شماری کروانا ہی بنیادی مطالبات تھے۔آزاد کشمیر میں محاذ رائے شماری کا قیام اپریل 1965ء میں عمل میں لایا گیا تھا آزاد کشمیر میں محاذ رائے شماری کے بنیادی اور بانی رہنماؤں میں عبدالخالق انصاری، امان اللہ خان اور مقبول بٹ شامل تھے۔ محاذ رائے شماری کے آزاد کشمیر میں پہلا صدر عبدالخالق انصاری، امان اللہ خان جنرل سیکرٹری اور مقبول بٹ کو پبلسٹی سیکرٹری بنایا گیا تھا۔

محاذ رائے شماری نے ایک مسلح ونگ نیشنل لبریشن فرنٹ کے نام سے بنا رکھا تھا لیکن اس کا آفیشل اعلان نہیں کیا ہوا تھا کیونکہ اس مسلح ونگ کے ذمہ بھارتی علاقوں میں مسلح کاروائیاں کرنا بھی شامل تھا کیونکہ محاذ رائے شماری کے چند لیڈرز جن میں مقبول بٹ بھی شامل تھے یہ محسوس کر چکے تھے کہ ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان تقسیم کر چکے ہیں اور اسے تنازعہ بنا کر ایک دوسرے کی دُشمنی کو بڑھانے کے لیے استعمال کرنے لگے ہیں اور ریاستی عوام سے جو وعدے کر رکھے ہیں انہیں پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لئے مقبول بٹ جیسے راہنماؤں نے بھارتی مقبوضہ علاقوں میں جہاں مسلم اکثریت اور کشمیری بولی جاتی تھی میں مسلح کاروائیوں کا آغاز کیا تھا اور ریاست کے مسئلے کو دونوں ملک اپنے مفادات کے لیے استعمال کررہے تھے ان سے دونوں طرف کے ریاستی عوام کو آگاہ کرنے کے لیے ایسے اقدامات بھی اٹھائے جس میں ہندوستانی طیارے کی ہائی جیکنگ بھی شامل تھی۔اس ہائی جیکنگ کے عمل کو پہلے پاکستانی حکومت نے اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہونے کی صورت میں محاذ رائے شماری کے تمام سیاسی لیڈروں کو سارے آزاد کشمیر سے گرفتار کر کے عقوبت خانوں میں جبر وتشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اس جبر وتشدد کا نشانہ بننے والوں میں مقبول بٹ اور کشمیری نوجوان ہائی جیکر بھی شامل تھی ان ہائی جیکروں کے نام ہاشم قریشی اور اشرف قریشی تھا انہیں اور مقبول بٹ کو انسانیت سوز تشدد سے پاکستانی حکام نے گزارا تھا اور ان بے گناہوں کے ساتھ توڑے گئے انسانیت سوز مظالم کو آزاد کشمیر کا کوئی فرد جو حریت پسندوں سے اور آزادی ریاست جموں کشمیر کا حامی ہے اور ہمدرد ہے کبھی نہیں بھولے گا۔محاذ رائے شماری نے ابتداء میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے وہی مطالبہ کیا تھا جس کا قانونِ

آزادی ہند میں ہندوستان کے بٹوارے سے پہلے دونوں فریقوں نے تسلیم کیا تھا کہ جو ریاست متنازعہ ہو جائے گی وہاں کے عوام کو اپنی ریاست کا آخری فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا جب محاذ کے لیڈروں کو اس مطالبے پر بھی ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا اور جیلوں میں قید رکھا جانے لگا تو انہیں یقین ہو گیا کہ دونوں ملکوں کے حکمران ریاست کا مسئلہ حل کرنے کی بجائے اسے مزید الجھانے والے حربے استعمال کرتے ہیں تو ان کا مطالبہ ساری ریاست جموں کشمیر کو حق خود ارادیت دینے کا شروع ہو گیا اور دونوں طرف کے عوام اس مطالبے کے حق میں ضرور تھے لیکن ریاستی جبر وتشدد سے عوام میں دونوں طرف خوف وہراس پھیلایا گیا تھا۔ گو کہ محاذ رائے شماری کا مطالبہ بالکل جائز تھا لیکن رائے شماری کا مطالبہ دراصل دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کو الحاق کے لیے چننا تھا۔

قانون آزادی ہند میں ریاستوں کو مکمل آزادی کا حق نہیں دیا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی ریاست کو آزادی کا فیصلہ کرنے اور الگ آزاد ملک کی حیثیت سے رہنے کا حق نہیں دیا گیا تھا اور ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ پیدا ہی اس لیے ہوا تھا کہ ریاست کے مہاراجہ نے دونوں ملکوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور دونوں کو معاہدہ قائمہ کرنے کی پیشکش کر دی تھی۔ پاکستان نے ریاست سے معاہدہ کرنے کے باوجود انگریز کے منصوبے کے تحت ریاست پر حملہ کر کے مہاراجہ کو ہندوستان سے الحاق پر مجبور کر دیا جس کی وجہ سے ریاست جموں کشمیر کا دونوں ملکوں کے درمیان تنازعہ پیدا ہو گیا۔ اب ریاست جموں کشمیر پر دونوں ملکوں نے اپنا اپنا دعویٰ شروع کر دیا تھا پاکستان ریاست کو مسلم اکثریت کی بنیاد پر دعویٰ کرنے لگا اور ہندوستان نے مہاراجہ کے الحاق کو بنیاد بنا کر ریاست پر اپنا دعویٰ شروع کر دیا تھا اور ریاستی عوام سے کیا گیا وعدہ بھول گئے کہ ریاست کا حتمی فیصلہ ریاست کے عوام کی رائے سے کیا جائے گا اس کے لیے ریاست میں استصواب رائے کروایا جائے گا۔ اب یہ دونوں ملک اس کو بھول کر آپس میں لڑنے لگے۔

محاذ رائے شماری نے ہندوستان اور پاکستان کو ان کے وعدوں کی طرف توجہ دلائی اور ریاست میں استصواب رائے کروانے کا مطالبہ کیا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ امان اللہ خان

اور مقبول بٹ محاذِ رائے شماری کا مسلح ونگ قائم کرنے کے حق میں تھے لیکن محاذِ رائے شماری کی اکثریت نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے نیشنل لبریشن فرنٹ کے نام سے ایک خفیہ گروپ تشکیل دیا۔ میجر امان اللہ سابق آزاد کشمیر فوج کا ممبر اس مسلح ونگ کا انچارج بنایا گیا جبکہ امان اللہ خان اور میر عبدالقیوم نے سیاسی اور مالی ونگ کی ذمہ داریاں سنبھالیں تھیں اور مقبول بٹ کو ان تمام ذمہ داریوں کا کوآرڈینیٹر (Coordinator) مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے آزاد کشمیر سے چند لوگوں کو تربیت دے کر ہندوستان کے زیر انتظام علاقوں میں بھیج دیا اور وہاں سے انہوں نے مقامی افراد کو مسلح سرگرمیوں کے لیے تربیت دے کر تیار کر لیا۔ مقبول بٹ کا گروپ ایک ڈبل ایجنٹ کے ذریعہ ہندوستانی فوج کے گھیرے میں آ گیا اور ستمبر 1966ء میں ہندوستانی فوج سے ایک جھڑپ میں ان کا ایک ساتھی کالا خان مارا گیا۔ مقبول بٹ اور دوسرا ساتھی میر احمد گرفتار کر کے سرینگر کی ایک عدالت میں انہیں ستمبر 1968ء میں سزائے موت دی گئی لیکن یہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ میجر امان اور اس کے ساتھی پاکستانی فوج نے گرفتار کر لیے جب وہ لائن آف کنٹرول کے قریب چند رضا کاروں کا انتظار کر رہے تھے۔ مقبول بٹ اور اس کے ساتھیوں کا سرینگر جیل سے فرار کو پاکستانی حکام نے شک کی نظر سے دیکھا اور اسے ہندوستانی سازش قرار دے کر مقبول بٹ اور ساتھیوں کو کئی ماہ تک پاکستانی حکام نے عقوبت خانوں میں جبر وتشدد سے گزارا اور پھر رہا کر دیا لیکن مقبول بٹ کو پاکستانی حکام نے شک کی نظر سے ہی دیکھا اور ڈبل ایجنٹ قرار دیتے رہے۔ نیشنل لبریشن فرنٹ نے اپنی مسلح سرگرمیاں بھارتی زیرِ انتظام جموں کشمیر تک جاری رکھی تھیں لیکن پاکستان نے جموں کشمیر میں اپنی مسلح سرگرمیاں اور پراجیکٹ جاری رکھے ہوئے تھے اس لیے پاکستانی فوج کسی ایسے مسلح کشمیری گروہ کی حمایت نہیں کرنا چاہتی تھی جو اس کے مکمل کنٹرول میں نہ ہو یا جس گروپ کی سرگرمیوں کو پاکستانی ریاست کے ادارے مشکوک سمجھتے ہوں۔

نیشنل لبریشن فرنٹ جو مقاصد مسلح سرگرمیوں اور سوتاژ کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتی تھی وہ نہ تو ریاست کے اندر حاصل ہوئے اور نہ ہی بین الاقوامی سطح پر ان سرگرمیوں کا کوئی

خاطر خواہ اثر ہوا۔ نیشنل لبریشن فرنٹ نے 30 جنوری 1971ء کو ہندوستان کا ایک مسافر بردار طیارہ گنگا ہائی جیک کر کے لاہور لایا لیکن اس عمل کو بھی پہلے پاکستانی حکام نے سراہا لیکن جونہی پاکستان پر ہندوستان نے فضائی پابندیاں لگا کر دباؤ ڈالا۔ این۔ ایل۔ ایف۔ کے تمام لیڈروں کو ہندوستانی ایجنٹ قرار دے کر پھر عقوبت خانوں میں ڈال دیا گیا۔ امان اللہ خان کو 15 ماہ تک گلگت کی جیل میں رکھا گیا اور 1971ء میں رہا کیا گیا جبکہ ان سب کو ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا گیا تھا۔ لیکن گلگت میں امان اللہ خان کی رہائی کے لیے عوامی مظاہروں کا دباؤ بڑھ گیا تھا اس لیے انہیں رہا کیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کو گلگت میں 14 سال تک کی سزائیں دی گئی تھیں لیکن انہیں بھی ایک سال کے بعد رہا کر دیا گیا تھا۔ مئی 1976ء میں مقبول بٹ ایک بار پھر ہندوستان کے زیر انتظام کشمیر کے علاقے میں داخل ہو گیا لیکن اس بار مقبول بٹ کو پھر گرفتار کر لیا گیا اور پھر سزائے موت سنائی گئی۔ مقبول بٹ کی گرفتاری سے این۔ ایل۔ ایف۔ کی آزاد کشمیر میں سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ امان اللہ خان برطانیہ چلا گیا اور وہاں 1977ء میں برطانیہ میں محاذِ رائے شماری اور این۔ ایل۔ ایف۔ کے بجائے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے نام سے نیا سیاسی گروپ قائم کر کے اس کے نام سے سیاسی سرگرمیوں کا برطانیہ میں نئے سرے سے آغاز کر دیا۔ مئی 1977ء میں امان اللہ خان نے ایک خفیہ گروپ جو مسلح کاروائیوں کے لیے قائم کیا تھا جس کا نام نیشنل لبریشن آرمی رکھا گیا تھا۔ امان اللہ خان نے اس مسلح گروپ کے نام سے

برطانیہ میں ہندوستانی سفارتکار رویندر مہاترے کو اغوا کروا کر قتل کرا دیا تھا جس کے نتیجے ہندوستانی حکومت نے مقبول بٹ کو دہلی کے تہاڑ جیل میں سزائے موت پر عمل کرتے ہوئے 11 فروری 1984ء کو پھانسی دے دی۔ ہندوستانی سفارتکار کو اغوا کر کے مقبول بٹ کو ہندوستانی جیل سے رہا کروانا بتایا جاتا ہے لیکن ہوا اس کے برعکس مقبول بٹ کو پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح کی مسلح کاروائیوں سے آزادی کی تحریکوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا ہے یہی کچھ ریاست جموں کشمیر کی اس مسلح تحریک کے ساتھ بھی ہوا۔ کچھ لوگوں کو رویندر مہاترے کے قتل میں گرفتار کیا گیا جن میں امان اللہ خان بھی شامل تھے لیکن انہیں رہا کر کے پاکستان بھیج

دیا گیا تھا لیکن راجہ قیوم اور ریاض احمد کو عمر قید کی سزائیں دی گئیں جنہیں بعد میں 22 سال کی لمبی قید کی زندگی گزارنے کے بعد رہائی ملی۔ اس طرح کی مسلح سرگرمیوں نے کئی نوجوانوں کی زندگیوں کو برباد کیا اور بے شمار قربانیاں بھی نوجوانوں سے لی گئیں لیکن ریاست کے کسی حصے میں نہ ان سرگرمیوں کو بڑے پیمانے پر عوامی قبولیت حاصل ہوئی اور نہ ہی ان سرگرمیوں کی وجہ سے ریاست جموں کشمیر میں ہندوستان اور پاکستان نے آج 74 سالوں بعد بھی ریاستی عوام سے وعدہ پورا کیا ہے۔

3۔لبریشن فرنٹ

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ ریاست کے دونوں حصوں میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے۔ لبریشن فرنٹ نے کشمیری بولنے والے ریاست کے علاقوں میں مقبول بٹ کی پھانسی کے بعد 1988ء میں ایک بار پھر مسلح کاروائیاں شروع کر دیں۔ 1987ء میں لبریشن فرنٹ کی برانچ ہندوستانی کشمیر میں قائم کی گئی تھی۔ اس تنظیم نے 1994ء تک ہندوستان کے خلاف مسلح جدوجہد میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا لیکن یاسین ملک نے جنگ بندی کا اعلان کیا اور بعد میں مسلح جدوجہد سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس پارٹی نے اعلان کیا تھا اس کے مقاصد پوری ریاست جموں وکشمیر کی آزدی کی جدوجہد کو پرامن سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ حاصل کیا جائے گا لبریشن فرنٹ نے بھارتی زیر انتظام کشمیر میں مسلح جدوجہد پاکستانی ریاست کی مدد سے شروع کی تھی جو بعد میں پاکستانی ریاست نے مدد واپس لے لی اور دوسرے مسلح کشمیری گروپوں کی مدد شروع کر دی جس کا نتیجہ وادی کشمیر میں ایک شدت پسند مذہبی تنظیموں اور مسلح گروہوں کا سیلاب آ گیا ان مسلح گروپوں کے مقاصد ایک ہی تھے وہ بھارت سے کشمیری بولنے والا علاقہ چھین کر پاکستان میں شامل کرنا چاہتے تھے ان شدت پسند تنظیموں میں جماعت اسلامی کا مسلح ونگ حزب المجاہدین بھی شامل تھا۔ ان جہادی تنظیموں نے ریاست جموں کشمیر کے تنازعے کا رخ ہی مذہبی جدوجہد اور فرقہ واریت کی طرف موڑ دیا تھا۔ ان تنظیموں نے پاکستانی ریاست کی طرف سے ہندوستانی ریاست کے خلاف مذہب کے نام پر

ہزاروں نوجوانوں کو ہندوستانی فوج کے خلاف مسلح سرگرمیوں کے لیے منظم کیا تھا۔ لبریشن فرنٹ کی قیادت نے جونہی میدان خالی کیا جہادی گروپوں نے تنازعہ کشمیر کی اہمیت کو کم کر کے اسے مذہبی فرقے تک محدود کر دیا جس کا فائدہ پاکستان نے اٹھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ چونکہ تحریک میں شامل مسلح گروپوں کے مقاصد محدود تھے اور یہ سارے گروپ ہندوستان کے خلاف پاکستان کی اعلانیہ جنگ لڑ رہے تھے لبریشن فرنٹ کی مسلح تحریک بری طرح ناکام ہو کر ان جہادی گروپوں کے کنٹرول میں چلی گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ لبریشن فرنٹ نے بھی اپنی تحریک کو مذہب کے لبادے میں ہی شروع کیا تھا اور ان کی مدد بھی پاکستان نے کی تھی چونکہ مقاصد واضح نہ ہونے کی وجہ سے یہ فکری بنیادیں بنانے میں بری طرح ناکام ہوئے اور اس فکری ابہام کا فائدہ ایک طرف پاکستان کے خفیہ اداروں نے اٹھایا تو دوسری طرف ہندوستان نے بھی پورا فائدہ اٹھایا۔ پاکستان نے لبریشن فرنٹ کی کمزور فکری بنیادوں کی وجہ سے فائدہ اٹھایا اور کشمیر عوام کی آزادی کی خواہش اور تحریک میں ریاست کی آزادی کے رجحان کی جگہ مذہبی جنونی گروہوں کے ذریعہ صرف کشمیر کے علاقوں کو ہندوستان سے چھین کر پاکستان کا حصہ بنانے کی حکمت عملی اپنائی۔ یہ حکمت عملی بری طرح ناکام ہوئی۔ امان اللہ نے برطانیہ سے واپس آ کر آزاد کشمیر میں لبریشن فرنٹ کی تنظیم کی بنیاد رکھی اور اسی دوران پاکستانی آمر ضیاء الحق اس تاک میں تھا کہ وہ کشمیر میں خالصتان طرز کی مسلح جدوجہد کا آغاز کرے۔

امان اللہ نے پاکستان کے اس بدترین انسان دُشمن جمہوریت دُشمن، آزادی دُشمن ایک غاصب آمر پر بھروسہ کرتے ہوئے کشمیری بولنے والے علاقوں میں مسلح جدوجہد کرنے کی حامی بھری تھی۔ لبریشن فرنٹ کی لیڈرشپ کے ذہن میں آزادی کا کیا تصور ہوسکتا ہے جو ایک ایسے خونی آمر کی مدد سے حاصل کی جائے گی جو اپنے ملک کے عوام سے بولنے کی آزادی بھی چھین چکا تھا۔ امان اللہ خان کے پاس جادو کی کونسی چھڑی تھی جسے گھما کر اس نے ضیاء الحق جیسے آزادی کے بدترین دُشمن کے کہنے پر کشمیری خطے کی آزادی کے لیے پاکستانی فوج سے مدد لی تھی۔ پاکستانی فوج کے جنرل آزادی کے نام سے چڑتے تھے اور اپنے عوام کو بنیادی انسانی حقوق اور آزادی دینے کے خلاف تھے وہ کشمیری عوام کی حقیقی آزادی کے کس طرح حامی

ہوسکتے تھے۔ البتہ لبریشن فرنٹ کی لیڈرشپ کا سیاسی شعور شاید اس قابل بھی نہیں تھا کہ وہ پاکستانی ریاست کے مقاصد کو سمجھ پائے یا جان بوجھ کر کشمیری نوجوانوں کو پاکستانی ریاست کی جنگ میں جھونکنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ دراصل لبریشن فرنٹ کی لیڈرشپ میں چند افراد ہی ایسی مہم جوئی کے ذریعہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریاست پر چلنے والے تنازعہ کا حصہ بن کر وہی کھیل ایک بار پھر کھیلنا چاہتے تھے جو 1947ء میں آزاد کشمیر میں کھیلا گیا تھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ 1988ء میں بھی ریاست کی آزادی کی تحریک چلانے والوں کے پاس اپنا کوئی منصوبہ تھا نہ کوئی آزادی کے لیے پروگرام نہ کوئی ویژن تھا۔ اس طرح کی لیڈرشپ جو کسی ایک ریاست کی دُشمنی میں دوسرے کو کندھا پیش کرے وہ عوام کی نجات کی بجائے انہیں ملکوں کے درمیان چلنے والے تنازعہ میں حصہ بنا کر کسی بڑی مصیبت میں ڈال سکتی ہے اور لبریشن فرنٹ نے کشمیری عوام کے سامنے آزادی کا کوئی پروگرام پیش کیا نہ اپنی سرگرمیوں کو ریاست کی وحدت کی بحالی کی طرف رخ موڑا۔ لبریشن فرنٹ بظاہر سیکولر ہونے کا دعویٰ تو ضروری کرتی رہی ہے لیکن ان کا طرزِ عمل مسلم قوم پرستی اور دوقومی نظریہ کے زیرِ اثر ہی رہا ہے ان کے ممبران میں صرف مسلم ہی تھے اور زیادہ تر ان کا فوکس کشمیری بولنے والا علاقہ ہی رہا ہے۔ اگر اس علاقہ سے حمایت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ بھی مسلم کی حمایت حاصل کرنے پر زور رہا ہے لیکن ان کی سرگرمیاں کشمیری فوکس ہی تھیں اور مسلم تک ہی محدود تھیں جس کی وجہ سے پاکستان نے جہادی گروپوں کو لبریشن فرنٹ کا تیار کیا ہوا میدان استعمال کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ چونکہ لبریشن فرنٹ نے بنیادی فکر ہی کشمیری مسلمان اور کشمیر کی ہندوستان سے آزادی لینے پر زور دیا تھا اور مسلح جدوجہد بھی پاکستان کی مدد سے اسی علاقے میں شروع کی تھی اس لئے اس فکر کی مضبوط بنیادیں پاکستانی ریاست سے ملتیں تھیں اس لئے انھوں نے کشمیر میں مسلح جہادی گروپوں کے کئی جتھے بنائے اور انہیں ہندوستانی فوج سے لڑنے کے لیے تربیت دی اور لبریشن فرنٹ کا سارا کام پاکستان کے حامی جہادی گروپوں کے کنٹرول میں آ گیا اس کا فائدہ ہندوستانی فوج کو ہوا وہ پہلے ہی دنیا کے سامنے کشمیری کی تحریک کو مذہبی

جنونیوں کی دہشت گردی کی تحریک کا لیبل لگا کر وحشیانہ طریقے سے اسے کچلنے میں مصروف ہو گئے اور ہندوستانی ریاست کو علم تھا مذہبی جہادی تحریک کے خلاف پوری دنیا میں ایک پروپیگنڈہ چل رہا ہے اس کا بھارت نے بڑا فائدہ اٹھایا کشمیری عوام سے ان مذہبی گروہوں کی حمایت کے نام پر بربریت کا سلوک کیا لوگوں میں شدید دہشت اور خوف کا ماحول پیدا کر رکھا تھا اس تحریک کا کشمیری عوام کو شدید نقصان ہوا اور بھارت نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مسلح تحریک کے نام پر صرف کشمیری بولنے والے علاقوں میں 8 لاکھ کے لگ بھگ فوج رکھی ہوئی ہے جو کسی بھی علاقے میں سب سے زیادہ فوجوں کی تعیناتی تصور کی جاتی ہے سویلین آبادی میں اتنی بڑی فوجوں کی تعیناتی نے عام شہریوں کی زندگیوں کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے

ایک طرف کشمیری عوام ہندوستانی فوج کے عذاب برداشت کرنے پر مجبور تھے تو دوسری طرف مسلح گروہوں کا عذاب بھی خوف بن کر عوام کو ڈرا رہا تھا ایسی مسلح تحریکوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا جن کے مقاصد کسی ملک کی پراکسی جنگ لڑنے تک محدود ہوں۔ ان مسلح گروپوں کے مقاصد پاکستانی فوج نے طے کر رکھے تھے اور یہ ان کے حصول کے لیے کشمیر کو استعمال کر رہے تھے ایسی تحریکیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں جن کے مقاصد محدود ہوں یا کسی فرقے کی علاقے یا کسی لسانی گروہ کے مفادات کے لیے لڑ رہے ہوں دنیا ایسے مسلح گروہوں کی حمایت کبھی نہیں کرتی کیونکہ یہ مذہبی گروہ انسانی آزادی اور حقوق پر یقین ہی نہیں رکھتے بلکہ یہ عوام کو پہلے سے ملی ہوئی سیاسی، سماجی اور مذہبی آزادی بھی چھین لیتے ہیں۔ بہرحال لبریشن فرنٹ کی قیادت نے ہندوستانی ریاست سے جنگ بندی کا یک طرفہ اعلان تو کر دیا لیکن اس فیصلہ کو لبریشن فرنٹ کے کئی لیڈروں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ امان اللہ خان نے بھی سرینگر کی قیادت سے اختلاف کرتے ہوئے مسلح جدوجہد کو روکنا ایک بڑی غلطی قرار دیا تھا۔ بعد میں لبریشن فرنٹ کے کئی گروپ اور دھڑے وجود میں آئے کیونکہ یہ کہا گیا تھا کہ لبریشن فرنٹ کے صدر یاسین ملک نے ہندوستانی وزیراعظم سے خفیہ ملاقات کی تھی جس کی وجہ سے پارٹی کے کئی سینئر لیڈرز اس سے الگ ہو گئے اور کئی لیڈرز اپنے اپنے گروپ بنا کر ابھی تک کام

کررہے ہیں۔

آزاد کشمیر میں آزادی کا دعوی کرنے والے چھوٹے چھوٹے بے شمار گروپ کام کررہے ہیں ان سب کا دعویٰ ہے کہ یہ ترقی پسند اور لیفٹ یعنی بائیں بازو کی سوشلزم اور مارکسزم کی حامی تنظیمیں ہیں لیکن ان سب کا نظریہ بھی مقامی سطح پر قوم پرستی اور ریاست کی آزادی اور خودمختاری کا ہی ہے ان میں چند ایک بھی فعال نہیں ہیں ان کا عوام پر اثر ورسوخ نہ ہونے کے برابر ہے ان میں چند گروپ ایسے بھی ہیں جو سوشلسٹ ریاست کی بات بھی کرتے ہیں لیکن ان کی جدوجہد کا بنیادی محور ریاست کی آزادی اور اس کے بعد ہی سوشلزم کا نفاذ ممکن ہے۔ ان گروپوں کی اکثریت آزاد کشمیر کے علاقوں تک ہی محدود ہے بلکہ چند ایک تو اپنا وجود پورے آزاد کشمیر میں بھی نہیں رکھتے ہیں۔ ان میں سے ریاست کے دوسرے حصوں میں کوئی بھی وجود نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود ان سب کا دعوی ہے کہ یہ ساری ریاست کو ہندوستان اور پاکستان سے آزاد کرا کر الگ ملک کے طور پر وجود میں لائیں گے۔ یہ ترقی پسند اور سوشلزم کے حامی ہونے کے باوجود جو دعویٰ کرتے ہیں وہ کسی اَن دیکھی دنیا کے افسانے سے کم نہیں ہے۔ جن سیاسی گروپوں کا ساری ریاست میں وجود ہی نہیں وہ کس طرح ساری ریاست کو دوبارہ متحدہ کریں گے ان کی سوچ اور فکر کے حامیوں کا وجود تو آزاد کشمیر میں بھی نہیں جہاں پر یہ موجود ہیں تو دوسرے ریاستی علاقوں میں یہ آزادی کی تحریک کو کس طرح چلائیں گے یہ انہیں بھی معلوم نہیں ہوگا۔

آزاد کشمیر میں ایسے گروپوں کا سیاسی مستقبل کیا ہوگا اس کے بارے میں اندازے ہی لگائے جاسکتے ہیں لیکن یہ سارے ترقی پسند گروپ لوکل سیاست میں اپنا اثر ورسوخ بنانے میں ناکام نظر آتے ہیں ان میں ترقی پسندی اور حقیقی آزادی اور ریاست کی بحالی کا ترقی پسندانہ رجحان کی سیاسی پارٹی کا وجود سب سے پہلے آزاد کشمیر میں 1985ء میں قائم کیا گیا اور یہ سیاسی پارٹی جموں کشمیر پیپلز نیشنل پارٹی کے نام سے بنائی گئی تھی اور اس میں زیادہ وہی بائیں بازو کے دانشور اور طالب علم تھے جن کا رجحان سوشلسٹ انقلاب کی طرف تھا۔ ان بائیں بازو کے باقی چند گروپوں کا الگ الگ ذکر کرنے کی بجائے ان گروپوں کی جہاں سے ابتداء

ہوئی اور جس سیاسی اور معاشی نظریئے کو یہ بائیں بازو کے گروپ لے کر عوام میں کام کر رہے ہیں یہ ایک ہی طرح کی سوچ اور فکر ہے۔ لہٰذا ان کی سیاسی فکر کو جموں کشمیر پی این پی کی سیاسی فکر سے ملتا جلتا ہی تصور کیا جائے۔

4۔ جموں کشمیر پیپلز نیشنل پارٹی

جموں کشمیر پی این پی کا قیام 10 اپریل 1985ء کو عمل میں لایا گیا تھا۔ اس پارٹی کی سیاسی فکر فلسفہ کی بنیاد مارکسزم پر رکھا گیا تھا اور اس پارٹی کا قیام آزاد کشمیر کے علاقے میں قائم کیا گیا تھا لیکن یہ پارٹی بھی ساری ریاست کی وحدت کی بحالی کا دعویٰ کرتی ہے جبکہ اس کا وجود آج بھی بمشکل سارے آزاد کشمیر میں بھی نہیں ہے اس پارٹی نے ساری ریاست کی آزادی کا واضع فارمولا بھی دے رکھا ہے اس پارٹی کے پروگرام میں ساری ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کی نو آبادی کہا گیا ہے اور اس نو آبادیاتی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پی این پی کا فارمولا وہی ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیات میں چلنے والی قومی تحریکوں کے بارے میں سوشلسٹ اور کیمونسٹ پارٹیوں کا فارمولا تھا دراصل یہ سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان چلنے والی سرد جنگ کے دوران مغربی سرمایہ دار ملکوں کی کالونیوں میں سوویت یونین اور اس کے اتحادی ملکوں کی حمایت سے چلنے والی تحریکوں کو اپنا ہمنوا بنانے کا طریقہ تھا اور اس طرح ان ملکوں میں قومی جمہوری انقلابات کو سپورٹ کیا گیا تھا گویا یہ قومی جمہوری انقلاب کی تھیوری دراصل محکوم قوموں کی آزادی کی حمایت کی تھیوری تھی اور ان قومی تحریکوں کو سامراج دُشمن اور سوشلسٹ انقلاب کی طرف جانے والی انقلابی تحریکوں سے تعبیر کیا گیا تھا۔ جموں کشمیر پی این پی بھی ریاست جموں کشمیر کے تمام تقسیم شدہ حصوں کو کالونی سمجھتی ہے اس لیے اس کے خلاف جدوجہد کو بھی قومی جمہوری اور انقلابی جدوجہد کا نام دیتی ہے۔

پی این پی کے بانی چیئرمین کامریڈ قربان علی کی تحریروں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ قومی جمہوری انقلاب کا وہی راستہ اپنانے کے حامی ہیں جو سامراجی تسلط کے خلاف

1945ء کے بعد اپنایا گیا تھا اور انقلابی تحریکوں کو قومی جمہوری تحریکوں کا نام بھی دیا گیا تھا اور کیمونسٹ پارٹیوں کو بھی کہا گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے ملکوں میں قومی بورژوازی یا قومی سرمایہ دار طبقے سے آزادی کی تحریکوں میں مکمل تعاون کریں اور مغربی سامراجی ملکوں کے تسلط سے آزادی کی مانگ کو طبقاتی سوال سے جوڑ کر قومی تحریکوں کو کامیاب کریں۔ ان کیمونسٹ گروپوں نے قومی آزادی کی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا اور قومی سوال اور مظلوم قوموں کے سوال کو ایک ساتھ حل کرنے کی کوشش کو قومی جمہوری انقلابی جدوجہد کا نام دیا گیا تھا۔ دراصل سرد جنگ کا آغاز جرمنی میں ہٹلر کی شکست کے دو سال بعد 1947ء میں ہوا تھا اور یہ سرد جنگ 1991ء تک سوویت یونین کے خاتمے تک جاری رہی اور اس دوران ساری دنیا کی سیاست کو کسی حد تک اسی سرد جنگ کے تابع کر دیا گیا تھا مظلوم قوموں اور طبقات کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ان کی حمایت میں سوویت یونین امریکہ اور مغربی ملکوں کی سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے یہ دراصل دنیا کو دو کیمپوں میں تقسیم کر کے انہیں امریکہ اور سوویت یونین کی ریاستی پالیسیوں کا ہمنوا بنانے کا ایک طریقہ کار تھا اور اس سرد جنگ میں امریکہ اور سوویت یونین نے اپنے ریاستی مفادات کو سب پر فوقیت دے رکھی تھی اس لئے سرد جنگ کی پالیسیوں کو دو ملکوں یا دو ریاستوں کی پالیسیاں بھی کہا جا سکتا ہے۔ البتہ ان پالیسیوں کے ذریعہ یہ دونوں ملک اپنی حمایت یافتہ ریاستوں کے حکمرانوں کو مالی مدد بھی دیتے تھے انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال بھی کرتے تھے۔ دراصل ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ پیدا کرنے والا اور اس کو تنازعہ ڈیزائن کرنے والا بھی برطانوی سامراج تھا اور اسی پالیسی کو امریکہ نے بعد میں آگے بڑھایا اور اسی بنیاد پر سیاسی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں کو بھی یہی توقع ہوتی تھی کہ ان کی حمایت اور مخالفت کون کرے گا۔

سوویت یونین بائیں بازو کے ان سیاسی گروہوں کو امریکی سامراج کے پٹھوں ملکوں کے خلاف خوب استعمال کیا کرتا تھا اور یہ سیاسی گروپ بھی اپنی سیاسی پالیسیاں اسی حساب سے بناتے تھے تا کہ انہیں مقامی حکمرانوں اور کسی علاقائی قومی تحریک کی صورت میں امریکہ کے گماشتہ قابض ملک کے خلاف سوویت یونین کی حمایت ملے اور یہی پالیسی آزاد ملکوں

کی کمیونسٹ اور انقلابی پارٹیوں کی تھی کیونکہ ان گروپوں کو سوویت ریاست اپنے اپنے ملکوں میں بظاہر سرمایہ دار حکمرانوں کے خلاف لیکن اندرون خانہ اپنے سیاسی دباؤ کے لیے بھی استعمال کیا کرتی تھی لیکن سوویت یونین نے ان کیمونسٹ پارٹیوں کو اپنے اپنے ملکوں میں طاقت یا اقتدار حاصل کرنے کے لیے کبھی بھی حقیقی جدوجہد کے لیے حمایت نہیں کی۔ بہرحال کیمونسٹ اور مارکسٹ نظریات کی حامی پارٹیاں بھی ماسکو نواز اور چین نواز ہوا کرتیں تھیں۔ بدقسمتی سے یہ پارٹیاں سوویت ماڈل اور چینی ماڈل کے لیے کبھی اپنے عوام کو قائل نہیں کر سکیں اور جہاں بھی کوئی اقتدار حاصل کیا گیا بزور طاقت ہی ریاست پر قبضہ کیا گیا تھا۔ جموں کشمیر پیپلز نیشنل پارٹی بھی ایسے ہی مارکسی نظریات اور خیالات رکھنے والی ایک بائیں بازو کی جماعت تصور کی جاتی ہے۔ جبکہ اپنے سیاسی پروگرام کے اعتبار سے ایک ترقی پسند قومی جماعت ہے۔آزاد کشمیر کے باقی جتنے بھی اس طرح کے گروپ ہیں ان سب نے پی این پی کا سیاسی معاشی اور ریاستی آزادی کے لیے بھی یہی پروگرام نقل کر رکھا ہے۔اب دنیا کی سیاسی صورتِ حال کو بدلے تین دہائیوں سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس جماعت سمیت باقیوں کا بھی دنیا کو دیکھنے کا وہی تیس (30) سال پرانا طریقہ ہی ہے ایسے حالات میں جب دنیا قومی ریاستوں کی سرحدوں کو مزید کھلا یا اوپن کر رہی ہے اور گلوبل ریاست یا ریاستوں کے اتحاد کے دور میں داخل ہو چکی ہے ریاستوں کا ایک دوسرے پر انحصار ٹیکنالوجی نے مزید بڑھا دیا ہے کسی ایسی جدوجہد کو جاری رکھنا جو گزرے ہوئے وقتوں کے تقاضوں کے مطابق ہو ان سیاسی گروپوں کی کامیابی کے امکانات کو بالکل ختم کر دیتی ہے۔ جموں کشمیر پی این پی کا منشور اور پروگرام سرد جنگ کے زمانے کی عکاسی کرتا ہے اور سرد جنگ ختم ہونے کے بعد بین الاقوامیت کے نئے دور کا تجزیہ اس جماعت کی طرف سے ابھی تک سامنے نہیں لایا گیا۔

ریاست جموں کشمیر کے سارے تقسیم شدہ علاقوں کو ہندوستان اور پاکستان کی کالونی یا نوآبادی کا درجہ قرار دینے والی یہ جماعت سیاسی پروگرام میں صرف یہ مشورہ دے پائی ہے کہ ریاست کا تقسیم شدہ ہر حصہ اپنی اپنی سیاسی جدوجہد اپنے اپنے قابض ملک کے خلاف کرے کیونکہ ریاست پر دونوں ملکوں کا سخت گیر فوجی کنٹرول ہونے کی وجہ سے ایک

حصے کے لوگ دوسرے علاقوں میں سفر نہیں کر سکتے لیکن سیاسی تحریکوں کی بنیاد کسی تضاد کی بنیاد پر ہوتی ہے بھارت کے زیر انتظام علاقوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورتِ حال آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے علاقوں سے بالکل مختلف ہے۔ اسی طرح ریاست کے اندر مختلف قوموں اور قومیتوں کا وجود بھی موجود ہے۔ ریاست کے پاکستان کے کنٹرول میں آنے والے آزاد کشمیر کا خطہ صوبہ جموں سے تعلق رکھتا ہے اور ان کی زبان ڈوگری / پوٹھوہاری / پہاڑی طرز کی ہے مظفر آباد کے علاقوں کی زبان ہندکو پہاڑی ہے جبکہ علاقہ انتظامی اعتبار سے کشمیری صوبے سے ٹوٹا ہوا ہے۔ لدّاخ سے ٹوٹا ہوا علاقہ بلتستان ہے جو ایک زبان کلچر سے تعلق رکھتا ہے جبکہ گلگت کا علاقہ زبان سے الگ خطہ بن جاتا ہے لیکن انتظامی اعتبار سے یہ علاقے ریاست کا شمالی صوبہ کہلاتے تھے۔ پی این پی کی لکھی ہوئی تحریروں میں ریاست جموں کشمیر میں رہنے والی قوموں اور قومیتوں کے تاریخی وجود کو تو تسلیم کیا گیا ہے لیکن انہیں کشمیری قومیں اور قومتیں کہہ کران کی نفی بھی کی گئی ہے۔ ریاست جموں کشمیر خود کوئی ریاست نہیں تھی بلکہ اس کا وجود صرف فیوڈل دور میں ہی قائم رہا اور ڈوگرہ خاندان کی بادشاہت نے ان علاقوں کی متحدہ ریاست کو جوڑے رکھا جب بادشاہت کا خاتمے کا وقت آیا تو یہ ریاست بھی ختم ہوگئی اس ریاست کا کوئی لمبا تاریخی ارتقاء موجود نہیں ہے اور نہ ہی ریاست سرمایہ داری کے دور میں داخل ہونے کے بعد اپنا وجود برقرار رکھ پائی۔

یہ ریاست ہندوستان کی ہی ایک شاہی ریاست تھی اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ الگ قومی ریاست نہیں تھی بلکہ متحدہ ہندوستان کے 565 ریاستوں کی طرح یہ بھی ایک فیوڈل ریاست تھی اور ہندوستان کی نیم قومی ریاست (Sub Nation) تھی جب ہندوستان کے بٹوارے کا وقت آیا تو ان تمام شاہی ہندوستانی ریاستوں کو ہندوستان اور پاکستان میں شامل ہونے کو کہا گیا تھا لیکن اسی ریاست کے حکمران نے دونوں ملکوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے یہ ریاست ہندوستان اور پاکستان کے درمیان متنازعہ ہوگئی اور دونوں کے درمیان تقسیم بھی ہوگئی تھی۔ اب اس ریاست کا تنازعہ دونوں کے درمیان پیدا ہوا تھا اس لئے اس تنازعہ کا حل ریاستی عوام کی رائے سے نکالنے پر اتفاق ہوا تھا اور اس وقت اس

ریاست کی متنازعہ حیثیت اسی نقطے پر قائم ہے۔جموں کشمیر پی این پی نے ریاست کے تنازعہ کے بارے میں وہی موقف اپنایا ہے جو باقی قوم پرستوں کا موقف ہے کہ ریاست سے دونوں ملکوں کو ریاستی عوام زبردستی نکال کر اپنی متحدہ ریاست کی آزادی کا اعلان کریں گے اس میں یکطرفہ موقف اختیار کیا گیا ہے جس طرح ہندوستان اور پاکستان نے اپنا یکطرفہ موقف اختیار کر رکھا ہے کہ ریاست ان دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کا حصہ بنے گی اور دونوں کا یکطرفہ موقف ہے جس کی وجہ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو پایا۔یہی موقف ریاست کی مکمل آزادی اور خود مختاری مانگنے والوں کا بھی ہے۔اگر مسئلہ سہہ فریقی ہے تو تینوں فریق اسے مل کر ہی حل کر سکتے ہیں۔اگر تینوں فریق اپنی اپنی بات پر ڈٹے رہیں گے تو اس کا حل بھی کوئی نہیں نکلے گا۔

جموں کشمیر پی این پی نے اپنی پارٹی تحریروں میں کشمیری بولنے والے خطے کو ہی ساری ریاست قرار دے کر اسی کے قومی سوال کو اجاگر کیا ہوا ہے اور کشمیر کے قومی سوال کو اتنا پرانا بتایا گیا کہ یہ سوال 1586ء سے موجود چلا آ رہا ہے۔جب مغلوں نے پہلی بار خطہ کشمیر پر قبضہ کر لیا تھا۔حالانکہ کشمیر کی اس وقت کی اپنی بادشاہت تھی جس کو ہندوستانی مغلوں نے شکست دے کر اس کشمیری خطے کو ہندوستانی مغل بادشاہت کا حصہ بنا ڈالا تھا۔اس کشمیری خطے کا آج کی ریاست جموں کشمیر کی ریاست سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کیونکہ یہ ریاست جموں کشمیر جن جغرافیائی خطوں پر مشتمل ہے کشمیری خطہ صرف اس کا چھوٹا سا علاقہ ہے جبکہ اس ریاست کا 86% علاقہ کشمیری نہیں ہے۔یہ ریاست ایک الگ تھلگ جغرافیائی اکائی ہے اور مغلوں نے جس علاقے پر قبضہ کیا تھا وہ اس ریاست کا صرف ایک علاقہ تھا دوسری بات یہ ہے کہ بادشاہوں کے دور میں کوئی قومی سوال کا وجود نہیں تھا اور نہ ہی اس دور میں کوئی قوم اپنا وجود رکھتی تھی۔یہ درست ہے کہ کشمیر کا خطہ اس وقت سے بیرونی سیاسی طاقتوں کے کنٹرول میں رہا ہے۔ہندوستان اور پاکستان نے ریاست کو تقسیم کر کے اس کے حصوں کو اپنے اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا ہے لیکن دونوں ملکوں کو ریاستی عوام کے ایک حصے کی حمایت بھی حاصل رہی ہے اور ایسی سیاسی جماعتوں کا وجود دونوں طرف موجود ہے جو ریاست میں ہندوستان یا پاکستان کی حمایت کرتی ہیں یہ کہنا کہ ہندوستان اور پاکستان اپنے اپنے زیر انتظام علاقوں کو عوام کی حمایت

کے بغیر کنٹرول کرتے ہیں یہ درست نہیں ہے ہندوستان اور پاکستان نواز سیاسی جماعتوں کی حمایت عوام میں آج بھی زیادہ ہے اور عوام کی اکثریت بھی ریاست کی بحالی اور مزید حقوق کی مانگ کی حمایت ضرور کرتی ہے لیکن ہندوستان اور پاکستان سے الگ ہونے والوں کی تعداد ریاست کے کسی بھی حصے میں زیادہ نہیں ہے صرف آزاد کشمیر اور وادی کشمیر میں ایسے چند گروپ ضرور ہیں لیکن ان کے ساتھ عوام کی حمایت بالکل بھی نہیں ہے اور ایسے گروپوں میں بھی کچھ ہندوستان کے حمایتی ہیں اور کچھ پاکستان نے ہی پیدا کر رکھے ہیں۔ محض سیاسی پروپیگنڈے کی بنیاد پر کسی ریاست کا مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی سیاسی دعوے کی بنیاد پر کسی ریاست کو آزاد ملک یا کسی دوسرے ملک کا حصہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کا بھی یہی دعوی ہے کہ ریاست کے عوام ان کے ساتھ ہیں آزادی کا دعویٰ کرنے والے کہتے ہیں کہ ساری ریاست کے عوام ان کے موقف کے ساتھ ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ ان تینوں فریقوں کے دعوؤں میں ساری سچائی پائی جاتی ہے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تینوں سوچوں کے لوگ ریاست جموں کشمیر کے خطوں میں موجود ہیں لیکن اکثریت کس کے حق میں ہے محض اندازہ ہی لگایا جاتا ہے۔

جموں کشمیر پی این پی کی سوچ نے نوجوانوں میں خاص کر آزاد کشمیر کی حد تک یہ سوچ ضرور پیدا کی ہے کہ ساری ریاست متنازعہ ہے اور اس پر دونوں ملکوں کا قبضہ ہے۔ پی این پی سے پہلے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو آزاد ہی تصور کیا جاتا تھا اور صرف بھارت کے زیر انتظام علاقوں کو ہی قوم پرست گروپ مقبوضہ تصور کرتے تھے اور ان میں سے اکثریت آج بھی آزادی صرف کشمیری مسلم علاقوں کی ہی مانگ رہی ہے جبکہ آزاد کشمیر کی عام آبادی کی اکثریت آزاد کشمیر کو آج بھی آزاد ہی تصور کرتی ہے۔ جو سیاسی جماعتیں آزاد کشمیر کو بھی پاکستان کی نوآبادی کہتی ہیں ان کی عوام میں پذیرائی بالکل بھی نہیں ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے سیاسی گروپ ہیں جو زیادہ تر پڑھے نوجوانوں تک ہی محدود ہیں۔ البتہ آزاد کشمیر کے عوام کو مزید سیاسی اور معاشی حقوق ملیں اس کی حمایت موجود ہے لیکن یہاں پاکستان کی طرف سے سختیوں کا زیادہ ہونے کی وجہ سے کوئی بڑی عوامی تحریک کے دور دور تک کوئی آثار موجود نہیں

ہیں کیونکہ یہاں سیاسی جماعتوں کا کنٹرول بھی پاکستان کا ہی ہے اور یہاں کی حکومتوں کا نظام چلانے والی جماعتیں پاکستانی جماعتوں کی ہی لوکل برانچیں ہیں۔ انتظامی معاملات انہی کے ذریعہ ہی حل ہوں گے لیکن ریاست کا تنازعہ حل کرنے میں ان پاکستان نواز جماعتوں کا آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں وہی یکطرفہ پاکستانی ریاست والا موقف ہی ہے یہی حال بھارتی زیر انتظام علاقوں کی سیاسی جماعتوں کا بھی ہے جو بھارت کے یکطرفہ موقف کی حامی جماعتیں ہیں۔

ریاست کو دونوں ملکوں کی نوآبادی سے نجات دلا کر ایک آزاد خودمختار قومی جمہوری ریاست بنانے کی حمایت ریاست کے کسی بھی حصے میں موجود نہیں ہے اور اس کے باوجود یہ سیاسی جماعت اپنے پرانے نظریات اور پالیسیوں میں تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں ہے اس جماعت کے پاس نہ صرف لیڈر شپ کی کمی ہے بلکہ اس کے نظریات بھی وقت اور حالات سے ہم آہنگ نہیں ہیں تو اس کی کامیابی کے امکانات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں ان سیاسی گروپوں کا سب سے بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ان کا وجود پوری طرح آزاد کشمیر جیسے چھوٹے سے ریاستی خطے میں بھی موجود نہیں ہے لیکن یہ دعوی ساری ریاست جموں کشمیر کو متحد کرنے اور دونوں ملکوں کے قبضہ سے آزاد کروانے کا کرتے ہیں۔ جموں کشمیر پی این پی کا یہ دعوی ہے کہ جو جس کا غلام ہے اُسی ملک کے خلاف سیاسی جدوجہد کرے جو خطہ پہلے آزاد ہوگا وہ ریاست کے دوسرے حصوں کو آزاد کرنے کی جدوجہد کرے گا۔ یہ ایسے لگتا ہے کہ فرض کیا گیا ہے کہ ریاست کے ہر خطے میں ایک ہی طرح کی آزادی اور نوآبادی کے خلاف جدوجہد ہو رہی ہے جبکہ عملاً ایسا ہرگز نہیں ہے ریاست میں جو بھی جدوجہد ہو رہی ہے وہ ہندوستانی اور پاکستانی ریاست کے یکطرفہ موقف کی بنیاد پر ہو رہی ہے محض فرض کر لینے سے اور مفروضے بنا لینے سے کسی سماج میں نہ تبدیلی آسکتی ہے اور نہ ہی مختلف لسانی، علاقائی، مذہبی اور سماجی گروہوں کو متحدہ کر کے کسی مشترکہ جدوجہد کے عمل میں لایا جاسکتا ہے اس وقت ریاست جموں کشمیر کی زمینی حقیقت کا سائنسی تجزیہ کرنا اور نئے سرے سے عوام کو نئے سیاسی نظریات اور پروگرام کے گرد جمع کرنا وقت کی اہم ضرورت بن چکی ہے آج اس خطے میں عموماً اور ریاست جموں کشمیر میں سو سال پرانے نظریات

کی بنیاد پر قومی جمہوری انقلاب نہیں لایا جاسکتا اور نہ ریاست میں کوئی ایک قوم بستی ہے جس کو محکوم بنالیا گیا ہو اور اس کی عوام کی اکثریت کو قومی محکومی کا شدید احساس پیدا ہو گیا ہو۔

ریاست میں ایسی صورتِ حال ہرگز موجود نہیں ہے۔ آزاد کشمیر کے علاقے کے جو انتظامی اور علاقائی آزادی سے متعلق مسائل ہیں ان کو مطالبات کی شکل میں کسی بھی جماعت نے پیش ہی نہیں کیا جس میں پی این پی بھی شامل ہے جبکہ اس کا سارا زور ہی کشمیر کے قومی سوال پر ہے آزاد کشمیر کے خطے کے پاکستانی ریاست کے ساتھ فوراً تضادات کو یہ پارٹی بھی سامنے نہیں لاسکی اور نہ ہی انہیں شناخت کر سکی۔ آزاد کشمیر میں جس طرح کا سیاسی، معاشی اور انتظامی نظام بنایا گیا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے پاکستان کے اداروں کا کردار آزاد کشمیر حکومت پر زیادہ حاوی ہے اور آزاد کشمیر میں جمہوری سیٹ اَپ بنیادی ضرورت ہے۔ اس خطے میں منتخب حکومتی اداروں کو مکمل با اختیار، جمہوری اور عوام کے سامنے جوابدہ بنانا ضروری ہے یہاں جمہوری نظام کے لیے بہترین سماج موجود ہے اس کو مزید ترقی دینے کی ضرورت ہے اس وقت آزاد کشمیر کے لوگوں کی فی کس آمدنی (Per capita income)1512 امریکی ڈالر اور پاکستانی روپے میں دو لاکھ کے لگ بھگ بنتی ہے۔ جبکہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں فی کس آمدنی (Per Capita Income)92 ہزار ہے گویا آزاد کشمیر میں فی کس آمدنی بھارت کے زیر انتظام ریاستی علاقوں سے دوگنا ہے جبکہ بھارت کے زیر انتظام ریاست جموں کشمیر کی آبادی بھارت کی کل آبادی کا 1% بنتی ہے۔ بھارت کی مرکزی حکومت کی طرف سے ریاست کو 10% گرانٹ ملتی ہے اور فی کس جموں کشمیر کے فرد کو 91,300 صرف اسی گرانٹ کی رقم سے ملتے ہیں تعمیر و ترقی کے اعتبار سے بھارت کے زیر انتظام علاقے آزاد کشمیر سے بہت آگے ہیں لیکن جتنی رقم گرانٹ کی صورت میں بھارتی مقبوضہ جموں کشمیر کو ملتی ہے اس حساب سے ترقی نظر نہیں آتی یا ہر خطے میں ترقی پر برابر رقم خرچ نہیں کی جاتی اور زیادہ رقم کا حصہ کرپشن کی نظر ہو جاتا ہے اس کے علاوہ ہندوستان کے زیر انتظام ریاست کی اپنی آمدنی 1.76 ٹریلین ہندوستانی روپیہ اور 24.28 بلین امریکی ڈالر بنتی ہے ہندوستان ہر سال 1.14 لاکھ کروڑ گرانٹ بھی دیتا ہے جبکہ آزاد کشمیر کی جی ڈی پی 2021ء میں 6.5 بلین

امریکی ڈالر ہے حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کو 1168 بلین بجٹ 22-2021ء میں گرانٹ دی ہے۔

ایشین ڈیویلپمنٹ بنک نے آزاد کشمیر کو مختلف شعبوں میں ترقی کے لیے 76 ملین ڈالر دیئے ہیں اور جرمنی نے صحت کے شعبے کو ترقی دینے کے لیے آزاد کشمیر کو 38 ملین ڈالر کی مدد دی ہے۔ اس کا اگر درست حساب رکھا جائے تو آزاد کشمیر میں صحت کے شعبے میں رقم خرچ ہی نہیں کی گئی یا رقم کا بڑا حصہ کرپشن کی نظر ہوا کیونکہ آزاد کشمیر میں ہیلتھ سیکٹر میں بہتر ڈھانچہ تعمیر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہسپتالوں کو بہتر نہیں بنایا گیا نہ ہی انہیں جدید سہولتوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ہر ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں جدید سہولتوں والے ہسپتالوں کی شدید ضرورت ہے۔ یہ صرف ایک چھوٹی سے جھلک دکھائی گئی ہے آزاد کشمیر حکومت کے صرف ایک شعبے کی تاکہ بتایا جائے کہ ان سیاسی گروپوں کی نعرے بازی کی سیاست اور آزاد کشمیر کے عوام کے بنیادی مسائل میں سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

یہ صرف آزاد کشمیر کی مارکسزم کی بنیاد پر بننے والی جموں کشمیر پی این پی کا مقامی سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کے بارے میں نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے جس پارٹی کے بانی نے آزاد کشمیر کے سماج کے لیے نئے سرے سے سائنسی تجزیہ پیش کرنے کی بنیاد فراہم کر دی تھی اور اس سماج کو نوآبادی کہہ کر اس طرف توجہ دلائی تھی لیکن اس پر پارٹی کی طرف سے مزید کوئی ریسرچ کرنے کی سرے سے کوشش کی گئی نہ نئی سوچ اور سمجھ پیدا کرنے کے لیے آزاد کشمیر کے نوجوانوں کی درست رہنمائی کی گئی پارٹی میں آج بھی 35 سال پرانا لکھا ہوا مواد ہی موجود ہے جو آج کے حالات اور آزاد کشمیر کے اپنے سماج کا سرے سے کوئی تجزیہ اور حل پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سوشلزم کا پرانا ماڈل چاہیے سیاسی ہو یا معاشی ناکام ہو کر ساری دنیا سے متروک ہو چکا ہے لیکن آزاد کشمیر جیسے پسماندہ ترین خطے کی معاشی، سیاسی، علاقائی ترقی اور آزادی کے لیے جو ماڈل پیش کیا گیا تھا وہ اس سماج کے مسائل کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہے۔ کیا ہم ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کی نوآبادی قرار دے کر کیا سو سال پرانے مغربی سامراجی ملکوں کے خلاف کی گئی انقلابی تحریکوں کو اپنے خطوں کے حالات سے مطابقت دے سکتے ہیں؟

کیا ریاست جموں کشمیر کوئی قومی ریاست بن چکی تھی جس کی مارکیٹ پر بیرونی قوتوں نے قبضہ کرلیا ہے؟

یہ درست ہے کہ دونوں پڑوسی ملکوں نے ریاست کو تقسیم کر کے اس کے حصوں پر جبراً اپنا سیاسی اور معاشی، علاقائی تسلط قائم رکھا ہوا ہے۔ یہ خطہ کوئی قومی ریاست کا درجہ حاصل کرنے کے لیے کسی قومی سیاسی تحریک کے نتیجہ میں وجود پذیر نہیں ہوئی ہے۔اس ریاست کی قوموں اور قومیتوں نے رضا کارانہ بنیادوں پر کوئی سیاسی شناخت کا سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔اس کے اندر چلنے والی سیاسی تحریک الگ قومی اور ریاستی شناخت کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ ہندوستان کے دو قومی نظریئے کی بنیاد پر بٹوارے کی تحریک کے رجحان کا ایک حصہ تھی۔ ریاست جموں کشمیر کی کسی بھی سیاسی جماعت نے ریاست کے لیے الگ نیشن کا درجہ یا الگ ریاست کا درجہ (Natioanhood یا Statehood) کے لیے جدوجہد نہیں کی تھی صرف فیوڈل ریاستی حکمران نے 1947ء سے پہلے کوشش ضرور کی تھی لیکن ریاست کی کسی بھی سیاسی جماعت نے اس کی الگ بفرسٹیٹ کی کوشش قبول کرنے کی بجائے ہندوستان اور پاکستان کی ریاستوں کا حصہ بننے کے لیے ساری جدوجہد کی تھی۔

آج بھی ریاست کے کسی بھی حصے میں ایسی کوئی مشترکہ تحریک نہیں جو دونوں ملکوں کو ریاست سے نکلنے کے لیے دباؤ ڈال رہی ہو اور نہ ہی ریاست کے سارے خطے ایک دوسرے سے ریاست کی آزاد حیثیت پر متفق ہیں اس ریاست کے تنازعہ کو کوئی ایک فریق یکطرفہ حل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ریاست کے تنازعہ میں ہندوستان اور پاکستان کا کردار حاوی ہے بلکہ 1947ء سے ریاست کو کنٹرول کرنے کے لیے دونوں ملکوں نے ریاست کے اندر بھی اپنے سیاسی گروہ اور جماعتیں اپنی اپنی حمایت کے لیے پیدا کر رکھے ہیں جن کے ذریعہ ریاست کے تقسیم شدہ حصوں کو کنٹرول کیا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے دونوں طرف ہندوستان اور پاکستان کی حامی سیاسی جماعتیں ہی مین سٹریم ہیں ان کی حمایت شاہد ریاست کا تنازعہ حل کرنے کے لیے نہ بھی ہو لیکن لوکل انتظامی امور اور روزمرہ کے مسائل حل کروانے کے لیے عوام انہی کے

محتاج ہوتے ہیں۔ ریاست کے دونوں طرف حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں ہندوستان اور پاکستان کی طرف سے ریاستی عوام پر سختیاں بھی کی جاتیں ہیں خاص کر ہندوستان نے ریاست کی حیثیت چھین کر عام شہریوں کی آزادیوں کو بڑی شدت سے کچلا ہے اور ریاستی دباؤ اور فوجی تسلط میں مزید اضافہ کیا ہے اور ریاستی عوام میں ہندوستان سے بیزاری اور آزادی کی خواہش میں اضافہ کیا ہے لیکن بد قسمتی سے کسی بھی سیاسی جماعت نے ریاستی عوام کے سامنے نہ تو ان کے روزمرہ مسائل کے حل کے لیے کوئی اچھا پروگرام پیش کیا اور نہ ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کا کوئی بہتر حل اور حکمت عملی پیش کی ہے جس کی وجہ سے عوام میں شدید مایوسی پیدا ہوئی ہے خاص کر کشمیری بولنے والے خطے میں بھارتی حکومت کی سختیاں اور فوجی جبر میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہوا۔ ریاست جموں کشمیر کی سیاسی قیادت چاہے پاکستان یا ہندوستان کے زیر کنٹرول علاقوں میں ہو، مفاد پرستی کے علاوہ ان کا کوئی سیاسی ویژن (Vision) ہی نہیں ہے۔ ریاست کے مختلف خطوں کے درمیان مذہبی اور علاقائی بنیاد پر دوریاں پہلے سے کئی گنا زیادہ ہیں مفاداتی گروہ ان دوریوں کو مزید استعمال کر کے اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔ عوام دونوں طرف کسی راہنمائی اور حقیقی مسائل کے حل کے لیے کسی حقیقی لیڈر اور سیاسی جماعت کی تلاش میں ہیں جو ان کو اس عذاب سے نکال کر نارمل زندگی کی طرف لائے۔ ریاست جموں کشمیر کا ہر حصہ متنازعہ ہے اور اس ریاست کا تنازعہ کسی علاقے یا خطے کی بنیاد پر حل نہیں ہوگا اور نہ ہی کسی مذہب یا فرقے کی بنیاد پر ریاست کا کوئی حل موجود ہے۔

یہ ریاستی عوام کا سیاسی، معاشی اور علاقائی حقوق کا سوال ہے اس کو حل کرنے کے لیے ساری ریاست کے خطوں کو قریب لانا اور ان کے درمیان ڈائیلاگ شروع کروانا اس حل کی طرف پہلا قدم ہوگا۔ اس حل میں ریاست کے تمام خطوں کی سیاسی پارٹیوں کو اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ اس کام کو کرنے کے لیے ابتداء ایسے سیاسی گروپوں اور سیاسی پارٹیوں کا ایک جمہوری اتحاد قائم کرنا ہوگا جو ریاست گیر اتحاد ہو جس اتحاد میں ریاست کے ہر حصے کی سیاسی جماعتوں کو شامل کیا جائے اور پہلے ان سے تجاویز لیں جائیں اور ریاست کے تنازعے کی نیچر کے مطابق ہی اس کا حل تلاش کیا جائے۔ جس میں تینوں فریقوں ہندوستان، پاکستان اور

ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق ایسا حل تلاش کیا جائے جس میں تینوں فریقوں کی پوزیشن برابر ہو کسی بھی فریق کو فتح اور شکست کا احساس نہ ہو کیونکہ مسئلہ سہہ فریقی ہے تو حل بھی سہہ فریقی ہی نکلے گا۔ ریاست کا حل نہ تو کسی سیاسی جماعت کی مرضی سے نکلے گا نہ کسی ایک مذہب یا فرقے کی مرضی سے نکلے گا اور نہ ہی ریاست کے کسی ایک خطے کی مرضی کا حل دوسروں پر مسلط کیا جائے گا اس جمہوری عوامی اتحاد میں ان لوگوں اور جماعتوں کو شامل کیا جائے جو اس مسئلے کا سہہ فریقی حل چاہتے ہوں۔

ریاستی عوام کو ایک طرف تو ہندوستان اور پاکستان کی ریاستوں نے دھوکے فریب اور پروپیگنڈے کا شکار بنا رکھا ہے اور یکطرفہ حل یعنی ریاست کا تعلق ہندوستان سے ہے اور پاکستان کا دعویٰ ہے کہ ریاست کا تعلق اس سے ہے۔ دوسری طرف آزادی اور خودمختاری کی بات کرنے والے چھوٹے سیاسی گروپ ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ ریاست کو دونوں ملکوں سے مکمل آزادی ملے گی۔ یہ تینوں موقف یکطرفہ ہیں اور ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان جس طرح بھی ریاستی تنازعہ میں فریق بنے ہیں ان کی حیثیت ریاست میں حاوی ہے اور ان کے دعوے بھی حاوی نظر آتے ہیں گو کہ ریاست میں کبھی عوام کی رائے ریاست کے تنازعے کے حوالے سے نہیں لی گئی جبکہ ہندوستان اور پاکستان ریاست کے انتظامی امور چلانے کے لیے اپنے حمایتی سیاسی جماعتوں کے ریاستی انتخابات جیتنے کو اپنی اپنی حمایت سمجھتے ہیں جبکہ آزادی اور ریاست کو دونوں ملکوں سے الگ کرنے والے سیاسی گروپوں نے کبھی انتخابات میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی انہیں الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت ہے اس طرح ہندوستان اور پاکستان کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ ان کی حمایتی سیاسی جماعتوں کی وجہ سے عوام ان کے ساتھ ریاست کا الحاق بھی کرنا چاہے گی۔ اس مسئلے کا حل تینوں فریقوں کی بات چیت سے ہی نکلے گا۔

☆☆☆☆

پندرہواں باب

مسئلہ جموں کشمیر اور اس کے ممکنہ حل

ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ ہندوستان کے بٹوارے کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ برطانوی سامراج نے ہندوستان سے جاتے ہوئے اس کا مذہبی بنیادوں پر بٹوارہ کر دیا تھا۔ ہندوستان کا بٹوارہ کانگریس اور مسلم لیگ کی مدد اور مرضی سے کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک میں دراڑیں اس وقت پیدا ہوئیں جب کانگریس کی لیڈرشپ نے آزادی کے لیے کوئی واضع راستہ اختیار کرنے اور اس تحریک کے واضع مقاصد طے کرنے کی بجائے کمپرومائز کی پالیسی اختیار کی۔ انگریز ہندوستان کی تقسیم کے اپنے مقاصد رکھتے تھے اور ہندوستان میں مذہبی فرقہ پرستی کو ہوا دینے کے لیے انگریز حکومت نے 1909ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے نام پر اسے مزید ہوا دی۔ گو کہ ہندو مسلم تقسیم ہندوستانی سماج میں پہلے سے ہی موجود تھی، انگریز حکومت نے اس تقسیم کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ انگریز حکومت نے ہندو مسلم کی تقسیم دراصل ہندوستان کی تقسیم اور ہندوستانی مسلمانوں کی تقسیم پر ختم کی۔ یہ فرقہ وارانہ تقسیم دراصل اس خطے میں اسی بڑے سیاسی کھیل (گریٹ گیم) کا حصہ تھی جو اس خطے میں بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش کی وجہ سے شروع ہوئی تھی۔ یہ کشمکش برطانوی سامراج اور زار روس کے دور سے چلی آ رہی تھی جو سوویت یونین کے

انقلاب کے بعد برطانیہ اور سوویت یونین کے دور میں شدت اختیار کر گئی تھی۔ سوویت یونین اور برطانیہ کے دور میں ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقے اور افغانستان کے راستے سوویت یونین کے ہندوستان پر حملے کا خطرہ برطانیہ کے لیے موجود رہا اور برطانیہ ہر حال میں سوویت یونین کو افغانستان سے پہلے سنٹرل اشیاء تک روکنا چاہتا تھا۔

برطانیہ دوسری عالمی جنگ کے بعد اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے وسیع خطے پر اپنا کنٹرول رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اس خطے میں سوویت یونین کے خطرے سے بچنے کے لیے برطانیہ نے ہندوستان کے شمالی علاقے کو الگ ملک بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہندوستان کے یہ شمالی علاقے برطانوی سامراجی سکیم میں فٹ ہوتے تھے کیونکہ یہ ہندوستان کے زرعی علاقے تھے جہاں سے برطانیہ نے اپنے سامراجی عزائم کے لیے فوج بھرتی کر رکھی تھی زرعی علاقے جو فیوڈل نظام کے تحت رہتے ہیں میں مذہب کا استعمال کرنا بھی آسان ہوتا ہے برطانوی سکیم کے مطابق ان علاقوں کو مذہبی تقسیم کے نتیجہ میں ہندوستان سے الگ کرنا اور اس خطے کو ہندوستان اور سوویت یونین کے درمیان بفرزون کے طور پر استعمال کرنا آسان تھا اسی سکیم کے تحت ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کیا گیا تھا۔ اس بٹوارے کی سکیم میں ریاست جموں کشمیر کا شمالی خطہ بہت ہی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ گلگت اور چترال کے علاقوں سے سنٹرل اشیائی ریاستوں کا زمینی رابطہ تھا۔ برطانوی سامراج کے لیے یہ علاقے حِکمت عملی کے لحاظ سے اور سوویت یونین کے لیے ہندوستان تک آسان رسائی کے لیے اہم راستہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ برطانیہ نے ریاست جموں کشمیر کو اس سکیم کے مطابق تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ برطانیہ کے ہندوستان سے نکل جانے کے بعد امریکی سامراج نے ان خطوں کو سوویت کیمونزم کے خطرات سے بچانے کی کوششوں میں نئے سرے سے سرد جنگ کی حِکمت عملی کا حصہ بنایا تھا امریکہ ہندوستان کی تقسیم کے حق میں نہیں تھا لیکن برطانیہ کو یہاں رہنے کا سو سال سے زیادہ کا تجربہ تھا اس لیے امریکہ نے برطانیہ کو ہندوستان جلد چھوڑنے پر مجبور کیا تھا کیونکہ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ ہندوستان کی برطانوی فوج کو تنخواہیں دیتا تھا برطانیہ کے

پاس اتنے مالی وسائل نہیں تھے۔ برطانیہ ہندوستان کی مذہب کے نام پر تقسیم کر کے ہندو مسلم قوموں کی تشکیل کے نام پر دونوں طرف اقتدار اپنے حمایت یافتہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے حوالے کر گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی قدیم قوموں کی پہچان کو نظر انداز کر کے ان قوموں کے تاریخی وجود سے انکار کیا گیا جبکہ ہندوستانی قوموں کا وجود تاریخی حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے انکار کر کے کوئی مصنوعی قوم تشکیل دینا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ قومیں اپنے تاریخی ارتقاء سے وجود میں آتی ہیں۔

ہندوستان کے بٹوارے سے اس خطے کی قدیم قوموں کو جو نقصان پہنچایا گیا ہے اس کے ازالے کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستان اور پاکستان ایسی فیڈرل ریاستوں کا ڈھانچہ تشکیل دیتے جس میں تمام قوموں کو برابری کا درجہ دیا جاتا اور فیڈریشن کا نظام ان قوموں کی رضا کارانہ مرضی سے قائم ہوتا اور دونوں ملکوں کے درمیان بھی دوستی ہوتی لیکن ایسا نہ ہوا بٹوارے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان شدید نفرت کا ماحول پیدا ہو گیا اور دونوں کے درمیان کئی تنازعات کھڑے ہو گئے ان دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی بجائے دُشمنی کا ماحول پیدا ہو گیا تھا ان تنازعات میں جموں کشمیر کے تنازعہ نے جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی اور یہ تنازعہ آج 75 سال گزرنے کے باوجود دونوں ملکوں کی دوستی کے راستے میں کھڑا ہے۔ اس تنازعہ کو حل کرنے میں دونوں ملک ناکام ہوئے لیکن ریاست کا تنازعہ آج بھی جنوبی ایشیائی خطے کو یرغمال بنائے ہوئے ہے۔ اس خطے میں آج بھی دنیا کی بدترین غربت، جہالت، پسماندگی، غلامی، توہم پرستی ڈھیرے ڈالے ہوئے ہے۔ کروڑوں لوگوں کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہے کروڑوں ہندوستانی اور پاکستانی بچے سکول نہیں جاتے عورتوں سے نابرابری جاری ہے جموں کشمیر کے تنازعے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے حکمران دُشمنی کا ڈھونگ کرتے ہیں اور جعلی نعرے بازی کر کے عوام کا شدید ذہنی اور معاشی استحصال کرتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان نے آپس میں دُشمنی برقرار رکھنے کے لیے جموں کشمیر کا تنازعہ کھڑا کر رکھا ہے اس تنازعہ کی وجہ سے دونوں کئی جنگیں لڑ چکے ہیں ریاست جموں کشمیر کو دونوں نے بٹوارے کے

وقت سے میدان جنگ بنا رکھا ہے اور لاکھوں ریاستی باشندوں کو بھی دونوں ملک موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ اگر ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ حل نہ ہوا تو ان دو ملکوں کے حکمران کسی بھی وقت نیوکلیئر جنگ کر سکتے ہیں ریاست جموں کشمیر دونوں ملکوں کے درمیان نیوکلیئر فلیش پوائنٹ بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے جنوبی ایشیاء کے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو خطرہ ہے۔ ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ برطانیہ نے ہی دونوں ملکوں کے درمیان پیدا کیا تھا اور ان کی دُشمنی کے لیے ہی ڈیزائن کیا گیا تھا لیکن اس میں ہندوستان اور پاکستان کے چند لیڈرز بھی ملوث تھے۔ ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کی نیچر کو سمجھے بغیر اس کا حل نکالنا ممکن نہیں ہے ہندوستان اور پاکستان اس لیے اس کا حل نکالنے میں ناکام ہوئے ہیں وہ اس تنازعہ کا یکطرفہ حل تجویز کرتے ہیں جو کسی دوسرے فریق کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا اس لیے حل نہیں نکل پاتا ہے دونوں ملکوں نے اس کا دوطرفہ حل نکالنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن دونوں اس میں بھی ناکام ہوئے۔ اگر اس کا یکطرفہ اور دوطرفہ حل بھی نہیں نکل سکا تو اس ریاست کا ممکنہ حل کیا ہوسکتا ہے اور اس مسئلے کی اصل نوعیت اور اس کی اصل نیچر کیا ہے؟ آیئے اس ریاست کے کئی ممکنہ حل پر غور کرتے ہیں اور ان میں سے بہتر حل کیا ہوسکتا ہے جو ہندوستان، پاکستان اور ریاست جموں کشمیر کے عوام کو بھی قبول ہو اور اس پر پہلے بھی غور کیا گیا ہے؟ نہیں کیا گیا تو اس سے پہلے کیا کیا حل تجویز ہوئے اور کیوں ناکام ہوئے؟

ا۔ ریاست کے تنازعہ کا سیاسی حل

ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ ایک سیاسی تنازعہ ہے اس لیے اس کا حل بھی سیاسی ہوگا۔ ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ نہ یکطرفہ یا دوطرفہ بلکہ یہ سہہ فریقی (Tri Lateral) تنازعہ ہے۔ یکطرفہ تنازعہ اور اس کے حل سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ ہندوستان کا یہ دعویٰ کہ ریاست جموں کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے کیونکہ ریاست کے مہاراجہ نے ہندوستان سے اس کا الحاق کر دیا تھا یہ ہندوستان کا دعویٰ یکطرفہ ہے اور اس کا حل ہندوستان یکطرفہ تجویز

کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ساری ریاست کو ہندوستان کے حوالے کیا جائے۔ پاکستان کا دعویٰ بھی ہندوستان کی طرح یکطرفہ ہے پاکستان کہتا ہے ریاست میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لیے ریاست دوقومی نظریئے کے تحت اس کا حصہ بنی چاہیے۔ پاکستان کا یہ دعویٰ 1947ء کے بٹوارے کے اصول کے مطابق ہے لیکن یہ دعویٰ بھی یکطرفہ اور پاکستان کا تجویز کیا گیا حل بھی یکطرفہ ہے۔ اب ہندوستان کا یہ دعویٰ تو درست ہے کہ ریاست کے مہاراجہ نے ہندوستان کے ساتھ ریاست کا الحاق ضرور کیا تھا لیکن الحاق اس صورت میں کیا گیا تھا جب پاکستان کی طرف سے ریاست پر قبائلیوں کے ذریعہ حملہ کیا گیا تھا اور فوجی مدد کے بہانے ہندوستان نے الحاق پر دستخط کروائے تھے جبکہ قانون آزادی ہند کی رو سے جو ریاست یا علاقہ متنازعہ ہو جائے گا اس کے حکمران کا کیا گیا الحاق کا معاہدہ حتمی تصور نہیں کیا جائے گا۔ ریاست کے متنازعہ ہونے سے الحاق کا حتمی فیصلہ ریاست کے عوام نے کرنا ہے اور یہی کچھ قانون آزادی ہند میں دونوں پارٹیوں نے قبول کیا تھا اور ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے الحاق کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے بھی تسلیم کرلیا تھا کہ ریاست کا حتمی فیصلہ ریاستی عوام کی رائے سے کیا جائے گا۔ پاکستان کا دعویٰ بھی اس لیے غلط ہو جاتا ہے کہ پاکستان نے خود مہاراجہ کی ریاست کی حکومت سے پہلے معاہدہ قائمہ کر کے ریاست کی وہی پوزیشن تسلیم کی جو برطانوی ہند کے زمانے میں تھی اور پھر اس معاہدہ قائمہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ریاست پر حملہ کر دیا تھا اور ریاست کو متنازعہ بنانے میں پہل کی تھی۔

دوقومی نظریہ کے تحت صرف برطانوی ہند کو تقسیم کیا گیا تھا جبکہ ریاستوں کے حکمرانوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کسی ایک ملک سے الحاق کریں اور الحاق کا اختیار صرف ریاستوں کے حکمرانوں کو دیا گیا تھا اور معاہدہ قائمہ (Stand Still Agreement) کرنے کا اختیار بھی ریاستوں کے حکمرانوں کو دیا گیا تھا لیکن پاکستان نے جلد بازی میں دونوں کی خلاف ورزی کی اور ریاست کے حکمران کے ایک فیصلہ کو مان لیا تھا پھر الحاق کا سوال ختم ہو گیا تھا بلکہ معاہدہ قائمہ تو اس وقت کیا گیا تھا جب ریاست جموں کشمیر کا حکمران مکمل

اقتدار اعلیٰ کا مالک بن چکا تھا۔ برطانوی ہند کی تقسیم کے دوران یہ اصول دونوں سیاسی جماعتوں کے لیڈروں نے تسلیم کیا تھا کہ دوقومی نظریہ ہندوستان کی شاہی ریاستوں پر لاگو نہیں ہوگا۔ اس طرح پاکستان کا دعویٰ دوقومی نظریئے کی بنیاد پر ریاست جموں کشمیر پر یکطرفہ ہو جاتا ہے اور اس کا حل بھی یکطرفہ ہو جاتا ہے اس پر کبھی عمل نہیں ہوسکتا اور نہ ماضی میں ہوا ہے اگر پاکستان کا یہ دعویٰ درست بھی مان لیا جائے تو کیا ہندوستان ریاست جموں کشمیر کے اپنے کنٹرول والے علاقے پاکستان کے حوالے کرنے پر راضی ہو جائے گا؟ ہندوستان اور پاکستان اس ریاست پر کئی جنگیں لڑ چکے ہیں۔

اگر ہندوستان نے ریاست کے علاقے پاکستان کے حوالے کرنے ہوتے تو اتنی جنگیں کبھی نہ لڑتا اور یہی حال پاکستان کا بھی ہے۔ اگر ہندوستان کے اس دعوے کو درست مان لیا جائے تو پاکستان اپنے کنٹرول والے ریاست کے علاقے کبھی ہندوستان کے حوالے نہیں کرے گا تو گویا ریاست جموں کشمیر کا ہندوستانی اور پاکستانی تجویز کیا گیا حل اگر ان دونوں ملکوں کو قبول نہیں تو ریاست جموں کشمیر کی دو کروڑ عوام ہندوستان اور پاکستان کا یکطرفہ حل کیوں قبول کریں؟ اب دوطرفہ حل کیا ہوتا ہے؟ دوطرفہ حل سے مراد ہندوستان اور پاکستان آپس میں مذاکرات کے ذریعہ ریاست کا کوئی ایسا حل نکالیں جو ان دونوں ملکوں کو قبول ہو۔ ایسا حل ساری ریاست کے کسی ایک فریق کو دینے والا حل تو نہیں ہوگا۔ پھر اس کا حل ریاست کی موجودہ تقسیم کو مستقل کرنے پر اتفاق ہوسکتا ہے یا دونوں ملک کسی اور طرح کی دوبارہ نئی تقسیم پر راضی ہو سکتے ہیں۔ کیا دونوں ملک ریاست کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے پر راضی ہو سکتے ہیں؟ اس کے امکانات بھی موجود نہیں ہیں کیونکہ مذہبی تقسیم صرف جموں کی ہوسکتی ہے اور جموں کے صرف دو ڈسٹرکٹ پونچھ اور راجوری ہی پاکستان کو مل سکتے ہیں۔ کشواڑ، ڈوڈہ اور بھدرواہ، رام بن کے علاقوں میں ہندو مسلم آبادی برابر ہے۔ ایسی صورت میں کشمیری بولنے والا سارا خطہ بھی پاکستان کو دینا پڑے گا۔ اگر ہندوستان نے ایسا حل تسلیم کرنا ہوتا تو پچھلے 30 سالوں سے کشمیری خطے میں چلنے والی مسلح تحریک کو اتنی بے دردی سے نہ کچلتا۔ ان باتوں سے

واضع ہوجاتا ہے کہ ہندوستان ریاست کی مذہبی تقسیم پر کبھی راضی نہیں ہوگا اور کشمیری خطہ کبھی پاکستان کے حوالے نہیں کرے گا۔ اب یہ بات واضع ہوچکی ہے کہ ہندوستان اپنے کنٹرول والے علاقے پاکستان کو نہیں دے گا اور نہ ہی ہندوستان ریاست کے پاکستانی کنٹرول والے علاقے پاکستان سے طاقت کے ذریعہ چھین سکتا ہے۔

گویا واضع یہ ہوا کہ ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کا کوئی فوجی حل موجود نہیں ہے۔ ہندوستان فوجی لحاظ سے طاقت ور ہونے کے باوجود پاکستان سے ریاست کے علاقے نہیں لے سکتا کیونکہ ہندوستان ریاست کے یہ مسلم علاقے زبردستی اپنا حصہ نہیں بنانا چاہتا اور نہ ہی اس کی آزاد کشمیر کے علاقوں سے کوئی دلچپسی ہے۔ گلگت بلتستان میں ہندوستان کی دلچسپی ہونے کے باوجود وہ علاقہ بھی نہیں لے سکتا کیونکہ وہاں اب چین نے اپنا اقتصادی راہداری کا منصوبہ شروع کررکھا ہے ہندوستان کے لیے وہاں کامیاب ہونا ممکن نہیں رہا ہے۔ ریاست کی موجودہ تقسیم ہی دونوں ملکوں کے لیے آخری دوطرفہ حل بچتا ہے لیکن یہ حل ریاست جموں کشمیر کی دونوں طرف کی آبادی کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔ ریاست کے تنازعہ کے حل کے لیے کئی تجاویز پہلے بھی پیش کی گئی ہیں۔ ان تجاویز میں ریاست کی آزادی اور خودمختاری بھی شامل ہے اور ریاست کا مشترکہ کنٹرول بھی کئی بار دونوں ملکوں کے درمیان زیر بحث رہا ہے اور شاید اب بھی دونوں طرف کے کئی ذہنوں میں ہو۔ ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کے علاقوں میں بانٹ کر لائن آف کنٹرول کو نرم کر دینے کی تجویز پر کہا جاتا ہے کہ دونوں ملک راضی ہوچکے تھے اور کسی معاہدے پر پہنچ گئے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بات چیت شروع ہونے سے پہلے یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ دونوں ملک ریاست کے ممکنہ حل کو سامنے رکھ کر اس بات چیت کا آغاز کریں۔ ہندوستان اور پاکستان 1947ء سے ہی اس تنازعہ کو حل کرنے کے دعوے کررہے ہیں لیکن آج تک اس مسئلہ کو حل نہیں کرپائے دوسری طرف دونوں ملک جموں کشمیر کے اوپر ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد میں بھی مصروف ہیں۔ پاکستان نے ریاست کو حاصل کرنے کے لیے کئی فوجی کوششیں بھی کی تھیں اور کشمیری

خطے میں مسلح تحریک کی مدد سے بھی ہندوستان کو اپنی مرضی کے حل پر مجبور کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ان میں سے کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور ایسی کوششوں کو مزید دوہرانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ 1947ء سے آج تک ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے ریاست کے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے جتنی بھی کوششیں کیں وہ یا تو یکطرفہ حل مسلط کرنے والی تھیں یا دوطرفہ حل نکالنے کی سعی کی گئی تھی اس لیے کوئی بھی حل کامیاب نہیں ہوسکا اور دونوں ملک 1947ء سے ہی اس تنازعہ میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ یہ مسئلہ حل نہ ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے حکمران طبقات یا تو نااہل ہیں یا اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بیرونی طاقتوں کے آلہ کار کا کردار ادا کررہے ہیں کیونکہ ریاست کا تنازعہ سرد جنگ کی ضرورتوں کی وجہ سے انگریز سامراج نے پیدا کیا تھا۔ اب ہم تجویز کیے گئے جتنے بھی حل ہیں ان کا جائزہ پیش کرتے ہیں اور موجودہ حالات میں کیا ان پرانے تجویز کیے گئے حل میں سے اب بھی کوئی قابل عمل ہے۔ ان میں تین حل تو ایسے ہیں جن پر عمل درآمد ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

۱۔ آزاد اور خودمختار ریاست کا حل

۲۔ ریاست کی مختلف طریقوں سے تقسیم کا حل

۳۔ زیادہ سے زیادہ خودمختاری کا حل

اس میں موجودہ تقسیم کی حالت میں دونوں طرف زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری دے کر موجود لائن آف کنٹرول کو دونوں ملکوں کے درمیان بارڈر تسلیم کرلیا جائے۔ ان تجاویز پر دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والے ماضی میں مذاکرات ناکام ہوتے رہے ہیں اور ریاست کا کوئی پائیدار حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ ان تجاویز میں ایسا کوئی مناسب حل پیش نہیں کیا گیا تھا جو اس تنازعہ میں ملوث تمام فریقوں کے لیے قابل قبول یا موجودہ صورتحال میں قابل عمل ہوتا۔ ان مذاکرات کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان میں اقتدار کے طاقتور سنٹرز میں فوج کا کردار اہم ہے اور فوج نے خود ایسا حل نکالنے میں

رکاوٹ ڈالی تھی جو سنجیدہ نوعیت کا ہو اور دوسری طرف ہندو قوم پرستوں کا سیاسی کردار ریاست کے کسی سنجیدہ حل میں رکاوٹ بن گیا تھا۔ ان کئی تجاویز میں سے اس تنازعہ کو ختم کرنے کے لیے صرف کشمیری بولنے والے علاقوں کی مکمل آزادی کی بات بھی کی گئی تھی اور ساری ریاست جموں کشمیر کی وحدت بحال کر کے اس کو مکمل آزاد ملک تسلیم کرنے کی تجویز بھی زیر بحث لائی گئی تھی لیکن اس نئی تجویز کو دونوں ملکوں نے مسترد کر دیا تھا۔

ریاست کو مکمل آزادی دینے کی تجویز کشمیریوں کی طرف سے بھی آئی تھی اور آزاد کشمیر میں ایسے سیاسی گروپوں کی طرف سے بھی اس کا مطالبہ کیا گیا ہے اور یہ مطالبہ اب بھی موجود ہے۔ دراصل اس طرح کا ایک سروے 2010ء میں ریاست کے مختلف خطوں میں براڈنک (Bradnok) نے کروایا تھا۔ اس سروے میں آزاد کشمیر میں 44% بھارت کے زیر انتظام جموں کشمیر میں 43% لوگوں نے کہا تھا کہ استصواب رائے ہونے کی صورت میں وہ مکمل آزادی کے حق میں ووٹ دیں گے۔ لیکن ہندوستان کے زیر انتظام کشمیر میں 74% سے 95% تک لوگوں نے مکمل آزادی کے حق میں ووٹ دینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جبکہ جموں کے خطے میں 1% سے بھی کم لوگوں نے ریاست کی مکمل آزادی کے حق میں ووٹ دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اسی طرح لدّاخ میں لیہ ڈسٹرکٹ میں 30% اور کارگل ڈسٹرکٹ میں 20% ریاست کی مکمل آزادی کے حق میں پائے گئے تھے۔ کشمیری بولنے والے خطے میں مکمل آزادی کے حق میں اس شدید رویے کا اظہار ظاہر کرتا ہے کہ اس خطے کے عام آدمی کی سوچ میں کافی تبدیلی آئی ہے لیکن ریاست کے کشمیری بولنے والے خطے سے باہر آزادی کے لیے اتفاق رائے کا ہونا بہت ہی مشکل ہے کئی لوگوں کا ماننا ہے کہ ریاست، قوم اور علاقہ کے تعلق کے حوالہ سے قومی سطح کی بحث ہونی چاہیے جو کشمیر کو مسلم اکثریت اور ہندوستان کو ہندو اکثریت لیکن سیکولر ریاست سے ہٹ کر زیر بحث لائے جس میں آزاد اور خود مختار ریاست بھی شامل ہو۔ اگر اس طرح کی بڑی تبدیلی ہندوستان کی قومی سوچ میں رونما ہو بھی جائے تو ریاست کی مکمل آزادی اور خود مختاری کو حاصل کرنے کے لیے استصواب رائے کروانا

ہندوستان کے لیے ناممکن ہوگا اور پاکستان کے لیے بھی یہ ماضی کا ایک خواب ہوگا۔

ہندوستانی حکومتیں ریاست کے مستقبل کے لیے استصواب رائے کو غیر متعلقہ تصور کرتیں ہیں اور گزرے وقتوں کا قصہ سمجھتیں ہیں لیکن ہندوستانی حکومتوں کو ڈر بھی ہے کہ اگر استصواب رائے کروایا گیا تو ووٹرز بھارت کو سزا دینے کے لیے مکمل آزادی کے حق میں رائے دے سکتے ہیں جبکہ پاکستان میں جنرل مشرف نے اپنے دور حکومت میں کہا تھا کہ استصواب رائے کروانا آج عملاً ممکن نہیں رہا اور اسے ناممکن قرار دے کر جنرل مشرف نے کئی دیگر حل پیش کیے تھے۔ ریاست کی مکمل آزادی اور خودمختاری کی تجویز تنازعہ کے حل کے لیے دونوں ملک مناسب نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ یہ تجویز بھارت اور پاکستان کی مرضی کا حل پیش نہیں کرتی ہے اور ریاستی آبادی کے ایک بڑے حصے کے لیے بھی یہ حل قابل قبول نہیں ہے۔

2۔ ریاست جموں کشمیر کی تقسیم

بھارت اور پاکستان کے درمیان ہونے والے امن مذاکرات کے دوران زیادہ زیر بحث رہنے والی تجاویز میں سے ایک تجویز ریاست جموں کشمیر کی دونوں ملکوں کی مرضی سے تقسیم بھی شامل رہی ہے۔ جس میں چند تبدیلیوں سے ریاست کا نئے سرے سے بٹوارہ کر دیا جائے جو دونوں ملکوں کے لیے قابل قبول ہو اور اس ریاست کے بٹوارے کے پیچھے یہ خیال موجود تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحد سرکاری طور پر تسلیم کر لی جائے گی اور دونوں اس پر راضی ہو جائیں گے چاہے موجودہ لائن آف کنٹرول ہو یا ایڈجسٹمنٹ ہو دونوں کی بارگینگ کر کے بارڈر بنایا گیا ہو جس میں دونوں طرف کے ریاستی علاقوں پر بھارت اور پاکستان کا آزادانہ اقتدار اعلیٰ قائم ہوگا تقسیم کے بعد جو ریاست کے حصے ان دونوں ملکوں کی قانونی حدود میں آئیں گے۔ بین الاقوامی بارڈر جو سرکاری سطح پر دونوں ملکوں کے درمیان طے ہوگا اسے نرم بارڈر میں تبدیل کر دیا جائے گا اور اس سارے خطے کو غیر فوجی علاقے میں بدل دیا جائے گا تا کہ اس طرح مسلح گروپوں کی سرگرمیوں میں کمی لانے کی امید پیدا ہو اور

امن قائم ہو سکے۔ انسانوں اور معاشی سرگرمیوں کا تبادلہ ہو سکے اور حالات نارمل ہو جائیں جو کشمیری عوام کی زندگیوں میں بہتری لاسکیں۔ ان تجاویز پر ایک سروے کروایا گیا تھا جس میں 85% لوگوں نے لائن آف کنٹرول کو مستقل بارڈر تسلیم کرنے کی حمایت کی تھی اور 74% لوگوں نے کہا کہ اگر پاکستان اپنی تمام فوجوں کو ریاست سے نکال دے تو تنازعہ حل ہونے کے چانسز زیادہ ہیں اور 69% نے کہا کہ اگر ہندوستان اپنی ساری فوجیں نکال دے تو صورتحال میں بہتری آسکتی ہے اور کشمیری بولنے والی آبادی میں ان تجاویز کے حق میں بہت زیادہ حمایت پائی گئی تھی۔ جو تبدیلیاں لائن آف کنٹرول سے بارڈر کو دورایڈ جسٹ کرنے کے لیے کی جائیں گی ان کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مسلم اکثریت والی وادی کشمیر کو پاکستان کے حوالے کر دیا جائے تو انہیں بارڈر میں تبدیلی اس حد تک بھی قبول ہوگی کیونکہ بارڈر ایڈجسٹمنٹ اگر پاکستان کے حق میں کر دی جائے تو اس طرح کشمیر میں پاکستان کی طرف سے مسلح جدوجہد کی مدد بھی ختم ہو جائے گی اور کشمیر کے بٹوارے کا پاکستانی مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا چونکہ پاکستان کا شروع سے ہی خطہ کشمیر پر فوکس رہا ہے۔

ا۔ کشمیر میں بارڈر کو نئے سرے سے بنانے میں کئی رکاوٹیں بھی موجود ہیں جن کی وجہ سے ریاست کے بٹوارے کی تجاویز کو سنجیدہ نہیں لیا گیا تاہم کچھ حقائق جو کشمیر میں موجودہ صورتحال کے ساتھ جڑے ہوئے تھے وہ ابھی تک موجود ہیں جب سے پہلی بار بات چیت میں ریاست کی تقسیم کی تجویز سامنے لائے گئی تھی۔ اس بارے میں جو پہلی پیچیدگی سامنے آئی تھی وہ یہ تھی کہ بھارت اور کشمیری خطے سے ریاست کے بٹوارے کی حمایت میں جو تجویز سامنے آئی تھی وہ لائن آف کنٹرول کو ہی بین الاقوامی سرحد بنانے کے حق میں تھی اور اس پر دوبارہ مذاکرات کے حق میں کوئی بھی نہیں تھا لیکن یہ براہِ راست پاکستان میں جو بنیادی اتفاق رائے پایا گیا تھا اس کے بالکل متضاد تھا وہ یہ تھا کہ لائن آف کنٹرول پر دوبارہ مذاکرات کیے جائیں تاکہ مسلم اکثریت والے ریاست کے کچھ علاقوں کو آزاد کشمیر میں شامل کیا جائے۔ اسی

طرح جب اس بارے میں سروے کروایا گیا کہ کیا وہ ریفرنڈم میں پاکستان میں شامل ہونے کے لیے ووٹ دیں گے تو صرف 15% نے پورے خطے سے کہا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونے کے لیے ووٹ دیں گے اور 50% آزاد کشمیر کے لوگوں نے کہا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونے کے لیے ووٹ دیں گے جبکہ جموں کے علاقے میں صرف 2% لوگوں نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ پاکستان کے اپنے زیر کنٹرول آزاد کشمیر میں آدھی آبادی نے پاکستان کا حصہ بننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

ہندوستان اور پاکستان کے زیر انتظام ریاست کے علاقوں کی رائے میں بہت بڑا فرق یہ ظاہر کرتا ہے کہ کشمیر وادی کے مسلمان کافی حد تک متعدل مزاج اور اپنے عقائد سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کے مذہبی نظام میں کسی حد تک ہندو مذہب کے چند پہلو بھی جڑے ہوئے ہیں کیونکہ وہ صوفی مت کے قائل ہیں جو امن پسند نظریات اور خیالات کے پیروکار ہیں جو پاکستان کے جنگجویانہ مسلم رویے کے بالکل الٹ بنیاد پرستی کے خلاف رویہ ہے ۔اس غیر مساویانہ رویہ سے پتہ چلتا ہے کہ لائن آف کنٹرول کے دونوں طرف مسلم کے درمیان کتنا بڑا فرق پیدا ہو چکا ہے۔ دوسری رکاوٹ جو ریاست کے بٹوارے کی تجویز میں موجود ہے اس کی جڑیں سیاسی حقیقت میں پوشیدہ ہیں جن میں دونوں طرف کے لیے علاقائی خودمختاری، لائن آف کنٹرول کے دونوں طرف سے فوجوں کا انخلاء اور نرم بارڈر کا بنایا جانا اس خطے میں امن کے لیے پہلی ضرورت بن چکا ہے اور اب یہ کوئی تجویز کا سادہ پہلو نہیں رہا جو کوئی سمجھوتہ ہونے سے حاصل ہو جائے۔اس بات پر اصرار کرنا کہ ان عناصر کو صرف کسی حل پر راضی ہونے کے بعد لاگو کیا جائے اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ریاست کے بٹوارے کی تجاویز ایک حقیقت پسندانہ حل مہیا کرنے میں ناکام ہوئیں ہیں۔ جو حل اس تنازعہ کا ان تجاویز میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ دو عناصر مل کر ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کو بٹوارے کی تجاویز کے لیے غیر مناسب بناتے ہیں چاہے کشمیر کے اندر اس کے لیے کتنی ہی

حمایت کیوں نہ حاصل کر لی گئی ہو اور ہندوستان پاکستان کی ممکنہ حمایت بھی چاہیے جتنی حاصل کی گئی ہو۔

3۔ریاست جموں کشمیر کے تمام خطوں کے لیے خودمختاری

آخری جو تجویز دی گئی جس نے تمام کرداروں میں قبولیت حاصل کی تھی جو اس تنازعہ میں ملوث تھے اور جسے لاگو کرنے کے لیے کامیابی کے بہترین مواقع تھے وہ تجویز ساری ریاست کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری کی تھی اور خودمختاری کی تجویز ہندوستان اور پاکستان دونوں کے زیرانتظام ریاست کے علاقوں کو دینے کی تھی۔تقسیم ریاست کی پچھلی تجویز کی طرح اس تجویز میں بھی کئی طرح کی تبدیلیاں موجود تھیں لیکن ہر تبدیلی عام منصوبے کے مطابق تھی جس میں ساری ریاست جموں کشمیر کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے جتنی ہندوستان اور پاکستان کے لیے ممکن ہوئی اتنی خودمختاری وہ اپنے اپنے زیر کنٹرول علاقوں کو دیں گے اور سلف رول یا اندرونی خودمختاری اس خطے کو غیر فوجی علاقہ بنانے کے ساتھ دی جائے گی اس کے ساتھ ہی بارڈر کو کھولنے اور نرم بنانے کے لیے دونوں اطراف اسی طرح عمل کیا جائے گا جس طرح پہلے والی ریاست کے بٹوارے کی تجویز میں کہا گیا تھا۔اندرونی خودمختاری کے لیے بنیادی گراؤنڈ تو آرٹیکل 370 میں جو ہندوستانی آئین میں مہیا کیا گیا تھا جس میں ہندوستان کے زیرانتظام ریاست جموں کشمیر کے خطے کو اندرونی خودمختاری دی گئی تھی۔لیکن جو اندرونی خودمختاری خصوصی طور پر آئین میں دی گئی تھی مکمل طور پر ختم کر دی گئی اور نظرانداز کی گئی تھی جس کی وجہ جموں کشمیر میں کئی جنگیں اور اندرونی بغاوتیں ہوئیں تھی۔ان تبدیلیوں کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے جو تجویز دی گئی تھی وہ تجویز کی گئی تبدیلیوں سے اصولی طور پر مختلف تھی کہ کس طرح کی اندرونی خودمختاری ہونی چاہیے اور کس قسم کی ہونی چاہیے اور کس طریقہ کار کے تحت اس کا بندوبست کیا جائے گا جیسا کہ کیا دونوں طرف کے خطوں کو الگ الگ خودمختاری دی جائے گی یا دونوں کو اکٹھا کر کے خودمختاری دی جائے گی؟ یا کیا ان ریاستی خطوں کو الگ الگ خودمختار انتظامی صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا یا ایک متحدہ ریاستی خطہ بنایا جائے گا۔

i۔کس طرح کی خودمختاری دی جائے گی

ان تجاویز میں خودمختاری کے لیے دو بنیادی ماڈلز پیش کیے گئے تھے۔ان میں جو اہم ماڈل پیش کیا گیا تھا وہ الگ الگ خطوں کی خودمختاری کے لیے کشمیر سٹڈی (K-Study) گروپ نے تجویز کیا تھا جس میں یہ سفارشات پیش کی گئی تھیں کہ پوری ریاست جموں کشمیر کو 5 الگ الگ خودمختار صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے جس میں کشمیر، جموں، لدّاخ، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے خودمختار صوبے بنائے جائیں اور انہیں دونوں ملکوں کے زیر کنٹرول خود مختاری دی جائے۔

گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کے خطوں کو پاکستان نے 1947ء سے ہی الگ کر رکھا ہے جبکہ دونوں علاقے ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں۔ان پانچوں صوبوں کو ایک دوسرے تک آزادانہ میل جول کی رسائی دی جائے گی اور ہندوستان اور پاکستان تک بھی آزادانہ رسائی دی جائے گی۔ یہ سارے ریاستی خطے اپنے اپنے جمہوری آئین قائم رکھیں گے اور اپنی اپنی قانون ساز اسمبلیاں بھی قائم کریں گے جو دفاع اور امور خارجہ کے سوا باقی تمام لوکل معاملات سے متعلق ایشوز کو مقامی سطح پر حل کریں گے۔ دفاع اور خارجہ امور کی مشترکہ ذمہ داری ہندوستان اور پاکستان کی ہوگی جو دفاع اور مالی امور کا بندوبست بھی کریں گے اور اس کو بعد میں کسی تاریخ میں طے کیا جائے گا۔ان چیزوں کا بندوبست اور کام کو ایک اعلیٰ سطح کا حکومتی ڈھانچہ جو پانچوں خطوں کے نمائندوں اور ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا جو آپس میں مل کر کام کریں گے اور ہر علاقے کے مسائل کو حل کریں گے اور اپنی خدمات اس پوری ریاست کو غیرفوجی علاقہ بنانے میں پیش کریں گے۔ کشمیر سٹڈی گروپ (K-Study) امریکہ میں رہنے والے کشمیریوں کا ایک گروپ ہے جس نے یہ تجاویز مشرف کے دور میں بھی دی تھیں اور مشرف نے اپنے دور حکومت میں اپنے چار نکاتی فارمولے کے تحت خودمختاری کی تجویز بھی دی تھی اور اس فارمولے کے مطابق ہر خطے کی شناخت کی گئی تھی جو اپنے مستقبل کی حیثیت کے تعین کے لیے کسی حل کی تلاش میں تھا جس میں کشمیر کے خطے کے

لیے سلف رُول (Self Rule) یا اندرونی خودمختاری کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ مشترکہ انتظام کا طریقہ کار اور علاقائی خودمختار حکومت کا تصور بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس مشترکہ انتظام خودمختاری کے لیے ایک ماڈل اور سفارشات سجاد غنی لون کی طرف سے بھی پیش کی گئی تھیں۔ جس میں اس نے متحدہ جموں کشمیر جس کے درمیان کوئی لائن آف کنٹرول اور کوئی بارڈر نہ ہو بلکہ ساری ریاست ایک معاشی یونٹ ہو اور جس میں ہندوستان اور پاکستان ریاست کا دفاع اور خارجہ امور کو مشترکہ کنٹرول کریں۔ موجودہ بارڈر اور لائن آف کنٹرول غیر متعلقہ ہو جائیں گے کیونکہ آزاد کشمیر اور جموں کشمیر کی ایک یونین بن جائے گی لیکن وہ برائے نام اپنا وجود برقرار رکھیں گے۔

ایک اور ماڈل بھی پیش کیا گیا تھا جس میں کشمیری صوبے کی الگ خودمختاری کی تجویز پیش کی گئی تھی اس میں کشمیری صوبے کی ایک انتظامی نظام کی تجویز دی گئی تھی اور اس کی تجویز کشمیریوں کی طرف سے آئی تھی جس کا دفاع اور امور خارجہ کی ذمہ داری ہندوستان اور پاکستان کی ذمہ داری ہوگی۔ جہاں دونوں ملک ایک دوسرے سے تعاون کریں گے اور اپنی ذمہ داریوں کو ریاستی حکومت کے ساتھ دوشعبوں کو کنٹرول کریں گے اور شیئر کریں گے۔ اس حل میں صرف یہ چیز مختلف ہے کہ صوبوں کے درمیان کوئی بارڈر نہیں ہوگا جو رکاوٹ آج آزاد کشمیر اور جموں کشمیر کے درمیان آنے جانے میں موجود ہے اس کو نرم کر دیا جائے گا۔ اس کا مقصد صرف انتظامی معاملات چلانے کی حد تک رہ جائے گا۔ الگ الگ خطوں کی خودمختاری کی تجویز کو مشترکہ اندرونی خودمختاری کے مقابلے میں بہت زیادہ حمایت حاصل ہوئی تھی لیکن دونوں تجاویز کو سامنے لایا گیا تھا اور دونوں ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کا بہترین حل پیش کرتی ہیں اور ہندوستان، پاکستان دونوں ملک انہیں قبول کر سکتے ہیں جس طرح ریاست کی تقسیم کی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ یہ اندرونی خودمختاری کی تجاویز بھی کئی حوالوں سے ناکام ہو گئی تھیں کیونکہ ان میں کئی فیکٹرز ایسے ہیں جو انہیں کامیابی سے لاگو ہونے سے روکتی تھیں۔ اس میں سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ جس نے تقسیم کی تجویز کو روکا ہے وہ اس خطے کو غیر فوجی علاقہ

بنانا تھا جس پر ہندوستان اور پاکستان دونوں نے عمل کرنا تھا۔ یہ وہ شرط ہے جو ریاست جموں کشمیر کی اندرونی خودمختاری پر بات چیت اور لاگو ہونے سے پہلے اس پر عمل درآمد ضروری ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے ایسے اقدامات نہیں کیے جس سے دونوں کے زیرِ انتظام کشمیر کے حصوں کو غیر فوجی علاقے بنانے میں مدد ملتی۔ ہندوستان کے زیر انتظام جموں کشمیر میں فوج اور سکیورٹی فورسز 1989ء سے اسی حالت میں پورے خطے میں موجود ہیں۔ ان سکیورٹی فورسز کو ریاست میں اس وقت لایا گیا تھا جب کشمیری خطے میں مسلح جدوجہد شروع ہوئی تھی حالانکہ ہندوستان کے خلاف جموں کشمیر میں 2003ء سے مسلح کارروائیوں میں بہت کمی آئی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہندوستان کے زیر انتظام جموں کشمیر میں اتنے بڑے پیمانے پر سکیورٹی فورسز اور فوجوں کی موجودگی نے ہندوستان سے ریاست کو اندرونی خودمختاری حاصل کرنے سے روکا کیونکہ جب بھی کشمیری عوام نے احتجاجوں اور عوامی تحریک کے زریعے سیاسی پراسس کا حصہ بننے کی کوشش کی اور ہندوستان نے جو اندرونی خودمختاری ریاست کو دے رکھی تھی، اس سے زیادہ خودمختاری مانگی تو ہندوستانی فوج اور سکیورٹی فورسز نےکشمیری عوام کے خلاف شدید جبر وتشدد کا استعمال کیا تھا۔ پاکستان نے لائن آف کنٹرول کے اپنی طرف فوجی حیثیت بدلنے سے انکار کر دیا تھا اور دنیا میں ان طاقتوں سے مل کر شیطانی دائرے بنانے کی کوشش کی تھی جو تنازعات حل نہیں ہونے دیتی اور پاکستان اس گیم کا حصہ بن گیا تھا کہ جس میں ایک فریق اپنی فوجوں کو اس وقت تک نہیں ہٹائے گا جب تک دوسرا فریق نہیں ہٹائے گا۔ یہی اہم حقیقت ریاست کی اندرونی خودمختاری کی تجاویز کو ممکنہ حل سے روکتی ہے۔ اس حل کی ناکامی کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مذاکرات کا خاتمہ اور پاکستانی فوج کی طاقت اور ریاست کے معاملات میں فوج کا موجود کردار اہم عناصر مانے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے کہ یہ تجاویز ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کا منفرد اور مناسب حل مہیا کرتی ہیں اور اس وقت ان تجاویز کے راستہ میں رکاوٹوں اور اس حل کو حقیقی

معنوں میں لاگو کرنے کا حل بھی بتایا گیا ہے۔ ان میں ہر ایک تجویز کا حدود سے باہر کے حل میں تاہم کئی مسائل ہیں جو اس طرح دونوں ملکوں کے ربط اور جُڑے ہوئے حل میں رکاوٹ ہیں جس پر ہندوستان اور پاکستان دونوں راضی بھی ہوں۔ اس تجویز کے باوجود یہ مذاکراتی عمل ناکامی سے دوچار ہوا۔ سارے جموں کشمیر کے ایشو پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والے مذاکراتی عمل کا خاتمہ پہلا مسئلہ تھا۔ یہ مذاکرات 2008ء کے ممبئی میں دہشت گردوں کے حملوں کے بعد ختم کیے گئے تھے۔ ان حملوں کا الزام ہندوستان نے پاکستان کے خفیہ اداروں اور لشکر طیبہ پر لگایا تھا ہندوستان نے پاکستان کے خفیہ اداروں کی دہشت گردوں کی مدد کرنے اور تربیت دینے کا الزام بھی لگایا تھا۔ ان حملوں کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات بہت زیادہ خراب ہو گئے تھے اور دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کی صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوستان نے ایسے اقدامات کیے تھے تاکہ وہ آئندہ ایسے حملوں کا شکار کبھی نہ ہو سکے پاکستان نے بھی اپنی فوجیں ہندوستان سے لگنے والے بارڈر کی طرف تعینات کر دی تھیں کیونکہ پاکستان کو خوف تھا کہ ہندوستان ممبئی حملے کا بدلہ لینے کے لیے پاکستان پر حملہ کر سکتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تعلقات نارمل ہوئے لیکن وہ اتنے نارمل کبھی نہ ہو سکے جیسا کہ ممبئی حملوں سے پہلے تھے کیونکہ ہندوستان نے پاکستان کو لگاتار یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ دہشت گردوں کو اور حملوں میں ملوث خفیہ اہلکاروں کو سزا دے لیکن اس وقت کی گیلانی، زرداری حکومت ایسا کرنے پر رضامند نہ ہوئی تھی یا وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھی۔

ہندوستان نے پاکستان سے مذاکرات اس وقت تک شروع نہ کرنے کا اعلان کر دیا تھا جب تک پاکستان ممبئی حملوں میں ملوث افراد کو سزا نہ دے گا۔ بھارت نے کہا کہ ایسے ماحول میں پاکستان سے مذاکرات کرنا ممکن ہی نہیں جس میں تشدد کی دھمکی موجود ہو اور تشدد امن مذاکرات کی نفی کرتا ہے۔ اور پاکستان کے ساتھ مذاکرات اس وقت تک نہیں ہوں گے جب تک پاکستان اپنی سرزمین سے دہشت گردوں کے کیمپوں کے ڈھانچے ختم نہیں کرتا جس کا پاکستان نے وعدہ کر رکھا تھا۔

پاکستان نے ایسا کرنے کے لیے اور ایسے عمل کو لاگو کرنے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ دوسرا ایشو جو ہندوستان اور پاکستان کو کسی بھی تجویز پر راضی ہونے سے روکتا ہے وہ پاکستانی سیاست کی اندرونی حقیقت ہے اور وہ فوج کی طاقت اور سیاسی کردار ہے۔ 1958ء سے پاکستانی فوج براہِ راست سیاسی معاملات میں مداخلت کرتی آئی ہے چاہے وہ بلاواسطہ ہو یا بلواسطہ ہو اور سیاسی اور معاشی معاملات پر اپنا مضبوط اثر ورسوخ بنائے رکھا ہے اور اس کی سماجی مفادات میں بھی دلچسپی موجود رہی ہے۔ یہ اثر ورسوخ بہت مضبوط ہے جس طرح عائشہ صدیقہ نے پاکستان میں فوج کے اثاثوں کو پاکستان کی جی ڈی پی کا 10% فیصد بتایا ہے جو ایک کمرشل ایمپائر بناتے ہیں جس میں فوج کو کروڑوں کی آمدنی ہوتی ہے اور فوج کے یہ کاروبار زراعت کے شعبے، مینوفیکچرنگ اور سروس سیکٹر کے معیشت کے حصوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان معاشی اثاثوں کی وجہ سے فوج کو سیاسی طاقت پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنا پڑتا ہے انہی اثاثوں کی دیکھ بھال کے لیے اور اپنی معاشی ایمپائر کو قائم رکھنے کے لیے فوج کے اعلیٰ عہدیداروں کو بار بار کشمیر کاز سے اپنی دلچسپی اور لگاؤ کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ حل ہونے کی بجائے قائم رہنے سے پاکستان اور ہندوستان کو اپنے اپنے اندرونی معاملات میں زیادہ فوائد نظر آتے ہیں۔

دونوں ملکوں نے ریاست کے تنازعہ کو اندرونی سیاست کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے اور دونوں ملکوں کی عوام کے درمیان نفرت پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ پاکستان میں فوج کا کشمیر پالیسی پر مکمل کنٹرول ہے۔ اس کا اظہار پاکستان کے لیفٹیننٹ جنرل شجاع پاشا نے 2009ء میں ہندوستان کے ڈیفنس ایڈوائزر سے ملاقات کے دوران کیا تھا جس میں شجاع پاشا نے کہا تھا کہ آئی ایس آئی اور فوج وزارت خارجہ سے مل کر پاکستان کی ہندوستان پالیسی بناتی ہیں اور اس نے ہندوستان سے کہا تھا کہ وہ تینوں اداروں سے براہِ راست ڈیل کریں کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والے مذاکرات کو یہی کنٹرول کرتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستانی فوج ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں کشمیر کے

مسئلہ پر جنگی فضا بنائے رکھنا چاہتی ہے تاکہ امن کی صورت میں فوج کا سیاسی اور معاشی معاملات پر کنٹرول کمزور نہ ہو جائے یہی وجہ ہے مشرف کے دور میں فوج کی پاپولیرٹی میں جو کمی آئی تھی وہ ممبئی حملوں کی وجہ سے واپس بحال ہوگئی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ پر ہونے والے تمام مذاکرات ناکام ہوئے ہیں اور اس تنازعہ کا کوئی مناسب اور بامعنی حل نکالنے میں بھی ناکام ہوئے ہیں۔

صرف کشمیری بولنے والے خطے کی آزادی کی تجویز کشمیر کے کچھ علاقوں میں بہت پاپولر ہے لیکن یہ تجویز بھی پورے خطے میں اکثریت کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام ہوئی اور اس تجویز میں ہندوستان اور پاکستان کے لیے کوئی دلچسپی موجود نہیں ہے۔ ریاست جموں کشمیر کے بٹوارے کی یہ تجویز کہ اسے دونوں ملکوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے شاید کسی حد تک پاکستان کی حمایت حاصل کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ بارڈر پاکستان کی مرضی سے دوبارہ تشکیل دیا جائے۔ یہ تجویز بھی موجودہ صورتِ حال میں غیر حقیقت پسندانہ ہے کیونکہ اس شرط میں اندرونی خودمختاری، بارڈر کا نرم ہونا اور اسے غیر فوجی علاقہ بنانا ان چیزوں کو لاگو کرنے کے بعد ہونا چاہیئے۔ اندرونی خودمختاری مشترکہ یا الگ الگ ہو یہ بھی حقیقت سے بہت دور ہے۔ یہ تجویز باقی تجاویز کی نسبت زیادہ سمجھوتے کے زیادہ قریب لگتی ہے لیکن یہ بھی ہندوستان کے لیے کوئی دلچسپی پیدا نہیں کر پائی کہ ہندوستان اپنے زیرانتظام جموں کشمیر کو اندرونی خودمختاری دے اور نہ ہی پاکستان اپنی فوجوں کو لائن آف کنٹرول سے دور لے جانے پر راضی ہوا۔ اگر یہ تجاویز اپنے ہی سمجھوتے کی وجہ سے ناکام نہ بھی ہوتیں تو پھر بھی ناکام ہو جاتیں کیونکہ ہندوستان، پاکستان کے درمیان اور پاکستان کے اندر کی حقیقی صورتحال کو دیکھ کر ان کی ناکامی یقینی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اس مسئلہ پر جو مذاکرات ہو رہے تھے وہ ممبئی حملے کی وجہ سے ختم ہو گئے تھے اور دونوں ملک جنگ کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ ہندوستان کا مطالبہ تھا کہ اس حملے میں ملوث خفیہ اہلکاروں اور دہشت گردوں کو سزائیں دی جائیں لیکن پاکستان اس کے لیے نہ راضی تھا اور نہ کرنے کی سکت رکھتا تھا۔ پاکستان کے

اندر آئی ایس آئی اور فوج ریاست کے مسئلہ پر مذاکرات کو ختم ہوتا دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ پاکستان میں فوج کو سیاسی اور معاشی لحاظ سے طاقتور پوزیشن میں رکھنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ اس قدر زیادہ پیچیدہ معاملہ ہو چکا ہے کہ ایک سادہ سی تجویز اس مسئلہ کے حل کے لیے کافی نہیں ہے۔ پاکستان میں بہت بڑی سیاسی تبدیلی کے بغیر اور ہندوستان کو اب کسی مذاکرات کے لیے سنجیدہ طریقے سے تیار کرنا اب ناممکن لگ رہا ہے۔ ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کا حل اس طرح شاید کبھی بھی نہ نکل پائے۔

اس وقت یہ امید کی جا سکتی ہے کہ لائن آف کنٹرول کے دونوں اطراف صورتحال بہتر ہو رہی ہے جو دونوں اطراف کے ریاستی عوام کے لیے خوش آئند ضرور ہے کیونکہ ریاست جموں کشمیر کے لوگ دونوں کے درمیان پھنس کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ کی وجہ سے بھیانک نتائج ریاستی عوام 1947ء سے بھگت رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ 75 سالوں کے بعد بھی کیا ہندوستان اور پاکستان کے حکمران طبقات ریاست کے تنازعہ کو موجودہ حقیقتوں کی روشنی میں حل کرنے کا سوچ رہے ہیں؟ کیا دونوں ملک مہذب پڑوسیوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں؟ کیا دونوں ریاست جموں کشمیر کے عوام کو اس تنازعہ اور ریاست کی غیر فطری تقسیم کے عذاب سے نکال سکتے ہیں؟ اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں ملک یکطرفہ طور پر تنازعہ کو حل کرنے کی سوچ سے باہر نکلیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دونوں ملکوں کو دوطرفہ حل سے بھی باہر آنا ہوگا۔ جب ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کی بنیادی نیچر کو دیکھا جائے تو پچھلے 75 سالوں میں دونوں ملکوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی جو سمجھ بنائی ہے وہ غلط سمجھ ہے۔ اس مسئلہ میں ہندوستان اور پاکستان ہی فریق نہیں ہیں بلکہ ریاستی عوام اپنی ریاست کے بنیادی فریق ہیں۔ یہ مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حل ہو گیا تو ریاستی عوام اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ ریاست کا تنازعہ صرف اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان اس تنازعہ کی نیچر کو سمجھ کر اسے سہ فریقی تنازعہ تسلیم کریں۔ جب تک دونوں ملک ریاست کے تنازعہ کو آپس کی انا پرستی، مذہبی، علاقائی اور بٹوارے کی نظر سے

دیکھتے رہیں گے تو اس کا کوئی حل نہیں نکلے گا۔

ریاست جموں کشمیر کے لوگوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ہندوستان نواز اور پاکستان نواز سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کی ناسمجھی والی پرانی سوچ سے باہر نکلیں۔ 75 سال کسی انسانی گروہ کے لیے بہت زیادہ وقت ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی پیچیدہ مسئلہ کا حل بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کے سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں نے ہندوستان اور پاکستان کا یکطرفہ موقف اختیار کر رکھا ہے یا دونوں ملکوں کی دوطرفہ پالیسی اپنا رکھی ہے جس میں ریاست کی تقسیم کا فارمولا بھی شامل رہا ہے۔ اس خرابی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ریاست جموں کشمیر کے عوام کی دونوں طرف کے چند پاکستان نواز اور ہندوستان نواز لیڈروں نے ہی نمائندگی کی اور یہ تاثر پیدا کر رکھا ہے کہ ریاستی عوام کا ایک حصہ ہندوستان کا حامی ہے اور دوسرا حصہ پاکستان کا حمایتی ہے جبکہ ہندوستان اور پاکستان کی نمائندگی کرنے کا حق صرف ہندوستانی اور پاکستانی نمائندوں کو ہی ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ریاست جموں کشمیر کا سیاستدان ریاست کی طرف سے صرف پاکستان اور ہندوستان کی سرکاروں کی پالیسی کو محض دوہرانے کی حد تک نمائندگی کرتا ہے تو ان کی سوچ ہی دوبارہ پیش کرے گا جو ہندوستان اور پاکستان کی سرکاروں نے اپنی طرف سے پہلے ہی یہ موقف پیش کر دیا ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان اور پاکستان کے اس دعوے کو درست مان لیا جائے جو ریاست کے تنازعہ کے بارے میں رکھتے ہیں یا کرتے ہیں تو یہ کسی مسئلہ کا حصہ تو ہوسکتا ہے یہ سوچ مسئلہ کا حل نہیں پیش کرتی ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ 75 سال ضائع کرنے کے بعد بھی دونوں ملکوں کے غیر حقیقت پسندانہ، یکطرفہ موقف کو ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کا حل ہی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ریاست جموں کشمیر تین فریقوں کے درمیان تنازعہ بنی ہوئی ہے تو دو فریق اس تنازعہ کو آپس میں بیٹھ کر کس طرح حل کر سکتے ہیں۔ اگر ہندوستان اور پاکستان ہی فریق ہوتے اور ریاست میں بھی ان کے حمایتیوں کی اکثریت ہوتی تو یہ دونوں مل کر اس تنازعہ کا فیصلہ کر چکے ہوتے لیکن وہ ایسا نہیں کر پائے تو مسئلہ سہہ فریقی ہے اور تینوں فریقوں کی مرضی سے ہی حل ہوگا۔

اب اس کی وضاحت ضروری ہے کہ ریاست کا جموں کشمیر کے تنازعہ کے تین فریق کیسے ہیں؟ دنیا کے سامنے تو ریاست کا تنازعہ دوطرفہ یعنی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہی موجود ہے۔ ہندوستان کے بٹوارے میں شاہی ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ یا تو ہندوستان اور پاکستان کا حصہ بنیں یا آزاد رہیں۔ ریاست کے مہاراجہ ہری سنگھ نے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن برطانوی حکومت نے اس آزادی کے آپشن سے ریاستوں کے حکمرانوں کو منع کر دیا تھا کہ کوئی ریاست کا حکمران ہندوستان اور پاکستان سے الگ ہونے کا یا آزاد رہنے کا اعلان نہ کرے۔ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی نے ہندوستان کی تمام فیوڈل ریاستوں کے حکمرانوں کو وارننگ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کوئی بھی ہندوستانی ریاست آزادی سے رہنے کا اعلان کرتی ہے تو برطانیہ نہ اسے خود تسلیم کرے گا، نہ ہی اسے اقوام متحدہ کا ممبر بننے دے گا اور نہ کسی دوسرے ملک سے اسے تسلیم ہونے دے گا۔ ہندوستان میں کانگریس کے لیڈر گاندھی نے کہا تھا کہ ہندوستان کی کسی بھی ریاست نے آزادی کا اعلان کیا تو اسے ہندوستان کے عوام کے خلاف اعلانِ جنگ تصور کیا جائے گا۔ ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ کہا گیا تھا کہ تمام ریاستوں کے برطانوی ہند یا برٹش انڈیا کے ساتھ کیے گئے تمام معاہدات 14 اگست کی رات سے ہی ختم ہو جائیں گے اور ریاستیں آزاد ہو جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تمام ہندوستانی ریاستوں کو اقتدار اعلیٰ واپس مل گیا تھا جو اقتدار اعلیٰ ان ریاستوں نے برٹش انڈیا کے ساتھ کچھ معاملات میں سانجھا (Shared) کیا ہوا تھا، برطانوی ہند کا ہی خاتمہ ہو گیا تو اس کے ساتھ ریاستوں کے معاہدے بھی ختم ہو گئے تھے۔ اس لیے تکنیکی اعتبار سے ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ کو اس لیے بحال کیا گیا تھا یا خود بخود بحال ہو گیا تھا تاکہ ریاستیں ہندوستان اور پاکستان سے الحاق کر سکیں اگر کسی خطے یا ریاست کے پاس اقتدار اعلیٰ موجود نہیں تو وہ کسی ملک سے الحاق کا اختیار نہیں رکھتی۔ا

قتدار اعلیٰ دو قسم کا ہوتا ہے، اندرونی اقتدار اعلیٰ اور بیرونی اقتدار اعلیٰ۔ ہندوستانی ریاستوں کو بیرونی اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں تھا۔ یہی حال ریاست جموں کشمیر کا بھی تھا۔ جب

ریاست جموں کشمیر کا اقتدار اعلیٰ برطانوی ہند کے ساتھ معاہدات ختم ہونے سے بحال ہو گیا تھا تو اقتدار اعلیٰ ریاستوں کے حکمرانوں کو منتقل کیا گیا تھا تا کہ ان کی مرضی سے ریاستوں کے الحاق کا فیصلہ کیا جائے۔ کیونکہ عوام کو اقتدار اعلیٰ منتقل کرنے سے ساری ہندوستانی ریاستوں میں استصواب رائے یعنی ہر جگہ ریفرنڈم کروانے پڑتے جو بہت زیادہ وقت طلب اور مہنگا کام تھا۔ ہندوستانی ریاستوں کی آبادی 23% اور رقبہ 40% کے لگ بھگ تھا۔ اگر 565 ہندوستانی ریاستوں میں عوام کی رائے سے ریاستوں کا فیصلہ کیا جاتا تو اس کے لیے بہت زیادہ خرچہ اور وقت برباد ہوتا اس لیے ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ اختیار قانونی طور پر دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی ریاستوں کا فیصلہ کریں کہ وہ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کے بٹوارے کے تحت کسی بھی ہندوستانی ریاست کو آزادی نہیں دی گئی تھی اس لیے تمام شاہی ریاستیں ہندوستان اور پاکستان میں شامل ہو گئی تھیں۔ صرف تین ریاستوں کے حکمرانوں نے ایسے فیصلے کیے کہ ان کا تنازعہ پیدا ہو گیا جن میں جونا گڑھ کے حکمران نے پاکستان سے الحاق کر دیا تھا، حیدر آباد کے نواب نے آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور ریاست جموں کشمیر کے مہاراجہ نے دونوں ملکوں کو معاہدہ قائمہ (Standstill agreement) کرنے کی درخواست کی تھی۔ جس کو پاکستان نے قبول کر لیا تھا اور ہندوستان نے مزید وقت مانگا تھا۔ جونا گڑھ میں نواب کے الحاق کے خلاف بغاوت ہو گئی اور سمل داس گاندھی نے ممبئی سے جلا وطن حکومت کا اعلان کر دیا کیونکہ جونا گڑھ کی نا تو پاکستان سے سرحد ملتی تھی اور نہ ہی آبادی مسلم تھی۔ حیدر آباد نے آزادی کا اعلان کیا تو پاکستان نے فوراً اس کی آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے کراچی میں حیدر آباد کی آزاد ریاست کا سفارتخانہ بھی کھول دیا تھا جبکہ ہندوستان نے اپنی فوج بھیج کر حیدر آباد کی ریاست کا گھیراؤ کر لیا اور آپریشن پولو کے نام سے نواب کی رضا کار فوجوں سے لڑائی شروع کر دی۔ چالیس ہزار کے لگ بھگ رضا کار مارے گئے اور ان کا کمانڈر ہندوستانی فوج کے سامنے سرینڈر ہو گیا تھا۔ جونا گڑھ کا بھی گھیراؤ کیا گیا اور دونوں ریاستوں میں اکثریت غیر مسلم آبادی کی تھی۔ اس لیے

دونوں ریاستوں میں ہندوستان نے استصواب رائے کروایا اور دونوں ریاستیں ہندوستان میں شامل ہوگئی تھیں۔

ریاست جموں کشمیر کے مہاراجہ نے پاکستان سے معاہدہ قائمہ کرلیا تھا اور دونوں ملکوں کے درمیان بفرسٹیٹ بننے کی کوشش کی تھی لیکن پاکستان نے ہی معاہدہ قائمہ (Standstill agreement) کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دو ماہ آٹھ دنوں کے بعد ریاست پر حملہ کردیا جس کی وجہ سے مہاراجہ نے تین چیزوں پر ہندوستان سے ریاست کا الحاق کردیا اور فوجی مدد طلب کی۔ مہاراجہ نے ہندوستان سے دفاع، خارجہ امور اور کمیونیکیشن پر ہی الحاق کیا تھا اور ریاست کو ہندوستانی یونین میں ضم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ مہاراجہ کا الحاق بھی عارضی تھا کیونکہ ریاست دونوں ملکوں کے درمیان متنازعہ ہوگئی تھی۔ آخری اور حتمی فیصلہ ریاست کی عوام نے استصواب رائے سے کرنا تھا۔ جب ریاست کے الحاق کی شرط کو ریاست کے عوام سے منسوب کردیا گیا تھا تو دونوں ملکوں نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ ریاست کا حتمی اور آخری فیصلہ کرنے کا اختیار عوام کو حاصل ہے۔ اس طرح ریاست جموں کشمیر کے عوام ہی ریاست کے تنازعہ میں بنیادی اور پرائمری پارٹی ہیں۔

اب ریاست کا فیصلہ ریاستی عوام کی رائے کے بغیر نہیں ہوسکتا کیونکہ تنازعہ سہہ فریقی بن چکا ہے۔ ریاست کا سپیشل تاریخی، سیاسی، ثقافتی، جغرافیائی اور آبادی کی بیک گراؤنڈ سختی سے اس طرف اشارہ دیتی ہے کہ ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ کی نیچر سہہ فریقی ہے۔ حقیقت میں جموں کشمیر کے مسئلہ کی اس بنیادی فطرت سے واضع ہوتا ہے کہ یہ ایک سہہ فریقی سیاسی تنازعہ ہے جو 1947ء سے ہندوستان، پاکستان اور ریاست جموں کشمیر کے عوام کے درمیان جاری ہے اور حل طلب ہے۔ ساری ریاست کے تقسیم شدہ حصے اس سیاسی تنازعہ کا حصہ ہیں۔ ریاست جموں کشمیر 1947ء میں ایک خونی جنگ کے نتیجہ میں غیر فطری تقسیم کا شکار ہوگئی تھی جس کے دو حصے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان پاکستان کے زیر کنٹرول ہیں۔ آزاد کشمیر 4471 مربع میل علاقہ اور 45 لاکھ آبادی ہے جبکہ گلگت بلتستان 28000 مربع میل علاقہ اور 15

لاکھ آبادی ہے۔ ہندوستان کے زیر انتظام کشمیر وادی کا علاقہ 9909 مربع میل اور آبادی 68 لاکھ ہے جبکہ جموں کا رقبہ 16337 مربع میل اور آبادی 53 لاکھ ہے۔ لدّاخ کا رقبہ 36751 مربع میل اور آبادی 2 لاکھ 74 ہزار رہی ہے۔ یہ 2011ء کی مردشماری کے مطابق بھارت کے زیر انتظام جموں کشمیر کے آبادی بتائی گئی ہے جبکہ 2021ء کی مردم شماری میں بھارت کے زیر انتظام ریاست جموں کشمیر کی آبادی ایک کروڑ 52 لاکھ کے لگ بھگ بتائی گئی ہے۔ لدّاخ کا 23612 مربع میل علاقہ چین کے پاس ہے۔ شکسام وادی جو لدّاخ کا علاقہ ہے پاکستان نے 1963ء میں چین کو تحفہ میں دیا تھا جب پاکستان اور چین نے سرحدی معاہدہ کیا تھا اور اقصائے چن کا علاقہ 1950ء میں چین نے اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ 1962ء کی چین بھارت جنگ میں چین نے اقصائے چن کے علاقوں پر اپنا قبضہ مزید مضبوط کرلیا تھا۔ اس قدر بکھری، ٹوٹی ہوئی اور منتشر ریاست کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے پہلی شرط یہی ہونی چاہیئے کہ اس ریاست کے بکھرے ہوئے خطوں کے عوام کی خواہش کے مطابق یہ ریاست اپنی اصل حالت میں بحال ہوا اور سب قوموں اور قومیتوں کا مشترکہ وطن بنے۔ اس سے پہلے اقوام متحدہ کا حوالہ بھی دیا جاتا تھا بلکہ پاکستان کی طرف سے آج بھی یہی کہا جاتا ہے کہ ریاست کے مسئلے کا حل اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہونا چاہیے جبکہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان (UNCIP) نے دونوں ملکوں سے جموں کشمیر کے تنازعہ کے حوالے سے ڈرافٹ کی گئی تجاویز مانگی تھیں۔

ہندوستان اور پاکستان نے ڈرافٹ کی گئی تجاویز اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں پیش کیں تھیں۔ سیکیورٹی کونسل نے 49-1948ء میں استصواب رائے کے لیے قرارداد منظور کی تھی اور جموں کشمیر کے سوال کو بدل کر ہندوستان پاکستان کا سوال بنایا گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان نے اقوام متحدہ کی 49-1948ء کی استصواب رائے کی قرارداد کو ایک طرف کردیا تھا جس قرارداد میں ریاست کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کریں جبکہ ہندوستان اور پاکستان نے

1966ء میں تاشقند معاہدہ کرلیا تھا اس کے بعد 1972ء میں شملہ معاہدہ کیا گیا تھا اور 1999ء میں اعلان لاہور پر دستخط کیے گئے تھے۔ ان معاہدوں نے اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی جگہ لے لی اور دونوں ملکوں نے ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ آپس میں بات چیت سے حل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اقوام متحدہ کی قرار داد میں ریاست کا حتمی فیصلہ کرنے کا اختیار ریاست جموں کشمیر کے شہریوں کو دیا گیا تھا جبکہ ان معاہدوں میں دونوں ملکوں نے ریاستی عوام سے یہ حق چھین کر آپس میں دو طرفہ مل بیٹھ کر اس کا حل نکالنے پر اتفاق کیا تھا لیکن تلخ حقیقت یہ ہے کہ جموں کشمیر ابھی تک ایک حل طلب سیاسی تنازعہ ہے اور یہ تنازعہ ہندوستان، پاکستان اور جموں کشمیر کے عوام کے درمیان 1947ء سے موجود ہے۔ اس تنازعہ میں جموں کشمیر کے عوام بنیادی فریق ہیں لیکن بدقسمتی سے جموں کشمیر کا یہ سہہ فریقی حساس نوعیت کا سیاسی تنازعہ بری طرح سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور ایک گہرے اندھیرے ٹینل میں دھکیل دیا گیا ہے جہاں سے اس کو نکالنا ہے۔ اب اس کا حل بھی تینوں فریقوں کی مرضی سے نکالنا ہوگا۔ جو لوگ مہاراجہ ہری سنگھ کے 26 اکتوبر 1947ء کے الحاق ہندوستان کو بنیاد بنا کر اس مسئلہ کو حل طلب قرار دیتے ہیں وہ اس تنازعہ کی نوعیت کو اپنی خواہش کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو یکطرفہ حل ہے جو باقی دو فریقوں کو تنازعہ سے باہر نکال دیتا ہے۔ الحاق ہندوستان نہ صرف مشروط تھا بلکہ ریاست کے ٹوٹ جانے سے الحاق تو صرف ہندوستان کے زیر انتظام ریاستی علاقوں تک محدود ہوگیا تھا۔ مہاراجہ نے ہندوستان سے دفاع، امور خارجہ اور کمیونیکیشن پر الحاق کیا تھا جب ریاست ہی متنازعہ ہوگئی تو الحاق خود بخود متنازعہ ہوگیا تھا اس لیے ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے الحاق کے دستاویزات پر دستخط کرتے ہوئے اس پر نوٹ لکھ دیا تھا کہ اب الحاق کا حتمی فیصلہ ریاست کے عوام استصواب رائے کے ذریعے کریں گے۔

الحاق میں ریاست جموں کشمیر کے علاقوں کو ہندوستان کے آئین میں خصوصی حیثیت دی گئی تھی اور ریاست جموں کشمیر کی طرف سے مہاراجہ کے ریجنٹ (Regent)

ڈاکٹر کرن سنگھ نے ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی (پارلیمنٹ) سے درخواست کی تھی جو جموں کشمیر کی حکومت کی ایماء پر کی گئی تھی کہ وہ ریاست کے الحاق کو ہندوستانی آئین میں شامل کرنے کا بندوبست کریں جو ہندوستانی آئین ریاست کی حیثیت کی عکاسی کرے اور ریاست جموں کشمیر کی خصوصی حیثیت کا تعین کرے۔ ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی نے آرٹیکل 370 کو آئین کا حصہ بنا لیا تھا اس طرح آرٹیکل 35A کی بنیاد مہاراجہ ہری سنگھ کے 32-1927ء کا باشندہ ریاست قانون اور 1952ء کا دہلی معاہدہ بنا تھا جو ریاست کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ اور ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے درمیان دہلی میں ہوا تھا۔

دہلی معاہدے کو بھی ہندوستان کے آئین کا حصہ بنایا گیا تھا اور آرٹیکل 370 میں شامل کیا گیا تھا اور یہ صدر کے آرڈر کے ذریعہ آرٹیکل 35A جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کی درخواست پر (سفارش پر) 14 مئی 1954ء کو ہندوستان کے آئین کے آرٹیکل 370 کا حصہ بنایا گیا تھا اور اس کے ذریعہ ہندوستان اور ریاست جموں کشمیر کے درمیان خصوصی تعلقات قائم ہوئے تھے۔ ریاست جموں کشمیر کے عوام کو ہندوستان کے آئین میں خصوصی درجہ دینے کا وعدہ الحاق کے دوران ہی کیا گیا تھا جو بعد میں آئین کے آرٹیکل 370 اور 35A کی صورت میں ہندوستانی آئین کا حصہ بنایا گیا تھا کیونکہ ریاست جموں کشمیر کی سیاسی اور تاریخی حیثیت جداگانہ تھی۔ ہندوستان کی موجودہ سرکار نے 5 اگست 2019ء کو ریاست جموں کشمیر کا خصوصی درجہ ختم کر کے ریاست کی حیثیت بھی ختم کر دی تھی جو نہ صرف ریاست جموں کشمیر اور ہندوستان کے الحاق کی بنیاد کے ہی خلاف ہے بلکہ ریاست کا جو آئینی تعلق ہندوستان سے بنایا گیا تھا اس کے بھی خلاف ہے اور ہندوستان نے اقوام متحدہ میں اور اپنی پارلیمنٹ میں جو ریاستی عوام سے وعدے کیے تھے یہ اقدام ان کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ ہندوستان کی سرکار نے یہ اقدام اٹھا کر ریاستی عوام سے بدترین دھوکہ دہی سے کام لیا ہے چونکہ آرٹیکل 370 کو ختم کرنے کا اختیار ہندوستانی پارلیمنٹ کے پاس موجود ہی نہیں ہے کیونکہ اس کا اختیار ہندوستانی صدر کو دیا گیا تھا لیکن اس صورت میں جب ریاست جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی

یہ درخواست کرتی کہ اس آرٹیکل میں تبدیلی کی جائے اسے ہٹایا جائے اور صدر اس کے لیے آرڈیننس جاری کرے لیکن ریاست جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی 1951ء میں بنائی گئی اور 1957ء تک قائم رہی اور اس نے ہندوستان سے آرٹیکل 370 ختم کرنے کی درخواست نہیں کی اور ریاست کی آئین ساز اسمبلی 1957ء میں ختم ہوگئی تھی اب ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے ختم ہونے سے آرٹیکل 370 مستقل ہوگیا تھا۔

موجودہ ہندوستانی سرکار نے آرٹیکل 370 ختم کرنے کے لیے اپنے آئین کی خلاف ورزی کی ہے یہ غیر قانونی اور غیر آئینی اقدام اٹھانے کے لیے سارے جموں کشمیر کو فوج کے حوالے کیا گیا تھا چونکہ اس اقدام نے ریاست کے عوام کے بنیادی حقوق اور شناخت بھی چھین لی ہے۔ یہ ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کو ہندوستان نے یکطرفہ حل کرنے کی ایک ناکام کوشش کی ہے لیکن اس اقدام سے ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ حل نہیں ہوا بلکہ مزید الجھ ضرور گیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے 1947ء سے ہی ریاست جموں کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یکطرفہ فرقہ وارانہ ذہنیت اپنا رکھی ہے اور غیر حقیقت پسندانہ، جنونیت پر مبنی سفارتکاری، ناقص اور دوطرفہ پالیسیاں اپنا رکھی ہیں جو سہہ فریقی تنازعہ جموں کشمیر کے برعکس ہیں جن کی وجہ سے تنازعہ جموں کشمیر کو آہستہ آہستہ تباہ و برباد کردیا گیا۔ اس کو پیچیدہ بنایا گیا ہے جس کی وجہ سے ریاست جموں کشمیر کا خصوصی حیثیت پر دونوں طرف اثر پڑا ہے۔ جموں کشمیر کے سہہ فریقی تنازعہ کو بڑے ہی ظالمانہ طریقے سے دونوں ملکوں کی تمام حکومتوں نے مس ہینڈل (Mishandle) اور مس مینج (Mis manage) کیا ہے۔

یہ ظالمانہ سلوک اور بڑے پیمانے پر غلطیاں اور ریاست کی اندرونی خودمختاری چھیننے کا کام بھارت کے زیر انتظام جموں کشمیر میں 1953ء میں نہرو دور حکومت میں شروع کیا گیا تھا۔ لیکن نہرو دور کے بعد بھی تمام مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے ریاست کی خصوصی حیثیت اور اس کی اندرونی خودمختاری ختم کرنے کے لیے مزید اقدامات کیے اور غیر دانشمندانہ طریقے سے ریاست جموں کشمیر کا سہہ فریقی حساس سیاسی تنازعہ کے ساتھ غیر ذمہ دارانہ

سلوک کیا۔اس وقت بھارت کی نریندر مودی حکومت نے ماضی کی ان بڑی غلطیوں سے سیکھنے کی بجائے 5 اگست 2019ء میں غیر جمہوری اور غیر آئینی طریقے سے پہلے ہی سے ختم کیا گیا ریاست جموں کشمیر کا خصوصی درجہ دینے والا ہندوستانی آئین کا آرٹیکل 370 کو غیر فعال بناتے ہوئے اس کی سیکشن کلاز 2 اور کلاز 3 کو ختم کر دیا اور آرٹیکل 35A کو بھی ختم کر دیا اس کی وجہ سے مستقل باشندہ ریاست جموں PRC سرٹیفیکیٹ کا خاتمہ ہو گیا جو ایکٹ 1963ء میں لایا گیا تھا اور 800 سے زیادہ مرکزی حکومت کے قوانین ریاست جموں کشمیر پر لاگو کر دیئے گئے۔ ریاست جموں کشمیر کا ریاست کا درجہ گھٹا کر اس کی دو یونین (ٹریٹریز) علاقے بنا دیئے گئے جن میں یونین علاقہ جموں کشمیر اسمبلی کے ساتھ اور یونین علاقہ لدّاخ بغیر اسمبلی کے بنا دیا گیا اور ریاستی باشندوں کا زمینوں کے تحفظ کے متعلق قانون ختم کر دیا اور زمینوں کی خرید وفروخت کا حق غیر ریاستی لوگوں کو بھی دیا گیا ہے۔نریندر مودی حکومت نے آمرانہ طریقے سے اور فرقہ پرستانہ مذہبی تعصب کا سہارا لیتے ہوئے ڈومیسائل سرٹیفیکیٹ غیر ریاستی باشندوں کو دینے شروع کر دیئے ہیں اور ریاستی باشندوں کی مرضی کے خلاف یہ سب کچھ کیا گیا ہے اور غیر ریاستی باشندوں کو زمین خرید کر ٹھیکیداری کی بنیاد پر کھیتی باڑی کرنے کا حق بھی دے دیا ہے۔

یہ اقدامات کرنے سے نریندر مودی حکومت نے ریاست جموں کشمیر کے عوام سے کیے گئے وعدوں کی سنگین خلاف ورزی کرتے ہوئے عوام کے اعتماد کو بری طرح ختم کر دیا ہے اور یہ ہندوستانی حکومت کی طرف سے سنگین سیاسی غلطی کی گئی ہے کیونکہ پہلے سے ریاست جموں کشمیر کے پیچیدہ ترین تنازعہ کو مزید پیچیدہ بنا کر اس کو حل سے دور کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔یہی سنگین سیاسی غلطی پاکستان کی موجودہ حکومت بھی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور گلگت بلتستان کو پاکستان کا پانچواں آئینی صوبہ بنانا چاہتی ہے۔گو کہ پاکستانی حکومت اندرونی اور بیرونی سیاسی دباؤ کی وجہ سے گلگت بلتستان کو عارضی صوبائی درجہ ہی دے پائی تھی۔

تاریخی، سیاسی اور جغرافیائی حقیقت یہ ہے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان متنازعہ ریاست جموں کشمیر کے حصے ہیں۔گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کو اندرونی خودمختاری کا درجہ دیا جانا چاہیے لیکن ان کے مستقبل کا حتمی فیصلہ متنازعہ ریاست جموں کشمیر کے تمام دوسرے متنازعہ خطوں کے ساتھ ہی کیا جائے گا۔ ریاست جموں کشمیر کی مزید تقسیم کو روکنے کے لیے بنیادی اقدامات کیا ہونے چاہیں۔اس کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ریاست کے تمام تقسیم شدہ خطوں کے عوام کا مضبوط اتحاد قائم کرنا ہوگا اور ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحد کر کے اس کی ایک فیڈرل ریاست بنانے کی کوشش تیز کرنا ہوگی۔ دوسرا قدم یہ اٹھانا ہوگا کہ ریاست گیر ایک متحدہ عوام کی تحریک چلانا ہوگی جو ریاستی عوام کے جمہوری سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق کی بحالی کے لیے جدوجہد کرے جب تک ریاست جموں کے مسئلہ کا حتمی حل نہیں نکلتا اس وقت تک ریاست کے تمام خطوں کے لیے آزاد اور خودمختار جمہوری حکومتوں کا مطالبہ کرنا اور ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں پر زور دینا کہ وہ اپنی فیل شدہ جموں کشمیر پالیسی کو بدلیں اور ایک طرفہ غیر حقیقت پسندانہ طاقت پر مبنی پالیسی کو ختم کر کے دونوں ملک حقیقت پسندانہ سہہ فریقی بیانیہ اور پالیسی اپنائیں اور اس تنازعہ کو سہہ فریقی سیاسی تنازعہ تسلیم کرتے ہوئے اس تنازعہ کو عقلی بنیادوں پر حل کرنے کے لیے سہہ فریقی ڈائیلاگ شروع کریں اور جموں کشمیر کے تنازعہ کے لیے امن کی بنیاد پر جنوبی ایشیائی عوام کے مفادات کے مطابق پالیسی ترتیب دیں۔ ہندوستان اور پاکستان کو چاہیے کہ وہ آپس میں بات چیت شروع کریں اور ڈیڈ لاک ختم کر کے معنی خیز مذاکرات کی راہ ہموار کریں۔اس مقصد کے لیے دونوں ملکوں کو چاہیے کہ ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس بلائیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ملک آپس میں جنگ بندی کا اعلان کریں اور بھارت کے زیر انتظام جموں کشمیر میں مسلح گروہوں اور ہندوستانی سیکیورٹی فورسسز کے درمیان جنگ بندی کا اعلان کیا جائے اور اعتماد بحال کرنے کے لیے بنیادی اقدامات کیے جائیں جس میں تینوں فریقوں، ہندوستان، پاکستان اور ریاست جموں کشمیر کے عوام کے درمیان سہہ فریقی ڈائیلاگ کا آغاز کیا جائے اور ریاست جموں کشمیر کے

مسئلہ کا سہہ فریقی حل نکالا جائے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی نوعیت کے اقدامات کیے جائیں اور تمام فریقوں سے صلاح اور مشورے شروع کیے جائیں جس میں ریاست کے تمام تقسیم شدہ اور متنازعہ خطوں کے درمیان ڈائیلاگ پراسیس شروع کرانے کے لیے دونوں ملکوں کی حکومتیں مدد کریں جس میں ریاست کے تمام خطوں کے سیاسی ،سماجی، کاروباری اور دانش ورحلقوں کو آزادانہ طور پر ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کے لیے فری ویزا کا نظام ریاستی باشندوں کے لیے لاگو کیا جائے اور ریاست کی تمام سیاسی جماعتوں کو آپس میں ڈائیلاگ کرنے کا آزادانہ مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ ریاست کی سیاسی جماعتیں پہلے آپس میں اتفاق رائے قائم کریں اور تجاویز مرتب کریں جو سہہ فریقی مذاکرات میں پیش کی جائیں۔ زیادہ تر لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ریاست جموں کشمیر کی مختلف خطوں میں قائم حکومتیں اپنے اپنے خطوں کے عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے ڈائیلاگ کا سلسلہ شروع کریں گے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی علاقائی حکومتوں کو دیکھا جائے تو یہ دونوں حکومتیں پاکستان کی حمایت سے ہی بنائی جاتی ہیں۔ان کا مئوقف وہی ہوتا ہے جو ریاست پاکستان کا ہوتا ہے۔ان علاقائی حکومتوں کو ریاست جموں کشمیر کے مستقل حل کے لیے ہونے والے سہہ فریقی ڈائیلاگ میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی کیونکہ ان حکومتی نمائیندوں اور پاکستانی ریاست کا مئوقف ایک ہی ہوگا۔اس لئے جو مئوقف پاکستانی حکومت کے نمائیندے بیان کریں گے وہی پاکستانی ریاست کا مئوقف تسلیم کیا جائے گا۔

ریاست جموں کشمیر کا ہندوستان کے زیر انتظام حکومتی ڈھانچہ جو بھی بنایا جائے گا وہ ہندوستانی ریاست کا حمایتی ہوگا۔اس لیے ریاست کا وہ خطہ بھی اپنی علاقائی حکومت کا وہی مئوقف دہرائے گا جو ہندوستانی ریاست کا نمائیندہ بیان کرے گا۔ایک ہی مئوقف کو دو مختلف حکومتوں کے نمائندوں کے ذریعہ بیان کروانا جائز نہیں ہوگا۔اس لیے ریاست جموں کشمیر کی

کوئی بھی حکومت چاہے سرینگر کی ہو یا مظفر آباد کی یا گلگت کی وہ ریاست کے تنازعہ کے حل کے لیے مذاکرات میں شرکت کرنے کی اہل نہیں ہوگی کیونکہ ان سے بات چیت کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان ریاست جموں کشمیر کی طرف سے اپنے ہی حمایتی لوگوں کی وہی باتیں دوبارہ سن کر آپس میں کس طرح متفق ہوں گے۔ اس لیے ریاست جموں کشمیر کی اس وقت مختلف خطوں میں کسی بھی حکومت کے پاس ریاست کے تنازعہ پر بات چیت کا منڈیٹ نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ایک جوڈیشل کمیشن بنایا جائے جس میں ہندوستان اور پاکستان کے چند ریٹائرڈ یا حاضر سروس ججز کو لیا جائے اور ریاست جموں کشمیر کے تینوں خطوں سرینگر، گلگت اور مظفر آباد کی طرف سے بھی برابر ججز لیے جائیں اور ایک مشترکہ کمیشن بنایا جائے جس کا صرف مقصد ریاست جموں کشمیر کے تمام تقسیم شدہ خطوں میں ایسے نمائندے چننے کے لیے انتخابات کروانا ہو جن نمائندوں کا کام صرف سہہ فریقی مذاکرات میں حصہ لینا ہو۔ اس جوڈیشل کمیشن کی زیر نگرانی ریاست کے ہر حصے سے جو نمائندے عوامی ووٹوں سے منتخب ہوں گے ان کے پاس صرف ہندوستان اور پاکستان سے مذاکرات کرنے کا منڈیٹ ہوگا اور اس منڈیٹ کے لیے عوام ان کا انتخاب کریں گے۔ ان کی ذمہ داریاں صرف ریاستی عوام کی ریاست کے تنازعہ کے حل کے لیے مذاکرات میں ریاست کی نمائندگی کرنا ہوگی۔ یہ نمائندے ساری ریاست جموں کشمیر سے عام انتخابات کی طرح اپنی ذمہ داریوں کے لیے عوامی ووٹوں سے منتخب ہوں گے۔ یہ ریاستی عوام کے حقیقی نمائندے ہوں گے کیونکہ انہیں ریاست کے تمام تقسیم شدہ خطوں سے عوام صرف اسی مقصد کے لیے منتخب کریں گے۔ یہ ریاستی نمائندے ہندوستان اور پاکستان کے حکومتی نمائندوں سے ریاستی عوام کے اصل منڈیٹ کے ساتھ بات چیت کے مجاز ہوں گے۔ اور یہ ریاست کی طرف سے جموں کشمیر کے تنازعہ میں تیسرے فریق کی نمائندگی کریں گے۔ یہ ہندوستان اور پاکستان سے ریاست کا حتمی حل نکالنے کے لیے انہیں قائل کریں گے کہ ریاست کا ایسا حل نکالا جائے جس میں تنازعہ کے تینوں فریقوں کی مرضی شامل ہو اور اس تنازعہ کا سہہ فریقی حل پیش کریں گے اور ریاست جموں کشمیر

کی تقسیم ختم کروانے پر ہندوستان اور پاکستان کو راضی کریں گے۔ ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کی نیچر سہہ فریقی ہے اس لیے ریاستی نمائندے اس کا سہہ فریقی حل پیش کریں گے اور ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو اس حل پر راضی کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کے حل کے لیے تمام ممکنہ حل پر بات چیت ہونی چاہیے اور تمام آپشنز (Options) اور روڈ میپ پر بات چیت اور ڈائیلاگ کی اجازت ہونی چاہیے اور ان پر بات چیت کسی شرط کے بغیر ہونی چاہیے۔ تمام روڈ میپ اور آپشنز پر بحث مباحثہ کرنے کے بعد اتفاق رائے سے کسی عقلی دلائل کی بنیادوں پر کوئی مستقل حل تینوں فریقوں کے کمپرومائز سے نکالا جائے اور ایسا کمپرومائز حل تینوں فریقوں کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر ہو سکتا ہے۔

1۔ ریاست جموں کشمیر کی جبری تقسیم ختم کر کے اس ریاست کی وحدت کو بحال کیا جائے اور اس کی تعمیر اور ترقی کے لیے اسے متحدہ خودمختار فیڈرل جموں کشمیر ریاست بنایا جائے اور اس کا نام بھی فیڈرل ہمالین متحدہ ریاست رکھا جا سکتا ہے۔

2۔ متحدہ جموں کشمیر سٹیٹ یا فیڈرل ہمالین متحدہ سٹیٹ ایک خودمختار فیڈرل ریاست ہوگی جس کی ایک مشترکہ فیڈرل اسمبلی ہوگی اور اس کی علاقائی اسمبلیاں / صوبائی طرز کی ہوں گی اور ان علاقائی اسمبلیوں سے نیچے کئی علاقائی ڈویلپمنٹ کونسلز (Councils) ہوں گی جو ہر علاقے کے عوام کی خواہشات کے مطابق ان کی حقیقی امنگوں کی نمائندگی کریں گی۔ تمام قوموں اور قومیتوں کے اطمینان کے لیے ہر مرحلہ پر ان کی نمائندگی کو یقینی بنایا جائے گا۔

3۔ متحدہ فیڈرل جموں کشمیر کے دفاع، خارجہ امور، کرنسی اور کمیونیکیشن کو مشترکہ طور پر ہندوستان اور پاکستان سے معاہدوں کے ذریعہ طے کر دیا جائے اور دونوں ملکوں کے مشترکہ کنٹرول میں دے دیا جائے۔ جس کی بنیاد ہندوستان اور پاکستان کی دوستی اور جموں کشمیر کے عوام اور ہندوستان، پاکستان کے عوام کے درمیان بھائی

چارہ پر مبنی ہو۔ ریاست جموں کشمیر کے چند امور کو دونوں ملکوں کے مشترکہ کنٹرول میں دینے سے ریاستی عوام کو بھی موجودہ صورتحال سے نکلنے میں مدد ملے گی کیونکہ جموں کشمیر کے عوام ایک اندھیرے والے ٹینل میں پھنسے ہوئے ہیں اس سے نکلنے کا بہترین حل یہی ہے کہ تینوں فریق مل کر اس ریاست کے تنازعہ کو مشترکہ سوچ اپنا کر اس کا حل نکالیں تاکہ ریاست کے عوام، ہندوستان اور پاکستان کے ڈیڑھ ارب انسانوں کو بھی اس جھگڑے سے نجات ملے۔

4۔ دونوں ملکوں کے سامنے ریاست کے حل کی یہ تجویز بھی رکھی جائے کہ دونوں ملک اتفاق رائے سے ریاست کو مکمل آزادی دینے پر رضا مند ہو جائیں اور دونوں ریاست کے دفاع کی گرانٹی مشترکہ طور پر دیں اور چین اور روس بھی اس کے دفاع کے گرانٹی میں شامل ہو جائیں۔ اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان کو ریاست سے مکمل انخلاء کرنا ہوگا جو دونوں ملکوں نے اقوام متحدہ کی تجویز پر بھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ تجویز دونوں ملکوں کے حکمرانوں کے علاوہ ریاست جموں کشمیر کے کئی خطوں اور ریاستی عوام کے ایک بڑے حصے کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہوگا اور ریاست کے دونوں طرف ہندوستان نواز اور پاکستان نواز سیاسی جماعتیں بھی اس حل کی شدید مخالف ہیں لیکن یہ بھی ایک ممکنہ حل ضرور ہے۔ اس کے علاوہ بھی جو حل ہوں گے ان پر دوستانہ ماحول میں تینوں فریقوں کے درمیان ڈائیلاگ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

5۔ ریاست جموں کشمیر کے عوام کو لائن آف کنٹرول نے بڑے بے رحمانہ طریقے سے تقسیم کر رکھا ہے اور یہ لائن آف کنٹرول 1947-48ء سے ہندوستان اور پاکستان نے ریاست کے عوام کے درمیان کھینچ رکھی ہے۔ اس کا خاتمہ ریاست کے عوام کی اولین ترجیح ہوگی اور اس لائن آف کنٹرول کو ختم کر کے جموں کشمیر اور ہندوستان، پاکستان کے درمیان ڈویلپمنٹ کوریڈور (Corridor) بنایا جائے

جس میں کئی لوکل کوریڈوزر (Corridors) بھی اور رابطے بنائے جائیں۔ سارے رابطے اور روٹس دونوں ملکوں اور ریاست جموں کشمیر کے درمیان بھی کھولے جائیں۔ یہ راستے اور رابطے متحدہ فیڈرل جموں کشمیر سٹیٹ کے درمیان اور دونوں ملکوں کے درمیان امن، دوستی، ثقافتی میلاپ، عوامی رابطوں اور میلاپ کے لیے نہایت اہم کردار ادا کریں گے۔ ان راستوں اور رابطوں کی بحالی سے انسانی Solidarity اور ہندوستان، پاکستان اور جموں کشمیر کے درمیان اور جنوبی ایشیاء میں ترقی کو بڑھاوا دے گی۔ جنوبی ایشیاء میں ان راستوں کے کھلنے سے تجارت بڑھے گی، روزگار میں اضافہ ہوگا۔

6۔ متحدہ فیڈرل جموں کشمیر سٹیٹ (State) جو ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ چند امور مشترکہ رکھے گی دونوں ملکوں کے درمیان امن، دوستی، تعاون، مشترکہ ترقی اور مشترکہ مستقبل کے لیے ایک مضبوط پل کا کردار ادا کرے گی۔ جموں کشمیر کے سیاسی تنازعہ کو خونی عسکریت پسندی اور بے رحمانہ جوابی فوجی کاروائیوں کی طرف بار بار دھکیلنے کی بجائے دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کا ذریعہ بنانے کا یہ بہترین موقع ہے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان یہ تنازعہ غیر ضروری سیاسی اور سفارتی محاذ آرائی کا باعث بنا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کبھی سرد جنگ اور کبھی گرم جنگ جاری رہتی ہے جو دونوں ملکوں کے غریب عوام کے وسائل پر ایک بڑا اور مستقل بوجھ بنا ہوا ہے۔ ان وسائل سے دونوں ملکوں کی حکومتوں کو چاہیے کہ غریب بچوں کے لیے نئے سکول کھولیں کیونکہ دونوں طرف کروڑوں بچے غربت کی وجہ سے سکول نہیں جاتے ان خاندانوں کی غریبی ختم کرنے کے لیے یہ وسائل استعمال کیے جائیں جو وسائل ریاست جموں کشمیر کو دونوں ملک کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

7۔ تاریخی بنیادوں پر دیکھا جائے تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جاری تنازعہ

اور ان کے درمیان سیاسی اور سفارتی محاذ آرائی، دونوں کے درمیان جاری سرد جنگ، گرم جنگ کی بنیاد دونوں ملکوں کی لیڈرشپ کا فرقہ وارانہ تصور اور ذہنیت ہے۔اس فرقہ وارانہ ذہنیت نے 1947ء کی ہندوستان کی فرقہ وارانہ تقسیم سے جنم لیا ہے۔ یہ دونوں طرف مرکزی تصور کے طور پر سماجی ماڈل کے طور پر اپنایا گیا ہے جو تھوڑے سے فرق کے ساتھ دونوں ملکوں نے اپنا رکھا ہے یہ فرقہ وارانہ نظام کا ماڈل دونوں طرف انتخابی نظام کی پالیسیوں اور سیاسی نظام کا بھی حصہ ہے۔ موجودہ دور میں جو گلوبل دور کہلاتا ہے اس کی تاریخی ضرورت بن چکی ہے کہ عالمگیریت کو پروموٹ کیا جائے اور نیچر اور انسان دوست بنیادوں پر اس کا حصہ بنا جائے۔گلوبلائزیشن یا عالمگیریت کا تقاضا ہے کہ ماضی کی تاریخی غلطیوں کو پل بنایا جائے اور فرقہ وارانہ مذہبی فیوڈل سیاسی اور سماجی ماڈلز کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ فرقہ وارانہ مذہبی تصورات کی بنیاد پر قومی ریاست کی تعمیر کا پراجیکٹ جو ہندو مسلم فرقہ پرستی کا دوقومی نظریہ کا تصور ہو آج کے دور میں کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔اسی فرقہ وارانہ دوقومی نظریہ کا ماڈل جموں کشمیر کی کثیرالمذہبی ریاست پر لاگو کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس کی وجہ سے ریاست کے ٹکڑے ہو گئے تھے اس ماڈل کو لے کر ریاستوں کو جدید بنیادوں پر تعمیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ فیوڈل دور کی مذہبی سوچ ایک پسماندہ سماج کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ موجودہ دور کی جدید قومی جمہوری ریاست کا ماڈل آج کی گلوبل سیاست کی عکاس ہونی چاہیے۔اس لئے ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان کی فرقہ وارانہ سوچ بری طرح ناکام ہوئی ہے۔ریاست کے تنازعہ کو اسی فرقہ وارانہ دوقومی نظریہ کی سوچ نے پیدا کیا ہے جس سوچ اور تصور نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے اسی میں حل کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ریاست جموں کشمیر کا پائیدار حل کا ریپوریٹ (Corporate) سرمایہ دارانہ نظام کے ماڈل میں تلاش کرنا بھی مشکل

ہے کیونکہ ہندوستان اور پاکستان میں کارپوریٹ سرمایہ داری کے خدوخال مضبوط فیوڈل فاؤنڈیشن کے ساتھ موجود ہیں۔

ہندوستان میں کارپوریٹ سرمایہ داری کئی رجحانات کے ساتھ جس میں فیوڈل / جاگیردانہ سماجی ڈھانچے، سیاسی خدوخال اور عناصر سمیت موجود ہے ہندوستان کا سوشل ماڈل جعلی سیکولر بنیادوں پر کھڑا ہے دائیں بازو کی ہندوفرقہ پرست جماعت بی جے پی نے اقتدار میں آتے ہی سیکولرازم کے جعلی چڑھائے گئے پردے بھی پھاڑ ڈالے ہیں۔ ہندوستانی سماج کی تہوں میں چھپے فرقہ واریت کے سانپ سطح پر نمودار ہوتے ہی سماج کو ڈسنے لگے ہیں اور یہ زہر ہندوستانی سماج کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ جہاں ہندوستان میں جعلی سوشل سیکولر ماڈل فیل ہوا اسی طرح پاکستان کا اسلامی سوشل ماڈل بھی جعل سازی کی چغلی کھا رہا ہے۔ پاکستان کو اس سماجی ماڈل نے مذہبی فرقہ پرستی اور دہشت گردی کی آگ میں جھونک رکھا ہے۔ پاکستانی سماج میں کئی طرح کی محدود سول جنگیں (Civil Wars) چل رہی ہیں جو ریاست کے اسلامی ماڈل کو ناکام بنا چکی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کا یہ ریاستی ماڈل جو 1947ء کے بعد تشکیل دیا گیا تھا اب بدلنے کی ضرورت ہے۔ دونوں ریاستوں کے نئے سرے سے فیڈرل ڈھانچے تشکیل دیئے جائیں اور موجودہ ڈھانچوں کو نئے سرے سے دوبارہ تشکیل دیا جائے اور انہیں بدلا جائے اور نیا ماڈل ان کی جگہ لایا جائے۔ یہ فرقہ وارانہ، متروک، تنگ نظر قوم پرستی پر مبنی فیوڈل ذہنیت والا کارپوریٹ سرمایہ داری والا ماڈل آج کے گلوبل دور سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس کو ہندوستان اور پاکستان میں بدلنا تاریخی ضرورت بن چکی ہے۔ جموں کشمیر کا سہہ فریقی سیاسی تنازعہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بنیادی وجہ تنازعہ بنا ہوا ہے اور یہ عسکریت پسندی اور جوابی فوجی کاروائیوں کی وجہ بھی بنا ہوا ہے۔ ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی بحالی کا روڈ میپ اور بیانیہ ہی اس کے ڈھانچے کی دوبارہ تعمیر اور نیا ماڈل بنانا ریاستی تنازعہ کے حل کی طرف پہلا قدم ہوگا اور ریاست کو خودمختار فیڈرل ریاست بنانے میں مدد کرے گا۔ اس فریم ورک میں نیچر اور انسان دوست ماڈل جو ہندوستان اور پاکستان کے

مشترکہ کنٹرول میں چند امور پر سمجھوتہ کرنے پر مبنی ہو اور یہ ماڈل انتہائی پراثر متاثر کن ہوگا اور اس کا بیانیہ اور روڈ میپ بھی تینوں فریقوں کے لیے قابل قبول ہوگا اور یہ جموں کشمیر کے سہہ فریقی تنازعہ کی نیچر کے مطابق ہوگا۔

یہ ایک عقلیت پسندی، حقیقت پر مبنی متوازن راستہ ہوگا جو تمام فریقوں کے مفادات کو قبول کرتے ہوئے دوستی اور بھائی چارے میں بدل سکتا ہے اور تمام فریقوں کی خواہشات کو پورا کرسکتا ہے جو اس تنازعہ میں ملوث ہیں۔ یہ حل اور بیانیہ اس روڈ میپ کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کی اہمیت، عزت اور وقار میں اضافہ کرسکتا ہے اور ریاست جموں کشمیر کے عوام کے لیے متحدہ ریاست کا خواب بھی پورا کرسکتا ہے۔ یہ ماڈل تینوں فریقوں کی حیثیت کو اس یقین کے ساتھ برابر لا کھڑا کرے گا اور یہ ریاست کو اندھیرے سے نکالنے کے ساتھ یہ احساس دلائے گا کہ تینوں فریقوں کی فتح ہوئی ہے کیونکہ ریاست کے لوگوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے عوام بھی 1947ء سے اس تنازعہ کی وجہ سے پھنس چکے ہیں۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں کو یہ ماڈل اس اندھیرے سے نکلنے کا موقع فراہم کرے گا۔ ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ ہندوستان، پاکستان اور ریاست کے عوام کے درمیان جب ڈائیلاگ سے حل ہو جائے گا تو ریاست کے جو علاقے چین کے زیر کنٹرول میں ہیں وہ جموں کشمیر اور چین ہندوستان، پاکستان کے مشترکہ مذاکرات اور سفارتی ذرائع سے واپس لیے جائیں گے۔

ا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کنفیڈریشن

ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ حل کرنے کے لیے ہم نے دونوں ملکوں کے درمیان اسے کنڈومنیئم (Condominium) بنانے کی تجویز پیش کی ہے اور اس کا مطلب ہوگا ریاست کو متحد کیا جائے گا اور اس کا دفاع اور خارجہ امور کو دونوں ملک یعنی ہندوستان اور پاکستان مشترکہ کنٹرول کریں گے۔ اس تجویز پر ہر بندے کے ذہن میں یہ سوال اٹھے گا کہ ہندوستان اور پاکستان کے حکمران تو ایک دوسرے کو دُشمن سمجھتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ ریاست کا مسئلہ حل کرکے آپس میں دوستی کرلیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان

اور پاکستان کے عوام سے مل کر جموں کشمیر کے تنازعہ پر مشترکہ موقف اپنایا جائے اور اس کے حل کے لیے جو تحریک چلائی جائے اس میں ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو بھی شامل کیا جائے۔ ہندوستان اور پاکستان کے عوام ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کے حل میں تب جموں کشمیر کے عوام کا ساتھ دیں گے جب انہیں یقین ہو جائے کہ اس کے نتیجے میں ہندوستانی اور پاکستانی عوام کا بھی بھلا ہوگا بلکہ دونوں ملکوں کے کروڑوں لوگوں کی زندگیاں بدل جائیں گی۔ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کی زندگیاں بدلنے کے لیے ہم ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کو حل کرنے کے ساتھ دونوں ملکوں میں تبدیلی کے لیے بھی ایک پروگرام پیش کرتے ہیں لیکن ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ حل کرنے سے وہ بنیادی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی جو دونوں ملکوں کو قریب آنے سے روکتی ہیں۔ اس تنازعہ کو حل کیے بغیر ہندوستان اور پاکستان اپنے مسائل حل کرنے میں ناکام رہیں گے جس طرح پچھلے 75 سالوں میں دونوں طرف مسائل حل کرنے میں ناکام ہوئے ہیں دونوں طرف کے حکمران طبقات فرقہ پرستی اور نفرت کے حربے استعمال کر کے دونوں ملکوں کے عوام کا استحصال کرتے ہیں اور جعلی نفرت کا ڈھونگ رچا کر دونوں طرف کے کروڑوں عوام کو پسماندہ، جاہل اور غریب رکھنا چاہتے ہیں دونوں کی اس لڑائی اور نفرت کا فائدہ عام لوگوں کو نہیں ہوتا بلکہ حکمرانوں کو ہوتا ہے۔ یہ نفرت اور تقسیم کے حربے انگریز سامراج کے دور میں استعمال کیے گئے تھے۔ مذہبی تعصب کی سیاست کا تعلق جاگیردارانہ عہد سے ہے مذہبی بنیادوں پر آج کے دور کی قومی جدید ریاست کی تعمیر ممکن نہیں ہے مغربی ملکوں میں سرمایہ دارانہ نظام نے فیوڈل یا جاگیردار حکمرانوں کے نظام حکومت کا خاتمہ کیا تھا اور جدید قومی ریاست کی بنیاد علاقہ، زبان، خطہ، زمین، ثقافت اور معیشت کے مشترکہ اصولوں پر رکھا گیا تھا اور اپنے اپنے ملکوں سے بادشاہتوں کا سیاسی نظام ختم کیا گیا تو جدید ریاست کو سیکولر بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا جس میں مذہب کا کردار ریاستی امور چلانے میں ختم کر دیا گیا تھا اور مذہبی عقائد کو انسانوں کا ذاتی مسئلہ قرار دے کر ریاست سے مذہب کو الگ کر دیا گیا تھا اور ریاست مذہب کے معاملات میں غیر جانبدار رہے گی کیونکہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں بلکہ ریاست کے شہریوں کا مذہب ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ریاست کے شہریوں کا ایک ہی

مذہب یا فرقہ ہو۔اس لئے ریاست تمام شہریوں کو حقوق برابر دے گی اور مذہبی آزادی ہر شہری کو دے گی تا کہ وہ جس مذہب عقیدے پر قائم رہنا چاہیے وہ اپنی مرضی سے اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہے۔

یہ جدید قومی ریاستوں کے بنیادی اصول تھے جہاں بھی بادشاہتیں ختم ہوئیں وہاں جدید قومی ریاستیں انہی اصولوں پر تشکیل دی گئیں اور ان قومی ریاستوں نے بے پناہ ترقی انہی اصولوں پر چل کر حاصل کی تھی۔آج بھی وہی ریاستیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ ہو چکی ہیں جہاں سیکولر جدید جمہوری نظام قائم کیا گیا ہے۔ہندوستان سے انگریزوں نے اپنی بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کیا تو بدقسمتی سے اپنے بنیادی اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے ہندوستان میں دوقومی نظریہ کے تصور کے تحت ہندو اور مسلم قوم کا تصور متعارف کروایا اور اسے تسلیم بھی کیا۔ ہندوستان کے فرقہ پرست لیڈروں نے انگریزوں کے اس نظریہ کو جائز تسلیم کرتے ہوئے ہندو مسلم قوموں کی بنیاد پر ہندوستان کا بٹوارہ کروالیا۔ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ اور غیر سائنسی تصور تھا لیکن اس کی بنیاد پر ہندوستان کا بٹوارہ آسان تھا۔اس لیے سب نے اس نظریہ کو قبول کیا تھا۔اس بٹوارے میں کانگریس کے لیڈرز بھی اتنے ہی قصوروار ہیں جتنے انگریز حکومت اور مسلم لیگ کی لیڈرشپ ہے۔کانگریس ہندوستان کے تمام مذاہب کو استعمال کرتے ہوئے ایک جعلی ہندوستان کا نعرہ دے رہی تھی جبکہ مذہب کی بنیاد پر جدید قومی ریاست تشکیل کرنا ممکن نہیں ہے۔اسی وجہ سے کانگریس کی ناقص سیاست کا فائدہ مسلم لیگ نے اٹھاتے ہوے ہندو مسلم قوم کا مذہبی تصور متعارف کروایا۔اس سے پہلے ہندو بنیاد پرست لیڈرز اس تصور کا پرچار کر چکے تھے۔گو کہ ہندوؤں کا مذہبی تصور اور ریاست کا تصور بھی قدیم ہندو عقائد سے جوڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

مذہبی ریاست کا تصور بادشاہت کے دور کا ہے۔یہ تصور جدید ریاستوں کی تعمیر میں رکاوٹ ہے اس لیے ہندوستان اور پاکستان اسی مذہبی تصور سے قائم ہو چکی ہیں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ان دو ریاستوں کو ختم کر کے ایک ریاست بنائی جاسکتی ہے اب ان دونوں ملکوں کو قائم رکھتے ہوئے ہی کوئی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔اس مذہبی بٹوارے نے

اس جنوبی ایشیاء کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔اس اس کا نئے سرے سے حل تلاش کیے بغیر جنوبی ایشیاء کو ترقی دی جاسکتی ہے اور نہ نیوکلیئر جنگ کی تباہی سے بچایا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جہاں ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کا سہہ فریقی حل نکالا جائے گا وہاں ہندوستان اور پاکستان کے اندر ریاستی ڈھانچوں میں بھی تبدیلی کی تجویز دی جاتی ہے تاکہ اس پورے جنوبی ایشیائی خطے کو دوبارہ ایک نئے جدید ریاستی ڈھانچے کے تحت لایا جائے تاکہ اس خطے میں دیر پا امن قائم ہو سکے اور ترقی کا ایک نیا دور شروع کیا جائے۔انگریز کے دیئے ہوئے اس سامراجی سیاسی اور معاشی نظام سے جنوبی ایشیاء کے عوام کو نجات دلائی جائے۔اس کے لیے سب سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کے ریاستی ڈھانچوں اور سیاسی اور سماجی ماڈلز سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کو سہہ فریقی تنازعہ ماننا ہوگا اور اس کا سہہ فریقی حل بھی نکالنا ہوگا۔ ہندوستان اور پاکستان کی ریاستوں کے ڈھانچوں کو حقیقی معنوں میں فیڈرل ریاستوں کا نیا انسان دوست، فطرت دوست ڈھانچہ تشکیل دینا ہوگا۔ دونوں ریاستوں کے ایسے فیڈرل نظام کے ڈھانچے تشکیل دیئے جائیں جس سے ہندوستانی اور پاکستانی سماجوں میں بھرا ہوا فرقہ پرستی اور مذہبی نفرت کا زہر نکالا جائے۔

نیا جدید ریاستی نظام اس پرانے جاگیردارانہ ذہنیت والے سماجی ماڈل کی جگہ لے اور دونوں خطوں ہندوستان پاکستان کو قریب لانے میں مدد کرے۔ ہندوستان اور پاکستان بٹوارے کے بعد دو علاقائی قومی شناختیں بن چکی ہیں ان کے درمیان دو قومی نظریئے کی بنیاد پر دُشمنی کو برقرار رکھنا دونوں ملکوں کے کروڑوں شہریوں کے حق میں نہیں ہے اس دُشمنی کو پل بنانے کے لیے حقیقت پسندانہ، عقلیت پسندانہ اور سائنسی سوچ کی بنیاد پر دونوں کے سماجی ماڈلز کو انسان دوست، نیچر دوست ماڈل میں بدل دیا جائے۔نیچر اور انسان دوست بنیادوں پر دونوں ملکوں کی کنفیڈریشن بنائی جائے۔ یہ کنفیڈریشن سرمایہ داروں کی منڈی اور منافع کی بجائے انسان دوستی اور فطرت دوست ہو اور دونوں کی برابری کی بنیاد پر استوار ہو۔ اس انڈو پاک کنفیڈریشن کا مشترکہ دفاع، مشترکہ خارجہ امور، مشترکہ کرنسی اور مشترکہ ترقی کا ماڈل اپنایا جاسکتا ہے۔ترقی کا ماڈل انسان دوست فطرت دوست ہو جس میں دونوں طرف باہمی

تجارت کا ایک مشترکہ تجارتی نظام تشکیل دیا جائے۔ اس ماڈل کے ذریعہ پرانے جاگیردارانہ / سرمایہ دارانہ متروک مذہبی مکسچر (Mixture) والے ڈھانچے کا خاتمہ کیا جائے اور ہندوستان پاکستان کا قومی نظام جو پسماندہ سماجی اور سیاسی نظریات کی بنیاد پر ہے اس کی جگہ نیا ریاستی قومی ڈھانچہ جو فیڈرل بنیادوں پر قائم ہو لایا جائے۔ طاقت ور مرکز کی جگہ ریاستوں کی علاقائی اسمبلیوں کو مزید سیاسی، انتظامی اور معاشی طاقت ٹرانسفر کی جائے اور ریاستوں کے فیڈرل انتظامی امور کے لیے دونوں ملکوں کے نئے آئین تشکیل دیئے جائیں۔ یہ دونوں ملکوں کے فیڈرل ڈھانچے انسان دوست فطرت دوست بنیادوں پر قائم ہوں۔ ہندوستان اور پاکستان کے بین الاقوامی بارڈرز کو فطرت اور انسان دوست گلوبل کوریڈورز (Corridors) میں بدل دیا جائے۔ اس نظام کی تشکیل میں پورے جنوبی ایشیائی خطے کے وسائل کو عوام کی فلاح وبہبود کی بنیاد بنایا جائے۔ جس میں دنیا کی ٹاپ معیار کی یونیورسٹیاں، گلوبل معیار کے ہسپتال، گلوبل معیار کے ریسرچ سنٹرز، گلوبل معیار کی خودکار ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مینوفیکچرنگ انڈسٹری بنائی جائے۔ اسی طرح ہر شعبے میں گلوبل معیار کے ادارے قائم کیے جائیں، گلوبل معیار کے ربوٹ بنائے جائیں، نیچر اور سپیس (Nature and Space) پر ریسرچ کے لیے گلوبل معیار کے ادارے قائم ہوں جس میں گلوبل ورامنگ اور ماحولیاتی آلودگی، موسمی تبدیلیوں کے حوالے سے اعلیٰ معیار کے ریسرچ ادارے قائم ہوں۔ اسی طرح غیر انسانی معیار کی انسان کی خوراک کی جگہ اعلیٰ درجہ کی زراعت کو فروغ دینے کے لیے ریسرچ ادارے قائم ہوں جو جنوبی ایشیاء میں صحت کا گرتا ہوا معیار دیکھ کر مناسب کھیتی باڑی کا نظام قائم کریں تاکہ اعلیٰ معیار کی انسانی خوراک کو عام کیا جائے۔

سماجی عدم مساوات کو ختم کرنے کے لیے سائنسی تحقیق کے معیاری ادارے قائم کیے جائیں اور انسانی عقل اور سوچ کے معیار کو بلند کرنے کے لیے تحقیقی سنٹر اور ادارے قائم ہوں جو انسان کو سائنسی بنیادوں پر سوچنے اور تحقیق کرنے کا ہنر سکھائیں تاکہ انسانی دماغ کی غیر صحت مندانہ سرگرمیوں کو صحت مند اور معیاری سرگرمیوں پر کام کرنے کی طرف مائل کیا جائے۔ انسان کی معاشرتی زندگی کو دلچسپ بنانے کے لیے سماج میں ایسے تحقیقی ادارے قائم

ہوں جو نوجوانوں کو انسانوں کی سماجی نفسیات کو سمجھنے میں تحقیق کریں انسان کے معاشرتی رویے کو انسان دوست فطرت دوست بنانے میں مدد کریں۔ انسانی سماج کو خوبصورت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر انسان کو معاشی پریشانیوں سے نجات دلائی جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ منافع کی بنیاد پر قائم سرمایہ داری کو ختم کر دیا جائے اس کی جگہ مشترکہ ملکیت اور مشترکہ انتظام کی بنیاد پر چلایا جانے والا ایسا نظام لایا جائے جو پیداواری قوتوں کی مشترکہ ملکیت میں ہو جو پیدا کرے وہی اس کا مالک ہو اس پیداواری عمل میں شریک تمام قوتوں کو اس پیداوار میں حصہ دیا جائے۔ مزدور کی اجرت کا نظام ختم کر کے اس کو پیداوار میں حصہ دار اور مالک بنایا جائے۔

اجرتوں اور ٹیکس کا نظام ختم کر دیا جائے اور ریاست کا پیداوار میں ایک حصہ الگ کر دیا جائے جو عوام کی ضرورت پر خرچ کرے۔ دولت پیدا کرنے کے ذرائع ریاست اور اس ادارے کا نظام چلانے والوں کی مشترکہ ملکیت اور مشترکہ انتظام میں دیا جائے۔ پیداوار کا ایک حصہ ریاست کو دیا جائے اور باقی ساری پیدا ہونے والی دولت کو مزدوروں اور انتظامیہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ منافع کا نظام سرے سے ہی غائب ہو جائے گا۔ ریاست کا انتظام بھی دو طرح کی پارلیمنٹ کے ذریعہ چلایا جائے ایک عوام کی پارلیمنٹ ہو جو گاؤں، محلہ اور وارڈ سے شروع ہو کر ملکی سطح تک جائے اور دوسری نمائندہ پارلیمنٹ ہوگی جو علاقائی، صوبائی اور آخر میں ملکی پارلیمنٹ ہوگی جو عوامی پارلیمنٹ کی طرف سے نمائندے چن کر گاؤں کی سطح سے لے کر ملکی سطح تک جائیں گے۔ اسے نمائندہ پارلیمنٹ کہا جائے گا۔ علاقے کی عوام جو ووٹ کا حق رکھتی ہوگی وہ اپنے گاؤں، محلے کی سطح پر عوامی پارلیمنٹ کہلائیں گے۔ وہ جو نمائندے اپنے علاقائی، ملکی پارلیمنٹ میں چن کر بھیجیں گے انہیں واپس بلانے کا اختیار بھی رکھتے ہوں گے۔ سیاسی جماعتوں کی حکمرانی کی بجائے لوکل سطح سے ملکی سطح تک عوامی نمائندوں کی حکومت ہوگی۔ سیاسی جماعتوں کا کردار صرف عام لوگوں کی رہنمائی کرنا ہوگا۔ کیونکہ جماعتی نظام کرپٹ بن جاتا ہے اور پارٹی کے چنے ہوئے نمائندے پارٹی ایجنڈا لوگوں پر مسلط کرنے لگتے ہیں سیاسی جماعتیں عوام کو گائیڈ کرنے کا کردار ادا کریں گی جو پارٹی کا عہدیدار پارلیمنٹ کا نمائندہ بننے کا خواہش

مند ہوگا اسے پارٹی کی ممبرشپ چھوڑ کر عوام کی نمائندگی کرنا پڑے گی۔ ہندوستان اور پاکستان کی اپنی علاقائی/صوبائی اور ملکی پارلیمنٹ کا نظام ہوگا۔ جموں کشمیر میں بھی یہی پارلیمنٹ کا ماڈل قائم کیا جائے گا۔

جموں کشمیر کی ریاست کو جنوبی ایشیاء کی مشترکہ پارلیمنٹ میں بھی نمائندگی دی جائے گی جس میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے بھی ہوں گے جسے جنوبی ایشیاء کی مشترکہ پارلیمنٹ کہا جائے گا۔اسی طرح جنوبی ایشیاء کی مشترکہ سیکیورٹی کا نظام قائم کیا جائے گا۔جنوبی ایشیاء کا مشترکہ ترقی کا نظام قائم کیا جائے گا ہندوستان اور پاکستان کی کنفیڈریشن قائم ہونے کے بعد جنوبی ایشیائی ممالک کی کنفیڈریشن بنائی جائے گی جو بارڈرز کے بغیر کنفیڈریشن ہوگی اور گلوبل چیلنجز کا مقابلہ کرے گی جس میں سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کی ہوئی غیرانسانی حالت کا خاتمہ اور موسمیات کی تبدیلیوں سے جو تباہی اور بربادی آنے والی ہے اس کا گلوبل سطح پر مقابلہ کرنے کے لیے تیاری کرے گی۔جنوبی ایشیاء کی کنفیڈریشن جنوبی ایشیاء میں علاقائی امن کو پروموٹ کرے گی اور عالمی امن کے لیے علاقائی حالات میں استحکام پیدا کرنے کے لیے کام کرے گی۔ یہ جنوبی ایشیائی کنفیڈریشن ساری ایشیاء کی کنفیڈریشن اور اشیاء کی کفیڈریشن گلوبل ریاست یا گلوبل کنفیڈریشن کو جنم دے گی لیکن اس وقت ہمارا فوکس ریاست جموں کشمیر کی بحالی اور اس کا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کنڈومینیم قائم کرنا ہے اور ساتھ ہی ہندوستان اور پاکستان کی کنفیڈریشن کو فوکس کرنا ہے کیونکہ اس وقت جنوبی ایشیاء میں ہندوستان اور پاکستان مسائل کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں اس خطے کے مسائل کی کنجی ریاست جموں کشمیر کا سہہ فریقی تنازعہ کا حل ہے اور اس تنازعہ کا خاتمہ دراصل اس خطے کے مسائل کے خاتمے کی شروعات ہوں گی۔لیکن ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کو حل کیے بغیر ہندوستان اور پاکستان آپس کے تعلقات میں بہتری نہیں لاسکتے اس لیے ہم پہلے اس تنازعہ کو تینوں فریقوں کو مل کر حل کرنے کی طرف لائیں گے اور باقی مسائل کا حل اسی مسئلہ کے حل سے نکلے گا لیکن اس کے لیے ہندوستان اور پاکستان کی محاذ آرائی کا خاتمہ اور سہہ فریقی مذاکرات کا آغاز کرنا بنیادی شرط ہوگی۔ دونوں ملک بڑے چیلنجز کا مقابلہ تب ہی کرسکیں گے کہ وہ بنیادی

مسئلہ حل کریں۔

اس وقت جو دنیا میں سب سے بڑا چیلنج بن چکا ہے وہ اس وقت زمین پر موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے انسانی زندگیوں کی بقاء اولین مسئلہ ہے۔ اس وقت زمین کا درجہ حرارت بڑھ چکا ہے اور مزید ڈیڑھ فیصد زمین کا درجہ حرارت بڑھ گیا تو زمین پر تمام طرح کی زندگیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے گلوبل وارمنگ سب سے بڑا چیلنج بن چکا ہے۔ چونکہ درجہ حرارت ساری دنیا میں بڑھ گیا ہے اس کا خاتمہ بھی گلوبل بنیادوں پر ہو سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے گرین ہاؤس گیسز (Gases) کا اخراج فضاؤں میں اتنی زیادہ مقدار میں کر دیا ہے کہ سورج کی گرمی جتنی زمین میں جذب ہوتی ہے باقی فالتو گرمی واپس فضا میں چلی جایا کرتی تھی۔ اب فضا میں انڈسٹریل فیول اور دیگر گیسوں کے استعمال نے فضاؤں کو اس قدر آلودہ کر دیا ہے کہ گرین ہاؤس گیسز (Gases) نے سورج کی گرمی کی واپسی کا راستہ ہی روک دیا ہے جس کی وجہ سے زمین کا درجہ حرارت 200 ڈگری ہونے سے تمام انسان اور جانوروں کی زندگیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس وقت سائنسدان مشورہ دے رہے ہیں کہ ہنگامی بنیادوں پر فضاؤں میں موجود گرین ہاؤس گیسز کی مقدار کو ہٹایا جائے اس کے لیے امیر ملکوں کا کردار زیادہ اہم ہے چونکہ اس آلودگی کو کم کرنے کے لیے ایک طرف تو مزید گرین ہاؤس گیسز کا اخراج بند کیا جائے اور نیا انڈسٹریل ماحولیاتی آلودگی سے پاک نظام لگایا جائے دوسرا کام فوراً کرنے کا یہ ہے کہ فضا میں جا کر ان آلودہ گیسز کو مشینوں کی مدد سے سٹور کر کے ختم کیا جائے یہ انتہائی مہنگا نظام چاہیے جو امیر ملک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جبکہ سائنسدان بار بار وارننگ دے چکے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ساری دنیا کو ایک ہونا پڑے گا اور تمام ملکوں کو مشترکہ کوشش کرنا ہوگی ورنہ انسان ہی مر جائے گا تو ملکوں کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ایسی مشترکہ کوشش جنوبی ایشیاء میں تب ممکن ہے جب ہندوستان اور پاکستان جو اس خطے کے بڑے ملک ہیں ایک نئے نظام کے تحت اکٹھے ہو جائیں اور اپنے خطے کو تباہی سے بچانے کی کوشش کریں۔

اس وقت ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو تصادم کی راہ ترک کر کے جنوبی ایشیاء میں انسانی زندگیوں کی بقا کی خاطر ایک ہو کر کام کرنا ہوگا ورنہ منافع کی حرص میں چند

سرمایہ دار اس سرزمین کا ہی خاتمہ کر دیں گے۔ جنوبی ایشیاء میں اس وقت پونے دو ارب انسان رہتے ہیں اور یہاں کی آبادی کی اکثریت غربت، جہالت، پسماندگی اور بیماریوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے یہاں کے عام لوگوں نے نہ آزادی دیکھی نہ خوشی دیکھی یہاں کے لوگ بے پناہ مسائل میں مبتلا ہیں یہاں کے حکمران طبقات تاریخ کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں یہاں عوام کو زندگی کی بنیادی سہولتیں دینے میں بھی ناکام ہوئے ہیں عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے کی بجائے پچھلے 75 سالوں سے ایک دوسرے سے محاذ آرائی کرنے میں ریاستوں کے بہت زیادہ وسائل برباد کر چکے ہیں اب وقت آ گیا ہے دونوں ملکوں کے عوام ان جاگیردارانہ / سرمایہ دارانہ پالیسیوں کا خاتمہ کرنے کا مطالبہ کریں اور اپنے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیادوں پر جدید تعلیم، صحت کی سہولتوں اور روزگار کا مطالبہ کریں۔ دونوں ملکوں کے حکمرانوں نے اپنی عوام کو آج 21 ویں صدی میں پینے کا صاف پانی اور صحت کی بنیادی سہولتوں سے دور رکھا ہوا ہے دونوں ملکوں میں فیوڈل طرز کی مذہبی پسماندہ سوچ کی بنیاد پر عوام پر حکمرانی کی جاتی ہے اور انہیں گمراہ کیا جاتا ہے تا کہ وہ جدید سہولتوں کا مطالبہ کرنے کی بجائے مذہب کی بنیادی سوچ کے مطابق اس زندگی کی ذلتوں کو قدرت کی طرف سے سزا کا شاخسانہ سمجھ کر قبول کر لیں۔ عوام کی بڑی تعداد کو آج بھی دیکھا جائے تو ماضی کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہے اور توہم پرستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور ہندوستان اور پاکستان نے عوام کو بنیادی سائنسی تعلیم سے دور رکھا ہوا ہے کروڑوں بچے دونوں ملکوں میں سکول نہیں جا پاتے کیونکہ غربت زیادہ ہے والدین خرچہ نہیں کر پاتے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے پونے دو ارب انسانوں کی نجات آپس میں اتحاد، امن، بھائی چارے میں ہے۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان اور پاکستان کو چاہیے کہ وہ اس وقت ریاست جموں کشمیر کے تنازعہ کے حل پر فوکس کریں اور پہلی فرصت میں ریاست کے سہہ فریقی تنازعہ پر سہہ فریقی مذاکرات کا اہتمام کریں۔ ہندوستان اور پاکستان اس تنازعہ میں جتنی دیر کریں گے اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ امن اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کے لیے مذاکرات کا عمل دوبارہ شروع کریں۔ اس خطے میں بڑی طاقتوں کے مفادات اور چین کی

ابھرتی ہوئی طاقت کے خلاف مغربی مما لک اور امریکہ کے مفادات واضع ہو چکے ہیں۔
ریاست جموں کشمیر کا تنازعہ آج تک ہندوستان اور پاکستان حل نہیں کر پائے تو اس کے پیچھے
بڑی طاقتوں کی گیم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس وقت دونوں ملکوں نے یہ موقع کھو دیا تو پھر اس
مسئلہ پر بڑی طاقتوں اور چین کی محاذ آرائی کا دور شروع ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔
ہندوستان، پاکستان اور چین کو مل بیٹھ کر اس خطے کے مسائل کو حل کرنا ہوگا۔

اس وقت تینوں پڑوسی ملکوں (ہندوستان، پاکستان اور چین) کو ریاست جموں کشمیر
کے مسئلہ کو ریاست کے حقیقی نمائندوں کو اعتماد میں لیتے ہوئے سہ فریقی حل نکالنا چاہیے جس
میں ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی بحالی، فیڈرل ریاست کا قیام اور دونوں ملکوں کے
درمیان مشترکہ امور پر معاہدے کرنا بھی شامل ہے۔ بھارت نے امریکہ کا اتحادی بن کر چین
سے محاذ آرائی کی پالیسی اپنائی اور پاکستان نے چین کے کہنے پر بھارت سے مزید محاذ آرائی
کرنے کی کوشش کی تو اس میں امریکہ اور چین سے زیادہ ہندوستان اور پاکستان کا نقصان
ہوگا۔ اس لیے دونوں ملکوں کو چاہیے کہ چین کو اعتماد میں لے کر پہلے مرحلے میں ریاست جموں
کشمیر کی تقسیم ختم کریں اور ریاست کو واپس متحد کریں۔ اس کی فیڈرل ریاست کا ڈھانچہ بننے
دیں دوسرے مرحلے میں ہندوستان اور پاکستان کی کنفیڈریشن بنانے کے اقدامات کریں۔
اس دوران تینوں ملک انڈیا، پاکستان اور چین جنگ نہ کرنے کا معاہدہ بھی کریں۔

☆☆☆☆

Bibliography

1.	British Paramountcy in Kashmir	Madhavi Yaseen
2.	The Kashmir question in security council	Domal Fedric-1948-52
3.	Gilgit rebellion	Major-A-Brown
4.	The shadow of the great game	Narinder Singh Sarila
5.	Cultural and political history of Kashmir	P-N-Bamzai
6	Danger in Kashmir	Josef Korbel
7	A concise History of Jammu and Kashmir	Hashmatullah Lakhanavi
8.	Atish-e- Chinar	Sheikh- M- Abdullah
9.	Kashmukash بی(کشمکش)	Chaudry Ghulam Abbas
10.	Mataiy Zindgi-(متاع زندگی)	Sardar M Ibrahim Khan-
11.	Raiders of Kashmir کشمیر کے حملہ آور اور پنڈی سازش کیس	Major General Akber Khan
12.	The nation that lost its soul-:گم گشتہ قوم	سردار شوکت حیات
13.	Kashmir Saga	Sardar-M- Ibrahim khan
14.	Mission with Mountbatten	Alan Campbell Johnson
15.	Kashmir a disputed legacy	Alastair Lamb

16.	History of kashmir	M- D- Fooq
17	Jehed-e-Musalsel-:جہد مسلسل	Amanullah Khan
18	Muqadma-e-Kashmirمقدمہ کشمیر	Sardar Abdul Qayoom Khan
19	www.uca.edu	University of Arkansas
20	Freedom House.org	
21	Tribune.com.pk	
22	Scholarsworks.bgsu.edu	
23	www.AJK.Govt-:Govt. Records	
24	How Moscow sees Kashmir	Heman Roy



منقسم ریاست جموں کشمیر کی تاریخ وجود شناخت اور روشن مستقبل کا مقدمہ لیے جاوید عنایت شعور کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ہم کیا تھے؟ کیا ہیں اور کیا ہونا چاہئے؟۔قوموں کے درمیان باوقار قوم روایات تہوار تہذیب و تمدن ثقافت کے سارے رنگ سمیٹنے کی آرزو آزادی کے ثمرات پر رقص جشن ہا ہو۔وہ خواب جو ہم روز بنتے ہیں وہ خواہشات جو جبر کی راکھ کے نیچے چنگاری سے شعلہ بننے کے لیے بیتاب ہیں۔جاوید عنایت نے اس کتاب میں ریاست کی تاریخ کو پہلی بار اس انداز سے پیش کیا ہے جو منقسم ریاست کو متحد کرنے کا راہ عمل ہے بلکہ ریاست کی تعمیر وترقی اور خوشحالی کا روڈ میپ ہے۔مصنف نے ریاست جموں کشمیر میں شامل تمام خطوں کی قدیم تاریخ کے ساتھ ساتھ ریاست کے تاریخی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پہلی بار ریاست جموں کشمیر کے بننے اور ٹوٹنے کے عمل کو اس کے سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی پہلو اور دیگر ٹھوس عوامل کو تاریخی حوالوں سمیت سامنے لایا ہے یوں مصنف نے نہ صرف تنازعے کی بنیادوں کو سامنے لاتے ہوئے اسے عام فہم کیا بلکہ جنوبی اشیا میں پائیدار امن کیلیے بہترین تجاویز بھی پیش کیں ہیں۔جس محنت اور لگن سے ریاست کی تاریخ اور اس پیدا شدہ تنازعے کو باریک بینی سے سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ قابل ستائش ہی نہیں نسل نو کے لیے مشعل راہ ہے

یاسین انجم۔پلندری
(زونل صدر گلوبل پارٹی)



Global Research Institute
0333-5577993 / 0345-5218785
978-969-7836-60-4
Price 1200/-